جلد ہفتم
جواہر الفقہ
فقہی رسائل و مقالات
کا نادر مجموعہ
مفتی اعظم پاکستان
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مکتبہ دار العلوم کراچی

جواہر الفقہ

فقہی رسائل و مقالات
کا نادر مجموعہ

مفتی اعظم پاکستان
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جلد ہفتم

مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

مضمون صفحہ

تفصیلی فہرست مضامین

جواہر الفقہ جلد ہفتم

کتاب الحظر والاباحۃ

(باب التداوی)

تنشیط الازہان فی الترقیع باعضاء الانسان

مضمون صفحہ

مضمون صفحہ

مضمون صفحہ

باب اللباس والزينة

احكام الخطاب فى بعض أحكام اللُّحى والخضاب

باب التصاوير

التصوير لأحكام التصوير

مضمون صفحہ

مضمون | صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

مضمون | صفحہ

مضمون صفحہ

مضمون صفحہ

مضمون صفحہ

تفصیل الكلام فی مسئلة الاعانة علی الحرام

تفصیل الأحكام للأرباح الفاسدة والمال الحرام

کتاب الفرائض

القول السدید فی تحقیق میراث الحفید الملقب بارغام العنید

مضمون | صفحہ

کتاب الوصایا

❀❀

٩٦

تنشیط الازمان فی الترقیع باعضاء الانسان

اعضاء انسانی کی پیوند کاری

مصدقہ

مجلس تحقیق مسائل حاضرہ

تاریخ تالیف ـــــــ شعبان ۱۳۸۷ھ (مطابق ۱۹۶۷ء)

مقامِ تالیف ـــــــ دارالعلوم کراچی

ایک انسان کا خون دوسرے انسان کو لگانے کا کیا حکم ہے؟ اسی طرح ایک انسان کا عضو دوسرے انسان کو لگانے کی اجازت ہے یا نہیں؟ سرجری کی بڑھتی ہوئی سہولتوں کے پیش نظر حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے یہ تحقیقی رسالہ تحریر کیا جو اکابر علماء کے تائیدی دستخطوں کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

فقہی مسائل میں اجتماعی غور وفکر کا سلسلہ قرونِ اولیٰ سے چلا آتا ہے، جن مسائل میں قرآن وسنت کے اندر کوئی نصِ صریح نہیں ہے۔ ان میں قرآن وسنت ہی کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لئے خود رسول اللہ نے ایک زریں ہدایت نامہ دیا ہے۔

حضرت علیٰ مرتضیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم قرآن وسنت میں مذکور نہیں تو اس میں ہمارے لئے کیا ارشاد ہے؟ آپ انے فرمایا۔

شاوروا الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأيا خاصة. (رواه الطبراني في الاوسط ورجاله موثقون من اهل الصحيح كذافي مجمع الزوائد للهيثمي ص ۱۷۸ ج ۱)

ترجمہ...... اس میں فقہاء اور عابدین سے مشورہ کر کے کوئی رائے قائم کرو، انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو۔ یہ حدیث طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کی ہے امام حدیث حافظ ہیثمی نے فرمایا کہ اس حدیث کے سب راوی معتمد اور صحیح کے رجال ہیں۔

!

اسی حدیث کے مقتضیات پر عمل کرتے ہوئے مختلف زمانوں میں علماءِ امت کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ نئے پیش آنے والے احکام دینیہ خصوصاً اجتماعی نوعیت کے مسائل میں باہمی غور وفکر، مشورہ اور بحث وتمحیص کے بعد کوئی فتویٰ دیتے تھے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کا عمل بھی اسی پر تھا، فقہی مسائل کی تحقیق کے لئے انہوں نے ماہر فقہائے عابدین کی جو مجلس بنائی ہوئی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا، مغلیہ حکومت کے دور میں 'فتاویٰ عالمگیریہ' جیسی عظیم الشان کتاب بھی اس طرح مرتب ہوئی۔

آخر دور میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ کا طریق کار بھی یہ تھا کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں، بالخصوص ان مسائل میں جو عالمگیر اور اجتماعی اہمیت کے حامل ہوں، محض اپنی انفرادی رائے پر اعتماد فرمانے کے بجائے وقت کے ماہر 'فقہاً عابدین' سے مشورہ فرماتے تھے اور موافق ومخالف تمام پہلو سامنے آنے کے بعد کوئی فتویٰ دیتے تھے، نئے فقہی مسائل کی تحقیقات کے لئے آپ نے ﴿حوادث الفتاویٰ﴾ کے نام سے ایک مستقل سلسلہ شروع کر رکھا تھا، اور ان میں سے بیشتر مسائل میں آپ کا طریق کار یہی تھا، عورتوں کے مصائب ومشکلات کو دور کرنے کے لئے ﴿الحلیة الناجزة﴾ بھی اسی طرح تصنیف ہوئی، جو حضرت تھانویؒ کے تفقہ اور دینی بصیرت کا نتیجہ ہے۔

یوں تو زندگی "ہر دم رواں پیہم دواں" ہے، اور ہر نیا زمانہ اپنے ساتھ نئے مسائل اور نئے حالات لے کر آتا ہے، لیکن خاص طور سے مشین کی ایجاد کے بعد سے حالات نے جو پلٹا کھایا ہے اس سے زندگی کا کوئی گوشہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے انسانی زندگی کے ہر ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں، اور ہر علم وفن میں نئے مسائل پیدا کر کے تحقیق وتفتیش کے نئے میدان کھولے ہیں۔ اسی ضمن میں

ایسے بیشمار فقہی مسائل بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کا صریح حکم قرآن وسنت یا فقہاء امت کے کلام میں موجود نہیں اور ان کا حل تلاش کرنے کے لئے فقہ اور اصولِ فقہ کی روشنی میں تحقیق ونظر کی ضرورت ہے۔

اسی وجہ سے آج 'شاوروا الفقهاء والعابدين' کے ارشادِ حدیث پر عمل کرنے کی ضرورت شاید پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے، ضرورت تو اس بات کی تھی کہ عالمِ اسلام کے چیدہ چیدہ 'فقہاء عابدین' جن کی فقہی بصیرت علم و عمل، تدین وتقویٰ اور معاملہ فہمی پر پوری امتِ اسلامیہ کو اعتماد ہو، مشترک طور سے ان مسائل پر غور وفکر کریں، لیکن آج پورا عالمِ اسلام جن سیاسی اور معاشرتی الجھنوں میں گرفتار ہے، ان کے پیش نظر یہ بات ممکن نظر نہیں آتی، بحالاتِ موجودہ علماء کے ہاتھ میں اتنے وسائل بھی نہیں ہیں کہ وہ ایک ہی ملک کے 'فقہاء عابدین' کو جمع کر کے یہ کام انجام دے سکیں۔

لیکن مالا یدرک کله لایترک کله کے پیشِ نظر صرف کراچی کے علماء نے اس کام کے لئے ایک غیر رسمی جماعت بنائی ہوئی ہے جس میں کراچی کی تین ممتاز دینی درسگاہوں دارالعلوم کراچی، مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن، اور اشرف المدارس ناظم آباد کراچی کے ماہر اہل فتویٰ شریک ہیں، یہ جماعت ابھی تک عام جماعتوں کی رسمی پابندیوں اور عہدہ ومنصب کے ضابطوں سے بے نیاز نہایت سادگی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ تینوں اداروں کے اہل علم وفتویٰ وقتاً فوقتاً مل کر بیٹھتے ہیں، نئے مسائل پر غور وفکر اور بحث وتمحیص کرتے ہیں۔ مسئلے کے تمام گوشوں کا غیر جانبداری کے ساتھ مطالعہ ہوتا ہے اور ہر شخص خود کھل کر اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ اور جب کوئی مسئلہ طے ہو جاتا ہے تو اس کو دلائل کے ساتھ لکھ لیا جاتا ہے۔

اس طرح یہ مجلس کئی فقہی مسائل طے کر چکی ہے۔ جو انشاء اللہ رفتہ رفتہ شائع کئے جائیں گے، فی الحال مریض کو خون دینے اور تبادلہ اعضاء انسانی کا مسئلہ شائع کیا جا رہا ہے جس کے لئے ملک و بیرون ملک کے اہل فتویٰ کے پاس سوال نامہ بھیج کران کی تحقیقات بھی جمع کی گئیں اور باہم بحث و تمحیص کے بعد اسے احقر نے مرتب کیا ہے۔

دوسرے طے شدہ مسائل میں بیمہ زندگی، بے سود کی بنکاری، پراویڈنٹ فنڈ اور اس کے سود کے احکام، مواقیت حج، مشینی ذبیحہ وغیرہ شامل ہیں ان کو بھی اسی طرح انشاء اللہ تعالیٰ شائع کیا جائے گا اور ملک و بیرونِ ملک کے اہل فتویٰ کے پاس بالخصوص بھیجا جائے گا، اگر کسی طرف سے کوئی مؤثر تحقیق ان کے خلاف میں آئی تو اس پر فکر و غور کے بعد بطور ضمیمہ شائع کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو نافع اور مفید بنائے۔ اور اپنے ان بندوں کو راہِ صواب کی ہدایت فرمائے جو اس کی مرضیات کی تلاش و جستجو کرنا چاہتے ہیں۔ ھو حسبنا و نعم الوکیل!

بندہ محمد شفیع

خادم دار العلوم کراچی

شعبان ۱۳۸۷ھ ہجری

مجلس تحقیق مسائل حاضرہ

سرپرست

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ

ارکان

حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ، مہتمم دارالافتاء والارشاد کراچی

حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ مفتی مدرسہ نیوٹاؤن کراچی

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ استاذ دارالعلوم کراچی

حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب استاذ دارالعلوم کراچی

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب استاذ دارالعلوم کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللہ و کفٰی وسلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصاً علٰی سیدنا محمد المصطفٰی ومن بھدیہ اھتدی اَللّٰھمَّ فاطرَ السمٰوات وَالارض عالم الغیبِ والشھادۃِ. انت تحکم بین عبادکَ فیما کانوا فیہ یختلفون. اھدنا لما اختلف فیہ الٰی الحق باذنک انک تھدی من تشاء الٰی صراطٍ مستقیم ط

امّا بعد

ڈاکٹری اور سرجری کی موجودہ ترقیات نے معالجات میں بہت سی نئی نئی صورتیں پیدا کردی ہیں ان سے جہاں بہت سے طبی فوائد حاصل ہوئے اس کے ساتھ بہت سے شرعی مسائل حلال وحرام کے متعلق بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ مثلاً ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا۔ ایک کی کھال دوسرے کے بدن پر جمادینا۔ ایک شخص کی آنکھ، ناک وغیرہ اعضاء کو دوسرے کے جسم میں پیوست کر کے کام لینا وغیرہ، اور اس گئے گذرے دور میں بھی بحمد اللہ مسلمانوں کی ایک بھاری تعداد ایسی موجود ہے جو حلال وحرام کا احساس رکھتی ہے اس لئے ایک زمانہ سے خلاف شرع

امور سے بچنے کا اہتمام رکھتی ہے اور اسی لئے ایک زمانہ سے انسانی خون اور اعضائے انسانی کے تبادلہ اور خرید و فروخت اور تبادلہ خون و اعضاء پر مرتب ہونے والے آثار کے متعلق اطراف عالم سے مختلف قسم کے سوالات بکثرت آتے رہتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن وسنت میں علاج ومعالجہ کی ان خاص جزئیات اور مخصوص صورتوں کے صریح احکام تو مذکور ہو نہیں سکتے کیونکہ یہ صورتیں اس وقت موجود ہی نہ تھیں لیکن قرآنِ کریم اور شریعت اسلامیہ کا یہ کمال ہے کہ ان کے بتلائے ہوئے اصول وقواعد میں صحیح غور وفکر سے کام لیا جائے تو ہر نئے سوال اور نئی صورت کا جواب اس میں موجود نظر آتا ہے شرط یہ ہے کہ قرآن وسنّت کے علوم کو ان کے ماہرین سے پڑھا اور سیکھا ہو اور پھر ان میں پورے غور وفکر سے کام لیا ہو اور اس غور وفکر میں خوفِ خدا اور آخرت کی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ شرعی حدود کے اندر ضرورتوں کا پورا کرنا پیشِ نظر ہو، محض وقتی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے قرآن وسنت کی نصوص میں کھینچ تان اور تاویلات کے درپے نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام ہر عربی جاننے والے بلکہ ہر فارغ التحصیل عالم کا بھی نہیں ہے۔ اس کے لئے ماہرین کتاب وسنت اور تفقہ فی الدین رکھنے والے متقی علماء کی ضرورت ہے اور ان کے لئے بھی احتیاط اس میں ہے کہ انفرادی رائے سے کوئی فتویٰ نہ دیں بلکہ صحابہ کرام کی سنت کے مطابق اپنے زمانہ کے معروف اہل فتویٰ سے مشورہ کر کے کوئی رائے قائم کریں۔ کیونکہ ان مسائل کے دونوں پہلو نازک ہیں جس طرح کسی حرام کو حلال کر دینا ایک بہت بڑا جرم وگناہ ہے اسی طرح حلال کو حرام کہہ دینا بھی ویسا ہی جرم ہے اور جن معاملات میں شریعت اسلام نے بلحاظ ضرورت کوئی وسعت دی ہے اور ان میں شریعت کی دی ہوئی وسعت کو نظر انداز کر کے عام مسلمانوں پر عرصۂ حیات کو تنگ کر دینا بھی کوئی دین کی خدمت نہیں کہلا سکتی بلکہ اس کا گناہ دین سے بیزاری اور نفرت کا سبب بن کر بہت سے

دوسرے گناہوں سے بڑھ جاتا ہے (نعوذ باللہ منہ)

احقر نے ایسے جدید عالمگیر مسائل میں اپنے بزرگوں کا خصوصاً حکیم الامت حضرت سیدی مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کا یہی طرز دیکھا اور برتا ہے کہ جن مسائل میں ابتلائے عام ہو، ان میں حدود شرعیہ کے دائرہ میں رہ کر غور وفکر فرماتے شریعت کی دی ہوئی سہولتیں تلاش کرتے اور پھر علماء وقت سے مشورہ کر کے کوئی فتویٰ دیتے تھے۔

عائلی مسائل نکاح وطلاق وغیرہ کے معاملے میں بہت سی عورتوں کی مظلومیت اور ہندوستان میں اسلامی حکومت اور اسلامی قانون نہ ہونے کے سبب ان کے مظلوم و بے کس رہ جانے کے بعد پیدا ہونے والے فتنوں پر نظر فرما کر مظلوم عورتوں کی گلو خلاصی کے لئے اب سے ۳۷ سال پہلے ۱۳۵۱ھ میں فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ میں غور وفکر کرنے کے بعد کچھ سہولت کی صورتیں سامنے آئیں تو اس کا التزام فرمایا کہ علماء دیوبند وسہارنپور کو تقریباً اس کی تصنیف میں شریک رکھا۔ دیوبند سے احقر کو اور مظاہر العلوم سہارنپور سے مولانا مفتی عبدالکریم صاحب مرحوم کو بلا کر خصوصیت کے ساتھ یہ کام سپرد فرمایا اور علماء حرمین سے خط وکتابت جاری رکھی جس کی وجہ سے اس کی تصنیف میں پانچ سال کا عرصہ لگا، پھر طبع کر کے ہندوستان کے مشاہیر علماء کے پاس بغرض استصواب رائے بھیجا، ان سب کی تصدیق وتائید حاصل ہونے کے بعد اس کو حیلہ ناجزہ کے نام سے شائع فرمایا۔

زیر نظر مسئلہ انسانی خون اور انسانی اعضاء کے تبادلہ کا معاملہ بھی اس زمانے میں ایک ابتلاء عام کا معاملہ ہے اور مسئلہ کتب فقہ میں منصوص نہیں جب اس کے متعلق پاکستان اور بیرون پاکستان سے متعدد سوالات آئے تو احقر نے سنتِ اکابر کے مطابق مناسب سمجھا کہ انفرادی رائے کے بجائے ماہر علماء کی ایک جماعت اس میں

غور وفکر اور بحث و تمحیص کر کے کوئی رائے متعین کرے چنانچہ اس کے لئے ایک سوالنامہ مرتب کر کے فقہ وفتویٰ کے مراکز پاکستان میں کراچی، ملتان، لاہور، پشاور وغیرہ اور انڈیا میں دیوبند، سہارنپور، دہلی وغیرہ میں بھیجے، اکثر حضرات کے جوابات وصول ہوئے تو ان پر غور وفکر بھی اجتماعی مناسب تھا مگر ملک گیر وسائل بھی آسان نہ تھے، اس کے لئے جتنے وقت اور طویل فرصت کی ضرورت تھی اس کا میسر ہونا بھی دشوار تھا۔ اس لئے بحکم ما لا یدرک کله لا یترک کله یہ صورت اختیار کی کہ صرف کراچی کے اہلِ فتویٰ علماء کا اجتماع کر کے ان پر غور کیا جائے اور یہ اجتماع جس نتیجہ پر پہنچے۔ اس کو منضبط کر کے ملک اور بیرونِ ملک کے ارباب فتویٰ کے پاس بھیج کر ان کی آراء اور فتاویٰ حاصل کئے جائیں تا کہ یہ ماہر اہلِ فتویٰ کا اجتماعی فتویٰ ہو سکے۔ اس اجتماع میں حسبِ ذیل حضرات نے شرکت کی۔ اور مختلف تاریخوں کی پانچ چھ نشستوں میں باہر سے آئے ہوئے جوابات اور اس مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کیا گیا اور اس معاملہ کے متعلق مذاہب اربعہ کی کتابوں کو سامنے رکھا گیا۔ یہ مجلس باتفاق رائے جس نتیجہ پر پہنچی وہ آئندہ صفحات میں مع دلائل کے لکھا جا رہا ہے۔ اسمائے شرکاء مجلس یہ ہیں۔

دار العلوم کراچی سے

۱)...... محمد شفیع خادم دار العلوم کراچی

۲)...... مولانا محمد صابر صاحب نائب مفتی

۳)...... مولانا سلیم اللہ صاحب مدرس دار العلوم

۴)...... مولانا سحبان محمود صاحب مدرس دار العلوم

۵)...... مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب مدرس دار العلوم

۶)...... مولانا محمد رفیع صاحب مدرس دار العلوم

۷)...... مولانا محمد تقی صاحب مدرس دار العلوم

مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی سے

۸)...... حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث و مہتمم مدرسہ

۹)...... مولانا محمد ولی حسن صاحب مفتی مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی

۱۰)...... مولانا محمد ادریس صاحب مدرس مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤ کراچی

دار الافتاء والارشاد سے

۱۱)...... مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ مفتی و مہتمم

باہر سے جن حضرات کے تحقیقی فتاویٰ موصول ہوئے۔ وہ حسبِ ذیل ہیں

۱) حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب — مفتی دار العلوم دیوبند

۲) حضرت مولانا مفتی محمد عبد اللہ صاحب — مفتی خیر المدارس ملتان

۳) مولانا عبد الستار صاحب — مفتی خیر المدارس ملتان

۴) مولانا محمد اسحاق صاحب — نائب مفتی خیر المدارس ملتان

۵) مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی — مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور

۶) مولانا مفتی محمود صاحب — مفتی مدرسہ قاسم العلوم ملتان

۷) مولانا عبد اللطیف صاحب — معین مفتی مدرسہ قاسم العلوم ملتان

۸) مولانا مفتی وجیہ صاحب — مفتی دار العلوم اسلامیہ ٹنڈو الہ یار

اس مجلس نے خون اور اعضاء کے مسائل کے علاوہ اسی طرح کے دوسرے اہم اور ابتلائے عام کے مسائل میں بحث وتمحیص کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ اور بحمد اللہ اس وقت تک بہت سے اہم مسائل زیر بحث آ کر مجلس کی رائے کی حد تک طے کر کے منضبط کر لئے گئے ہیں۔ جس میں مسائل ذیل شامل ہیں۔

۱)...... بیمہ زندگی کا مسئلہ

۲)...... پراویڈنٹ فنڈ کے سود اور اس فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ کا مسئلہ

۳)...... بلا سود بنکاری کا مفصل نظام

۴)...... یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ اور ان سے گوشت خریدنے کا مسئلہ

۵)...... مشینی ذبیحہ کا مسئلہ

اس وقت خون اور اعضاء کے زیر بحث مسئلے کے متعلق جس قدر جوابات، بیرونی حضرات سے موصول ہوئے۔ یا ارکان مجلس نے اپنی تحقیق سے لکھے۔ ان سب، پر غور وفکر کے بعد مجلس جس نتیجہ پر پہنچی ہے اس کو ان اوراق میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہر ایک کو الگ الگ لکھنے میں تکرار بھی ہوتا ہے۔ اور بے ضرورت ضخامت بڑھتی۔ اس لئے بحث وتمحیص کے بعد جو کچھ منقح ہوا اس کو ایک ترتیب سے لکھ لیا گیا۔ اور دلائل کے حوالوں کو عوام کی سہولت کے لئے الگ لکھ دیا گیا ہے۔ واللہ المستعان۔

مقدمہ

چند اصولی مسائل

مسائل کی تفصیل اور جوابات سے پہلے چند اصولی [1] باتیں سمجھ لینا ضروری ہے۔ تا کہ آنے والے مسائل کے سمجھنے میں سہولت ہو۔

---

(۱)...... یہ اصولی مسائل تقریباً سبھی فتاویٰ میں جو اس سلسلہ میں زیر غور ہیں اجمالاً یا تفصیلاً متفرق طور پر مذکور تھے ان کو بطور مقدمہ کے یکجا کر دیا گیا ہے ۱۲۔

ہر حرام چیز انسانیت کے لئے مضر ہے

پہلی بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام و ممنوع قرار دیا ہے وہ پوری انسانیت کے مفاد کی خاطر اور بڑی حکمت پر مبنی ہے، بخل یا اپنا کوئی فائدہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان چیزوں کو وہ اپنے کسی نفع کے لئے روکنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ علیم و خبیر اور حکیم ہیں ان کا کوئی حکم فضول و بے فائدہ نہیں ہو سکتا، اس لئے اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ جن چیزوں کو ہم پر حرام کیا گیا ہے۔ وہ انسان اور انسانیت کے لئے ضرر رساں ہیں، اور اگر اس میں کوئی نفع محسوس بھی ہو تو اس میں مضرت کا پہلو بہر حال غالب ہے، پھر بعض مضرتیں تو ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے جسم کو بیمار یا کمزور کر دیتی ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جن سے جسم کو کوئی ظاہری مضرت نہیں پہنچتی مگر وہ روح انسانی کے لئے مضر ہوتی ہیں، اخلاق و کردار پر ان کا برا اثر پڑتا ہے۔

پہلی قسم کی مضرتوں کو تو ساری دنیا جانتی اور مانتی ہے، جسم انسانی کی صحت و علاج کے متعلق جتنی قسم کے معالجات اور علوم و فنون دنیا میں رائج ہیں۔ طب یونانی، ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک ویدک وغیرہ بھی ان چیزوں کی مضرت کے قائل ہیں اور اسی لئے انسان کو ایسی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کی تاکید کرتے ہیں۔ جیسے مردار جانور کا گوشت وغیرہ کہ سب جانتے ہیں کہ اس کا کھانا انسانی صحت کو برباد کر دیتا ہے۔

لیکن باطنی اور روحانی صحت و مرض آنکھوں سے نظر نہیں آتے کسی میٹر یا ایکسرے وغیرہ کے آلات سے بھی ان کو نہیں دیکھا جا سکتا، اس لئے طبِ جسمانی کے حکماء بھی اس کا ادراک نہیں کر سکتے، ان کا انکشاف صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو

روحِ انسانی کے طبیب ہیں، اس کی صحت و مرض کو پہچانتے ہیں، اور جن کی نظر میں انسان کے جسم سے زیادہ اس کی صحت اور کردار کی درستی قابلِ اہتمام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت اسلام نے جن چیزوں یا کاموں کو حرام قرار دیا ہے وہ صرف انسان کی فلاح و بہبود کی خاطر حرام کیا ہے۔ یہ چیزیں کبھی اس کے جسم کے لئے مضر ہوتی ہیں کبھی روح کے لئے اور کبھی دونوں کے لئے۔

تکریم انسان اور اس کے دو پہلو

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تمام عظیم الشان مخلوقات میں انسان کو ایک خاص شرف بخشا ہے۔ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے اس کو تمام کائنات میں ممتاز درجہ دیا ہے۔ ظاہری شکل وصورت میں لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۱)۔ اور علم وادراک کے اعتبار سے عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ (۲)۔ اور تمام کائنات ومخلوقات سے افضل واشرف ہونے میں وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۳) اسی انسان کی شان ہے، پھر اس تکریم انسانی کے دو پہلو ہیں، ایک تو یہ کہ انسان کی زندگی اور آسودگی کے لئے تمام کائنات ومخلوقات سے اپنی خدمت اور کام لینے کا حق دیا گیا۔ بہت سے جانوروں کے دودھ سے لے کر گوشت پوست اور ہڈی وغیرہ سب چیزیں انسان کے استعمال کے لئے مباح کر دی گئیں۔ اس کی جان کی حفاظت کے لئے احکام میں طرح طرح کی آسانیاں پیدا کی گئیں۔ اور خاص اضطراری صورتوں میں انسانی جان کی حفاظت کے لئے بہت سی حرام چیزوں میں

(۱)...... ہم نے انسان کو بہت خوبصورت ڈھانچہ میں ڈھالا ہے۔

(۲)...... اللہ تعالیٰ نے سکھایا انسان کو وہ علم جس کو وہ نہیں جانتا تھا ۱۲۔

(۳)...... ہم نے اولادِ آدم کو خاص اعزاز بخشا ہے۔

گنجائش دی گئی، اس تکریم انسانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان اپنی خوراک اور علاج و دوا کے لئے بے شمار چیزوں کو کاٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر اپنے کام لا سکتا ہے۔ مگر کسی انسان کے جز اور عضو کے ساتھ یہ معاملہ جائز نہیں کیونکہ وہ تکریم انسان کے خلاف ہے اس کے اجزاء کا لین دین، بیع وشراء عام اشیاء کی طرح جائز نہیں۔

علاج و دوا کے معاملے میں شریعت اسلام کے تمام احکام ان ہی دونوں پہلوؤں کی رعایت پر دائر ہیں۔

معالجات میں شریعت اسلام کی سہولتیں

تیسرا اصولی مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بہت معظم ومکرم بنایا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ایک مقدس امانت ہے جو انسان کے سپرد کی گئی ہے، اسی لئے اس کے ضائع کرنے کی صورت کو سنگین جرم اور سخت حرام قرار دیا ہے، اس مقدس امانت کی حفاظت کے لئے بھی بڑے سامان تیار کئے ہیں اور جان بچانے اور تکلیف دور کرنے کے لئے ان کے استعمال کو نہ صرف جائز قرار دیا ہے بلکہ اس کا حکم فرمایا ہے۔ ایک بیمار کے پاس اگر کوئی ایسی دوا یا تدبیر علاج موجود ہے جس کے استعمال سے اس کی جان یقینی طور پر بچ سکتی ہے تو اس کا استعمال ضروری قرار دیا ہے۔ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی نہیں پیدا کی جس کی دوا پیدا نہ کی ہو، تجربہ اور مشاہدہ گواہ ہے کہ ہر خطے اور طبقے کے انسانوں میں جس طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اسی خطہ میں اس کی دوائیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ جن موسموں میں خاص امراض رونما ہوتے ہیں انہیں موسموں میں ازالۂ مرض کی غذائیں اور دوائیں بھی حق تعالیٰ پیدا فرماتے ہیں۔ شریعت اسلام نے بیماروں کو ہر کام میں سہولت دینے کے لئے ہر عبادت اور ہر کام میں بیماروں کے لئے مستقل احکام وضع

فرما دیئے ہیں۔ نماز جیسی اہم اور لازمی عبادت میں بیمار کے لئے جب وہ کھڑا نہ ہو سکے تو بیٹھ کر اور بیٹھ بھی نہ سکے تو لیٹ کر اور رکوع سجدہ نہ کر سکے تو اشارہ سے نماز ادا کرنے کی سہولت دے دی ہے۔ وضو اور غسل پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کو اس کا قائم مقام کر دیا ہے۔

انسانی جان کو بچانے کے لئے حالتِ اضطرار میں خاص شرائط کے ساتھ بہت سے وہ کام اور وہ چیزیں اس کے لئے جائز کر دی ہیں جو عام حالات میں حرام ہیں۔ کلمۂ کفر سے بڑھ کر کوئی جرم و گناہ اسلام میں نہیں ہو سکتا مگر کوئی شخص زبان سے کلمۂ کفر بولنے پر ایسا مجبور کر دیا جائے کہ اگر یہ کلمۂ کفر نہ بولے تو اس کا قتل کر دیا جانا یقینی ہو تو ایسی حالت میں زبان سے کلمۂ کفر بولنے کی بھی اجازت دے دی گئی ہے۔ جب کہ دل اسلام و ایمان پر جما ہوا ہو۔

قَالَ اللهُ تَعَالٰى. مَنْ كَفَرَ بِاللهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ط (سورۂ نحل)

ترجمہ...... جو شخص ایمان لائے پیچھے اللہ کے ساتھ کے کفر کرے مگر جس شخص پر زبردستی کی جاوے، بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو۔

اسی طرح جو شخص بھوک پیاس سے مر رہا ہو اس کے لئے خاص شرائط اور حدود کے اندر حرام و نجس چیزوں کو استعمال کر کے جان بچا لینا نہ صرف جائز بلکہ اس پر لازم کر دیا گیا ہے، ایسی حالت میں شراب، خنزیر، مردار جانور تک کھا کر جان بچانے کے لئے خود قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ بشرطیکہ اضطراری حالت ہو اور قدر ضرورت سے زیادہ نہ کھائے قرآن حکیم کی آیت ذیل کا یہی مطلب ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ط (سورۂ بقرہ)

ترجمہ...... پھر بھی جو شخص بے تاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ طالب لذت

ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا۔

وَفِیْ اٰیۃِ اُخْرٰی (دوسری آیت میں ہے)

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ط (سورۂ مائدہ)

ترجمہ...... پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہو جاوے۔ بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے رحمت کرنے والے ہیں۔

قرآن کریم کی آیات مذکورہ میں جس طرح کی ضرورت اور جن شرائط کے تحت کسی حرام کو مباح قرار دیا ہے وہ خود قرآنی دلالت واشارت کی رو سے یہ ہیں۔

الف...... جان بچانے کے لئے کوئی جائز صورت نہ رہے۔

ب...... ناجائز حرام چیز کے استعمال سے جان بچ جانا یقینی ہو تو اس حالت میں حرام چیز کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔ لیکن اس معاملہ میں ان شرائط وقیود کی پوری پابندی ضروری ہے جن کے تحت قرآن کریم کا یہ فیصلہ ہے۔ عوام بلکہ بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی اس معاملہ میں اکثر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہر انسانی حاجت کو وہ ضرورت واضطرار کا درجہ دے دیتے ہیں۔ حالانکہ اصطلاح قرآن میں ان دونوں میں بڑا فرق ہے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ حاجت، ضرورت، منفعت وغیرہ کے اصطلاحی الفاظ کی تعریفات اور ان کے احکام تفصیل سے لکھ دیئے جائیں۔

حاجت، ضرورت، منفعت وغیرہ کی تعریف اور درجات

چوتھا اصولی مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جس حال کو اضطرار اور ضرورت قرار دیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔ علامہ حمویؒ نے شرح الاشباہ والنظائر میں بحوالہ فتح

القدیر نقل کیا ہے کہ یہاں پانچ درجے ہیں۔ضرورت، حاجت، منفعت، زینت، فضول (حموی علی الاشباہ طبع ہند ص ۱۰۸)

ضرورت: کی تعریف یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب الموت ہو جائے گا۔یہی صورت اضطرار کی ہے اسی حالت میں حرام و ممنوع چیز کا استعمال (چند شرائط کے ساتھ جو آگے آرہی ہیں) جائز ہو جاتا ہے۔

حاجت: کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو ہلاک تو نہیں ہو گا مگر مشقت اور تکلیف شدید ہو گی۔ یہ صورت اضطرار کی نہیں، اس لئے اس کے واسطے روزے، نماز طہارت وغیرہ کے بہت سے احکام میں رعایت اور سہولتیں تو دی گئی ہیں مگر ایسی حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوں گی۔

منفعت: یہ ہے کہ کسی چیز کے استعمال سے اس کے بدن کو فائدہ پہنچے گا لیکن نہ کرنے سے کوئی سخت تکلیف یا ہلاکت کا خطرہ نہیں۔ جیسے عمدہ قسم کے کھانے اور مقوی غذائیں، اس حالت کے لئے نہ کوئی حرام حلال ہوتا ہے۔ نہ روزہ کا افطار جائز ہوتا ہے۔مباح اور جائز طریقوں سے یہ چیزیں حاصل ہو سکیں تو استعمال کرے اور نہ حاصل ہو سکیں تو صبر کرے۔

زینت: جس سے بدن کی کوئی خاص تقویت بھی نہیں، محض تفریح خواہش ہے، ظاہر ہے اس کام کے لئے کسی ناجائز چیز کے جائز ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

فضول: وہ ہے جو زینت مباح کے دائرہ سے بھی آگے محض ہوس ہوا اس کا حکم بھی ظاہر ہے کہ اس کے لئے احکام میں کوئی رعایت ہونے کے بجائے اس فضول کی مخالفت احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔

ہمارے زیر بحث مسائل کا تعلق چونکہ زیادہ تر اضطراری حالات سے ہے اس لئے اس کو پوری وضاحت سے سمجھ لینا ضروری ہے۔

اضطراری حالت کی مزید تفصیل

لفظ ضرورت ہی سے اضطرار ماخوذ ہے، ضرورت کے اصطلاحی معنی ابھی معلوم ہو چکے ہیں کہ خطرۂ جان کے لئے مخصوص ہے جس میں جان کی ہلاکت کا خطرہ یقینی نہ ہو وہ ضرورت و اضطرار میں داخل نہیں بلکہ حاجت میں داخل ہے۔

خطرۂ جان کا یقینی ہونا بھی قرآن کریم ہی کے الفاظ سے ثابت ہے جن مواقع میں قرآن نے استعمال حرام کی اجازت دی ہے وہ ایسے ہی ہیں جن میں ہلاکت کا خطرہ یقینی ہے جس صورت میں ہلاکت جان کا خطرہ یقینی نہ ہو اگرچہ خوف کسی درجہ میں ہو وہ بھی حالت اضطرار نہیں مثلاً ایک شخص کسی کو قتل کی دھمکی دیتا ہے، اور ارادہ بھی کر لیتا ہے مگر صرف اتنی بات سے یہ شخص مضطر نہ کہلائے گا جب تک حالات و اسبابِ قتل ایسے جمع نہ ہو جائیں جن سے بچ کر نکلنا ممکن نہ ہو مثلاً قاتل کے پاس آلات قتل موجود ہیں یہ شخص تنہا ہے کسی دوسرے کی امداد کا احتمال نہیں اور خود اپنی طاقت سے اس کا مقابلہ کر کے اپنی جان بچا نہیں سکتا تو یہ شخص شرعاً مضطر کہلائے گا جس کے لئے کلمۂ کفر زبان سے کہہ دینے کی یا کسی حرام چیز کے استعمال کی اجازت قرآن کریم نے دی ہے۔

دشمن کے ذریعہ جان کا خطرہ تو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن مرض کے سبب سے جان کا خطرہ ہے یا نہیں اس میں ہر شخص کا فیصلہ معتبر نہ ہو گا، بلکہ کسی ماہر فن معتمد حکیم یا ڈاکٹر کا فیصلہ معلوم کرنا چاہئے۔ قرآن ہی کے الفاظ سے یہ بھی مستفاد ہے کہ استعمال حرام اس صورت میں جائز ہے جب کہ یہ بھی یقین ہو کہ اس حرام چیز کے

استعمال سے جان بچ سکتی ہے اور حرام کے سوا اس کے لئے کوئی دوسری دوا مفید یا موجود نہیں ہے جیسے بھوکے پیاسے مضطر کو یہ یقین ہوتا ہے کہ حرام لقمہ کھانے یا ناپاک گھونٹ پینے سے جان بچ جائے گی تو جس صورت میں حرام کے سوا کوئی اور دوا بھی ایسی موجود ہو جس سے جان کا خطرہ ٹل سکتا ہے یا حرام دوا کے کارگر ہونے اور اس سے جان بچ جانے کا یقین نہ ہو تو ایسی صورت میں استعمالِ حرام جائز نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی حرام چیز کا حلال ہونا تین شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

اول...... یہ کہ حالت اضطرار کی ہو کہ حرام کے استعمال نہ کرنے میں جان کا خطرہ ہے۔

دوسرے...... یہ خطرہ محض موہوم نہ ہو بلکہ کسی معتمد حکیم یا ڈاکٹر کے کہنے کی بناء پر عادۃً یقینی جیسا ہو۔

تیسرے...... یہ کہ اس حرام کے استعمال سے جان بچ جانا بھی کسی معتمد حکیم یا ڈاکٹر کی تجویز سے عادۃً یقینی ہو۔ یہ سب شرائط قرآن کریم ہی کے ارشادات سے مستفاد ہیں۔

ان تینوں شرطوں کے ساتھ باتفاق فقہائے امت استعمال حرام جائز ہو جاتا ہے۔

(مسئلہ) اس اضطراری حالت میں بھی بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً ایک شخص کسی کو مجبور کرے کہ تم فلاں آدمی کو قتل کردو ورنہ میں تمہیں قتل کرتا ہوں تو یہ حالت اگرچہ اضطرار کی ہے مگر ایسے مضطر کے لئے اپنی جان بچانے کے لئے دوسرے کی جان لینا حلال نہیں، کیونکہ دونوں انسانوں کی جان یکساں محترم ہے، البتہ اگر دوسرے شخص کا مال ہلاک کرنے پر کسی کو مجبور کیا جائے تو مال غیر کو ضائع کر کے اپنی جان بچا لینا جائز ہے کیونکہ مال کا بدل بذریعہ ضمان ہوسکتا ہے۔ (الاشباہ والنظائر) فقہاء رحمہم اللہ کی تصریحات اس معاملہ میں

حسب ذیل ہیں۔

۱)...... ان المسلم لا یحل له ان یقی روحه بروح من هو مثله فی الحرمة کما لو اکره بوعید القتل علٰی ان یقتل مسلماً (شرح السیر الکبیر ص ۲۶۹ ج۳ مطبوعه دکن)

۲)......فتاویٰ عالمگیریه جلد ۵ ص ۳۵۵ طبع مصری. ویجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتة للتّداوی اذاا خبره طبیب ان شفاء ہ فیه ولم یجد فی المباح ما یقوم مقامه وان قال الطبیب یتعجل شفاء ک فیه وجهان اه ومثله فی کتاب البیوع من ردالمحتار مبحث بیع الحیات ص ۲۹۸ جلد ۴.

۳)......وفی تکملة البحر الرائق من الحظر والاباحة وفی النوادر امرأة حامل اعترض الولد فی بطنها ولا یمکن الا بقطعه ار باعاً ولو لم یفعل ذالک یخاف علٰی امه من الموت فان کان الولد میتا فی البطن فلا بأس به وان کان حیاًلا یجوز لان احیاء نفس بقتل نفس اخری لم یرد فی الشرع وفیه بعد ذالک لامرأة حامل ماتت فاضطرب الولد فی بطنها فان کان اکبر رائیه انه حی یشق بطنها لان ذلک تسبب فی احیاء نفس محترمة بترک تعظیم المیت فالاحیاء اولٰی. بحر(ص ۲۳۳ ج۸).

وفی الاشباه والنظائرلا بن نجیم الضرورات تبیح المحظورات ومن ثم جاز اکل المیتة عند المخمصة

واساغة اللقمة بالخمر والتلفظ بكلمة الكفر للاكراه وكذااتلاف مال غيره (الاشباه ص ۱۰۸) وفى القاعدة الرابعة من الاشباه اذا تعارض مفسدتان روعى اعظمهما ضررا بار تكاب اخفهما (الاشباه ص ۱۱۲)

۴)......وفى ردالمحتار قبيل فصل البير من الطهارة فى النهاية عن الذخيرة يجوزان علم فيه الشفاء ولم يعلم دواءً اٰخر (وفيه بعد ذلک) وافادسيدى عبدالغنى انه لا يظهر الاختلاف فى كلامهم لاتفاقهم على الجواز للضرورة واشتراط صاحب النهايه العلم لا ينافيه اشتراط من بعده الشفاء ولذا قال والدى قال فى شرح الدرران قوله لا للتداوى محمول على المظنون والا فجوازه باليقينى اتفاقى كما صرح به فى المصفّٰى. اقول وهو موافق لمامرفى الاستدلال بقول الامام. لكن قد علمت ان قول الاطباء لا يحصل به العلم. والظاهر ان التجربة تحصل غلبة الظن دون اليقين الا ان يريد وابالعلم غلبة الظن وهو شائع فى كلامهم فتامل (ردالمحتار)

۵)......ومن فقه الشافعية . قال فى شرح المهذب للنووى ان اضطر ولم يجد شيئا فهل يجوز له ان يقطع شيئا من بدنه ويأكله؟ فيه وجهان! قال ابو اسحٰق يجوز لانه احياء نفسٍ بعضو فجاز كما يجوزان يقطع

عضو اذا وقعت فيه الآكلة لاحياء نفسه

(شرح مهذب ص ۴۱ ج ۹)

۲)......ومن فقه الحنابلة قال ابن قدامة في المغنى (ص ۵۹۶ ج ۸) وسبب الاباحة الحاجة الى حفظ النفس عن الهلاك لكون هذه المصلحة اعظم من مصلحة اجتناب النجاسات والصيانة عن تناول المستخبثات اھ.

مذکورہ بالا تصریحات سے بنص قرآن و باجماع امت اضطراری حالات میں حرام چیزوں کا بقدر ضرورت استعمال کر کے جان بچا لینے کا جائز ہونا ثابت ہو چکا۔ اب غیر اضطراری حالات میں کس قدر رعایت وسہولت از روئے شرع ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا بیان آگے آتا ہے۔

غیر اضطراری حالات میں علاج اور دوا کے لئے شرعی سہولتیں

پانچواں اصولی مسئلہ یہ ہے کہ قرآنی اور شرعی اصطلاح میں جو حالت اضطراری نہیں یعنی جان کا خطرہ نہیں مگر بیماری اور تکلیف شدید ہے حرام و ناجائز دوا وغیرہ کے استعمال سے یہ تکلیف دور ہو سکتی ہے جس کو مذکورہ تفصیلات میں حاجت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، کیا ایسے حالات میں بھی شرعاً حرام و نجس دواؤں کے استعمال کی کوئی گنجائش ہے؟ اس معاملہ میں نماز، روزے وغیرہ عبادتوں میں شریعت اسلام نے بیمار کو سہولتیں دی ہیں وہ تو قرآن و حدیث سے واضح طور سے ثابت ہیں اور ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ نماز بیٹھ کر لیٹ کر، اشارہ سے بھی جائز کر دی گئی ہے، روزہ افطار کرنے اور بعد میں قضا کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن غیر اضطراری

حالت میں حرام و ناجائز چیزوں کا استعمال اس صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور نہیں اور قرآن کریم نے جو اس کی اجازت اضطراری حالت میں دی ہے اس کے تحت میں یہ صورت آتی نہیں۔ اور روایات حدیث سے اس معاملہ میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوتا، اس لئے فقہاء امت کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بغیر اضطرار کے کتنی بھی تکلیف ہو حرام و ناجائز چیزوں کا استعمال جائز نہیں، مباحات ہی سے علاج کی کوشش کی جائے، ان کی دلیل صحیح بخاری کی یہ حدیث ہے (**ان اللہ لم یجعل شفاء کم فی ما حرم علیکم**) یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی شفا اس چیز میں نہیں رکھی جو ان پر حرام کر دی گئی ہیں، لیکن جمہور فقہاء رحمہم اللہ نے اس معاملہ میں واقعہ اہل عرینہ سے استدلال کیا ہے جو حدیث کی معتبر کتابوں میں موجود ہے کہ یہ لوگ بیماری میں مبتلا تھے۔ رسول اللہ ؐ نے ان کو اونٹ کا دودھ اور پیشاب استعمال کرنے کی اجازت دی، مگر اس واقعہ میں احتمالات متعدد ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی حالت اضطرار کی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پیشاب کی اجازت خارجی استعمال کے لئے دی ہو پینے کا معاملہ نہ ہو۔ ان احتمالات کے ہوتے ہوئے اس روایت سے کوئی قطعی فیصلہ جواز کا نہیں نکالا جا سکتا، مگر ایک احتمال ضرور ہے۔

دوسرا استدلال جمہور فقہاء کا اس واقعہ سے ہے جو عرفجہ بن اسعد صحابی رضی اللہ عنہ کو کوفہ اور بصرہ کے درمیان جنگ کلاب میں پیش آیا تھا کہ ان کی ناک کٹ گئی تو انہوں نے چاندی کی ناک بنوا کر لگالی، مگر اس میں بدبو پیدا ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو سونے کی ناک بنوا کر لگانے کا حکم دیا کیونکہ سونا سڑتا نہیں ہے۔ یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مسند احمد وغیرہ میں روایت کی گئی ہے۔ اور فقہاء و محدثین نے اس کو معتبر تسلیم کیا ہے۔ اس میں سونے کی ناک لگانے کا حکم ہے۔ حالانکہ مردوں کے لئے سونے کا استعمال رسول اللہ ﷺ نے حرام فرمایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابوموسیٰ

اشعری ﷺ، عبداللہ ابن عمر وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر اس طرح تشریف لائے کہ ایک ہاتھ میں آپ ﷺ کے ریشمی کپڑا تھا دوسرے میں سونا۔ اور ارشاد فرمایا۔

هٰذان محرما ن علٰی ذكور امتی حلال لا نا ثهم . اخرجه ابوداؤد والنسائی وابن ماجة واحمد وابن حبان (تخريج هدايه للزيلعی ص ۴۵۵ ج ۴)

ترجمہ...... یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لئے جائز ہیں۔

حضرت عرفجہ کے واقعہ میں ان کے لئے سونے کی ناک لگانے کی اجازت ظاہر ہے کہ علاج و دوا کے درجہ میں ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں کوئی اضطراری حالت نہ تھی جس میں جان کا خطرہ ہوتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ غیر اضطراری حالت میں بھی جب تکلیف شدید ہو تو بعض ناجائز چیزوں کے استعمال کے گنجائش ہے، جب کہ اس کے سوا علاج کی کوئی اور صورت نہ ہو، شرط یہ ہے کہ کسی معتمد علیہ طبیب یا ڈاکٹر کے قول سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ ناجائز دوا ہی اس بیماری کا علاج ہے اور کوئی جائز دوا اس کا بدل نہیں ہو سکتی اور اس دوا کا اس بیماری کے ازالہ میں مؤثر و مفید ہونا بھی فنی طور پر یقینی ہو۔

حضرات فقہاء کی تصریحات اور شرائط کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

فی الدر المختار قبیل فصل البئر. اختلف فی التداوی بالمحرم فظاهر المذهب المنع كما فی رضاع البحر ولكن نقل المصنف ثم وهٰهنا عن الحاوی قیل یرخص اذا علم فیه الشفاء ولم یعلم دواءً اخر كما

رخص فی الخمر للعطشانِ وعلیه الفتویٰ قال الشامی تحتهٗ. ففی النهایة عن الذخیرة یجوزان علم فیه الشفاء ولم یعلم دواء ٔاخر. وفی الخانیة فی معنیٰ قوله علیه الصلوٰة والسلام ان الله لم یجعل شفاء کم فیما حرم علیکم کما رواه البخاریؒ. ان مافیه شفاء لا باس بهٖ کما یحل الخمر للعطشانِ للضرورة. وکذ اختاره صاحب الهدایة فی التجنیس فقال لورعف فکتب الفاتحة بالدم علیٰ جبهتهٖ اوانفه جاز للاستشفاء وبالبول ایضاً ان علم فیه شفاءً لکن لم ینقل وهذالان الحرمة ساقطة عندالاستشفاء کحل الخمرو المیتة للعطشان والجائع (من البحر)

وافاد سیدی عبدالغنی انه لا یظهر الاختلاف فی کلامهم لاتفاقهم علی الجواز للضرورة. واشتراط صاحب النهایة العلم لا ینافیه اشتراط من بعده الشفاء ولذاقال والذی فی شرح الدرران قوله لا للتداوی محمول علی المظنون والا فجوازه بالیقینی اتفاقی کما صرح به فی المصفٰی اقول وهو ظاهر موافق لما مر فی الاستدلال بقول الامام. لکن قد علمت ان قول الاطباء لا یحصل به العلم والظاهران التجربة یحصل به غلبة الظن دون الیقین الا ان یرید وابالعلم غلبة الظن وهو شائع فی کلامهم فتامل (شامی قبیل فصل البئر. ص ۱۹۴ ج ۱. استنبول) ومثل ما ذکرنا من فقه الاحناف

یوجد فی الفقه الشافعی والمالکی والحنبلی ایضاً بل اصرح واوضح منه ولا حاجة الیٰ سرد جمیع النقول واللہ اعلم ۱۲ منه.

خون اور اعضائے انسانی کے زیر بحث مسائل

مذکورہ صدر اصولی مسائل جن کی تفصیل بقدر ضرورت دلائل کے ساتھ لکھ دی گئی ہے یہی بنیادی مسائل ہیں، جن میں غور وفکر کے ذریعہ اہل فکر ونظر مسائل زیرِ بحث میں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ یہ مسائل اگرچہ بالکل نئے ہیں نزول قرآن اور عہد سلف میں ان کا وجود نہیں تھا۔ لیکن قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے اصول کے ماتحت نئے سے نئے پیش آنے والے مسائل کا حل اہل علم کے لئے دشوار نہیں۔

اس وقت زیر بحث مسئلے دو ہیں۔ ایک یہ کہ کسی انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں داخل کرنا شرعاً کیسا ہے اور اس کے متعلقہ مسائل۔

دوسرا۔ ایک انسان کا کوئی عضو دوسرے انسان کے بدن میں لگانے کا مسئلہ پہلے مسئلہ کی تنقیح وتحقیق حسبِ ذیل ہے۔

خون کا مسئلہ

سوالات:۔

۱)......ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا جائز ہے یا نہیں۔

۲)......اگر جائز ہے تو کیا اس کام کے لئے کسی انسان کا خون صرف

رضا کارانہ بلا معاوضہ لیا جاسکتا ہے یا معاوضہ دے کر خرید و فروخت بھی جائز ہے۔

۳)......کیا اس معاملہ میں مسلم و غیر مسلم کے خون میں کوئی فرق ہے۔ یا دونوں کا ایک حکم ہے۔

۴)......کیا اس خون کا اثر میاں بیوی کے باہمی نکاح کی حلت و حرمت پر بھی پڑتا ہے۔

الجواب:۔

۱)......خون انسان کا جز ہے اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس اور ناپاک بھی ہے، اس کا اصل تقاضا یہ ہے کہ عام حالات میں ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا حرام ہو۔ اجزائے انسانی کی تکریم بھی اس کی مقتضی ہے اور اس کا نجاست غلیظہ ہونا بھی حرمت ہی کا مقتضی ہے۔

قال الامام الشافعیؒ فی الام وان ادخل دماً تحت جلده فنبت علیه فعلیه ان یخرج هذ الدم ویعید کل صلوٰة صلاها بعد اد خاله الدم تحت جلدهِ (کتاب الام ص ۵۴ جلد اوّل)

لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات اور دواء میں شریعت اسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل سامنے آئے۔

اوّل:...... یہ کہ خون کے استعمال کی حرمت دو وجہ سے ہوسکتی ہے۔

ایک یہ کہ خون انسان کا جز ہے۔ اور جزء انسان کا استعمال جائز نہیں ہوتا۔

دوم:...... یہ کہ خون نجس اور حرام ہے۔

جہاں تک پہلی وجہ یعنی اس کے جز انسان ہونے کا تعلق ہے اس میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خون اگر چہ جزء انسانی ہے مگر اس کو دوسرے انسان کے

بدن میں منتقل کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ انجکشن کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے بدن میں ڈالا جاتا ہے اس لئے اس حیثیت سے اس کی مثال انسانی دودھ کی سی ہوگئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے نکلتا ہے۔ اور دوسرے انسان کے بدن کا جز بنتا ہے۔ اور شریعت اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیشِ نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے اور بچوں کو ماں کا دودھ پلانا صرف جائز نہیں، بلکہ عام حالات میں واجب قرار دیا ہے۔

بچوں کے علاوہ بڑوں کے لئے بھی دوا و علاج کے لئے عورت کے دودھ کو حضرات فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ عالمگیری میں ہے۔ **ولا باس بان یسعط الرجل بلبن المراۃ ویشربہ للدواء** (عالمگیری مصری ص ۱۱۲ ج ۴)

اس لئے جزء انسانی ہونے کی حیثیت سے اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید قیاس نہیں، لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح شریعتِ اسلام نے عورت کے دودھ کو جزء انسانی ہونے کے باوجود ضرورت کی بناء پر بچوں کے لئے جائز کر دیا ہے۔ اسی طرح ضرورت کی بناء پر خون دینا بھی جائز ہے۔

اب خون کا استعمال حرام ہونے کی دوسری وجہ رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ خون ناپاک ہے اب یہ تداوی بالمحرم میں داخل ہوگا جس کی تفصیل مقدمے میں گذر چکی ہے۔

بناء علیہ

مریض کو خون دینے کے حکم میں یہ تفصیل ہے۔

۱)...... جب خون دینے کی ضرورت ہو، یعنی کسی مریض کی ہلاکت کا خطرہ ہو، اور ماہر ڈاکٹر کی نظر میں اس کی جان بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو۔ تو خون دینا جائز ہے۔

۲)...... جب ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دینے کی حاجت ہو، یعنی مریض کی ہلاکت کا خطرہ تو نہ ہو لیکن ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دیئے بغیر صحت کا امکان نہ ہو اس وقت بھی خون دینا جائز ہے۔

۳)...... جب خون نہ دینے کی گنجائش ہے مگر اس سے اجتناب بہتر ہے۔

لما فی الهنديه وان قال الطبيب يتعجل شفاء ک فيه وجهان (ص ۳۵۵ ج۵)

۴)...... جب خون دینے سے محض منفعت یا زینت مقصود ہو، یعنی جب ہلاکت یا مرض کی طوالت کا اندیشہ نہ ہو بلکہ محض قوت بڑھانا یا حسن میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو ایسی صورت میں خون دینا ہرگز جائز نہیں۔

سوال دوم:۔

کیا کسی مریض کو خون دینے کے لئے اس کی خرید و فروخت اور قیمت لینا بھی جائز ہے۔

الجواب:۔

خون کی بیع تو جائز نہیں، لیکن جن حالات میں جن شرائط کے ساتھ نمبر اول میں مریض کو خون دینا جائز قرار دیا ہے۔ ان حالات میں اگر کسی کو خون بلا قیمت نہ ملے تو اس کے لئے قیمت دے کر خون حاصل کرنا بھی جائز ہے، مگر خون دینے والے کے لئے اس کی قیمت لینا درست نہیں۔

حضرات فقہاء کی تصریحات اس مسئلہ میں حسب ذیل ہیں۔

فاما بيع لبن الآدميات فقال احمد اكرهه واختلف اصحابنا فی جوازه فظاهر كلام الخرقی جوازهٗ لقوله وكل ما فيه المنفعة وهٰذا قول ابن حامد ومذهب

الشافعي وذهب جماعة من اصحابنا الٰى تحريم بيعه.

وهو مذهب ابى حنفية لا نه مائع خارج من اٰدمية فلم يجز بيعه كا لعرق ولانه من اٰدمى فاشبه سائر اجزائِه والاول اصح لا نه لبن طاهر منتفع به فجاز بيعه كلبن الشاة، ولا نه يجوز اخذ العوض عنه فى اجارة الظئر فاشبه المنافع ويفارق العرق فانه لا نفع فيه ولذالک لا يبا ع عرق الشاة ويبا ع لبنها، وسائر اجزاء الاٰدمى يجوز بيعها فانه يجوز بيع العبدو الامة، وانما حرم بيع الحر لانه ليس بمملوک وحرم بيع العضو المقطوع لانه لا نفع فيه (المغنى لا بن قدامة ص ۲۶۰ ج۴) وقال الشافعىؒ يجوز بيعه (لبن المرأة) لانه مشروب طاهرٌ (الٰى قوله) وعن ابى يوسف يجوز بيع لبن الامة ولا يجوز بيع شعر الخنزير لانه نجس العين فلا يجوز بيعه اهانة له ويجوز الانتفا ع به للخرز للضرور ة (الى قوله) ويوجد مباح الاصل فلا ضرورة[۱] الى البيع (هدايه ص۵۵ ج۲)

ونجس العين لا يجوز بيعه اهانة له ويجوز الانتفا ع بِهِ

(۱)......قوله فلا ضروره قال الفقيه ابو الليث ان كانت الاساكفة لا يجد ون شعر الخنزير الابالشراء ينبغى ان يجوز لهم الشراء للضرورة (نهاية) ان شعر الخنزير يوجد مباح الاصل فلا ضرورة الٰى بيعه وعلٰى هٰذا قيل اذا كان لا يوجد الا بالبيع جاز بيعه لكن الثمن لا يطيب للبائع (عينى) (وهو) اى شعر الخنزير (يوجد مباح الاصل فلا حاجة الٰى بيعه) فلم يكن بيعه فى محل الضرورة حتى يجوز، علٰى هٰذا قال الفقيه ابو الليث فلو لم يوجد الا بالشراء جاز شراءهُ لشمول الحاجة اليه وقد قيل ايضاً ان الضرورة ليست ثابتة فى الخرزبه بل يمكن ان يقام بغيره. (فتح القدير ص۲۰۲ ج۵)

للخرز للضرورة لان غيره لا يعمل عمله فان قيل اذا كان كذالك وجب ان يجوز بيعه اجاب بانه يوجد مباح الاصل فلا ضرورة الى بيعه وعلىٰ هذا قيل اذا كان لا يوجد الا بالبيع جاز بيعه لكن الثمن لا يطيب للبائع وقال ابو الليث ان كانت الا ساكفة لايجدون شعر الخنزير الا بالشراء ينبغي ان يجوز لهم الشراء . (عنايه على هامش الفتح ص ۲۰۲ ج۵)

سوال سوم:۔

کسی غیر مسلم کا خون مسلم کے بدن میں داخل کرنا جائز ہے یا نہیں۔

الجواب:۔

نفس جواز میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کافر یا فاسق فاجر انسان کے خون میں جو اثرات خبیثہ ہیں ان کے منتقل ہونے اور اخلاق پر اثر انداز ہونے کا خطرہ قوی ہے۔ اسی لئے صلحاء امت نے فاسق فاجر عورت کا دودھ پلوانا بھی پسند نہیں کیا۔ بناء علیہ کافر اور فاسق فاجر انسان کے خون سے تابمقدور اجتناب بہتر ہے۔

سوال چہارم:۔

شوہر، بیوی کے خون کا باہم تبادلہ۔

الجواب:۔

شوہر کا خون بیوی کے بدن میں یا بیوی کا خون شوہر کے بدن میں داخل کرنے سے نکاح پر شرعاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نکاح بدستور قائم رہتا ہے، کیونکہ شریعت اسلام نے محرمیت کو نسب، مصاہرت، رضاعت کے ساتھ مخصوص کیا ہے، ان سے تجاوز کرنا درست نہیں اور رضاعت سے ثبوت محرمیت بھی مدت رضاعت کے ساتھ خاص ہے مدت رضاعت یعنی اڑھائی سال عمر کے بعد دودھ پینے سے بھی حرمت

رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

کما ھو مصرح ومفصل فی عامة کتب الفقه واللہ سبحانه وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دار العلوم کراچی نمبر ۱۴

تصدیقات شرکاء مجلس

رشید احمد صاحبؒ	مفتی دار الافتاء والارشاد کراچی
محمد عاشق الٰہی صاحبؒ	بلند شہری عفی عنہ مدرس دار العلوم کراچی
ولی حسن ٹونکی غفرلہٗ	مفتی جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی
محمد رفیع عفا اللہ عنہ	مدرس وناظم مدرسہ ابتدائیہ دار العلوم کراچی
محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ،	بانی مدرسہ عربیہ جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن وسرپرست ماہنامہ بینات کراچی
محمد تقی عثمانی	مدرس ومدیر ماہنامہ البلاغ کراچی
سحبان محمودؒ	مدرس وناظم دار العلوم کراچی

اعضائے انسانی کا مسئلہ

یعنی کسی بیمار یا معذور انسان کا علاج دوسرے زندہ یا مردہ انسان کے اعضاء کا جوڑ لگا کر کرنا۔

آج کل سرجری کی حیرت انگیز ترقیات نے اس معاملے میں عجیب عجیب کرشمے دکھلائے ہیں اور ایک انسان کے عضو سے دوسرے بیمار یا معذور انسان کی تکلیف دور کر کے علاج و معالجہ کا بظاہر ایک نہایت مفید باب کھول دیا ہے۔

لیکن ہر فائدے کی چیز کو مفید اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ اس کے پیچھے فائدہ سے زیادہ نقصان اور شخصی یا قومی مضرتیں نہ ہوں۔ ورنہ مطلقاً فائدے سے تو دنیا کا کوئی جرم خالی نہیں۔ چوری، ڈاکہ، اغواء، زنا، شراب، سود، قمار وغیرہ جرائم میں کچھ فوائد ہی تو ہیں جن کی بناء پر لاکھوں باہوش باعقل انسان ان میں مبتلا ہوتے ہیں، مگر چونکہ ان کے پیچھے فوائد سے زیادہ نقصانات اور قومی اجتماعی مضرتیں ہیں اس لئے باتفاق عقلائے دنیا ان چیزوں کو مفید نہیں کہا جا سکتا۔

اس لئے ضروری ہے کہ تبادلۂ اعضائے انسانی کے مفید پہلو کے ساتھ اس کے مضر پہلوؤں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

تبادلہ اعضائے انسانی کی تین صورتیں

ایک صورت جو زمانہ قدیم سے جاری ہے وہ تو یہ ہے کہ انسان کے عضو کا بدل جمادات یا نباتات وغیرہ سے تلاش کیا جائے اور فنی مہارت کے ذریعہ اس کو کارآمد و مفید بنایا جائے، جیسے مصنوعی دانت، مصنوعی آلہ سماعت وغیرہ کہ زمانہ قدیم سے اس کا

رواج ہے اور حال میں سائنسی ترقیات نے اس فن کو بہت آگے بڑھا دیا ہے اور ابھی اس میں ترقی کا بہت بڑا میدان ہے جس کا بیان عنقریب آئے گا اور اس طرح کے مصنوعی اعضاء کا استعمال بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت (۱) سے کیا بھی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حیوانات کے اعضاء سے یہ کام لیا جائے یہ بھی قدیم زمانہ سے جاری تھا اور حال کی طبی تحقیقات اور سرجری ترقیات نے اس میں نئے نئے انکشافات کئے ہیں اور اگر ماہرین فن حضرات اس طرف پوری توجہ دیں تو اس معاملے میں بہت سی نئی انکشافات اور زیادہ سے زیادہ مفید اور کامیاب معالجات کی بڑی امید کی جاسکتی ہے۔

یہ دونوں صورتیں دینی، دنیوی، شخصی، اجتماعی، ہر حیثیت سے بے خطر بے ضرر ہیں۔ تیسری صورت انسانی اعضاء سے دوسرے انسان کے علاج کی ہے جس کا سوال اس وقت پیش نظر ہے۔ اس میں بلاشبہ بہت سے فوائد بھی ہیں جن کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ مثلاً ایک نابینا انسان کو دوسرے مردہ انسان کی آنکھیں لگا کر بینا کر دکھایا گیا۔

لیکن اس کے ساتھ اس کے بہت سے مضر پہلو بھی ہیں جو پوری انسانیت کے لئے تباہی کا راستہ بن سکتے ہیں۔ اس لئے اس سلسلہ کو ریسرچ و تحقیقات کے ذریعہ ترقی دینے سے پہلے ان مضرتوں پر نظر کرنا ضروری ہے جن کی کچھ تفصیل یہ ہے۔

الف)...... کہ حق تعالیٰ نے دنیا کی تمام کائنات و مخلوقات کو انسان کے فائدے اور استعمال کے لئے بنایا ہے اور انسان کو ساری کائنات کا مخدوم اور استعمال

---

(۱)...... حضرت عرفجہ صحابی رضی اللہ عنہ کی ناک جاہلیت کی ایک جنگ کلاب میں کٹ گئی تھی انہوں نے چاندی کی ناک بنوا کر لگائی اس میں بدبو پیدا ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو سونے کی ناک لگوانے کا حکم دیا۔ (ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد)

کرنے والا بنایا ہے، آیت قرآنی

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ اور خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا

اس امر کی شاہد ہیں۔

زمین کی تمام مخلوقات معدنیات، نباتات، حیوانات کو انسان اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرتا ہے اور اس فائدہ کے لئے ان چیزوں کو کانٹ چھانٹ کر، کوٹ پیس کر بلکہ جلا کر اور کیمیاوی تحلیل کے طریقوں سے استعمال کر سکتا ہے۔ صرف حیوانات میں تکریم روح کی بناء پر کچھ پابندیاں لگائی ہیں ان پابندیوں کے دائرے میں انسان جانور کے تمام اعضاء، ہڈی، چمڑے بال وغیرہ کو اپنے مختلف قسم کے کاموں میں لگاتا ہے۔

اگر انسان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو کہ اس کی کھال اور بال اور اعضاء کو قطع و برید کر کے استعمال کیا جائے تو یہ انسانی شرافت و تکریم اور منشاء تخلیق کائنات کے بالکل منافی ہے اسی لئے انسانی اعضاء کی خرید و فروخت، کاٹ تراش کر استعمال کو سنگین جرم اور سخت حرام قرار دیا ہے۔ اور دنیا کے ہر دور میں عقلاء و حکماء نے اس فیصلہ کو تسلیم کیا ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی مختلف شریعتوں کا بھی اس پر اتفاق رہا ہے مسیحی دنیا جو آج کل ان چیزوں میں پیش پیش نظر آتی ہے اس کا بھی اصل مذہب یہی ہے اسلام نے ایک انسان کے اعضاء کو دوسرے انسان کے لئے استعمال کرنا اس کی رضامندی اور اجازت کے ساتھ بھی جائز نہیں رکھا اور نہ کسی انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنا کوئی جزو دوسرے کو معاوضہ پر یا بلا معاوضہ دے دے۔

ب)......انسان کو جو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا خاص مظہر بنایا ہے اور اس کے بدن میں بولنے، دیکھنے، سننے، سمجھنے وغیرہ کے لئے ایسی نازک خودکار مشینیں لگا دی ہیں کہ سائنس جدید و قدیم مل کر بھی اس کا کوئی حصہ بنا نہیں سکی۔ انسان کا وجود

درحقیقت ایک چلتی پھرتی فیکٹری ہے جس میں سینکڑوں نازک مشینیں کام کر رہی ہیں۔ یہ سب مشینیں ان کے پیدا کرنے والے نے انسان کو ودیعت و امانت کے طور پر دی ہیں اس کو ان چیزوں کا مالک نہیں بنایا۔ البتہ امانت کے طور پر دینے والے کریم مولا نے ان سرکاری مشینوں کے استعمال کی ایسی آزادانہ طاقت و اجازت دے دی ہے کہ اس سے اس کو یہ دھوکہ لگ جاتا ہے کہ میں اپنی جان اور اپنے اعضاء کا خود مالک ہوں مگر حقیقت حال یہ نہیں، اسی وجہ سے انسان کو جس طرح خودکشی کرنا حرام ہے اسی طرح اپنا کوئی عضو کسی دوسرے کو رضاکارانہ طور پر بلا معاوضہ لے کر دے دینا بھی حرام ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ نے قرآن وسنت کی واضح نصوص کی بناء پر فرمایا ہے کہ جو شخص بھوک پیاس سے مر رہا ہے اس کے لئے مردار جانور اور ناجائز چیزوں کا کھانا پینا تو بقدر ضرورت جائز ہو جاتا ہے مگر یہ بات اس وقت بھی جائز نہیں ہوتی کہ کسی دوسرے زندہ انسان کا گوشت کھالے اور نہ کسی انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنا گوشت یا کوئی عضو دوسرے انسان کو بخش کر دے کیونکہ خرید و فروخت یا بخشش و ہدیہ اپنی ملک میں ہوسکتا ہے۔ روح انسانی اور اعضاء انسانی اس کی ملک نہیں جو وہ کسی کو دے سکے۔

ج)...... آج کل ڈاکٹری اور سرجری کی نئی ترقیات نے فنی طور پر بلاشبہ اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے کہ ایک انسان کی آنکھیں دوسرے نابینا انسان کے چہرہ میں پیوست کر کے اس کو بینا کر دکھایا۔ ایک انسان کا گردہ، پتہ، پھیپھڑا دوسرے مریض انسان کے جسم میں لگا کر اس کو تندرست کر دینے کا کرشمہ دکھایا اور اس وقت یہ کام جس انداز اور پیمانے پر ہو رہا ہے اس میں بظاہر ان مضرتوں کی روک تھام کا انتظام کر لیا گیا ہے جو اس تماشے کے نتیجہ میں پورے انسانی معاشرے کو تباہی میں ڈال سکتی ہے۔ کیونکہ ایسے اعضاء صرف خالص رضاکارانہ طور پر صرف ان لوگوں سے لئے

اور دیئے جاتے ہیں جو اس جہاں سے گذر رہے ہیں خواہ کسی بیماری کی وجہ سے یا سزا کے طور پر قتل ہونے کی وجہ سے، لیکن دنیا کے تجربات رکھنے والا کوئی صاحب بصیرت ان وقتی پابندیوں پر مطمئن نہیں ہوسکتا، خدانخواستہ یہ طریق علاج رواج پا گیا تو اس کا ایک نقد نتیجہ تو یہ ہوگا کہ غریب انسان کی آنکھیں اور گردے اور دوسرے اعضاء ایک بکاؤ مال کی طرح بازار میں بکا کریں (۱) گے۔

وہ اپنے بچوں کی خاطر یہ قربانی اپنی رضامندی کے ساتھ دے گا۔

---

(۱)...... حال ہی میں روزنامہ مشرق ۲۵؍دسمبر ۱۹۶۷ء شائع شدہ ایک واقعہ نے اس خطرہ کی پوری تصدیق ہی نہیں بلکہ مذہب پرست مسلمانوں کی غیرت کو چیلنج کیا ہے کہ یورپ کے ممالک نے اس کاروبار کو مذہب واخلاق کے خلاف قرار دے کر ممنوع کر دیا ہے، اب اس کا انحصار صرف ایشیاء کے آبرو باختہ انسانوں پر رہ گیا ہے۔ اخبار کا متن پورا یہ ہے۔

(سنڈے مشرق ۲۵؍دسمبر ۱۹۶۷ء، ۲۲؍رمضان المبارک ۸۷ھ)

وہ انسانی ڈھانچوں کا کاروبار کرتے ہیں

برطانیہ کی دو فرموں میں انسان کے جسم کے اندرونی ڈھانچے تیار کئے جاتے ہیں اور ساری دنیا کو برآمد کئے جاتے ہیں ان کی تجارت بڑی ترقی پر ہے جس کی وجہ سے ان فرموں کی الماریاں انسانی جسم کے ڈھانچوں سے ہر وقت بھری رہتی ہیں۔

یہاں اصلی اور پلاسٹک کے مصنوعی ڈھانچے ملتے ہیں۔ ان کے خریدار، میڈیکل اسکول اور کئی دوسرے تعلیمی ادارے ہیں ساری دنیا کے لوگ اس قسم کے ڈھانچے برطانیہ ہی سے درآمد کرتے ہیں۔ دیگر اشیاء کی قیمتوں میں آئے دن کے اضافے کے ساتھ ساتھ مردوں کی ہڈیوں کے دام بھی اونچے ہو گئے ہیں۔ حالانکہ پچھلی جنگ عظیم سے قبل ایسا ڈھانچہ جس میں کم سے کم دو سو ہڈیاں ہوتیں ۸ پونڈ میں مل جایا کرتا تھا لیکن آج اس کی قیمت ۶۰ پونڈ ہے اگر کسی کو کھوپڑی خریدنی ہو تو اسے اس کے لئے ۱۵ شلنگ ادا کرنے پڑتے ہیں جسم کی ہڈیاں جو ایشیائی ممالک سے برطانیہ میں درآمد کی جاتی ہیں، بڑی صاف ستھری ڈھلی ہوئی اور سفید ہوتی ہیں۔ ان فرموں کا کمال یہ ہے کہ یہاں کے کاریگر ان ہڈیوں کو جوڑ کر پورا انسانی ڈھانچہ تیار کر لیتے ہیں جس کا جوڑ جوڑ اسی طرح حرکت کر سکتا ہے جس طرح زندہ انسان کا کرتا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مالداروں نے دنیا کی دولت اور سامان ضرورت و راحت سب سمیٹ کر اپنے گھروں میں بھر ہی لئے ہیں۔ جن سے کروڑوں غریب انسان محروم ہیں۔ مگر خالق کریم نے انسانی اعضاء و اجزاء میں جو مساوات امیر و غریب کے درمیان قائم کر رکھی ہے کہ فاقہ زدہ فٹ پات پر بسر کرنے والے بچے کو بھی وہی صحیح سالم کان اور زبان ملتی ہے جو بڑے سے بڑے سرمایہ دار کو نصیب ہوتی ہے۔ اگر یہ چیزیں بھی بکاؤ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے آگے) ٹوٹینیم روڈ پر واقع ایک فرم جس کا نام ایڈم رویلی اینڈ کولمیٹڈ ہے ڈھانچہ تیار کرنے میں بڑی مشہور ہے درآمد شدہ ہڈیوں کو جوڑنے کے بعد یہاں سے ڈھانچے فوراً برآمد کر دیئے جاتے ہیں۔ البتہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے۔ جب ہڈیاں کمیاب ہو جاتی ہیں۔ اس فرم کے ایک ترجمان نے بتایا کہ جنگ سے قبل تو روس فرانس وغیرہ سے بھی حقیقی ہڈیاں درآمد ہوا کرتی تھیں۔ جنہیں ہسپتالوں اور میڈیکل اسکولوں اور تعلیمی اداروں کے استعمال کے لئے برآمد کیا جاتا تھا لیکن اب ان ممالک نے ہڈیوں کی برآمد پر پابندی لگا دی ہے اور اسے ممنوع قرار دیا ہے، اس کی وجہ کچھ تو مذہبی ہے اور کچھ اخلاقی۔ اب صرف ایشیا ہی سے انسانی ہڈیاں درآمد ہوتی ہیں چنانچہ اگر ایشیائی ممالک بھی اس تجارت کو ممنوع قرار دے دیں تو بحرانی صورت کا سامنا ہوگا۔

ایسی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانوی فرموں میں مصنوعی مسالے سے تیار کیا ہوا انسانی ڈھانچہ بنالیا گیا ہے اس ڈھانچہ کو برطانوی فرموں نے سام کا نام دیا ہے۔ ڈھانچہ اب بھی کئی تعلیمی ادارے منگواتے ہیں لیکچر دینا ہو تو یہی مصنوعی سام استعمال ہوتا ہے۔ پورے انسانی قد کا سام ۵ فٹ ۷ انچ کا ہوتا ہے اور اس کی قیمت ۳۸ پونڈ ۹ شلنگ ہے۔

جسم کے اندرونی اعضاء بھی سرے کی سائنٹیفک پلاسٹکس لمیٹڈ تیار کرتی ہے مصنوعی دل کی قیمت ۱۳ پونڈ ۳ شلنگ، مصنوعی دماغ کی قیمت ۱۱ پونڈ ۱۰ شلنگ مقرر ہے۔ یہ کمپنی کان بھی تیار کرتی ہے۔ جن کی قیمت ۱۰ پونڈ ہے اس مصنوعی کان کے پردوں میں آواز ٹکرانے کے بعد اسی طرح لہریں نمودار ہوتی ہیں جس طرح اصلی کان میں ہوتی ہیں۔ انسان کے سانس لینے کا نظام بھی طلباء کے استفادہ کے لئے مصنوعی تیار کیا جاتا ہے جس کی قیمت ۷ اپونڈ ۱۵ شلنگ ہے، اس مصنوعی سانس لینے والے انسان پر جان بچانے کے طریقے کی مشق آسانی سے کی جاسکتی ہے کیونکہ اس کے مصنوعی پھیپھڑے اسی طرح کام کرتے ہیں جس طرح انسانی پھیپھڑے کرتے ہیں۔ (حاشیہ ختم ہوا)

مال بن گیا تو بہت سے غریب اپنے بچوں کی مصیبت دور کرنے کے لئے اپنی یہ چیزیں بھی داؤ پر لگا دیں گے، اور دنیا کا تجربہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ پھر یہ بگاڑ صرف یہیں نہیں رکے گا کہ رضا کارانہ طور پر کسی انسان کے اعضاء واجزاء لئے جائیں بلکہ بہت سے مردے خصوصاً لاوارث مردے بہت سے اعضاء سے محروم ہو کر اس دنیا سے جایا کریں گے۔ اور شاید اگلے دور کے حکماء انسانی اعضاء کو دیر تک کارآمد باقی رکھنے کا کوئی انتظام کرلیں جیسے آج کل انسانی خون بلڈ بنکوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے تو پھر کسی انسانی میت کی خیر نہیں۔ اور یہ غسل وکفن اور نماز جنازہ اور کفن ودفن کے سارے قصے ہی بے باق ہو جائیں۔ ع

نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔

اور خدانخواستہ یہ سلسلہ بڑھتا رہا تو صرف اپنی موت مرنے والوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کام کے لئے بہت سے انسانوں کے قتل کا ایک بازار گرم ہو جانا ممکن ہے جو پورے انسانی معاشرے کی تباہی کا اعلان ہے۔

نابینا کو بینا کرنے اور مریض کو تندرست کرنے کے لئے ہر زمانے میں علاج کے مختلف طریقے جاری رہے جو اکثر بیماریوں میں کامیاب ہوتے ہیں اور بہت سے بیمار ایسے بھی ہوتے ہیں کہ کوئی طریقہ علاج ان کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکا۔

سرجری کے ان نئے طریقوں کی اگر بالفرض حلال وحرام اور انسانی معاشرہ کے آئندہ مصائب کے خطرات سے بالکل قطع نظر کر کے پوری حوصلہ افزائی کی جائے اور سب مل کر اس کے رواج دینے کی کوشش بھی کرلیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی اندھا نہیں رہے گا یا کوئی بیمار تندرستی سے محروم نہیں رہے گا۔

تجربہ شاہد ہے کہ ان نئی سے نئی ترقیات ہی کے آپریشن لاموں اور مریضوں

کی قیام گاہوں اور ماہر ڈاکٹروں کے سایوں میں روزانہ ہزاروں مریض دم توڑ کر عدم کی سرحد پار کر لیتے ہیں مغربی ممالک میں تبادلہ اعضاء کے ذریعہ علاج کرنے کا تجربہ سالہا سال سے ہو رہا ہے لیکن پلاسٹک سرجری کے مقابلہ میں وہ بہت کم کامیاب ہوا ہے اور اس سے دیرپا فوائد حاصل نہیں کئے جا سکے، امریکی رسالہ 'سیربین' اپنی ستمبر ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

> پہلے اس (آنکھ کے) پردے کو نقصان پہنچنے کی صورت میں اس کی جگہ وہ پردہ لگا دیا جاتا تھا جو ایسے لوگوں کے مرتے ہی ان کے آنکھ سے حاصل کر لیا جاتا تھا جو اسے بطور عطیہ دینا چاہتے تھے لیکن بعض ایسے اسباب کی بنا پر جنہیں ابھی تک سمجھا نہیں جا سکا ہے، اس طرح لگائے جانے والے بہت سے پردے دھندھلا جاتے تھے اور آدمی دوبارہ بصارت سے محروم ہو جاتا تھا۔ (ص ۳۴)

اس کے علاوہ پلاسٹک سرجری نے حال ہی میں جو حیرت انگیز تجربات اور انکشافات کئے ہیں ان کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تبادلۂ اعضاء کا طریقہ مشکوک اور مشتبہ ہونے کے علاوہ مشکل الحصول بھی ہے اور اس کے لئے ایک طویل عمل کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے باوجود اسے ہر جگہ استعمال نہیں کیا جا سکتا، مذکورہ رسالہ لکھتا ہے۔

سیلیکون اور اسی قسم کے دوسرے مرکبات کے اطمینان بخش طور پر قابل استعمال ہونے سے قبل سرجنوں کو اس قسم کے اعضاء تبدیل کرنے کے لئے کری کی زندہ ہڈیوں اور نسیجوں پر اعتماد کرنا پڑتا تھا اس طریقہ کی وجہ سے مریض پر بالعموم دو آپریشن کرنے پڑتے تھے۔ پہلے آپریشن کی ضرورت اس لئے ہوتی تھی کہ اگر کسی دوسرے شخص یا جانور کے جسم سے حاصل شدہ پیوند لگانے کی کوشش کی جاتی تو مریض

کا جسم اسے قبول نہ کرتا اور اس کے کے خلاف ایک حیاتیاتی مزاحمت شروع کر دیتا تاہم مریض کے اپنے جسم کے ایک حصے سے پیوند لے کر دوسرے حصہ میں لگانے کے طریقوں کے بہت بہتر ہو جانے کے باوجود بھی بعض مسائل حل طلب رہ گئے تھے۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کبھی کبھی نیا پیوند کامیابی کے ساتھ لگائے جانے کے مہینوں بعد جا کر جسم کے سیال اسے قبول کرتے تھے، اب سیلیکون کے اعضاء بن جانے کے بعد مجروح یا مریض اعضاء کو زندگی بھر کے لئے تبدیل کیا جا سکتا ہے (حوالہ مذکور) ایسی حالت میں کسی وقتی اور شخصی مصلحت کے لئے پوری قوم کو تباہی کے راستہ پر ڈال دینا کوئی دانشمندی کا کام نہیں کہا سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے آفت زدہ اعضاء کی جگہ دوسرے اعضاء کا پیوند لگانے کی تین صورتوں میں سے پہلی اور دوسری صورت بے خطر بے ضرر بھی ہے اور شریعت و مذہب کی رو سے حلال بھی، تیسری صورت انسان کے اجتماعی مفاد کے لئے مضرت رساں بھی ہے اور شرعاً حرام و ناجائز بھی جس کی تفصیل عنقریب آتی ہے۔

اس لئے انسانی فلاح کا بے خطر راستہ یہی ہے کہ ڈاکٹری اور سرجری کے ماہرین اپنے ریسرچ و تحقیق کی پوری توانائی پہلی صورتوں پر خرچ کریں تو بہت امید ہے کہ جن معالجات کے لئے انسانی اعضاء کی قطع و برید کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے وہ سب انہیں دو صورتوں سے پوری ہو جائیں۔ اور حال میں میرے اس خیال کی تائید اس مقالہ سے پوری طرح ہوتی ہے جو امریکی شعبہ اطلاعات پاکستان کے ماہنامہ سیر بین کے تازہ شمارہ ستمبر ۷۶ء میں مصنوعی فاضل اعضاء کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے کچھ اقتباسات ابھی ذکر کئے گئے ہیں۔

یہ ڈاکٹری تحقیقات اگرچہ ہمارا موضوع بحث نہیں ہیں لیکن اس میں معین ضرور ہیں اس لئے اس مقالہ کو رسالہ کے آخر میں بطور ضمیمہ پورا نقل کر دیا گیا ہے۔

انسانی اعضاء واجزاء کے شرعی احکام

تبادلہ اعضائے انسانی کے زیر عنوان ابھی آپ کو قرآنِ حکیم کے صریح نصوص سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مخدوم کائنات بنایا ہے یہ تمام مخلوقات کا استعمال کرنے والا ہے خود اس کے اعضاء وجزاء کا استعمال اس کی اہانت اور تخلیق کائنات کے منشاء کے خلاف ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کے اعضاء واجزاء انسان کے منشاء کے خلاف ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کے اعضاء واجزاء انسان کی اپنی ملکیت نہیں ہیں جن میں وہ مالکانہ تصرفات کر سکے اسی لئے ایک انسان اپنی جان یا اپنے اعضاء وجوارح کو نہ بیچ سکتا ہے نہ کسی کو ہدیہ اور ہبہ کے طور پر دے سکتا ہے اور نہ ان چیزوں کو اپنے اختیار سے ہلاک وضائع کر سکتا ہے۔ شریعت اسلامیہ کے اصول میں تو خودکشی کرنا اور اپنی جان یا اعضاء رضا کارانہ طور پر یا بقیمت کسی کو دے دینا قطعی طور حرام ہی ہے جس پر قرآن وسنت کی نصوص صریحہ موجود ہیں۔ تقریباً دنیا کے ہر مذہب وملت اور عام حکومتوں کے قوانین میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس لئے کسی زندہ انسان کا کوئی عضو کاٹ کر دوسرے انسان میں لگا دینا اس کی رضامندی سے بھی جائز نہیں حضرات فقہا کی تصریحات اس کے متعلق درج ذیل ہیں۔

فتاویٰ عالمگیری کتاب الحظر والاباحۃ ۱۸ باب التداوی ص ۳۱۰ ج ۵

مضطر لم یجد میتۃ وخاف الھلاک فقال لہ رجل اقطع یدی وکلھا اوقال اقطع منی قطعۃ وکلھا لا یسعہ ان یفعل ذالک ولا یصح امرہٗ بہٖ کما لا یسع للمضطر

ان یقطع قطعة من نفسه فیاکل کذافی فتاویٰ قاضیخان ومثله فی اکراه البزازیه علٰی هامش الهندیه (ص ۱۱۶ جلد ۲ ومثله فی خلاصة الفتاویٰ ص ۳۳ ج ۲.)

اور شرح سیر کبیر میں ہے۔

الا ترىٰ انه لو ابتلی بمخمصة لم یحل له ان یتناول احدا من اطفال المسلمین لدفع الهلاک عن نفسه (ص ۲۶۹ و ۲۷۰ ج ۳ مطبوعه دکن)

مگر اس وقت تک ڈاکٹروں اور سرجنوں نے بھی زندہ انسان کے اعضاء کا استعمال کہیں تجویز نہیں کیا۔ اس لئے اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں، بحث طلب مسئلے دو ہیں جو آج کل ہسپتالوں میں پیش آرہے ہیں اور جس کے لئے اپیلیں کی جا رہی ہیں وہ یہ کہ جو انسان دنیا سے جا رہا ہے خواہ کسی عارضہ کے سبب یا کسی جرم میں قتل کئے جانے کی وجہ سے اس کی اجازت اس پر لی جائے کہ مرنے کے بعد اس کا فلاں عضو قطع کر لیا جائے اور کسی دوسرے انسان میں لگایا جائے۔

یہ صورت بظاہر مفید ہی مفید ہے کہ مرنے والے کے تو سارے ہی اعضاء فنا ہونے والے ہیں ان میں سے کوئی عضو اگر کسی زندہ انسان کے کام آجائے اور اس کی مصیبت کا علاج بن جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے کہ عام لوگوں کی نظریں صرف اس کے مفید پہلو پر جم جاتی ہیں اور اس کے وہ مہلک نتائج نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں جن کا کچھ ذکر شروع بحث میں آچکا ہے مگر شریعت اسلام جو انسان اور انسانیت کے ظاہری اور معنوی صلاح وفلاح کی ضامن ہے اس کے لئے مضر اور مہلک نتائج سے صرف نظر اور صرف ظاہری فائدہ کی بناء پر اس کی اجازت دے دینا ممکن نہیں۔ شریعت اسلام نے صرف زندہ انسان کے کارآمد

اعضاء ہی کا نہیں بلکہ قطع شدہ بے کار اعضاء واجزاء کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے۔ اور مردہ انسان کے کسی عضو کی قطع و برید کو بھی ناجائز کہا ہے۔ اور اس معاملہ میں کسی کی اجازت اور رضامندی سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی اجازت نہیں دی اور اس میں مسلم و کافر سب کا حکم یکساں ہے کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے جو سب میں برابر ہے، تکریم انسانی کو شریعت اسلام نے وہ مقام عطا کیا ہے کہ کسی وقت کسی حال کسی کو انسان کے اعضاء واجزاء حاصل کرنے کی طمع دامن گیر نہ ہو۔ اور اس طرح یہ مخدوم کائنات اور اس کے اعضاء عام استعمال کی چیزوں سے بالاتر ہیں جن کو کانٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر غذاؤں اور داؤں اور دوسرے مفادات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس پر ائمہ اربعہ اور پوری امت کے فقہاء متفق ہیں اور نہ صرف شریعت اسلام بلکہ شرائع سابقہ اور تقریباً ہر مذہب وملت میں یہی قانون ہے۔

حضرات فقہاء کی تصریحات اس معاملہ میں حسب ذیل ہیں۔

فقہاء امت کی تصریحات

۱)......قال فی شرح السیر الکبیر وفیه دلیل جواز المداواة بعظم بالٍ وهذالان العظم لا یتنجس بالموت علٰی اصلنا لا نه لا حیوٰة فیه الا ان یکون عظم الانسان اوعظم الخنزیرفانه یکره التداوی به لانّ الخنزیر نجس العین فعظمه نجس کلحمه لا یجوز الانتفاع بهٖ بحال والادمی محترم بعد موتهٖ علٰی ما کان علیه فی حیاتهٖ فکمالا یجوز التداوی بشی من الأدمی الحی اکراماًله فکذلک لا یجوز التداوی بعظم المیت قال رسول الله ﷺ کسر عظم المیت ککسرعظم الحی.(ص ۹۰ ج ۱. طبع دکن)

قال فی الهدایه لا یجوز بیع شعور الانسان ولا الانتفاع بهٖ لان الآدمی مکرم لا مبتذل فلا یجوز ان یکون شئ من اجزائهٖ مهانا مبتذلا (اهدایه ص ۳۹)

وقال ابن همام فی شرحه وفی بیعه اهانة له کذافی النهایة بالانتفااه ومثله فی عامة کتب المذهب وفی العنایه شرح الهدایه وجلد الأدمی لکرامة لئلا یتجاسه الناس علیٰ من کرمه الله بابتذالِ اجزائهٖ قال ابن الهمام فی توضیح بعض المسائل، ان الا تفاق علیٰ ان حرمة المسلم میتا کحرمتهٖ حیا اه وفی الدرالمختار من البیع الفاسد وشعر الانسان لکرامة الأدمی ولو کان کافراذکره المصنف وغیره فی بحث شعر الخنزیر . قال الشامی قوله وشعر الانسان لا یجوز الانتفاع بهٖ لحدیث لعن الله الواصلة والمستوصلة قوله ذکره المصنف حیث قال والأدمی مکرم شرعا ولو کان کافرًا فایرادالعقد علیه وابتذاله به والحاقه بالجمادات اذلال لهٗ.(شامی ص ۱۴۵ ج ۴)

وفی العالمگیر یة باب التداوی من الحظر والا باحة الانتفاع باجزاء الأدمی لم یجز قیل للنجاسة وقیل للکرامة هوالصحیح کذافی جواهر الاخلاطی (عالمگیری ص ۳۹۰ ج۵) وفی البدائع ص ۱۳۲ ج۵) ولو سقط سنه یکره ان یاخذ سن میت فیشد ها مکان الاول بالاجماع وکذایکره ان یعید تلک السن المساقطة مکانهاعندابی حنیفه ومحمد ولکن یاخذ سن شاة زکیة فیشدها مکانها وقال ابو یوسف لا باس بسنه ویکره من غیره. (ومثله فی خلاصةالفتاوی ص ۵۳۶ ج ۲ وفی الهندیه ص ۳۷۲ ج۵ وفی البحر

ص ۱۳۳ ج ۸) وفی البحر الرائق. وان قطعت اذنه قال ابو یوسف لا باس بان یعید ھاالٰی مکانھا وعندھما لا یجوز بحر (ص ۱۱۳ ج ۱) واذا کسر للمرأة عظم فطار فلا یجوز ان ترقعه الا بعظم ما یوکل لحمه زکیا وکذالک ان سقطت سنه صارت میتة فلا یجوز له ان یعید ھا بعد ما بانت فلا یعید سں شیئ غیر سن زکی یوکل لحمهٗ وان وقع عظمهٗ بعظم میتة اوزکی لا یوکل لحمهٗ اوعظم انسان فھو کالمیتة فعلیه قلعه واعادة کل صلوٰة صلّٰھا وھو علیه فان لم یقلعه اجبره السطان علٰی قلعه فان لویقلع حتی مات لم یقلع بعد موته لا نه صارمیتا کله واللہ حسیبهٗ وکذالک سنه اذاندرت فان اعتلت سنه فربطھا قبل ان تندر فلا باس لا نھا لا تصیر میتة حتی تسقط (ص ۵۴ ج) اول کتاب الام وروی باسنادہٖ عن اسماء بنت ابی بکرؓ قالت اتت امراة الی النبی ﷺ فقالت یا رسول اللہ! ان بنتالی اصا بتھا الحصبة فتمزق شعرھا أفاصل فیه، فقال رسول اللہ لعنت الواصلة والموصلة کتاب الام. (ص ۵۴ ج ۱)

ھذاآخر ما اردنا ایراده واللہ ولی التوفیق والسدادوھو سبحانه اعلم.

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ دار العلوم کراچی ۱۴

۱۰ شعبان ۱۳۸۷ھ

تصدیقات
شرکائے مجلس

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

بانی جامعہ العلوم الاسلامیہ وسرپرست ماہنامہ بینات بنوری ٹاؤن کراچی

رشید احمد

مفتی دار الافتاء والارشاد۔ کراچی

ولی حسن ٹونکی غفر اللہ لہ

مفتی جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

محمد تقی عثمانی

مدرس ومدیر ماہنامہ البلاغ دار العلوم کراچی

سحبان محمود

مدرس وناظم دار العلوم کراچی

محمد رفیع عفا اللہ عنہ

مدرس وناظم مدرسہ ابتدائیہ کراچی

محمد عاشق الٰہی بلند شہری عفا اللہ عنہ

مدرس دار العلوم کراچی

ضمیمہ

منقول از ماہنامہ سیربین۔امریکی شعبہ اطلاعات پاکستان مورخہ ستمبر ۱۹۶۷ء

مصنوعی فاضل اعضاء

صنعتکار اپنی مصنوعات کے فاضل حصے یا پرزے بنانے کا سلسلہ طویل عرصہ قبل ہی شروع کر چکے تھے کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ اکثر اوقات یہ صورت زیادہ آسان اور کم خرچ ہوتی ہے کہ کسی چیز کے فرسودہ حصّوں کی مرمت کرنے کی بجائے انہیں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ خیال کہ انسان کے لئے بھی ایسے فاضل اعضاء بنائے جائیں جن سے وہ مستفید ہو سکے اس وقت سے موجود ہے جب سے کہ مصنوعی دانت بنائے جانے لگے ہیں لیکن اس خیال کو مصنوعی دانتوں کے علاوہ کسی دوسرے میدان میں کچھ عرصہ پیشتر تک عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس راہ میں بڑی بڑی فنی رکاوٹیں حائل تھیں ایک بات تو یہ تھی کہ ابھی طبی تحقیقاتی کارکنوں کو یہ بات ٹھیک سے معلوم نہ ہو سکی تھی کہ انسان کے مختلف اعضاء کس طور پر کام کرتے ہیں مثال کے طور پر سائنس صدیوں تک دنیا کے مکمل ترین پمپ یعنی دل کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہی۔ ایک دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ انسانی اعضاء کے افعال کی میکانکی پر ٹھیک ٹھیک نقل کیوں کر کی جا سکتی ہے، مناسب سامان کا فقدان، فنیات کا غیر ترقی یافتہ ہونا، حرکت کرنے والے نہایت چھوٹے اجزاء بنانے کی عدم صلاحیت غرض کسی نہ کسی سبب سے یہ مسئلہ ناقابل حل بنا رہا۔ گو مصنوعی ہاتھ پیر اور سماعت کے آلات جیسی چیزوں

نے انسانی اعضاء کی جگہ تو لے لی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان اعضاء کے افعال کی ٹھیک ٹھیک نقل نہ کرسکی ہیں ان میں سے بہت سے آلات کے استعمال کی مہارت حاصل کرنا مریضوں کے لئے نہ صرف دشوار تھا بلکہ ان میں سے بہت سے آلات نسبتۃً بڑے یا بھاری ہوتے تھے اور جن انسانی اعضاء کی جگہ لینے کے لئے انہیں بنایا گیا تھا ان کے افعال ٹھیک طرح انجام نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن اب طبی دنیا میں 'فاضل اعضاء' کا ایک حقیقی انقلاب بڑی تیزی کے ساتھ آرہا ہے، اب عمل جراحی کے ماہروں اور طبی انجنیئروں کے اشتراک عمل اور طرح طرح کے مصنوعی سامان اور نہایت چھوٹی چیزیں تیار کرنے کی جدید ترین فنی ترکیبوں کی مدد سے روز افزوں تعداد میں ایسے آلات بن رہے ہیں۔ جو انسانی اعضاء کی قریب قریب مکمل طور پر نقل کرسکتے ہیں۔ یہ آلات جسامت اور افعال کے اعتبار سے قدرتی اعضاء سے اس حد تک مشابہ ہوتے ہیں کہ اکثر صورتوں میں انہیں جسم میں اسی جگہ لگایا جاسکتا ہے جہاں قدرتی اعضاء ہوتے ہیں ان میں سے اکثر میں تو یہ بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ مریض کسی بیماری سے صحت یابی کے دوران ان کے استعمال میں مہارت حاصل کرے۔ ان آلات کو بدن میں مطلوبہ مقامات پر لگانے کے بعد یوں ہی چھوڑا جاسکتا ہے اور کسی دیکھ بھال کے بغیر وہ اپنا فعل بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ آج کل ہزاروں اشخاص اپنی زندگی صحت اور کام کرنے کی اہلیت کے لئے نئے فاضل اعضاء کے مرہون منت ہیں۔ مثال کے طور پر دھات یا مٹی کے بنے ہوئے کولھے کے جوڑ، ڈیکران کی بنی ہوئی شریانیں، پلاسٹک کے بنے ہوئے آنکھ کے ڈھیلے اور پردے سیلیکون ربر کے بنے ہوئے دل کے صمام (والو) سانس کی نالیاں کان کی کرکری ہڈی اور عضلات اور دوسرے مصنوعی اعضاء روز افزوں تعداد میں استعمال ہورہے ہیں۔ اس انقلاب کی ابتداء بس ہورہی ہے دل کا پہلا مصنوعی صمام ایک مریض کے جسم میں ۱۹۶۰ء میں سی

کر لگایا گیا تھا اور پلاسٹک کی بنی ہوئی آنکھ کی پہلی پتلی ۱۹۶۵ء میں لگائی گئی تھی، مستقبل میں جب یہ سلسلہ اپنے انتہائی عروج پر جا پہنچے گا تو 'نیا علم جراحی' معالجہ کو بڑی حد تک اصلاح اور تریاقوں پر مبنی علم کی بجائے ایک ایسی سائنس میں تبدیل کر دے گا جس میں مصنوعی فاضل اعضاء بڑی تعداد میں استعمال کئے جانے لگیں گے۔ بعض ماہر تو یہاں تک پیش بینی کر رہے ہیں کہ ایک ایسی نئی قسم کا انسان وجود میں آجائے گا جو جزوی طور پر تو انسان ہوگا اور جزوی طور پر انسان کی ایجاد اور اس انسان کی زندگی کے طول جسمانی مہارت اور ذہنی صلاحیت کا دار و مدار بڑی حد تک مصنوعی اعضاء پر ہی ہوگا۔

'پلاسٹک کا بنا ہوا آنکھ کا پردہ' یہ پردہ ابھی ابھی تجربوں کے مرحلوں سے نکلا ہے اور اس سے روہوں کی شکایت اور وہ شفاف جھلی جو آنکھوں کی پتلی کو ڈھکے ہوئے ہے، اس کی دوسری خرابیوں کے مریضوں کے لئے بڑی آس بندھتی ہے۔ یہ پردہ لاس اینجلس کے سیڈر سینمائی طبی مرکز میں ڈاکٹر ولیم اسٹون اور دوسرے ماہروں کی ایک جماعت نے ۱۹۴۸ء میں تیار کیا تھا اس سے پہلے اس پردے کو نقصان پہنچنے کی صورت میں اس کی جگہ وہ پردہ لگا دیا جاتا تھا جو ایسے لوگوں کے مرتے ہی ان کی آنکھ سے حاصل کر لیا جاتا تھا جو اسے بطور عطیہ دینا چاہتے تھے لیکن بعض ایسے اسباب کی بنا پر جنہیں ابھی تک سمجھا نہیں جا سکا ہے۔ اس طرح لگائے جانے والے بہت سے پردے دھندلا جاتے تھے اور آدمی دوبارہ بصارت سے محروم ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر اسٹون کی جماعت نے یہ طے کیا کہ مصنوعی پردہ اس مسئلے کا بہترین حل ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک سوراخ دار جھلی بنائی جو شفاف پلاسٹک کے ایک روزن کو روکے رکھتی ہے یہ ٹوپی کا جھلی کچھ عرصے میں اپنی جگہ جم جاتی ہے اور آنکھ کی عام نسیجیں اس جھلی کے سوراخوں سے نکل کر اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ اس طرح ۱۹۶۵ء سے اب تک پلاسٹک کے تقریباً پانچ پردے کامیابی کے ساتھ لگائے جا چکے ہیں۔ انسانی

نفسیات اور فلسفہ حیات کے لئے اس کے مضمرات چاہے کچھ ہوں، بیشتر پچھلی طبی کامیابیوں کی طرح فاضل انسانی اعضاء کے روز افزوں استعمال کے مقاصد بھی بڑے محدود ہیں۔ اس کے موجودہ مقاصد انسان کی زندگی کو قدرے اور طول دینا بیماری اور چوٹ کے تکلیف دہ اثرات کو زائل کرنا اور انسانی مصائب میں کمی کرنا ہیں۔ ایسے مصنوعی آلات جو بعض مطلوبہ کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں ان کی فہرست بڑی اطمینان بخش ہے۔ ایسے سینکڑوں مصنوعی فاضل اعضاء میں سے چند کا ذکر نیچے اور اگلے صفحے پر کیا گیا ہے۔ یہ اعضاء بیمار اور معذور انسانوں کی معذوری میں کمی اور تکالیف میں تخفیف کا باعث ہو رہے ہیں یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ سائنسدان ایک دن اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ ایسی بیشتر بلکہ تمام چیزیں بنانے لگیں جن پر انسان مشتمل ہوتا ہے۔ تاہم ابھی سرجنوں کو بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ابھی انہیں ایک ایسا چھوٹا سا مصنوعی گردہ بنانا ہے جو قریب قریب اتنی ہی کارکردگی کا حامل ہو جتنا کہ انسانی گردہ ہوتا ہے ان چیزوں کو بنانے کے لئے بہتر قسم کے سامان کی تلاش کے سلسلے میں ابھی بڑی مہم سر کرنا باقی ہے، بعض صورتوں میں دل کے مصنوعی صماموں میں ربر کی گولیاں ٹوٹ کر الگ بھی ہو گئی ہیں ان گولیوں کو ایک سال میں صمام کو ۴ کروڑ مرتبہ کھولنا اور بند کرنا پڑتا ہے یا پھر وہ جسم کے سیالوں کو جذب کر کے اتنی پھول گئی ہیں کہ ان کے کام میں نقص پیدا ہونے لگا ہے، ان گولیوں کے ان چوکھٹوں سے جو انہیں بائیں جانب جوف کے اندر رکھتے ہیں باہر نکل جانے کی وجہ سے متعدد مہلک وارداتیں بھی ہو چکی ہیں۔ طبی انجنیئروں کے لیے یہ اور دوسری ناکامیاں بڑی پریشان کن ہیں لیکن ان کی وجہ سے ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ طب میں ایک حقیقی انقلاب برپا ہو چکا ہے اور یہ کہ اب وہ دن قریب آتا جا رہا ہے جب انسانوں کے لئے فاضل اعضاء اسی طرح عام طور پر ملنے

لگیں گے ۔ جس طرح موٹروں، ٹیلیویژن سٹوں اور سلائی کی مشینوں کے فاضل پرزے اس وقت ملتے ہیں۔'

سیلیون کا بنا ہوا دل کا صمام ۱۹۶۰ سے اب تک اس قسم کے ۳۰ ہزار صمام (والو) انسانوں کے دلوں میں سی کر لگائے جا چکے ہیں یہ صمام کیلیفورنیا کی ایڈورڈ رز لیبارٹریز نے بنائے ہیں۔اس شریانی صمام کا صنوبری حصہ دھات کے ایک حلقہ اور سیلیون ربر کی ایک گولی پر مشتمل ہوتا ہے جو دھات کے ایک چوکھٹے میں تیرتی رہتی ہے جب کسی شخص کے قدرتی صنوبری صمام میں نقص پیدا ہو جاتا ہے تو سرجن اسے نکال لیتے ہیں یہ قدرتی صمام (والو) دل کا خون پمپ کرنے والے دو خانوں یعنی بائیں جانب کے جوف اور اوپری خانے کے درمیان ہوتا ہے اسے نکال کر اسی جگہ مصنوعی صمام لگا دیا جاتا ہے اور جوف کے اندر معلق کر کے اس کے چوکھٹے کے حلقے کو دل کے پٹھے کے ساتھ سی دیا جاتا ہے جب دل کے بائیں جانب کے خانے سے خون جوف میں پہنچتا ہے تو گولی آہستہ سے چوکھٹے کی تہ پر بیٹھ جاتی ہے اور خون کو گزر جانے دیتی ہے پھر جب جوف سے خون پمپ ہو کر شہ رگ کے راستے جسم کی تمام شریانوں کو پہنچتا ہے تو گولی اٹھ کر نرمی کے ساتھ دھات کے حلقے میں پھنس جاتی ہے اور اس طرح خون الٹا بہ کر خانے میں واپس پہنچنے نہیں پاتا ہے جو مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔'خون کی مصنوعی رگیں' بڑھاپے، فرسودگی خوراک میں زیادہ چکنائی ان تمام باتوں کی وجہ سے اہم نوعیت کی شریانیں سخت پڑ جاتی ہیں۔ ان میں خون جمنے لگتا ہے وہ باہر سے پھول جاتی ہے یا پھر معمول کے مطابق دباؤ کے تحت خون کے دوران کو جاری نہیں رکھ سکتیں یہ صورتیں اکثر اوقات مفلوج کن یا مہلک ثابت ہوتی ہیں۔

سرجن ۱۲ سال سے لچکدار مصنوعی شریانیں بنانے پر کام کر رہے تھے، شروع میں اس قسم کی شریانوں کے جو نمونے بنائے گئے ان میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ جب

انہیں جسم کے کسی ایسے حصے میں لگایا جاتا تھا جو برابر مرتے رہتے ہیں (مثال کے طور پر کولھے کے جوڑ کے قریب) تو وہ بعض اوقات مڑنے کے بجائے بل کھا جاتی تھیں اس مسئلے کا حل ایلا باما یونیورسٹی کے ڈاکٹر ڈبلو اسٹرلنگ ایڈورڈ نے ۱۹۵۵ میں نکال لیا انہوں نے دے کران کی ایک ایسی شریان بنائی جو ہزاروں مریضوں پر کامیابی کے ساتھ استعمال کی جا چکی ہے۔ 'دھات کے جوڑ اور ہڈیاں' تیس سال قبل سائنس دانوں نے مختلف دھاتوں کو ملا کر ویٹالیم نامی ایک مرکب تیار کیا تھا یہ مرکب مضبوط اور ہلکا ہوتا ہے اور یہ تحلیل بھی نہیں ہوتا بری طرح شکستہ ان ہڈیوں کی جگہ لینے یا انہیں سہارا دینے کے لئے اسے بخوبی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسے مریضوں کے جسم میں استعمال کرنے کے لئے اس کے بہترین نمونوں اور طریقوں کے بارے میں کچھ عرصے تک بڑی تحقیق ہوتی رہی تھی اس ضمن میں ایک کامیاب چیز ویٹالیم کا بنا ہوا کولھے کا جوڑ اور ان کی ہڈی ہے جسے کولمبیا (جنوبی کیرولینا) کے ڈاکٹر آسٹن ٹی مور نے ۱۹۳۸ء میں بنایا تھا یہ ہڈی کولھے خانے میں اور ان کی ہڈی کے غیر شکستہ حصے کے ساتھ ٹھیک ٹھیک بیٹھ جاتی ہے اس میں ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مریض کے وزن کو ٹانگ کے اوپری حصے میں مساوی طور پر تقسیم کر دیتی ہے اس سے پیشتر کے نمونوں میں سارا بوجھ اس حصے میں ایک دو نقطوں پر ہی پڑتا تھا ڈاکٹر مور کے بنائے ہوئے تقریباً دو ہزار جوڑ اور ہڈیاں ۱۹۳۹ء سے اب تک مریضوں کے جسم میں لگائی جا چکی ہیں اور تقریباً تمام صورتوں میں مریض لنگڑائے بغیر چلنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

'محرک مثانہ' آدھے دھڑ کے فالج زدہ جن مریضوں کی ریڑھ کی ہڈی چوٹ کھا جاتی ہے ان میں بیشتر اموات اس بنا پر واقع ہوتی ہیں کہ پیشاب کی نالی کے فعل میں نقص پیدا ہو جاتا ہے یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب متاثر اعصابی نظام اس بڑے عضلے کو سکیڑنے میں ناکام ہو جاتا ہے جو عام حالات میں مثانے سے پیشاب کو

خارج کرنے کی قوت پیدا کرتا ہے جب مثانہ پیشاب کو پورے طور پر خارج نہیں کرتا تو شدید قسم کی سمیت پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے اس نقص کو دور کرنے کے لئے میمونائیڈس ہسپتال بروکلن (نیویارک) کے ڈاکٹر ایڈرئین کینٹ ووٹز اور ڈاکٹر مارٹن سومین نے ایک برقیاتی ٹرانسمیٹر اور محرک آلہ بنایا ہے جو مثانے کو خالی کرنے کے لئے ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔

یہ محرک آلہ حقیقت میں ایک چھوٹا سا ریڈیو ریسیور ہے جسے مریض کے پیٹ میں نچلے حصے میں جلد کے نیچے نصب کر دیا جاتا ہے، جب مریض ٹرانسمیٹر کا (جو جسم سے بالکل الگ رہتا ہے اور جسے مریض اپنے ہاتھ میں رکھ سکتا ہے) بٹن دبا کر محرک آلہ کو چلا دیتا ہے تو یہ پیشاب کو خارج کرنے والے عضلے پر ہلکی طاقت کی برقی رو ڈالتا ہے اس برقی رو کی وجہ سے متعلقہ عضلہ مثانے پر دباؤ ڈالتا ہے اور اس طرح تمام پیشاب خارج ہو جاتا ہے جان بچانے والا یہ آلہ ۱۹۶۳ء سے اب تک آدھے دھڑ کے فالج کے چھ مریضوں پر استعمال کیا جا چکا ہے۔

'سیلیکون ربر کا کان' جسم انسانی کے ایسے ابھرے ہوئے اعضا جیسے کان یا ناک وغیرہ کو نقصان پہنچنے کی شکل میں انہیں تبدیل کرنے کے لئے سیلیکون اور اس قسم کے دوسرے مرکبات کے اطمینان بخش طور پر قابلِ استعمال ہونے سے قبل سرجنوں کو اس قسم کے اعضاء تبدیل کرنے کے لئے کری کی زندہ ہڈیوں اور نسیجوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طریقے کی وجہ سے مریض پر بالعموم دو آپریشن کرنے پڑتے تھے۔ پہلے تو مریض کے جسم کے کسی حصے سے کری کی غیر ضروری ہڈی حاصل کرنا پڑتی تھی اور پھر اسے ایک نئے کان یا کسی دوسرے عضو کی حیثیت سے لگانے کے لئے بھی آپریشن کرنا پڑتا تھا۔ پہلے آپریشن کی ضرورت اس لئے ہوتی تھی کہ اگر کسی دوسرے شخص یا جانور کے جسم سے حاصل شدہ پیوند لگانے کی کوشش کی جاتی تو مریض کا جسم اسے قبول نہ کرتا

اور اس کے خلاف ایک حیاتیاتی مزاحمت شروع کر دیتا۔ تاہم مریض کے اپنے جسم کے ایک حصے سے پیوند لے کر دوسرے حصے میں لگانے کے طریقوں کے بہت بہتر ہو جانے کے باوجود بھی بعض مسائل حل طلب رہ گئے تھے ان میں سے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کبھی کبھی نیا پیوند کامیابی کے ساتھ لگائے جانے کے مہینوں بعد جا کر جسم کے سیال اسے قبول کرتے تھے اب سیلیکون کے اعضاء بن جانے کے بعد مجروح یا مریض اعضاء کو زندگی بھر کے لئے تبدیل کیا جا سکتا ہے، ان اعضا کو کوئی بھی مطلوبہ شکل دی جا سکتی ہے اور انہیں کسی بھی جگہ صفائی کے ساتھ سیا جا سکتا ہے اگر کوئی شخص کسی حادثے میں اپنے کان کے بیرونی حصے سے محروم ہو جائے تو سرجن سے مشکین کے ڈاؤ کارننگ طبی مرکز میں بنا ہوا سیلیکون کا ایک نیا کان لگا سکتے ہیں۔ کان کی اسی نئی کری کو صحیح جگہ لگائے جانے کے بعد اسے جلد کے پیوند سے ڈھک دیا جاتا ہے تا کہ وہ اصلی کان کی طرح بالکل قدرتی نظر آنے لگے۔

'پلاسٹک کا بنا ہوا دل کا پمپ' یہ مصنوعی پمپ ڈاکٹر کینٹر ووٹز اور ان کے بھائی آرتھر نے جو ماہر طبعیات ہیں بنایا ہے۔ یہ مصنوعی دل ایسے دلوں کی مدد کرتا ہے جو عمر کی وجہ سے کمزور ہو جاتے ہیں، یا انہیں کسی اور طرح نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے اس طرح جسم میں خون کی کافی مقدار بہم پہنچائی جاتی ہے۔ یہ پمپ حسب ذیل چیزوں پر مشتمل ہے۔ (u) (یو) کی شکل کا پلاسٹک کا ایک خول جس کے اندر سیلیکون ربر کی بنی ہوئی ایک لچکدار نلکی ہوتی ہے، خول سے منسلک ہوا کی ایک نلکی اور اس پر قابو رکھنے والی ایک برقیاتی مشین، خول کو مریض کے جسم کے اندر نصب کر دیا جاتا ہے اور ہوا کی نلکی سینے کی دیوار میں سے گذرتی ہے اس نظام کے برقیرے دل پر لگا دیئے جاتے ہیں یہ نلکی بلند دباؤ والی ہوا کے ایک ذخیرہ سے مربوط رہتی ہے اور برقیروں کا تعلق اس قابو مشین سے ہوتا ہے جو دل کی اپنی حرکت کے ساتھ ہم وقت رہتی ہے، اس پمپ کے دونوں سرے

دل کے بائیں جانب کے جوف کے ذرا اوپر شہ رگ کے ساتھ سی دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ پمپ خود شہ رگ یعنی اس شریان کا جو جسم کو خون فراہم کرتی ہے ایک اہم جز بن جاتا ہے۔ یہ پمپ کچھ اس طرح کام کرتا ہے جونہی بائیں جانب کے کمزور پڑ جانے والے جوف میں خون بھر جاتا ہے۔ وہ سکڑتا ہے اور خون کو شہ رگ میں دھکیل کر سیلیکون ربر کی اندرونی نلکی میں بھر دیتا ہے۔ جوف کے سکڑنے کے آخری لمحے پر برقیرے قابو مشین کو اشارہ کرتے ہیں کہ وہ بلند دباؤ والی ہوا کو پلاسٹک کے بیرونی خول میں داخل کر دے، یہ ہوا خون سے بھری ہوئی اندرونی نلکی کو دباتی ہوئی نیچے اترتی ہے اور اس طرح خون کو رگوں میں داخل کر دیتی ہے اس کے بعد خون پھر جوف میں بھر جاتا ہے اور پھر اس عمل کا اعادہ ہوتا ہے اور اس طرح مریض کو جس کا دل اتنا قوی نہیں ہوتا کہ وہ کسی مدد کے بغیر اچھی طرح کام کر سکے زندہ رکھا جاتا ہے۔ اس طرح اب تک کنٹر وونٹر چار پمپ استعمال کئے جا چکے ہیں دل کے ایک مریض کو اس آلے کے مدد سے تیرہ دن تک زندہ رکھا گیا ۱۲۔

ماہنامہ سیر بین کراچی
جلد ۱۹ شمارہ ۹ ص ۳۲ تا ۳۴
ستمبر ۱۹۶۷ء (جنگ)

۹۷

ضبط ولادت

کی

شرعی اور عقلی

تاریخ تالیف ـــــــــ ۱۳۸۱ھ (۱۴رجنوری ۱۹۶۱ء)

مقامِ تالیف ـــــــــ گارڈن ایسٹ کراچی نمبر ۵

مروجہ برتھ کنڑول یعنی خاندان منصوبہ بندی کے موضوع پر مفصل اور مدلل تحریر ہے جس میں شرعی اور عقلی اور اقتصادی پہلو سے تفصیلی بحث کی گئی ہے، کتاب کا ابتدائی حصہ جو ''شرعی حیثیت'' سے متعلق ہے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا اور آخری حصہ جو ''عقلی اور اقتصادی حیثیت'' سے متعلق ہے اس کو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثانی صاحب مدظلہم نے تحریر فرمایا، یہ دونوں تحریریں اب تک ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

حرف آغاز

کچھ سالوں سے ضبطِ ولادت کی تحریک پاکستان میں زور پکڑ رہی ہے، اور اہل مغرب مشرقی ممالک میں اس تحریک کو برسرکار لانے کے لئے پوری پوری کوشش کر رہے ہیں۔ جس کا معمولی اندازہ امریکی رسالہ ''ٹائم'' کی ایک اطلاع سے کیجئے، اس نے خبر دی ہے کہ امریکہ کی صدارتی کمیٹی نے جو جولائی ۱۹۵۹ء میں قائم کی گئی تھی، پرزور سفارش کی ہے کہ امریکی امداد انہی ممالک کو دی جائے، جو برتھ کنٹرول پر کاربند ہوں۔

کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ کا دستور شروع سے چلا آرہا ہے، ہمارے پاکستانی باشندوں کو بھی یہ کام کافی دلکش معلوم ہونے لگا ہے، اور وہ اس دلکشی میں کھو کر ان نقصانات کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو اس فعل کی بدولت رونما ہو سکتے ہیں، بلکہ ہوئے ہیں۔ پھر غالباً انہیں اس تحریک کے اس خطرناک مقصد کا بھی علم نہیں ہے، جس کے زیر اثر مغربی قومیں مشرقی ممالک میں برتھ کنٹرول کا رواج دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔

مگر خدا کا شکر ہے کہ اب بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں، جو اس فعل کے صحت وسقم کا فیصلہ جذبات سے نہیں دلائل سے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ کام شرعی حیثیت سے کیا درجہ رکھتا ہے؟ اور عقلاً اس پر عمل کرنا چاہئے یا نہیں؟

اس سلسلے میں میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کے پاس عرصۂ دراز سے سوالات کی بھرمار ہو رہی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس مسئلے کی شرعی اور عقلی حیثیت جاننے کے لئے بے تاب ہیں۔ والد ماجد مدظلہم کا بہت عرصے سے ارادہ تھا کہ اس موضوع پر کوئی جامع کتاب تحریر فرمائیں، لیکن ہجوم مشاغل کے سبب بہ نفس نفیس جلد یہ کام نہ کر سکے، تو احقر کو حکم دیا۔ میں نے اپنی بساط کے موافق تعمیل کی، مگر شرعی

حیثیت کا باب خود لکھنے کے باوجود اس پر کامل اطمینان نہ ہوا، اس لئے والد ماجد مدظلہم سے درخواست کی، آپ نے ہجوم کار کے باوجود یہ پورا باب خود ہی تحریر فرما دیا۔ جس سے بحمد اللہ اس کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

دیگر تمام ابواب کے اندر مواد فراہم کرنے میں جتنی محنت مجھ سے ہوسکی ہے، اس قدر کی ہے۔ اور بحمد اللہ اس بات کو ہر آن پیش نظر رکھا ہے کہ مواد فراہم کرنے میں جانبداری نہ آنے پائے۔ ایک نظریہ قائم کر کے دلیلیں نہیں ڈھونڈیں، دلیلیں دیکھ کر نظریہ قائم کیا ہے۔

یہی درخواست قارئین سے بھی ہے کہ اس کتاب کو اسی طرح پڑھیں، جس طرح میں نے اس موضوع کی دوسری کتابیں پڑھی ہیں۔ یعنی کوئی ایک نظریہ قائم کر کے نہیں، بلکہ غیر جانبداری کے ساتھ جیسے ایک حق کا متلاشی کرتا ہے۔ اس طرح اس کا مطالعہ فرمائیں۔ اس کے باوجود اگر کہیں غلطی محسوس ہو، یا شبہ پیش آئے، تو احقر کو مطلع کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ حق کو قبول کرنے میں کسی قسم کی عار مجھے محسوس نہ ہوگی۔

آخر میں ان تمام حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے میرے اس ''نقش اول'' کو ترتیب دینے میں قدمے سخنے میری مدد فرمائی۔ میرے برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی دار العلوم کراچی قابل ذکر ہیں۔

اور خدائے کریم کا شکر تو کسی طرح ادا ہو ہی نہیں سکتا کہ اس نے مجھ جیسے بے بساط شخص پر اتنا بڑا فضل فرمایا۔ اسی سے التجا ہے کہ ان الٹے سیدھے نقوش کو مفید اور مقبول بنا دے۔ وما ذالک علیہ بعزیز۔

محمد تقی عثمانی

۱۴ جنوری ۱۹۶۱ء

۱/۴۷ گارڈن ایسٹ کراچی نمبر ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

موضوع سخن

برتھ کنٹرول کی جو تحریک آج کل بہت زور وشور کے ساتھ چل رہی ہے، اسے اپنے ملک میں عملی جامہ پہنانے کا اہم فیصلہ ہمیں اسی وقت کرنا چاہئے، جب کہ ہم اس کو تین کسوٹیوں پر بخوبی پرکھ چکے ہوں:

۱:......سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ جس نظریئے پر ہم عمل کرنے جا رہے ہیں، وہ اسلام کے ان عظیم اصولوں کے خلاف تو نہیں، جو انسانی زندگی کے تمام تر شعبوں میں ایک معتدل اور پرسکون راہ کی ہدایت کرتے ہیں۔

۲:......پھر یہ سوچنا چاہیے کہ یہ تحریک عقل کے نزدیک بھی قابل قبول ہے یا نہیں؟

۳:......اس کے بعد اپنے گرد وپیش پر نظر ڈالنی چاہئے کہ یہ تحریک کہیں عملی جامہ پہن چکی ہے یا نہیں؟ اگر اس پر کہیں عمل ہوا ہے، تو اس کے نتائج و ثمرات کس صورت میں ظاہر ہوئے؟ اس لئے ہم ان صفحات میں برتھ کنٹرول سے متعلق ان تینوں موضوعات پر الگ الگ بحث کریں گے، تا کہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے۔

۱...... شرعی حیثیت

شرع اسلام کا اصل مدار کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر ہے۔ ضبطِ تولید کوئی نیا مسئلہ نہیں، بلکہ مختلف ضرورتوں کے ماتحت مختلف صورتوں سے ہر زمانہ اور ہر ملک میں زیر بحث آتا رہا ہے۔ عہد رسالت اور زمانۂ نزول قرآن میں بھی اس کی مختلف صورتیں مختلف اسباب واغراض کے ماتحت زیر بحث آئی ہیں، اور ان کے متعلق یہی سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے، اور زبان حق ترجمان سے ان کے جوابات ارشاد ہوئے۔ ایک مسلمان کے لئے کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سب سے اہم یہی ارشادات ہیں۔ انہیں کی روشنی میں کوئی مسئلہ شرعی حیثیت سے طے ہوسکتا ہے۔

قرآن وسنت میں غور کرنے سے اس مسئلہ کی دوصورتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک "قطع نسل"، یعنی کوئی ایسی صورت اختیار کرنا، جس کے سبب دائمی طور پر انسان اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہے۔ دوسرے منع حمل، یعنی اولاد پیدا کرنے کی قابلیت باقی رہتے ہوئے کوئی ایسی صورت اختیار کرنا، جس سے حمل قرار نہ پائے۔ ہم ان دونوں کے متعلق قرآن وسنت کے ارشادات کسی قدر تفصیل سے پیش کرتے ہیں، تاکہ مسئلہ کو سمجھنے اور اس کا نتیجہ نکالنے میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔

۱:...... قطع نسل

اس کی جو صورت قرن اول میں معروف تھی، وہ "اختصاء" ہے۔ (یعنی خصیتین نکلوا کر قوت مردی ختم کرنا) حدیث میں اس سلسلے کے چند سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوئے، سب کے جواب میں اس عمل کو سختی سے منع فرمایا۔ اور حرام قرار دیا۔

ایک سوال کا واقعہ صحیح بخاری (باب مایکرہ من التبتل و الخصاء) میں یہ نقل کیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا کرتے تھے، جوانی کے تقاضے سے جنسی خواہش ہمیں پریشان کرتی تھی۔ اس لئے ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی کہ ہم اختصاء کے ذریعہ قوتِ مردمی کو قطع کر دیں تاکہ اس سے آزاد ہو کر جہاد کے کام میں مشغول رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے منع فرمایا۔ (اس فعل کے حرام ہونے سے متعلق) قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی:

”یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ“

(صحیح بخاری ص:۷۵۹ ج:۲)

”اے ایمان والو! تم اللہ کی ان پاکیزہ چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ بناؤ، جو اس نے تمہارے لئے حلال قرار دی ہیں۔ اور حد سے تجاوز نہ کرو، کیونکہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قطع نسل کا یہ عمل آیت مذکورہ کے تحت حرام اور حد سے تجاوز میں داخل ہے۔

۲:...... دوسرا سوال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے فقر و افلاس کی وجہ سے کیا کہ شادی کرنے اور اس کے حقوق ادا کرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہ تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اختصاء کی اجازت طلب کی، تاکہ جنسی خواہش کی پریشانی رفع ہو جائے۔ اور گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ مٹ جائے۔ آپ نے ان کو بھی سختی سے منع فرمایا۔ (صحیح بخاری ص:۷۶ ج:۲)

ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ قطع نسل اور قوت مردمی کو ختم کرنا تحریم حلال اور حدود اللہ سے تجاوز ہونے کے سبب حرام ہے۔ ان دونوں حضرات کا عذر قوی اور صحیح تھا، مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اختصاء کی اجازت نہ دی۔

۳:...... اسی طرح کا ایک تیسرا سوال حضرت عثمان بن مظعونؓ نے اس بناء پر کیا کہ ان کی تمنا یہ تھی کہ کسی طرح جنسی خواہش کو ختم کر کے ہر وقت عبادت اور ذکر اللہ میں لگے رہیں۔ انہیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ اور بکثرت روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔

حافظ ابن عبدالبرؒ نے ''الاستیعاب'' میں یہ روایت نقل کی ہے، اور اسی طرح کا سوال و جواب حضرت علیؓ اور ابوذر غفاریؓ کا نقل کیا ہے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے جنسی خواہش ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے، اور تولید کی قابلیت باقی نہ رہے، مطلقاً حرام و ناجائز ہے۔ خواہ اس میں کتنے ہی فوائد نظر آئیں۔ علامہ بدرالدین عینیؒ نے بخاری کی شرح میں فرمایا:

وَهُوَ مُحَرَّمٌ بِالِاتِّفَاقِ

قطع نسل کا یہ عمل باتفاق حرام ہے

۲:...... منع حمل

اس کی جو صورت اس زمانہ میں معروف تھی، اسے ''عزل'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے مادۂ تولید رحم میں نہ پہونچے۔ خواہ مرد کوئی صورت

---

(۱)...... عمدۃ القاری ص:۲۰۷، ج:۲

اختیار کرے، یا عورت فم رحم کو بند کرنے کی کوئی تدبیر کرے، یہ دونوں شکلیں قدیم زمانہ سے معروف ہیں۔ بعض صحابہ کرامؓ سے خاص خاص ضرورتوں کے ماتحت ایسا کرنا منقول ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشاد اس کے متعلق مختلف سوالوں کے جواب میں فرمائے، وہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے صاف طور پر ممانعت معلوم ہوتی ہے، اور نہ صریح طور سے جائز ہونا مستفاد ہوتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ آپ نے اس عمل کو پسند نہیں فرمایا، اسی لئے اس مسئلہ میں ائمہ سلف میں اختلاف رہا، بعض نے مطلقاً ناجائز قرار دیا۔ اور بعض نے کہا کہ یہ عمل فی نفسہ ناپسندیدہ ہے، مگر خاص خاص ضرورتوں کے ماتحت اجازت بھی دی جاسکتی ہے۔ اور اگر کسی غرض فاسد کی وجہ سے کیا جائے تو ناجائز ہے۔ روایات حدیث اس بارہ میں یہ ہیں:

۱:......حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنی کنیزوں سے عزل کرنا چاہا (تاکہ گھر کے دوسرے کاموں میں حرج پیش نہ آئے) مگر یہ مناسب نہ معلوم ہوا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کئے بغیر ہم ایسا کریں۔ آپؐ سے سوال کیا، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"مَا عَلَيْكُمْ اَنْ لَا تَفْعَلُوْا مَا مَنْ نَسَمَةٍ كَائِنَةٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ اِلَّا وَ هِيَ كَائِنَةٌ" (بخاری ومسلم)

"اگر تم ایسا نہ کرو تو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ کیونکہ جو جان پیدا ہونے والی ہے تو وہ ضرور ہو کر رہے گی۔"

۲:......انہیں ابوسعید خدریؓ کی ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کے متعلق دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا:

"مَامِنْ كُلِّ الْمَاءِ يَكُوْنُ الْوَلَدُ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ خَلْقَ شَيْءٍ لَمْ يَمْنَعْهُ شَيْءٌ." (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

''ہر نطفہ سے تو بچہ پیدا ہوتا نہیں، اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔''

مطلب یہ ہے کہ جس مادہ سے کسی بچہ کا پیدا ہونا اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دیا ہے، وہ ضرور اپنے مستقر پر پہونچ کر حمل بنے گا۔ تم کتنی ہی تدبیریں اس کے خلاف کرو، کامیاب نہ ہو گے۔

۳:...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کی کہ میری ایک کنیز ہے، وہی گھر کے سب کام انجام دیتی ہے، میں اپنی جنسی ضرورت بھی اسی سے پوری کرتا ہوں، مگر یہ چاہتا ہوں کہ اس کو حمل نہ رہے۔ (تاکہ گھر کے کاموں میں خلل نہ پڑے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اِعْزِلْ عَنْھَا اِنْ شِئْتَ فَانَّہٗ سَیَاتِیْھَا مَاقُدِّرَ لَھَا''

(مسلم شریف)

''تمہارا دل یہی چاہتا ہے، تو عزل کرلو۔ مگر یہ یاد رکھو کہ جو بچہ اس کے بطن سے پیدا ہونا تقدیر الٰہی میں لکھا گیا ہے، وہ ضرور پیدا ہوگا۔''

کچھ عرصہ کے بعد یہ شخص پھر حاضر ہوا، اور ذکر کیا کہ وہ کنیز عزل کرنے کے باوجود حاملہ ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جو بچہ پیدا ہونا مقدر ہے، وہ ہو کر رہے گا۔

۴:...... حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ میں اپنی بیوی سے عزل کرتا ہوں آپ نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو؟ اس نے عرض کیا کہ میرا ایک بچہ

ہے، جس کو وہ دودھ پلاتی ہے، مجھے خطرہ ہے کہ حاملہ ہوگئی تو اس کا دودھ بچے کو مضر ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فارس اور روم کے لوگ ایسا کرتے ہیں، ان کے بچوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ (مسلم)

ان چاروں روایات حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو پسند نہیں فرمایا، مگر صاف ممانعت بھی نہیں فرمائی۔

۵:......اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہم اس زمانہ میں عزل کرتے تھے، جب کہ قرآن کا نزول جاری تھا، گویا اگر یہ عمل ناجائز ہوتا، تو قرآن کی کوئی آیت اس کی ممانعت پر نازل ہوجاتی۔ جب ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ عمل جائز ہے۔

یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے نقل کی ہے مسلم کی ایک روایت میں اتنا اور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے اس عمل کی اطلاع ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا۔

۶:......لیکن جذامہ بنت وہبؓ کی حدیث جو صحیح مسلم میں منقول ہے، اس میں ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کے بارہ میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ذَالِکَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ وَهِيَ اِذَا الْمَوْءُ دَةُ سُئِلَتْ" (مشکوٰۃ ص:۲۷۶)

"یہ تو خفیہ طور پر اولاد کو زندہ درگور کردینے کے حکم میں ہے، اور آیت قرآن اِذَا الْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ (۱) اس کو شامل ہے۔"

---

(۱)......اس آیت میں احوال قیامت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: جب اس لڑکی سے جسے زندہ درگور کیا گیا ہے سوال کیا جائے گا۔

اس آخری حدیث میں صراحت کے ساتھ اس عمل کی ممانعت اور حرمت بیان فرمائی گئی ہے، اور اس کو قتل اولاد کے حکم میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی حدیث کے بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مَا کُنتُ اَریٰ مُسلِماً یَفعَلُہٗ.''

''میں کبھی یہ گمان نہ کرتا تھا کہ کوئی مسلمان ایسا کرے گا''

(فتح القدیر)

۷:...... مگر اس کے مقابل ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اپنی کنیزوں سے عزل کرتے تھے، مگر بعض یہودیوں نے کہا کہ یہ تو موؤدۃ صغریٰ ہے۔ یعنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی چھوٹی صورت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہود غلط کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کوئی جان پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ (ترمذی)

بظاہر یہ حدیث پہلے والی حدیث جذامہ رضی اللہ عنہا کے خلاف ہے، اس میں تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزل کو وأد خفی فرمایا، اور اس میں یہود کے قول موؤدہ صغریٰ کو غلط قرار دیا۔ .... لیکن درحقیقت ان دونوں میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہود نے تو اس عمل کو زندہ درگور کرنے ہی کی ایک قسم قرار دیا تھا، فرق چھوٹے بڑے کا کیا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حقیقتاً زندہ درگور کرنا قرار نہیں دیا، بلکہ ''وأد خفی'' فرما کر اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ اگرچہ ظاہر اور حقیقت کے اعتبار سے موؤدہ نہیں، مگر اسی مقصد کا ایک پوشیدہ راستہ ہے۔ جس کے لئے لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے، یعنی لڑکیوں کی وجہ

سے عار لاحق ہو جانے کا خطرہ۔ اس طرح یہ روایت پہلی روایت سے تو متصادم نہیں رہتی، مگر پچھلی سب روایات کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس میں عزل کو صراحۃً منع فرمایا ہے، اور پچھلی سب روایات میں صاف منع نہیں فرمایا ہے۔

ان دونوں قسم کی روایات جمع کرنے کے لئے علماء اہل تحقیق نے مختلف صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ واضح اور اسلم یہ ہے کہ روایت جذامہؓ کو کراہت پر محمول کیا جائے، اور پچھلی سب روایتوں کو جواز پر، اب ان سب روایات کے مجموعے سے یہ حاصل ہوگا کہ یہ عمل جائز تو ہے، مگر مکروہ اور ناپسندیدہ۔

جمع روایات کے اس طریق کے لئے خود ان روایات میں شواہد موجود ہیں۔ کیونکہ جوازِ عزل کی جتنی روایات اوپر نقل کی گئی ہیں، ان سب کا حاصل یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کی ہمت افزائی تو کہیں نہیں فرمائی، بلکہ ناپسندیدگی یا فضول ہونے کا اظہار فرمایا، البتہ واضح طور پر اس عمل کی ممانعت بھی نہیں کی، تو اس کا حاصل بھی یہی نکلا کہ یہ عمل جائز مگر مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ اور جذامہؓ کی آخری حدیث کا حاصل بھی تحقیق کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل مکروہ ہے، کیونکہ وأدِ خفی کو حقیقی وأد کا درجہ تو نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقی وأد حرام ہے، تو اس وأدِ خفی کو مکروہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ صحابہؓ وتابعینؒ کی ایک بڑی جماعت کا یہی مسلک ہے کہ اس عمل کو مکروہ قرار دیا جائے۔ علامہ عینیؒ نے بخاری کی شرح میں فرمایا ہے:

> ''اس عمل کی کراہت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، ابن عمرؓ، اور ابوامامہؓ سے مروی ہے، ابراہیم نخعیؒ، سالم بن عبداللہؒ، اسود بن یزیدؒ اور طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ عزل مکروہ ہے۔''

عام فقہائے امت کا رجحان بھی ان تمام روایات حدیث کو دیکھنے کے بعد یہی

ہے کہ یہ عمل مکروہ ہے، جیسا کہ فتح القدیر، ردالمحتار، احیاء العلوم وغیرہ میں ان کی تصریحات موجود ہیں۔

البتہ عذر اور مجبوری کے حالات ہر جگہ مستثنیٰ ہوا کرتے ہیں، یہاں بھی خاص خاص اعذار کی حالت میں یہ کراہت باقی نہ رہے گی۔ جس کی تفصیل ردالمحتار وغیرہ میں مذکور ہے۔

مثلاً عورت اتنی کمزور ہے کہ بارِ حمل کا تحمل نہیں کرسکتی یا کسی دور دراز کے سفر میں ہے، یا کسی ایسے مقام میں ہے، جہاں پر قیام و قرار کا امکان نہیں، خطرہ لاحق ہے، یا زوجین کے باہمی تعلقات ہموار نہیں علیحدگی کا قصد ہے۔

ان سب اعذار کا خلاصہ یہ ہے کہ شخصی اور انفرادی طور پر کسی شخص کو عذر پیش آجائے، تو عذر کی حد تک اس طرح کا عمل بلا کراہت جائز ہوگا، عذر رفع ہونے کے بعد اس کے لئے بھی درست نہیں۔ اور عام لوگوں کے لئے اجتماعی طور پر اس کی ترویج بہر حال ناپسندیدہ اور مکروہ ہے۔

ایک اور بات بھی یاد رکھئے کہ کوئی شخص انفرادی طور پر کسی ایسی غرض کے ماتحت عزل کرے، جو اسلامی اصولوں کے خلاف ہے، تو اس کا یہ عمل بالکل ناجائز کہلائے گا۔ مثال کے طور پر اگر یہ خیال ہو کہ لڑکی ہوگئی، تو بدنامی ہوگی۔ تو اس کے اس عمل کو جائز نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس کی بناء وہ نظریہ ہے، جس پر قرآن کریم نے جابجا نکیر فرمائی ہے۔ علیٰ ھذا کوئی شخص مفلسی کے وہم سے یہ کام کرے، تو بھی جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کا مقصد اسلام کے بنیادی اصولوں کے بالکل خلاف ہے۔

خلاصہ:

مذکور الصدر بحث سے حاصل شدہ نتیجہ یہ ہے کہ ضبط ولادت کا اگر کوئی ایسا

طریقہ اختیار کیا جائے، جس سے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے، خواہ مرد کی طرف سے یا عورت کی طرف سے کسی دوا یا انجکشن کے ذریعہ یا آپریشن اور خارجی تدابیر سے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ ارشادات کے ماتحت ناجائز اور حرام ہے۔

ہاں منع حمل کی صورتیں خواہ وہ عزل وغیرہ کی صورت میں ہوں، یا کسی دوا اور انجکشن یا خارجی تدابیر کے ذریعہ شخصی حالات کو دیکھ کر خاص خاص ضرورتوں کے ماتحت وقتی طور پر بقدر ضرورت ان کا استعمال کر لینے کی گنجائش ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ اس عمل کا مقصد کوئی ناجائز نہ ہو۔ لیکن اس کو قومی اور اجتماعی شکل دینا شریعت وسنت کا مقابلہ ہے کہ اس کو قوم وملت کے لئے نہ صرف جائز بلکہ ذریعۂ فلاح وترقی قرار دینا، جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم وملک کے لئے مضر یا کم از کم ناپسندیدہ بتلایا ہو، ہرگز جائز نہیں۔ خصوصاً جب کہ اس کی بنیاد فقر وافلاس کے خوف یا اقتصادی بدحالی کے خطرہ پر رکھی جائے، جس کو رب العالمین نے خالص نظام ربوبیت کے تحت اپنی ذمہ داری قرار دی ہے، اور کسی کی مداخلت کو اس میں جائز نہیں رکھا۔

عرب کے جاہل جو فقر وافلاس کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے، ان کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے قرآن کریم نے جو ارشاد فرمایا ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ تمہارا یہ فعل نظام ربوبیت میں مداخلت کے مترادف ہے۔ تمام مخلوق کے رزق کی ذمہ داری رب العالمین نے نہایت واضح طور پر میں اپنے ذمہ لی ہے:

"وَمَامِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا" (ھود:٦)

''زمین پر چلنے والی کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو وہ ان سب کے ٹھیئے ٹھکانے کو جانتا ہے۔

اس آیت میں اور اس کی امثال بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ وہ جتنی جانیں اس عالم میں پیدا فرماتے ہیں، ان کے رزق یعنی ضروریات زندگی کی کفالت وہ خود فرماتے ہیں۔ اور اس شان سے فرماتے ہیں کہ مقرر کردہ راشن ڈپو پر جانے اور وہاں سے رزق حاصل کرنیکی محنت بھی ہر مخلوق کے ذمہ نہیں ڈالی، بلکہ یہ بھی ان کے ذمہ نہیں کیا گیا کہ جب وہ کسی دوسری جگہ منتقل ہوں، تو درخواست دے کر اپنا راشن وہاں منتقل کرائیں، بلکہ فرمایا'' يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا''یعنی رب العالمین ہر جاندار کی مستقل قیام گاہ اور عارضی قیام گاہ کو جانتا ہے، وہیں اس کو رزق دیتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:

''اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَانُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ''

(الحجر ۱۴: ۲۱)

''کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس موجود نہ ہوں اور ہم ان میں سے مخصوص مقدار نازل کرتے ہیں۔''

ان آیات الٰہیہ پر ایمان رکھنے والے کو یہ ماننا پڑے گا کہ خداوند قدوس نے مخلوق کو معاذ اللہ بے سوچے سمجھے پیدا کر کے نہیں ڈال دیا کہ دوسروں کو ان کے رزق کا انتظام کرنا پڑے، اور نہ معاذ اللہ یہ ممکن ہے کہ پیدا کرنے والے کو اس کی خبر نہ ہو کہ مخلوق کی آبادی بڑھتی جاتی ہے، اور یہ دنیا اور اس کی تمام اشیاء محدود ہیں، ان کے لئے کس طرح پوری ہوں گی۔

علیم وحکیم نے ہر مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے اس کے رہنے سہنے اور کھانے

پینے کا انتظام کر رکھا ہے، جاندار کے وجود میں آنے سے پہلے بطن مادر میں اور پیدا ہونے کے بعد ماں کی چھاتیوں میں اس کی غذا پیدا کر دی جاتی ہے، اور معدے کی طاقت کے ساتھ اس کی غذا بدلتی رہتی ہے، صرف انسان ہی نہیں جنگل کے ہر جانور کے متعلق بھی قدرت کا یہی قانون ہے، جس کی جس زمانے میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اس کی پیداوار بڑھا دیتے ہیں۔ اور جس کی ضرورت کم ہو جاتی ہے، اس کی پیداوار بھی کم کر دیتے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں پٹرول کا کوئی کام نہ تھا، اس کی پیداوار بھی کچھ نہ تھی آج نئی دنیا کی روح پٹرول پر قائم ہے، تو زمین نے اس کے خزانے اگل دیئے ہیں۔

اسی طرح زمین کی وسعت کا حال ہے کہ پچھلے دور میں ''ربع سکوں'' زمین کا بہت تھوڑا حصہ آباد تھا، باقی زمین کو پہاڑ، جنگلات اور خالی میدانوں نے گھیر رکھا تھا۔ آبادی بڑھتی گئی، اور بستیاں ہر جگہ بنتی گئیں، اور آج بھی موجودہ زمین پر اتنی وسعت ہے کہ بہت کچھ آبادی اس میں سما سکتی ہے۔ جن کی دلیلیں اور اعداد و شمار ہم آگے اپنے مقام پر پیش کریں گے۔ انشاء اللہ۔

اس کے علاوہ قدرت نے موت اور حوادث کا ایسا نظام بنایا ہے کہ خود بخود زمین کے حصے خالی ہوتے، اور دوسروں کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور جس رفتار سے دنیا کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے، اسی رفتار سے حوادث بڑھتے جاتے ہیں۔ پچھلی صدیوں میں ساری جنگوں میں ہلاک ہونے والے انسانوں کی تعداد کا موازنہ اگر صرف ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے کر لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ شاید اس جنگ نے پچھلی ساری جنگوں کا ٹوٹل ایک دفعہ میں پورا کر دیا، ہر جگہ طوفان، سیلاب، وبائی بیماریاں، ریلوں کے باہم تصادم کے حوادث جو پہلے نہ تھے، آج ہر طرف قدرتی اسباب کے تحت پیش آتے رہتے ہیں، اور کوئی طاقت ان کو روکنے پر قادر نہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ نظام ربوبیت اسی ذات کے لئے سجتا ہے، جس نے اس مخلوق کو پیدا کیا ہے، وہ جانتا ہے کہ جس کو میں پیدا کررہا ہوں، وہ کہاں بسے گا، کہاں رہے گا، کہاں کھائے گا؟ کسی ملک کے عوام یا حکومت کو اس میں مداخلت کرنا زیبا نہیں دیتا۔

انسان کی انتظامی مشنری کا کام صرف اتنا ہے کہ اختیاری اسباب کی حد تک زمین کی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کرے، پیدا شدہ غلّات وسامان کو ضائع ہونے سے بچانے کی فکر کرے، حاصل شدہ سامان کی تقسیم عدل وانصاف کے ساتھ کرے۔ آباد زمینوں کی تقسیم میں عدل وانصاف قائم کرے، اور غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے میں خداداد عقل وفہم اور وسائل سے کام لے کر آباد کرنے کی کوشش کرے، اگر انسان کی انتظامی مشنریاں ان فرائض کو صحیح طور پر انجام دینے لگیں، تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کو کسی دور میں بھی معاشی بدحالی کا سامنا کرنا نہ پڑے۔

مگر ہو یہ رہا ہے کہ انسانوں نے اپنے کرنے کا کام تو چھوڑ رکھا ہے، یا بے پروائی سے خراب کر رکھا ہے۔ اور رب العالمین کے نظام ربوبیت میں مداخلت کرنے کی فکر میں پڑ گئے۔ یہ صورت حال عقلاً بھی غلط ہے، اور تجربہ ومشاہدہ نے بھی اس کا غیر مفید ہونا واضح کردیا ہے کہ موجودہ دنیا کی ساری کوششیں انسان کو امن وسکون اور عافیت واطمینان دلانے میں قطعاً ناکام نظر آتی ہیں، جس کا اندازہ موجودہ زمانے اور پچھلے زمانہ کے موازنہ سے ہر شخص بآسانی کرسکتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ضبط تولید کو قومی حیثیت سے رواج دینا، اور اس کو دنیا کی فلاح ونجات کا ذریعہ قرار دینا نظام ربوبیت میں بے جا مداخلت اور تعلیمات سنت کا مقابلہ ہے، جو کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا، پھر اس سے صلاح وفلاح کی امید بھی موہوم امید ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۲......عقلی حیثیت

جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا کہ برتھ کنٹرول پر عمل اسلامی اصولوں کے خلاف ہے، تو عقل سلیم کا تقاضا تو یہ ہے کہ بحث کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے۔ اس کے اصولوں کو کسی بشری ذہنیت نے جنم نہیں دیا۔ بلکہ وہ اس مالک الملک والملکوت کے بنائے ہوئے ہیں، جس کا علم ہر ہر چیز پر محیط ہے۔ اس کے تمام احکام عقل سلیم کے عین مطابق اور بڑی دقیق حکمتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کا کوئی نظریہ ایسا نہیں، جو عقل وخرد کے کسی صحیح تقاضے سے ٹکرایا ہو، اس لئے جب اسلام کا ایک حکم معلوم ہوا، تو ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے، لیکن جو لوگ بے عقلی سے عقل اور شرع میں تفاوت سمجھتے ہیں، ان کے اطمینانِ خاطر کے لئے مناسب ہے کہ زیر بحث تحریک کو خالص عقل کی میزان میں بھی تول لیا جائے۔

ا:......اس دنیا کے معرض وجود میں آنے سے لیکر اب تک کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالئے، تو یہ بات بخوبی آشکارا ہو جائے گی کہ ہمیشہ ضروریات کی مناسبت سے پیداوار کی رفتار رہی ہے۔ جیسی جیسی ضرورتیں سامنے آتی رہیں ویسے ہی اسباب اور سہولتیں پیدا ہوتی رہیں، جب اس روئے زمین پر کھانے پینے والے کم تھے، تو اشیائے خورد ونوش بھی اسی نسبت سے کم تھیں، جب انسانوں کی آبادی زمین کے ایک محدود رقبہ میں تھی، تو مواصلات کے لئے سائیکل تک کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اس وقت نہ یہ ہوائی اور بحری جہاز تھے، نہ ریل اور موٹر کاریں اس وقت کے

لوگ اگر یہ سوچ کر برتھ کنٹرول کرنے لگتے۔ کہ ''آبادی روز بروز بڑھتی جارہی ہے، اور وسائل معاش محدود ہیں، نہ اس وقت کھانے پینے کا اتنا سامان ہے کہ تمام بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ بھر سکے، اور نہ کوئی سفر کا ذریعہ ہے، جس سے قطع منازل کا کام لیا جائے۔ اگر اضافہ کی روک تھام نہ کی گئی، تو اندیشہ ہے کہ تمام عالم انسانیت ایک عظیم مصیبت اور تنگی میں گرفتار ہوجائے گی۔ اس لئے ہمیں ضبط تولید کرنا چاہئے'' تو ہزاروں سال پہلے دنیا کا وجود ختم ہوجاتا، لیکن انہوں نے یہ غلطی نہیں کی۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت جاریہ سے واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ آبادی بڑھے گی، تو اس کا بڑھانے والا اسے تنگی معاش سے بھی بچائے گا۔ اور ان کی ضروریات پوری فرمائے گا، چنانچہ ہوا بھی یہی کہ جوں جوں نسل انسانی میں اضافے کے ساتھ ساتھ ضرورتیں بڑھتی رہیں، وسائل معاش میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

بہرکیف عادت اللہ ہمیشہ سے اسی طرح جاری ہے کہ جیسی جیسی ضرورتیں سامنے آتی ہیں ویسے ہی انہیں رفع کرنے کا سامان کیا جاتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ جس چیز کا وجود دنیا اور اس میں بسنے والوں کے لئے بے ضرورت ہوجاتا ہے مالک الملک اس کو بہت کم اور بسا اوقات معدوم کردیتا ہے۔ بڑی واضح مثال ہے کہ جب وسائل سفر میں ہوائی اور بحری جہاز ریلیں اور موٹریں ایجاد نہ ہوئی تھی تمام دنیا میں رہنے والوں کے تمام سفر گھوڑوں پر طے ہوتے تھے لیکن جب ان چیزوں نے گھوڑوں کی جگہ کو زیادہ بہتر طریقے سے پر کردیا تو ان کی وہ اہمیت ختم ہوگئی جو پہلے تھی رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کثرت کے ساتھ انہیں استعمال کرنا ہی چھوڑ دیا اب حساب کا تقاضا تو یہ تھا کہ آج گھوڑے گلی کوچوں میں کتے بلیوں کی طرح گھوما کرتے اور ادنیٰ درجہ کی بات یہ تھی کہ ان کی قیمت میں بڑی نمایاں کمی ہوجاتی لیکن واقعہ کیا ہے؟ گھوڑوں کی تعداد میں اضافہ تو الگ رہا حیرت انگیز کمی ہوگئی اور قیمت میں کمی

تو در کنار نمایاں اضافہ ہوگیا۔

دور جانے کی ضرورت نہیں آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ہندوستان میں پہلے گائے کا ذبیحہ قانوناً جائز تھا ہر روز لاکھوں گائیں ذبح ہوتی تھیں چند سالوں سے گائے کا ذبح کرنا قانونی جرم قرار دے دیا گیا اور ان کی اتنی بڑی تعداد روز بچتی رہی حساب لگایا جائے تو اس کی رو سے آج ہندوستان میں انسانوں کی تعداد کے قریب قریب گائیں ہونی چاہئیں لیکن کیا کسی نے دیکھا کہ وہاں ان کی اتنی افراط ہوگئی ہو؟

ہرگز نہیں یہ تو قادر مطلق کے وہ قوانین ہیں جن تک عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی یہ وہ مرحلہ ہے جہاں ہوش وخرد جواب دے جاتے ہیں۔ حساب و کتاب کی زبان گنگ ہو جاتی ہے، فطرت کے ان محیر العقول قوانین میں حساب و کتاب قدم بھر ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ کہنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ اضافۂ آبادی معاشی تنگی پر منتج ہوگا بلکہ جب آبادی بڑھے گی تو قادر مطلق وسائل رزق میں وسعت عطا کریں گے جیسے کہ پہلے سے ہوتا چلا آتا ہے۔

اللہ نے ہی اس محدود رقبہ زمین میں اپنی مخلوق کی بے شمار انواع پیدا کی ہیں جن میں سے ہر ایک میں توالد وتناسل کی ایسی زبردست قوت ہے کہ اگر صرف ایک ہی نوع بلکہ بعض انواع کے صرف ایک جوڑے کی نسل کو پوری قوت سے بڑھنے دے تو ایک قلیل مدت میں تمام روئے زمین صرف اسی نسل سے پٹ جائے اور کسی دوسری نسل کے لئے ایک ذرہ برابر گنجائش باقی نہ رہے۔

مثلاً اسٹار مچھلی بیس کروڑ انڈے دیتی ہے اگر اس کے صرف ایک فرد کو اپنی پوری نسل بڑھانے کا موقع میسر آجائے تو تیسری چوتھی پشت تک دنیا کے تمام سمندر اس سے لبالب بھر جائیں اور ان میں پانی کے ایک قطرے کی بھی گنجائش نہ رہے مگر

وہ کون ہے جو ان نسلوں کو اپنی مقررہ حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا؟ یقیناً وہ ہماری سائنٹیفک کوششیں نہیں خدا کی حکمت ہے۔

تو جس طرح خدا نے اپنی حکمت سے ان نسلوں میں ایسا اضافہ نہیں ہونے دیا جو ان کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دے بعینہ اسی طرح اس کی حکمت نسل انسان پر بھی حاوی ہے ہمیشہ سے اسی حکمت کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ قدرت کے ان کاموں میں دخل اندازی کے مرتکب ہوں۔

دوسرے یہ کہ ضبط تولید خواہ کسی طرح کیا جائے بہرصورت ایک غیر فطری عمل ہے کیونکہ عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی تعلق قائم کرنے سے فطرت کا اصل مقصد بقائے نوع ہے جو خصوصیت سے عورت کے جسمانی نظام اور اس کے تدریجی تغیرات پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی جسمانی مشنری بنانے کا منشاء صرف یہ ہے کہ وہ بقائے نوع کی خدمت انجام دے وہ جب اپنے شباب کو پہونچتی ہے تو ماہواری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ہر ماہ اسے استقرار حمل کے لئے تیار کرتا رہتا ہے پھر جب نطفہ قرار پاتا ہے تو اس کے جسمانی نظام میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ ہونے والے بچے کا مفاد اس کے اپنے وجود پر غالب آ جاتا ہے اس کی قوت کا صرف اتنا حصہ اس کے لئے چھوڑا جاتا ہے جتنا اس کی زندگی کے لئے ناگزیر ہے بقیہ تمام قوت بچے کی نشو نما پر صرف ہوتی ہے، یہی چیز عورت کی فطرت میں مامتا، ایثار، رحم اور محبت کے جذبات پیدا کرتی ہے۔

وضع حمل کے بعد عورت کے جسم میں ایک دوسرا انقلاب رونما ہوتا ہے جو اسے

دودھ پلانے پر آمادہ کرتا ہے اس زمانہ میں غدود رضاعت ماں کے خون سے بہترین اجزاء جذب کرکے بچے کے لئے دودھ فراہم کرتے ہیں اور اس مرحلے پر بھی فطرت عورت کو ذاتی مفاد پر نوعی مفاد کو ترجیح دینے کا سبق دیتی ہے۔

مدت رضاعت کے بعد قدرت کی طرف سے اسے دوسرے استقرار حمل پر تیار کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ اس اہم خدمت کی اہل رہتی ہے اور جہاں سن یاس شروع ہوتا ہے ساتھ ہی ساتھ اس کا حسن و جمال ختم ہونے لگتا ہے جاذبیت کافور ہو جاتی ہے شگفتگی اور جولانی طبع پر زوال آجاتا ہے اور پھر اس کے لئے بڑھاپے جسمانی تکلیفوں اور نفسانی افسردگیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی تان موت پر ہی جا کر ٹوٹتی ہے۔

اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ عورت کی زندگی کا سب سے بہتر زمانہ وہی ہے جس میں وہ ایک اہم نوعی خدمت کے لئے جیتی ہے اور جب وہ اپنے لئے جیتی ہے تو بری طرح جیتی ہے تو گویا اس کی تخلیق اور ازدواجی تعلق سے فطرت کا مقصد بقائے نوع ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ فطرت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان عائلی زندگی اختیار کرکے تمدن کی بنیاد رکھے کیونکہ ازدواجی تعلق سے اولاد اور ایک گھریلو ماحول پیدا ہوتا ہے پھر اس خانگی ماحول سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا اسی طرح گھر سے خاندان اور خاندان سے قبیلے بنتے ہیں اور اسی بنیاد پر تمدن کی عمارت قائم ہوتی ہے۔

اس لئے فطرت نے مرد و عورت کے عائلی رشتے میں جو کشش اور لذت پیدا کی ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ انسان اپنی طبعی خواہش سے ان مقاصد کو پورا کرے لیکن جو شخص اس لذت کو تو حاصل کرتا ہے مگر اس مقصد کو پورا نہیں کرتا جس کے معاوضے

میں اسے لذت حاصل ہوئی ہے تو اس کی مثال بالکل اس خادم جیسی ہے جو معاوضہ تو پورا لے مگر خدمت سے انکار کردے کیا ایسا خادم سزا دینے کے لائق نہیں؟

جس طرح یہ خادم سزا دینے کے قابل ہے اسی طرح وہ انسان بھی مجرم ہے جو لذت حاصل کرنا چاہتا ہے، مگران مقاصد کو پورا نہیں کرتا جن کے بدلے فطرت نے اسے لذت سے بہرہ اندوز کیا ہے، فطرت اس شخص کو سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑ سکتی جو اس کی حکم عدولی یا اس سے غداری پر آمادہ ہے، اس لئے لامحالہ اسے نقصانات پہونچنے چاہئیں۔

واقعہ اس عقلی نتیجہ کی تائید میں ہے حقیقتاً اس عمل سے انفرادی اور اجتماعی نقصانات ہوتے ہیں چند نقصانات ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

جسمانی نقصانات

ضبط ولادت سے عورت اور مرد دونوں کی جسمانی اور نفسانی صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے عورت کے بارے میں تو ہم پہلے لکھ آئے ہیں چونکہ عورت کا تمام جسمانی نظام بقائے نوع کا اہم رول ادا کرنے کے لئے بنایا گیا ہے اس لئے جب تک وہ اس خدمت کے قابل رہتی ہے ٹھیک رہتی ہے لیکن جوں اس کی اس خدمت میں فرق آتا ہے ساتھ ہی ساتھ حسن و جمال شگفتگی اور جولانی طبع پر بھی زوال آتا ہے۔

مرد کی کیفیت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں کیونکہ اس کے جسم کی بناوٹ میں بھی ذاتی مفاد پر نوعی مفاد کو ترجیح دی گئی ہے مرد کے جسم میں اس کے صنفی غدّے (Saxual glands) سب سے زیادہ اہم خدمات انجام دیتے ہیں یہ غدے مرد کے جسم میں صرف قوت تولید بہم پہنچا کر اپنا کام ختم نہیں کر دیتے بلکہ انسانوں کو وہ ماء الحیات (hermon) بھی عطا کرتے ہیں جس کے زیر اثر جسم پر بال پیدا

ہو جاتے ہیں عضلات میں طاقت اور توانائی آجاتی ہے ڈھانچے کی ہڈیاں سخت اور مضبوط ہو جاتی ہیں اور جسم کے دوسرے اعضاء بھی بالیدگی اور پختگی حاصل کر لیتے ہیں اس کے ساتھ ہی نفسیاتی تغیر واقع ہوتا ہے اور مرد میں عقل وتمیز اور شعور بیدار ہو جاتا ہے یہ طاقت وتوانائی تازگی اور انبساط مرد کے اسی دور کا خاصہ ہے جس میں وہ توالد وتناسل کے قابل ہوتا ہے پھر جوں جوں اس کے قوائے تناسل میں اضمحلال طاری ہوتا ہے اسی نسبت سے اس کی توانائی اور تازگی میں فرق پڑنا شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس نوعی خدمت کے بالکل قابل نہیں رہتا تو وہی دور اس کے بڑھاپے کا ہوتا ہے جس میں اس کی قوت جواب دیتی ہے، حوصلے پست اور ولولے سرد ہو جاتے ہیں، نوعی خدمت کی استعداد کا ختم ہو جانا فی الحقیقۃ اس کے لئے موت کا پیغام ہے۔

اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ نر و مادہ کی عین فطرت اولاد پیدا کرنے کا تقاضا کرتی ہیں اور صنفی غدوں کا جسمانی اور ذہنی قوتوں پر بڑا اثر ہوتا ہے۔

اب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ جب انسان ازدواجی تعلق سے صرف لذت کو پیش نظر رکھے گا اور اس مقصد کو پورا کرنے سے انکار کر دے گا جس کی طلب اس کی رگ وپے میں خون حیات بن کر دوڑتی ہے تو ممکن نہیں کہ عصبی نظام اور صنفی غدوں کے عمل پر اس حرکت کے برے اثرات مرتب نہ ہوں چنانچہ پروفیسر لیونارڈ ہل ایم بی اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:

> ''یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کی زندگی میں اس کے صنفی غدود کا بڑا اثر ہے جو غدے زوجی قوت پیدا کرتے ہیں وہی انسان میں توانائی اور چستی بھی پیدا کرتے ہیں ان ہی سے انسان میں کیرکٹر کی بہت سی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں زمانۂ بلوغ کے قریب جب ان غدوں کا عمل تیز ہو جاتا ہے

تو جس طرح انسان میں تناسل کی استعداد پیدا ہوتی ہے اسی طرح اس میں خوبصورتی شگفتگی اور ذہنی قوت، جسمانی طاقت جوانی اور عملی سرگرمی بھی پیدا ہوتی ہے اگر ان غدوں کے فطری مقاصد کو پورا نہ کیا جائے گا تو اپنے ضمنی فعل یعنی تقویت کو بھی چھوڑ دیں گے خصوصاً عورت کو استقرار حمل سے روکنا دراصل اس پوری مشین کو معطل اور بے مقصد بنانا ہے۔'' (۱)

۱۹۳۷ء میں برطانیہ کے نیشنل برتھ ریٹ کمیشن نے ضبط ولادت کے مسئلہ پر طبی نقطۂ نظر سے جو رپورٹ شائع کی تھی اس میں لکھا ہے:

''مانع حمل وسائل کے استعمال سے مردوں سے نظام جسمانی میں برہمی پیدا ہوسکتی ہے، عارضی طور پر ان میں مردانہ کمزوری یا نامردی بھی پیدا ہوسکتی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے کہا جاسکتا ہے کہ ان وسائل کا کوئی زیادہ برا اثر مرد کی صحت پر نہیں پڑتا البتہ اس بات کا ہمیشہ خطرہ ہے کہ مانع حمل وسائل سے جب مرد کو ازدواجی تعلق میں اپنی خواہشات کی تکمیل حاصل نہ ہوگی تو اس کی عائلی زندگی کی مسرتیں غارت ہوجائیں گی اور وہ دوسرے ذرائع سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جو اس کی صحت کو برباد کردیں گے اور ممکن ہے کہ اسے امراض خبیثہ میں مبتلا کردیں۔''

عورتوں کے متعلق کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی کہ:

''جہاں طبی لحاظ سے منع حمل ناگزیر ہو جہاں بچوں کی پیدائش حد سے زیادہ ہو وہاں منع حمل کی تدابیر عورت کی صحت پر بلاشبہ اچھا اثر ڈالتی ہیں لیکن جہاں ان میں سے کوئی ضرورت داعی نہ ہو وہاں منع حمل کی

(۱)...... یہ اقتباس مولانا مودودی کی ''اسلام اور ضبط ولادت'' سے ماخوذ ہے، آگے جو نیشنل برتھ ریٹ کمیشن کی رپورٹ کا اقتباس ہے وہ بھی اس کتاب سے لیا گیا ہے۔

تدابیر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کے عصبی نظام میں سخت برہمی پیدا ہوجاتی ہے اس میں بدمزاجی اور چڑچڑا پن پیدا ہوجاتا ہے جب اس کے جذبات کی تسکین نہیں ہوتی تو شوہر کے ساتھ اس کے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ نتائج ان لوگوں میں زیادہ دیکھے گئے جو عزل (coitus interroptus) کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔"

بعض دوسرے ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ اعواجا رحم، حافظہ کی خرابی اور بسا اوقات مراق اور جنون جیسے عوارض مانع حمل طریقوں سے پیدا ہوجاتے ہیں، نیز جس عورت کے یہاں زیادہ عرصہ تک بچہ پیدا نہیں ہوتا اس کے اعضاء تناسل میں ایسے تغیرات واقع ہوتے ہیں جس سے اس کی قابلیت تولید ختم ہوجاتی ہے اور اگر وہ کبھی حاملہ ہو تو وضع حمل میں اسے سخت اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے۔

علاوہ بریں برتھ کنٹرول کے بعض طریقوں میں سرطان پیدا ہوجانے کا خطرہ ہے حال ہی میں شادی کی رہنمائی کی قومی کونسل میڈیکل ایڈوائزری بورڈ کے سکریٹری ڈاکٹر اسیتھل ڈیوکس نے ایک بیان میں کہا:

"ضبط ولادت کی گولیاں عنقریب برطانیہ میں فروخت ہونی شروع ہوجائیں گی لیکن ان کی وجہ سے سرطان میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہوسکتا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ چند سالوں کے استعمال کے ساتھ اس کے انتہائی خطرناک نتائج نکلیں گے جس میں سرطان میں مبتلا ہونا بھی شامل ہے اس گولی کے دوسرے اثرات کی وجہ سے عورتوں کی صحت خراب ہوجائے گی۔" (۱)

---

(۱)......روزنامہ انجام مجریہ ۳ ستمبر ۱۹۶۰ء۔

خانگی تعلقات پر ضبط ولادت کا اثر

دوسرا اہم نقصان جو اس فعل کی بدولت پیش آئے گا یہ ہے کہ استقرار حمل سے بے فکر ہو جانے کے بعد شہوانی جذبات حد اعتدال سے بڑھ جائیں گے ڈاکٹر فورسٹر لکھتا ہے:

> ''مرد کی زوجیت کا رخ اگر کلیۃً خواہشات نفس کی بندگی کی طرف پھر جائے اور اس کو قابو میں رکھنے کے لئے کوئی قوت ضابطہ موجود نہ رہے تو اس سے جو حالت پیدا ہوگی وہ اپنی نجاست و دنائت اور زہریلے نتائج کے اعتبار سے ہر اس نقصان سے کہیں زائد ہوگی جو بے حد و حساب بچے پیدا کرنے سے رونما ہو سکتی ہے۔'' (۱)

اس کے علاوہ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اولاد ماں باپ کے درمیان تعلق قائم رکھنے میں ایک مضبوط کڑی ہوتی ہے اولاد کی تعلیم و تربیت اور ان کی دیکھ بھال ماں باپ کی شرکت ان کے درمیان محبت قائم رکھنے میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے اور جب اولاد ہی نہ رہے تو ان کے تعلق کی نوعیت عام جانوروں میں نر و مادہ کے درمیان بھی تعلق سے زیادہ بلند مقصد نہیں رہتی اس لئے دونوں کے درمیان کوئی مضبوط و مستحکم رشتہ پیدا نہیں ہو سکتا، صرف بھی تعلق باقی رہ جاتا ہے اور اولاد کے نہ ہونے کی صورت میں ایک دوسرے کو چھوڑ دینا بہت آسان ہو جاتا ہے اس بناء پر باہمی ناچاقیاں اور طلاق اس فعل کا لازمی نتیجہ ہو جاتی ہے۔

(۱)...... ماخوذ از ''اسلام اور ضبط ولادت ص:۵٦''۔

اخلاقی نقصانات

ضبط ولادت کا اخلاق پر بھی بہت برا اثر پڑ سکتا ہے سب سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اب تک بھی لوگ خاندان اور سوسائٹی میں بدنامی سے خوف کھاتے ہیں لیکن جب برتھ کنٹرول کے طریقے عام ہو جائیں گے تو زنا کی راہ سے ایک زبردست چٹان ہٹ جائے گی اور یہ شجرۂ خبیثہ خوب پروان چڑھے گا۔ لذت پرستی اور نفس کی بندگی حد سے زیادہ بڑھے گی اور اس سے ایک عام اخلاقی گراوٹ وبائے عام کی طرح پھیلے گی اور جنسی جرائم بڑھیں گے۔

۲:...... یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان میں کردار کی بہت سی خصوصیت پیدا کرنے میں اولاد کا بڑا حصہ ہوتا ہے والدین تو اولاد کی تربیت کرتے ہی ہیں ضبط نفس، کفایت شعاری، سنجیدگی، ایثار، عاقبت اندیشی جیسے خصائل حمیدہ اولاد کی پرورش سے پیدا ہوتے ہیں لیکن ضبط ولادت ان تمام اخلاقی اوصاف کی راہ مار دیتا ہے۔

۳:...... اس کے علاوہ بچوں کی تربیت میں صرف والدین ہی کارفرما نہیں ہوتے بلکہ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کی تربیت کرتے ہیں ان کا آپس میں رہنا سہنا، ملنساری، محبت، اخوت اور دوستی کے جذبات پیدا کرتا ہے جس بچے کو اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور دوسرے معاملات کا موقع نہیں ملتا وہ بہت سے اعلیٰ اخلاقی خصائص سے محروم رہ جاتا ہے۔

قومی اور اجتماعی نقصانات

اب ایک نظر ان نقصانات پر بھی ڈال لیجئے جو پوری قوم کو ضبط تولید کی بدولت

بھگتنے پڑتے ہیں۔

۱:...... ہر مرتبہ مرد و عورت ملتے ہیں تو مرد کے جسم سے لاکھوں جراثیم حیات عورت کے جسم میں داخل ہوتے ہیں اور عورت کے جسم سے لاکھوں بیضی خلئے (Egg cells) نکل کر ان جراثیم سے ملنے کے لئے بڑھتے ہیں ان جراثیم اور خلایا میں سے ہر ایک علیحدہ نسلی اور شخصی خصائص کا حامل ہوتا ہے ان ہی میں عقل مند، ذہین، اور بہادر بھی ہوتے ہیں۔ اور انہی میں احمق، کند ذہن، اور بزدل بھی، انسان کے اختیار میں یہ بات نہیں کہ کسی خصوصیت کے خاص جرثومے کو کسی ایک خصوصیت رکھنے والے خلئے سے ملا کر ایک مخصوص قسم کا انسان پیدا کر دے اس لئے بہت ممکن ہے کہ ضبط ولادت پر عمل کرنے والا انسان اپنی قوم میں ایک بہترین مدبر، جرنل یا حکیم کی پیدائش کو روکنے کا موجب ہو اور اسے اپنی حدود اختیار سے تجاوز کرنے کی سزا فطرت کی طرف سے یہ ملے کہ اس کی نسل میں بے وقوف، غدار، بزدل اور خودغرض قسم کے لوگ پیدا ہوں، بالخصوص جب یہ بے جا مداخلت عام ہو جائے تو وہ یقیناً قحط الرجال کے خطرے میں مبتلا کرے گی۔

۲:......ضبط ولادت سے جس قوم کی آبادی گھٹ جائے وہ ہر وقت تباہی کے کنارے پر ہوتی ہے اگر اس میں کبھی جنگ چھڑ جائے یا وبائی مرض پھیل جائے یا کوئی اور حادثہ رونما ہو جائے تو آدمیوں کا ایسا قحط پیدا ہوگا جس کے بعد اس قوم کا پنپنا مشکل ہو جائے گا، پھر ضبط ولادت کے رواج سے عوام میں ایک خودغرضانہ ذہنیت پیدا ہو جائے گی ہر شخص اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر یہ فیصلہ کرے گا کہ اسے کتنی اولاد کی ضرورت ہے؟ وہ یہ نہیں سوچے گا کہ ملک و قوم تعداد افراد کے لحاظ سے کس حال میں ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کی آبادی کم ہوئی تو بوقت ضرورت بڑھائے نہ بڑھ سکے گی۔

۳۔ ضبط ولادت معاشی نقطۂ نظر سے

آج کل کی تحریکِ ضبط ولادت کا منشاء چونکہ معاشی تنگی کا ازالہ بیان کیا جاتا ہے اس لئے ہم یہاں اس امر کی تحقیق بھی کرنا چاہتے ہیں کہ حقیقت میں ضبط ولادت معاشی لحاظ سے ناگریز ہے یا نہیں؟ اور معاشی لحاظ سے ضبط ولادت مفید ہے یا مضر؟

اس تحقیق کے لئے ہمیں تقریباً ڈیڑھ صدی پیچھے لوٹنا ہوگا کیونکہ موجودہ تحریکِ ضبط تولید کی بنیاد اس نظریے پر ہے جو ۱۷۹۸ء میں مالتھس نے پیش کیا تھا۔

مالتھس کا مسئلہ آبادی

یوں تو عرصۂ دراز سے علماء معاشیات میں یہ خیال موضوع بحث رہا ہے کہ جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اسی رفتار سے ذرائع معاش نہیں بڑھتے اس لئے اندیشہ ہے کہ ذرائع معاش بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہ دے سکیں اور تمام عالمِ انسانیت کو معاشی تنگی کا سامنا کرنا پڑ جائے یہاں تک کہ یہ خیال اس ''مہذب دور'' کی ایجاد بھی نہیں بلکہ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ اسی خطرے کے پیش نظر اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے۔

لیکن عصر جدید میں جس شخص نے سب سے پہلے اس مسئلے کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی وہ انگلستان کا مشہور معاشی عالم مالتھس ہے انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اس نے یہ اعلان کیا کہ ادنیٰ اجرت اور افلاس کی وجہ بنی نوع انسان کی عددی زیادتی میں مضمر ہے اضافۂ آبادی کا اشیاء خورد ونوش پر دباؤ پڑتا ہے اور اس

طرح اجرت کی سطح نیچی رہتی ہے اس میں اضافہ ممکن نہیں، تاوقتیکہ محنت کرنے والی آبادی کے اضافہ کو نہ روکا جائے، بالفاظ دیگر وسائل معاش کے مقابلہ میں آبادی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتی ہے اوران دونوں میں توازن اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب کہ آبادی میں وقتاً فوقتاً تخفیف ہوتی رہے۔

اس تخفیف کے لئے مالتھس نے دوقسم کے مانعات کا ذکر کیا ہے۔

ا:......ایجابی مانعات (positivr crects) یعنی وہ موانع جو پیدا شدہ اورموجودہ آبادی کوکم کردیں۔مثلاً فاقہ،امراض، جنگ وغیرہ۔

۲:......انسدادی مانعات (preventivr crects) یعنی وہ موانع جو آبادی کووجود میں آنے سے باز رکھیں پہلی قسم کی روک تو اموات کی زیادتی سے ہوتی ہے اوردوسری تولید کی تحدید سے۔

اس کے بعد جن لوگوں نے ضبط ولادت کی باقاعدہ تحریک اٹھائی انہوں نے برتھ کنٹرول کے مروجہ طریقوں کوانسدادی مانع کےطور پر استعمال کیا۔

اب ضبط تولید کی معاشی حیثیت جاننے کے لئے ہمیں دو پہلوؤں سے غور کرنا چاہئے،ایک یہ کہ مالتھس کا نظریہ کہاں تک صحیح تھا؟ دوسرے یہ کہ بعد کے لوگوں نے ضبط ولادت کے جن طریقوں کواستعمال کیاوہ درست تھے یانہیں؟

جہاں تک ان طریقوں کے استعمال کاتعلق ہے جوآج کل رائج ہیں اس کے بارے میں یہ کہنا پڑے گا کہ ضبط تولید پرعمل کرنے والوں نے جوطریقہ اختیار کیا وہ قطعی غلط تھا۔

مالتھس نے انسدادی مانع کے واسطے جس طریقے کی سفارش کی تھی وہ برتھ کنٹرول کے موجودہ طریقے نہ تھے بلکہ برہم چرچ (ضبط نفس) کاقدیم طریقہ تھا

ہارورڈ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر معاشیات ڈاکٹر ایف۔ڈبلیو۔ٹاسگ لکھتے ہیں:

"مالتھس کی یہ خواہش تھی کہ بیاہ کی عمر بڑھا دینی چاہئے اور یہ کہ شادیاں زیادہ سن پر پہونچنے کے بعد ہونا چاہئیں اگر ایسا کیا گیا تو شادی کی شرح گھٹ جائے گی اس لئے کہ ممکن ہے کہ اس عمر کو پہونچنے سے قبل کچھ نوجوان مر جائیں۔" (۱)

اس تجویز کی وجہ یہ نہیں ہوسکتی کہ اس زمانہ میں ضبط تولید کے دوسرے طریقوں کا تصور نہ تھا اس لئے کہ اگر آج کل کے فرز جے اور دوسرے طریقے ایجاد نہ ہوئے تھے تو کم از کم عزل کا وجود تو بہت پہلے سے تھا اس کے باوجود مالتھس نے انسدادی مانع آبادی کے لئے اس طریقے پر عمل درآمد نہیں سکھایا لیکن اس کے اصل نظریئے کے حاملین نے نفع نقصان سوچے بغیر ایک ایسی مہلک راہ اختیار کر لی جس کی خرابی کا خمیازہ انہیں بعد میں بھگتنا پڑا۔

۲: رہی مالتھس کی تجویز سو وہ عملاً تو اتنی مضر اور غلط نہیں جتنی وہ تجاویز ہیں جو برتھ کنٹرول کے سلسلہ میں آج کل رائج ہیں۔

البتہ اس کا اصل نظریہ ایک اصل کلی کے لحاظ سے ہرگز صحیح نہیں، مالتھس نے جس صورت حال میں یہ نظریہ پیش کیا تھا اس میں تو بے شک اضافہ آبادی کا تناسب خاصا تشویشناک تھا جب صدیوں کے ترقی پذیر تمدن اور تہذیب کی بدولت بتدریج ضروری آلات اور علم حاصل کرنے کے بعد کسی تہذیب یافتہ آبادی کا دفعۃً نئے ملک پر قبضہ ہوتا ہے تو ایسی آبادی کو کچھ مدت کے لئے اضافہ تعداد کی غیر محدود گنجائش مل جاتی ہے چنانچہ جس زمانے میں مالتھس نے اضافے کے امکانات دنیا کے سامنے

(۱)......ترجمہ اصول معاشیات ص:۳۳۴، ج:۲ مطبوعہ حیدر آباد۔

پیش کئے ہیں اس میں شمالی امریکہ اور دوسرے کئی ممالک کے اندر یہی صورت پیش آئی تھی اس کا مطلب یہ نہیں کہ عام حالات میں بھی اضافہ آبادی اس قدر ہو کہ عرصہ حیات تنگ کر دے چنانچہ ڈاکٹر ایف۔ ڈبلیو۔ ٹاسگ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ حیوانات کی کوئی نوع بھی اپنی بیشترین شرح سے نہیں بڑھ سکتی اگر وہ ایسا کرے تو مرور زمانہ کے ساتھ اس کی تعداد اس قدر بڑھ جائے گی کہ دوسروں کی بقا ناممکن ہو جائے گی اور صرف وہی کرۂ ارض پر چھا جائے گی انسان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے ہر ربع صدی کے اختتام پر اس کی تعداد دوگنی نہیں ہو سکتی صرف غیر معمولی حالات کے تحت اس قسم کی شرح طویل زمانے تک قائم رکھی جا سکتی ہے جب صدیوں کے ترقی پذیر تمدن اور تہذیب کی بدولت بتدریج ضروری آلات اور علم حاصل کرنے کے بعد کسی تہذیب یافتہ آبادی کا دفعۃً نئے ملک پر قبضہ ہوتا ہے تو ایسی آبادی کو کچھ مدت کے لئے اضافہ تعداد کی غیر محدود گنجائش مل جاتی ہے چنانچہ جس زمانے کو مالتھس نے اضافے کے امکانات کو تمثیل کے طور پر پیش کیا ہے اس میں شمالی امریکہ میں یہی صورت پیش آئی۔ علی ھذا ریاستہائے متحدہ کے باشندوں میں بھی ان کی تاریخ کے بیشتر حصے میں یہی صورت حال تھی اور اہل کنیڈا، اہل آسٹریلیا اور ارجنٹائن کی صورت میں بھی یہی ہوا، یہ سب صورتیں بنی نوع انسان کی تاریخ میں نہایت شاذ صورتیں ہیں یہ ان مقابلۃً شاذ صورتوں کے مشابہ ہیں جن میں کوئی حیوان مثلاً پروانہ پرند، یا دودھ پلانے والا جانور کسی نو آباد علاقے کو ہجرت کر جائے جو اس کے لئے بالکل نیا ہو اور کچھ مدت تک وہاں اپنی غذا کے ذرائع کو کم یا اپنے رقیبوں کو طاقتور پائے بغیر اپنی تعداد بڑھا سکتا ہو کسی ایسے ملک میں جہاں آبادی قائم ہوئے مدت

گزر چکی ہو بنی نوع انسان کسی بیشترین شرح سے اپنی آبادی کو نہیں بڑھا سکتے۔" (۱)

اس کے علاوہ مالتھس کے زمانے میں وہ حیرت انگیز ایجادات بھی عمل میں نہ آئی تھی جو آج کل حیرت انگیز نہیں سمجھی جاتیں سفر اور دوسرے مواصلات کے ترقی یافتہ ذرائع، ریل، ہوائی اور بحری جہاز ایجاد نہ ہوئے تھے بعد میں اس کے برعکس ان عمدہ ذرائع مواصلات نے دور دراز کے سفروں میں بے حد سہولت پیدا کر دی قدیم ممالک کے لوگ نئے نئے ملکوں میں آباد ہونے لگے اور ان ممالک کی پیداوار قدیم ملکوں میں آنے لگی۔ جدید مقامات کے دریافت ہونے اور دور افتادہ ممالک کے درمیان آمد و رفت کے سہل ذرائع قائم ہونے سے مسئلہ آبادی کافی حد تک طے ہو چکا ہے چنانچہ ڈبلیو۔ایچ۔مور لینڈ صاحب لکھتے ہیں:

"جس زمانے میں مالتھس نے مسئلہ آبادی پر قلم اٹھایا تھا دنیا کی حالت آج کل کے مقابل جداگانہ تھی اس کو معلوم نہ تھا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب کہ ریل اور دخانی جہازوں کے ذریعہ سے خوراک اور دیگر ضروریات کی کثیر مقداریں دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچا کریں گی یہ پیش کردہ مسئلہ اس خیال پر مبنی ہے کہ ہر ملک کو اپنے واسطے سامان خوراک خود ہی پیدا کرنا پڑتا ہے اور مالتھس کے زمانے میں حالت بھی یہی تھی لیکن اب معاملہ دگرگوں ہے اب چاہے تو ایک ملک اپنا کل سامان خوراک دوسرے ملک سے منگا سکتا ہے بشرطیکہ وہ کسی دوسری شکل میں کافی دولت پیدا کرتا ہو جس کو بطور قیمت معاوضے میں دے سکے مثلاً انگلستان اپنی خوراک کا بہت تھوڑا حصہ خود پیدا کرتا ہے، بلکہ وہ اپنی گوناگوں مصنوعات کے عوض میں دوسرے ملکوں

(۱)......ترجمہ اصول معاشیات از ڈاکٹر ٹاسگ ج:۲،ص:۳۲۰۔

سے خوراک کا سامان لیتا ہے۔ اب سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی ملک اپنے واسطے کیونکر کافی خوراک پیدا کرے بلکہ یہ کہ وہ کیونکر اس قدر دولت پیدا کرے کہ مطلوبہ مقدار خرید سکے۔" (۱)

مورلینڈ صاحب کے اس قول پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ گزشتہ دور میں یہ واقعات مسئلہ آبادی کو کافی حد تک طے کر چکے ہیں لیکن آئندہ نئے نئے ممالک دریافت ہونے کی امید اب بہت مدہم ہے چھوٹے چھوٹے جزیرے ملیں تو ملیں غالباً امریکہ اور آسٹریلیا جیسے براعظم اب نامعلوم نہیں رہے ایجادات بھی منتہائے کمال کو پہونچ چکیں اور اگر ان کا سلسلہ جاری رہا بھی تو جیسا انقلاب دخانی انجن نے کر دکھایا آئندہ ایسا ہونا دشوار ہے لہٰذا جو خطرہ مسئلہ آبادی میں مضمر ہے وہ صرف ملتوی ہوا ہے ہمیشہ کے لئے رفع نہیں ہوا اور اب نہیں تو ہزار سال کے بعد اس کا وقوع ممکن ہے۔

اس اعتراض کا جواب تین طرح دیا جاسکتا ہے:

۱:...... جہاں تک ایجادات اور ملکوں کی دریافت کا تعلق ہے تو ان کے اضافہ کا تصور جو آج کل مشکل نظر آتا ہے وہ اس تصور سے مختلف نہیں جو گزشتہ زمانے میں لوگوں کے ذہن میں آچکا ہے۔ .... بھلا گزشتہ زمانے میں کس کو یقین آتا تھا کہ انسان بھی کبھی سمندر کا فراخ سینہ چیر کر دور دراز کے سفر بہ سہولت طے کرلے گا یا سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں پرواز کرے گا یہ راکٹ اور اسپٹنک جو دنیا سے گزر کر چاند اور مریخ تک کی خبر لاتے ہیں ان جیسی چیزوں کا تصور جادوگروں کے اڑن کھٹولے کی صورت میں ہو تو ہو کسی حقیقی اور مشاھد چیز کی حیثیت سے ہرگز نہ تھا اس کے باوجود جو چیزیں اس وقت ناممکن نظر آتی تھیں آج ممکن ہی

(۱)...... مقدمہ معاشیات مطبوعہ حیدرآباد۔

نہیں موجود ہیں۔ اسی طرح اس وقت کی قیاس آرائی بھی آئندہ کے لئے ایجادات کے ختم ہونے پر کوئی معقول دلیل نہیں۔

۲:......اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ آئندہ وہ اسباب پیدا نہ ہوں گے جو بڑھتی ہوئی آبادی کو روک سکیں یا ان کی تمام ضروریات کے کفیل ہو جائیں تو یہ تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ مستقبل قریب میں ایسے تشویشناک اضافے کی کوئی امید نہیں اور مستقبل بعید کے لئے اس وقت کا پھینکا ہوا تیر کچھ مضر نتائج تو پیدا کر سکتا ہے کسی مفید نتیجہ کی امید موہوم ہے۔

۳:...... پروفیسر الیاس برنی اصول معاشیات میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قرآئن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً آبادی کبھی اس قدر نہ بڑھے گی کہ ضروریات ملنے میں دقت ہو، افزونی آبادی پر جو خاص خاص بندشیں قائم ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔''

اس کے بعد انہوں نے چندان اسباب کا ذکر کیا ہے جو اضافۂ آبادی کے سیلاب پر بند کا کام دیتے ہیں ان میں سے بعض اہم چیزوں کا خلاصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

(الف): دولتمند طبقوں میں غالباً تعیش کے اثر سے بچے کم پیدا ہوتے ہیں زیادہ تر اولاد غرباء اور متوسط الحال طبقوں میں ہوتی ہے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دولتمندی کے پھیلنے سے اضافۂ آبادی کی رفتار مدہم ہو جاتی ہے۔

(ب): تعلیم یافتہ طبقے میں دماغی محنت کی کثرت سے نفسانی خواہشیں ضعیف ہو جاتی ہیں اور ایسے لوگوں کو شادی سے رغبت نہیں رہتی لہٰذا اشاعت تعلیم کے ساتھ

ساتھ افزونی آبادی کی روک تھام ہو رہی ہے۔

(ج): جدید ترقی یافتہ ممالک میں مستورات میں کچھ ایسی آزادی پھیلی ہے کہ وہ بال بچوں کے جنجال سے بچ کر سیاست اور انتظام ملک میں حصہ لینا چاہتی ہیں، اور اس پر تعلیم مزید ہے اس وجہ سے ایسی عورتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو شادی سے گریز کرتی ہیں۔

(د): عادات بد بری طرح پھیل رہی ہیں جن سے امراض خبیثہ نشو ونما پاتے ہیں اور قوتِ مردمی کو زائل یا کم کر دیتے ہیں۔

(ہ): ہر صدی میں دو چار جنگیں ضرور ہو جاتی ہیں خصوصیت سے موجودہ آلات حرب کے ایجاد ہونے سے جنگوں میں ہلاک ہونیوالوں کا تناسب بے حد بڑھ چکا ہے۔

(و): وبائیں گونا گوں امراض، زلزلے، طوفان اور حادثات غرض چند در چند کارکن قدرت کی طرف سے ایسے موجود ہیں جو آبادی کی کانٹ چھانٹ کرتے رہتے ہیں۔

> ''پس واضح ہوا کہ آبادی حد سے زیادہ بڑھنے اور ضروریات کے میسر نہ آنے کا خدشہ خلاف قرائن ہے جو خدا پیدا کرتا ہے وہی سب کی ضروریات کا کفیل ہے۔'' (۱)

اس کے علاوہ جناب پرمتھ ناتھ بنرجی نے اپنی تالیف ''انڈین اکنامکس'' میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ آبادی کے اضافے کا تناسب تشویشناک نہیں ہے انہوں

(۱)......اصول معاشیات از الیاس برنی باب: ۲۸، ص: ۶۱۹۔

نے سب سے پہلے ایک معقول دلیل یہ پیش کی ہے:

اضافہ کچھ یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ مردم شماری کا انتظام بمقابل سابق زیادہ منضبط اور مکمل ہو گیا ہے۔ (۱)

اس دلیل کی واقعیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ تمام دنیا میں نیوانگلینڈ کی ماساچوسٹیس ہی ایک ایسی ریاست ہے جہاں صحیح شرحیں مسلسل درج کی جاتی رہی ہیں دوسرے ممالک میں اس کا پورا اہتمام نہیں ہوا اور وہاں کی شرح پیدائش دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت ادنیٰ ہے زیادہ سے زیادہ تناسب پیدائش ۲۷ء۶ فی ہزار رہا ہے اور اکثر ۲۴ء۲۵ کے درمیان دائر رہتا ہے۔ (۲)

اس کے بعد پرمتھ ناتھ صاحب نے لکھا ہے:

بقول پروفیسر سینگمین آبادی کے مسئلہ کو صرف تعداد پر ختم نہ سمجھنا چاہئے بلکہ اس کو پیداوار کی قوت اور واجبی تقسیم سے بھی بہت کچھ تعلق ہے قانون تقلیل حاصل کا پورا پورا عمل صرف زراعت میں ہوتا ہے اور حقیقی تقابل آبادی اور خوراک میں نہیں بلکہ آبادی اور دولت میں ہے اگر آبادی بڑھے اور دولت اپنی اسی مقدار پر قائم رہے یا آبادی کے مقابل اس میں کمتر اضافہ ہو تو نتیجہ یہی رہا تو لوگ اور بھی زیادہ خستہ حال ہو جائیں گے۔

چنانچہ پچھلے زمانے میں ہندوستان کی یہی حالت رہ چکی ہے اس کے برعکس اگر اضافۂ آبادی کے ساتھ پیداوار اور دولت میں بھی اس قدر ترقی ہوتی رہے تو ملک میں موجودہ آبادی سے بھی زیادہ لوگ اچھی طرح بسر کر سکتے ہیں۔''

---

(۱)...... معاشیات ھند ص: ۲۹۔ (۲)...... دیکھئے ترجمہ اصول معاشیات از ٹاسگ ص: ۳۲۸ ج: ۲۔

مذکورہ بحث سے آپ پر واضح ہو چکا ہوگا کہ مالتھس نے جس زمانے میں مسئلہ آبادی پیش کیا تھا اس وقت حالات کچھ اور تھے اور اب کچھ اور ہیں اس لئے مالتھس کے مسئلہ آبادی کو موجودہ زمانے کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔

البتہ مالتھس کے بعد جس شخص نے اس کے مسئلہ آبادی کو کچھ ترمیم کر کے پیش کیا ہے وہ مارشل ہے اس کا نظریہ ضرور قابل غور ہے۔

اس کا خیال ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں انگلستان کے ماہرین معاشیات نے اضافۂ آبادی کا وسائل معاش پر جو بار پڑتا ہے اس کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے لیکن ان کا یہ مبالغہ ایک حد تک حق بجانب تھا وہ لوگ یہ کیونکر جان سکتے تھے کہ آگے چل کر وسائل آمد و رفت میں ایسی حیرت انگیز ترقی ہوگی کہ دنیا کی زرخیز ترین زمینوں کی پیداوار دور دراز کے ملکوں میں جا کر اس قدر ارزانی شرحوں سے فروخت ہوں گی۔ انھیں یہ علم کیسے ہو سکتا تھا کہ سائنس کی ترقی سے انسان اپنے محدود وسائل ہی کے ذریعہ اس قدر کام لے سکے گا لیکن یہ واقعات پیش آئے جس کی وجہ سے مالتھس کا نظریہ کسی قدر قدیم ہو گیا ہے اور اس میں جدید حالات سے مطابقت باقی نہیں رہی۔

البتہ اگرچہ اس نظریئے کی شکل قدیم ہو چکی ہے لیکن اپنی اصلیت کے اعتبار سے وہ اب بھی بڑی حد تک صحیح ہے۔

اس کے بعد مارشل نے مسئلہ آبادی کو حسب ذیل طریقے سے بیان کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ اضافۂ آبادی کا انحصار دو چیزوں پر ہے ایک قدرتی اضافہ یعنی اموات کے مقابلہ میں پیدائش کی کثرت، دوسرے توطن۔

قدرتی اضافہ

ان میں سے پہلی چیز یعنی کثرتِ ولادت کا انحصار زیادہ تر ان عادتوں پر ہوتا ہے جو شادی سے متعلق ملک کے باشندوں میں رائج ہوتی ہیں لیکن خود ان عادتوں پر حسب ذیل اسباب کا اثر پڑتا ہے:

(الف) آب وہوا: گرم ممالک کے لوگ جلدی شادی کر لیتے ہیں اور سرد ممالک کے رہنے والے دیر سے۔

(ب) پرورش خاندان کی دقتیں: ہم دیکھتے ہیں کہ آبادی کے مختلف طبقوں میں شادی کی عمر مختلف ہوتی ہے مثلاً متوسط طبقے کے افراد بہت دیر سے شادی کرتے ہیں دستکار اور صناع ان سے کسی قدر جلد اور بے مہارت مزدوران سب سے جلد، وجہ صاف ظاہر ہے کہ متوسط طبقوں کو سوسائٹی میں اپنا وقار اور عزت برقرار رکھنے میں بہت روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس وقت تک شادی نہیں کرتے جب تک کہ پرورش خاندان کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے کافی مقدار میں کمانہ لیں۔ دستکاروں اور صناعوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ وہ بیس اکیس سال کی عمر تک جتنا کما لیتے ہیں وہی ان کی انتہائی آمدنی ہوتی ہے اس لئے بالعموم وہ اس عمر تک شادی کر لیتے ہیں۔ اور ادنیٰ طبقوں کی کیفیت ان سے بھی دگرگوں ہے، کیونکہ سترہ، اٹھارہ برس ہی کی عمر میں ان کی آمدنی انتہائی حدود کو پہونچ جاتی ہے۔

(ج) رسم ورواج: بعض پسماندہ دیہاتی علاقوں میں اب تک یہ قانون ہے کہ صرف بڑے لڑکوں کو شادی کی اجازت دی جاتی ہے یورپ کے بعض مقامات میں بکثرت یہ قانون رائج ہے اسی طرح کے دوسرے رسوم ورواج بھی قدرتی

مانعات کے علاوہ اضافۂ آبادی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

توطن

عام مشاہدہ ہے کہ اکثر لوگ خاص کر معاشی اسباب کے زیر اثر اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جا بستے ہیں اس ہجرت کا بھی ملک کی آبادی پر بسا اوقات گہرا اثر مرتب ہوتا ہے پچھلے دنوں انگلستان کی بہت سی آبادی آسٹریلیا میں جا جا کر بسی ہے۔ (۱)

مارشل کے اس نظریہ آبادی کو پیش نظر رکھ کر (جو جدید حالات کے مطابق ہے) آپ خود بخود اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ مارشل کے نزدیک بھی مالتھس کا نظریہ ایک اصل کلی کے اعتبار سے قطعی غلط تھا وہ کچھ مخصوص حالات ہی تھے جن کے تحت مالتھس نے تحدید نسل کی تجویز پیش کی تھی اب وہ حالات ختم ہو چکے ہیں۔

اب مارشل کے اس نظریہ آبادی سے بھی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ تحدید نسل کی کوئی ضرورت نہیں جو حالات رونما ہوتے رہتے ہیں ان کا تغیر و تبدل ہی ضبط تولید کے تقاضوں کو پورا کر دیتا ہے کہیں آب و ہوا کہیں رسم و رواج اور کہیں پرورش خاندان کی دقتیں شادی سے باز رکھتی ہیں اور نتیجۃً اضافۂ آبادی سے بھی اور کسی جگہ خارجی توطن اور ہجرت آبادی میں کمی کرتی رہتی ہے۔

بہرکیف! جن لوگوں نے جذباتی انداز کو چھوڑ کر غیر جانبدارانہ اور سنجیدہ طریقے سے غور و فکر کیا ہے ان کا بیان یہ ہے کہ پورے کرۂ ارض کا آبادی کے لئے ناکافی ہونا ممکن نہیں، اس موضوع پر حال ہی میں ''ہفتہ وار ٹائم'' کے اندر ایک بہت تحقیقی مضمون شائع ہوا تھا جس میں دلائل سے ثابت کیا گیا تھا کہ اضافۂ آبادی سے

(۱)...... مارشل کے نظریۂ آبادی کی مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو جناب حبیب الرحمٰن کی کتاب ''معاشیات'' ص:۷۵ تا ۷۸ مطبوعہ ۱۹۵۳ء۔

متعلق یہ جذباتی پیش گوئیاں اور بے سوچے سمجھے اندازے قطعی غلط ہیں ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو مالتھس کی پیشگوئیوں کا ہوا تھا، اس مضمون کا کچھ خلاصہ ہم افادۂ ناظرین کے لئے پیش کرتے ہیں۔

صاحب مضمون نے لکھا ہے کہ یہ پیش گوئیاں کرنے والے سائنس کی ممکنہ ایجادات اور غیر متوقع انقلابات کا اندازہ نہیں کر سکے جس طرح مالتھس کے زمانے میں آسٹریلیا، افریقہ، اور جنوبی امریکہ میں بڑی بڑی زمینیں خالی پڑی تھیں اسی طرح موجودہ زمانے میں بھی ایمزن بیسن کے اندر پوری زمین کا بیسواں حصہ بالکل خالی پڑا ہے صرف ایتھوپیا کی ۱۸ کروڑ ایکڑ ایسی زمین غیر مزروعہ پڑی ہے جو تمام دنیا کی سب سے زیادہ زرخیز زمین ہے وہ ایشیا جس میں ہجوم آبادی کا اتنا شور مچ رہا ہے، اس میں زمین کے بڑے بڑے قابل کاشت حصے غیر مزروعہ ہیں مثلاً فلپائن کے جزیرہ منڈاناؤ اور جنوبی ویتنام کی سطح مرتفع کا پورا حصہ غیر آباد ہے جب کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں دو کروڑ ستر لاکھ ایکڑ زمین جو پہلے زیر کاشت تھی صرف اس لئے بے کار چھوڑ دی گئی کہ غذا بہت زیادہ پیدا ہونے لگی تھی۔

اور اگر ان اہم حقائق سے قطع نظر کر کے یہ طے کر لیا جائے کہ ان غیر آباد زمینوں کو کام میں نہیں لایا جائے گا تب بھی دنیا کی غذائی پیداوار بہت زیادہ بڑھائی جا سکتی ہے۔

۱۹۵۹ء میں انڈیا نے تین ارب ڈالر غذا کی درآمد میں صرف کئے تھے اور اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ پچھلے چند سالوں سے ہر سال تین لاکھ سے چار لاکھ ٹن کا غلہ درآمد کر رہا ہے حالانکہ اگر اس کے ذمہ داروں سے یہ پوچھ لیا جائے کہ انڈیا اپنی پیداوار کو جاپان کی طرح تین گنا کیوں نہیں بڑھا سکتا؟ تو ان کے پاس کوئی معقول جواب نہ ہوگا۔

انڈیا اور جاپان کی زرعی پیداوار کی شرح میں جو تفاوت ہے وہ صرف اس لئے کہ جاپان کا کسان کرم خوردوا بہترین بیج اور زیادہ کیمیائی کھاد استعمال کرتا ہے اور اگر انڈیا بھی انہی جیسے محتاط طریقوں پر عمل کرے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی پیداوار جاپان کی نسبت سے کم رہے۔

برطانیہ کے معاشی ماہر مسٹر کولن کلارک نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر تمام دنیا اپنی قابل کاشت زمینوں کو ایسے مؤثر طریقے سے کاشت کرے جیسے ہالینڈ کا ہنرمند کسان کرتا ہے تو موجودہ زرعی زمین ۲۸ ارب کی آبادی کو یورپ کے معیار زندگی کے مطابق سامان غذا مہیا کرسکتی ہے گویا زمین میں موجودہ آبادی سے تقریباً دس گنا زائد آبادی کے لئے بھی گنجائش ہے۔ (۱)

(۱)......ترجمہ ''ٹائم ویکلی نیویارک'' مجریہ ۱۱ جنوری ۱۹۶۰ء

پاکستان میں مسئلہ آبادی

آیئے ہم دیکھیں کہ خصوصیت سے پاکستان میں مسئلہ آبادی کی کیا نوعیت ہے؟ اس موضوع پر غور وفکر کرنے کے لئے مندرجہ ذیل سوالات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

۱:......کیا واقعی آبادی کی رفتار زائد ہے؟

۲:......وسائل معاش کا آبادی کے ساتھ کیا تناسب ہے؟

۳:......اگر یہ صحیح ہے کہ وسائل معاش اضافہ آبادی کا ساتھ نہیں دیتے تو کیا ضبط ولادت ہی اس مسئلہ کا واحد علاج ہے؟

۴:......اگر ضبط ولادت کے علاوہ اور کوئی بہتر علاج ممکن ہے تو کیا؟

اب آپ ان میں سے ہر ایک سوال کا جواب موجودہ حالات کی روشنی میں تلاش کیجئے تو معلوم ہوگا کہ:

۱:......اس میں تو واقعی کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان کی آبادی خاصی رفتار سے بڑھ رہی ہے ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک کے عرصے میں پاکستان کے علاقہ میں ۵ء۱۰ فیصد افراد کا اضافہ (۱) ہوا لیکن اس کا بہت بڑا حصہ مہاجرین کی درآمد کا نتیجہ تھا ۱۹۵۷ء کے وسط میں جو پنج سالہ منصوبہ پیش کیا گیا تھا اس کے اندازے کے مطابق چھ سال کے عرصہ میں ہر سال آبادی کے اندر ۴ء۱ فیصد اضافہ (۲) ہوا اور ۱۹۶۱ء کی حالیہ مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق دس سال کے عرصے میں ہر سال دس لاکھ نفوس بڑھے ۱۹۵۱ء میں کل آبادی ۸ کروڑ کے لگ بھگ تھی اور ۱۹۶۱ء میں ۹ کروڑ

(۱)......دیکھئے Pak Economics by Mr.Afzal P .241

(۲) Essoyes of Pakistan Economy by Mr. Khurshid AHmed.P.24

سے بھی زائد ہوگئی ہے۔

لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ محض اس اضافے سے بوکھلا کر رقبے اور پیداوار کی گنجائشوں سے آنکھیں بند کر لینا دانشمندی اور سنجیدگی کا تقاضا نہیں بلکہ پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ملک کا رقبہ کتنے اضافے کی گنجائش رکھتا ہے؟ اس کی پیداوار کہاں تک اضافۂ آبادی کا ساتھ دے سکتی ہے؟

۲:...... جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے اس کی حیثیت سے پاکستان کی آبادی نہ اب تشویشناک ہے اور نہ مستقبل میں اس کی کوئی امید ہے، کیونکہ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ایک زراعتی ملک ایک مربع میل میں ۲۵۰ افراد تک کی ضروریات زندگی کو پورا کرسکتا ہے پاکستان ایک زراعتی ملک ہے (اس کی آبادی کا ۷۹ فیصد حصہ زراعت پیشہ ہے) اور یہاں اوسطاً ایک مربع میل میں ۲۰۸ آدمی بستے ہیں [۱] اس لحاظ سے پاکستان میں فی مربع میل ۴۲ افراد کی مزید گنجائش ہے اور یہ گنجائش بہت وسیع ہے۔

البتہ اگر موجودہ زرعی پیداوار کو دیکھا جائے تو وہ بیشک مزید اضافے کی متحمل معلوم نہیں ہوتی، اگر چہ ہماری زرعی پیداوار کو دیکھا جائے تو وہ آبادی کا ساتھ دے رہی ہے، اور اگر صحیح طریقۂ تقسیم پر عمل کیا جائے تو یہی پیداوار تھوڑے بہت مزید اضافہ کی گنجائش بھی رکھتی ہے بڑی اہم پیداوار میں سے ۳۷ لاکھ ۸۵ ہزار دو سو بیس ٹن گندم پیدا ہوتا ہے۔ (۲)

جو متحدہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے گندم کے ۴۱ فیصد سے بھی زیادہ ہے (۳) چاول کی کل پیداوار ۸۴ لاکھ ۶۱ ہزار سے کچھ زائد ہے اور یہ مقدار متحدہ

(۱) Cssayson Pakistan Economy P.24

(۲) Hand and Crop statistics of Pakistan 1959

(۳) سالنامہ پاکستان مطبوعہ: ۱۹۵۱ء

ہندوستان کی پیداوار کا تقریباً ۳۵ فیصد حصہ ہے۔

پوری دنیا کا تقریباً ۷۵ فیصد پٹ سن ہمارے ملک میں پیدا ہوتا ہے[1] غرضیکہ موجودہ پیداوار موجودہ آبادی کے لئے کافی ہے البتہ کسی بڑے اضافہ کی متحمل نہیں۔

۳:......لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اگر موجودہ پیداوار مزید اضافۂ آبادی کی نسبت سے کم ہے تو اس کا واحد علاج ضبطِ ولادت ہی ہے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ ہم آبادی کو دانستہ کم کر کے مہلک خطرات کو خود اپنے ہاتھوں مول لے لیں البتہ آئندہ معاشی حالات استوار کرنے کے لئے ہمیں پیداوار بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔

رہا یہ کہ وہ کیا ممکنہ طریقے ہیں جن پر عمل کر کے ہم معاشی بحران سے نجات پا سکتے ہیں؟ (یہی چوتھا سوال بھی ہے) سو اس سلسلہ کی مختلف تجاویز اور ممکنہ طریقے ہم آگے ایک مستقل باب کے تحت پیش کریں گے، جن سے آپ پر یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ ضبط ولادت کی پامال راہ سے الگ کئی پرسکون راہیں بھی ہیں جن پر چل کر ہم ہر مصیبت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ واللہ الموفق والمعین۔

(۱) افسوس کہ پٹ سن کی پیداوار کا علاقہ اب پاکستان میں شامل نہیں ہے۔ ناشر

۴۔ تجربہ کیا کہتا ہے؟

مذکورہ حقائق سے پوری طرح واضح ہو چکا ہے کہ ضبط ولادت نہ تو شرع اسلام کی کسوٹی پر صحیح ثابت ہوا، اور نہ عقل ہی اسے رواج دینے پر راضی ہے ان منہ بولتے دلائل کے بعد ایک سلیم الفکر انسان کا ذہن سو فیصد اس نتیجے پر پہنچنا چاہئے کہ ضبطِ ولادت پر عمل کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔

لیکن افسوس کہ ہم اپنی اس قوم سے مخاطب ہیں جو دو سو سال کے اس المناک پھیر میں آ کر اپنی سیاسی عظمتوں کے ساتھ ساتھ اپنی تمام فکری صلاحیتیں بھی یورپ کی قربان گاہ پر لٹا چکی ہے ہماری مرعوبیت اور احساس کمتری اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ ہمارے دل کسی ایسی بات کو جگہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتے جو براہ راست یورپ سے درآمد نہ کی گئی ہو خواہ اس کی صداقت پر قرآن وسنت کے کتنے ہی قطعی دلائل رکھ دیئے جائیں یا خالص عقلی اور نا قابل انکار براھین کے ڈھیر لگا دیئے جائیں، ہماری نگاہیں اور ہمارے دل ان کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے بلکہ یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب رہتے ہیں کہ اس بارے میں ماتھس نے کیا کہا؟ نیوٹن نے کیا سوچا؟ برنارڈ شا نظریہ کیا ہے؟ اور آخر کار اسی نظریئے کو حرف آخر قرار دیتے ہیں جو کسی مغربی مفکر کی دماغی پیچ سے وجود میں آیا ہو، قرآن وسنت کیا کہتے ہیں؟ عقل کیا پسند کرتی ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو ذہنی تقلید کے اس دور میں ''فرسودہ'' ہو چکے ہیں۔

اس لئے یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ یورپ کے جن ممالک نے اس

طریقے کو رواج دیا انہوں نے اس کا کیا پھل پایا؟............اور آخر کار انہوں نے اس عمل سے متعلق کیا رائے قائم کی؟ ضبطِ ولادت کی تحریک تقریباً ۷۰/۸۰ سال سے مغربی ممالک میں سرگرم عمل رہی ہے اتنی مدت ایک ایسی تحریک کا راز فاش کرنے کے لئے بالکل کافی ہے جسے مختلف اقوام وممالک میں کثرت کے ساتھ اشاعت نصیب ہوئی ہو اور اس کے نتائج پر کئی بار تحقیق کی جا چکی ہو، وہاں اس تحریک کے جو مہلک نتائج برآمد ہوئے ان کی مختصر داستان یہ ہے۔

۱......طبقات کا عدم توازن

انگلستان کے رجسٹرار جنرل کی رپورٹوں اور نیشنل برتھ ریٹ کمیشن کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ضبطِ ولادت کا رواج زیادہ تر اعلیٰ اور متوسط طبقوں میں ہے۔ زیادہ تر اچھی تنخواہیں پانے والے کارکن تعلیم یافتہ، اور امراء تجار اور کارخانہ دار اس تحریک پر کاربند ہیں، رہے ادنیٰ درجے کے مزدور وغیرہ تو ان میں اس تحریک کا رواج بدرجۂ صفر ہے۔ نہ ان میں زیادہ شاندار معاشرت کی ہوس ہے اور نہ اونچے حوصلے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے یہاں ابھی تک وہی قدیم تقسیم کار ہے کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے۔ اسی وجہ سے وہ معاشی تنگی اور وسائل زندگی کی گرانی کے باوجود برتھ کنٹرول کو ضروری نہیں سمجھتے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں شرح پیدائش بہت زیادہ ہے اور اس کے برعکس اعلیٰ اور اوسط طبقوں میں شرح ولادت بہت کم ہے۔

مختلف شہروں کے مختلف طبقوں میں فی ہزار شرح پیدائش حسب ذیل ہے:[1]

---

(۱)......اصول معاشیات ڈاکٹر ٹاسگ بحوالہ کتب مختلفہ ص: ۳۳۸، ۳۳۹، ج: ۲۔

طبقے	پیرس	برلن	ویانا	لندن	ہیمبرگ
بہت مفلس طبقے	۱۰۸	۱۵۷	۲۰۰	۱۴۷	۱۵۱
مفلس طبقے	۹۵	۱۲۹	۱۶۴	۱۴۰	×
آرام کی زندگی بسر کرنے والے	۷۲	۱۱۴	۱۵۵	۱۰۷	×
متمول طبقے	۵۳	۶۳	۱۰۷	۸۷	×
بہت متمول طبقے	۳۴	۴۷	۷۱	۶۳	۵۹

یہ اعداد وشمار بھی ذرا پرانے ہیں انگلستان کے نسبتہً بعد میں آنے والے اعداد و شمار کے مطابق صورت حال مزید خراب ہے کیونکہ مفلس طبقوں میں شرح پیدائش ۴۰ فی ہزار ہے جب کہ اعلیٰ اور اوسط طبقوں میں صرف ۱۶ فی ہزار ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جسمانی محنت کرنے والے طبقے بڑھ رہے ہیں اور ان لوگوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جارہی ہے جو ذہنی اور عقلی اعتبار سے بلند درجہ رکھتے ہیں اور جن میں قیادت وکارکردگی کی صلاحیت ہے یہ چیز قحط الرجال پر منتج ہوگی جس کے بعد کوئی قوم سربلند نہیں رہ سکتی اور اسی چیز کی پیشگوئی ڈاکٹر ایف۔ڈبلیو ٹاسگ نے کی تھی:

> اسی بناء پر خوش حال طبقے میں اس رجحان کی موجودگی سے یہ خطرہ ہے کہ آبادی کی خوبیاں انحطاط پذیر ہوجائیں گی، وہبی قابلیت کے لوگ کم پیدا ہوتے ہیں اور جو کچھ پیدا ہوتے ہیں ان پر اپنی وہبی استعداد سے پوری طرح کام لینے کے لئے عملی مقابلے کا بطور مہیج بہت کم اثر پڑتا ہے اس کے برخلاف آبادی کے ادنیٰ ترین طبقوں میں شرح ولادت بہت اعلیٰ ہوتی ہے گو ان کی جماعت سے بھی اعلیٰ قابلیت کے چند افراد پیدا ہوتے ہیں لیکن عام جماعت معمولی قابلیت کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔

یہ نتیجہ ہمارے ملک میں زیادہ ظاہر ہوگا، اگر خدانخواستہ ہم نے ضبطِ تولید کو یہاں رواج دیا کیونکہ ہماری آبادی کی اکثریت میں برتھ کنٹرول کی کوئی خواہش نہیں پائی جاتی ہے جس کا اندازہ اس لطیفے سے کیجئے کہ حال ہی میں ''ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ لندن'' میں ایک واقعہ بطور کارٹون شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت انڈیا نے ضبطِ ولادت کی طرف ترغیب دلانے کے لئے کچھ اشتہار شائع کئے تھے جس میں ایک طرف تو اس خاندان کی تصویر تھی جس میں صرف ایک میاں بیوی اور ایک دو بچے ہیں اور یہ خاندان خوشحال ہے دوسری طرف اس کے برعکس اس خاندان کا عکس دکھایا گیا تھا جو اولاد کی زیادتی کی وجہ سے پریشان ہے جب یہ اشتہار ملک کے عوام اور دیہات میں پہنچا تو لوگوں نے اس خاندان کو زیادہ پسند کیا جس میں بچے زیادہ ہیں۔

یہ لطیفہ بھی اگرچہ حقیقت کی عکاسی کر رہا ہے لیکن سنجیدگی سے غور کرنے پر بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

برتھ کنٹرول کا رواج تعلیم یافتہ شہری لوگوں میں ہوسکتا ہے، غیر تعلیم یافتہ اور دیہاتی افراد میں اس رجحان کا پیدا کرنا کسی کے بس میں نہیں جو قومیں دنیا کی مہذب ترین قومیں کہلاتی ہیں وہ بھی ان لوگوں میں یہ ''مہذب طریقہ'' رائج نہ کر سکیں۔

اور پاکستان میں اکثریت انہی لوگوں کی ہے آبادی کا ۸۴٫۷ فیصد حصہ غیر تعلیم یافتہ اور ۸۹٫۶ فیصد حصہ دیہاتی ہے اس پر اگر یہاں ضبطِ ولادت کو رواج دیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم یافتہ اور متمدن ذہن رکھنے والی نسلیں اٹھنا بند ہو جائیں گی آبادی کی اکثریت ان لوگوں کی ہوگی جن میں کارکردگی اور جہان بانی کی صلاحیتیں مفقود ہوں گی کیا یہ ایک عظیم نقصان نہیں؟

۲: طلاق کی کثرت

آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ ضبطِ ولادت ازدواجی رشتوں کو کمزور کرڈالتا ہے اولاد ہی میاں بیوی کا تعلق برقرار رکھنے میں ایک مضبوط کڑی ہوتی ہے اس کے نہ رہنے کی صورت میں زوجین کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہوجانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، یہی وجہ ہے کہ یورپ میں طلاق کا رواج بکثرت پھیل رہا ہے اور طلاق حاصل کرنے والوں کی اکثریت ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہے جو بے اولاد ہیں۔

۳: شرح پیدائش کی کمی

سب سے زیادہ اہم نتیجہ یہ ہے کہ جتنی قومیں ضبطِ ولادت پر کاربند رہیں ان کی شرح ولادت خوفناک حد تک گھٹ گئی، یہ تحریک ۱۸۷۶ء میں برگ وبار لائی اور اس کے بعد سے ان کی شرح پیدائش حیرت انگیز حد تک گھٹتی چلی گئی مثال کے طور پر انگلستان کو لیجئے وہاں ۱۸۷۶ء میں شرح پیدائش ۳ء۳۶ فی ہزار تھی اور ۱۹۲۶ء میں ۸ء۱۷ رہ گئی اس سے زیادہ واضح طور پر ضبطِ ولادت کا نتیجہ معلوم کرنے کے لئے شرح مناکحت اور شرح پیدائش کا موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انگلستان میں ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۱ء تک شرح مناکحت میں ۶ء۳ فیصد کمی واقع ہوئی ہے لیکن شرح پیدائش ۵ء۲۱ فیصد کم ہوگئی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۳ء تک شرح نکاح بدستور قائم رہی مگر شرح پیدائش میں ۵ء۱۶ فیصد کمی واقع ہوئی، ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۶ء کے درمیان مختلف ممالک میں شرح مناکحت اور شرح پیدائش کا جو تناسب پایا گیا ہے اس کا حال ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا:

ممالک	شرح نکاح	شرح ولادت
فرانس	۶ء۷ فیصد اضافہ	۲۸ء۲ فیصد کمی
جرمنی	۴ء۹ فیصد کمی	۴۹ء۴ // //
اٹلی	۹ء۸ // //	۲۹ء۱ // //
ہالینڈ	۱۰ء۳ // //	۳۵ء۲ // //
سوئڈن	۱۱ء۳ // //	۴۵ء۱ // //
ڈنمارک	۱۲ء۳ // //	۳۵ء۲ // //
انگلینڈ اور ویلز	۱۳ء۳ // //	۵۱ء۰ // //
ناروے	۲۶ء۳ // //	۳۸ء۰ // //

شرح پیدائش کی روز بروز کمی کے باوجود ان ملکوں میں آبادی کا جو اضافہ ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فن طب کی ترقی اور حفظان صحت کی تدابیر نے شرح اموات کو بھی بڑی حد تک کم کر دیا ہے ان ممالک کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ دیکھ کر مالتھس نے ۱۹۵۸ء میں اپنی تھیوری پیش کی تھی اور یہی وہ سال ہے جس میں چیچک اور دوسرے امراض کے لئے ٹیکہ ایجاد ہوا بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جو ایک عظیم طوفان آیا تھا اس میں ۵۰ فیصد افراد کے بچے رہنے کا ظاہری سبب محض یہ تھا کہ انہیں بروقت طبی امداد پہنچا دی (۱) گئی لیکن بہر حال برتھ کنٹرول کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرح پیدائش اور شرح اموات میں بہت کم تفاوت رہ گیا اور اگر ضبطِ تولید کے ساتھ ساتھ حفظان صحت کو یہ ترقی نہ ہوتی تو خطرہ تھا کہ شرح اموات شرح ولادت سے زیادہ نہ ہو جائے۔

(۱) ٹائم ویکلی ۱۱ جنوری ۱۹۶۰ء

خصوصیت کے ساتھ فرانس کی حالت تو بے حد نازک تھی ۱۸۷۶ء میں اس کی شرح پیدائش ۲۶ء۲ تھی اس کے بعد ۱۹۴۱ء تک متواتر بڑی خوف ناک حد تک گھٹتی چلی گئی یہاں تک کہ ۱۹۴۱ء میں شرح پیدائش ۵ء۱۶ اور شرح اموات ۷ء۱۵ تھی اس صورت حال کو دیکھ کر بعد از خرابیٔ بسیار فرانسیسی قوم کی آنکھ کھلی وہاں کے تمام دانشور چیخ اٹھے کہ ع:

بس بس ساقی　　اور نہ بھرنا
لگ گئے لگ گئے ہوش ٹھکانے

ایک تحریک ''تحریک قومی برائے اضافۂ آبادی'' کے نام سے شروع کی گئی حکومت نے ضبطِ تولید کی تعلیم اور نشر و اشاعت کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا آبادی بڑھانے کے لئے تقریباً ایک درجن قوانین نافذ کئے گئے جن کی رو سے زیادہ بچے پیدا کرنے والے خاندان کو مالی امداد دی، ٹیکس میں کمی کی گئی، تنخواہیں، مزدوریاں، اور پینشنیں زیادہ دی گئیں غرض قانونی اور اخلاقی طور پر برتھ کنٹرول کے خلاف ترغیب و ترہیب کے ہر ممکن پہلو کو اختیار کر کے بڑی مشکل سے حکومت نے شرح پیدائش کی کمی پر قابو پایا اور اب وہاں خاندانی منصوبہ بندی نے ضبطِ ولادت کے بجائے یہ رخ اختیار کرلیا کہ ایک خاندان کو حکومت نہ صرف بچے کی خوراک، رہائش اور پرورش کے لئے امداد دیتی ہے بلکہ وہ اس کی پیدائش کے بھی بہت پہلے سے اس کے بارے میں فکر شروع کر دیتی ہے اور بعض اوقات تو یہ فکر بچے کے پیدا نہ ہونے کی صورت میں بھی کیا جاتا ہے جب کوئی جوڑا شادی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے شادی سے پہلے طبی معائنہ کروانا پڑتا ہے اور ڈاکٹر فیصلہ کرتا ہے کہ آیا وہ باہم ملکر صحت مند بچے پیدا کرنے کے قابل ہیں یا نہیں پھر جب شادی کے بعد انھیں بچے کی نعمت کے حصول کی امید ہو جاتی ہے تو حاملہ ماں ڈاکٹروں کے حوالے ہو جاتی ہے جو

اس کے بچے کی پیدائش بلکہ اس کے بعد تک اس کی ہر حالت کے ذمہ دار ہوتے ہیں بچے کے پیدا ہونے کے بعد سولہ سال تک ہر بچے کو لازماً اسکول میں داخل کر کے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔

۱۹۴۶ء سے ہر سال شادی شدہ یا غیر شادی شدہ شخص جو بچوں کا کفیل و ذمہ دار ہو، اسے الاؤنسوں کا فائدہ دیا جاتا ہے متعلقہ بچوں کا ماں باپ ہونا بھی لازمی نہیں اصل چیز یہ ہے کہ وہ اپنے زیر پرورش بچے کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں، ۷ ہزار انسپکٹر اور ڈاکٹر اور ۶ ہزار سماجی کارکن قانونی والدین کی مانند ان لوگوں کے بارہ میں بھی جانچ پڑتال کرتے رہتے ہیں بچوں کی تعداد کے مطابق رہائش کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں ٹیکسوں میں رعایت دی جاتی ہے اور کئی قسم کی دوسری سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں (۱)۔

خصوصاً ٹرانسپورٹ میں بس اور ٹرین کے کرائے اور اولیت کارڈ (prisrhy card) انھیں مل جاتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ لائنوں میں کھڑے کھڑے پاگل ہو جاتے ہیں۔

ان تمام قوانین کے نافذ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شرح پیدائش میں اضافہ شروع ہوا، ۱۹۴۷ء کے عالمی اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرانس کی شرح ولادت ۲۱ء۰ فی ہزار اور شرح اموات ۱۲ء۲ فی ہزار ہے۔

کم وبیش یہی کیفیت جرمنی اور اٹلی میں پیش آئی ۱۸۷۶ء میں جرمنی کی شرح پیدائش ۴۰ء۹ فی ہزار اور اٹلی کی ۳۹ء۲ فی ہزار تھی پھر تقریباً ۱۹۴۱ء تک مسلسل گھٹتی چلی گئی یہاں تک کہ ۱۹۴۱ء میں جرمنی کی شرح پیدائش صرف ۱۵ء۹ فیصد رہ گئی۔

---

(۱) ہفت روزہ شہاب لاہور، ۴ دسمبر ۱۹۶۰ء

لیکن چونکہ نازی جماعت کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس خطرے کو محسوس کیا گیا کہ اگر ہماری شرح ولادت گھٹتی رہی تو اندیشہ ہے کہ ایک وقت ہماری قوم بالکل بانجھ ہوکر رہ جائے گی اور موجودہ نسل کے کاموں کو سنبھالنے کے لئے نئی نسلیں اٹھنا بند ہو جائیں گی اس لئے حکومت نے ضبطِ ولادت کی تعلیم وترویج کو قانوناً روک دیا عورتوں کو کارخانوں اور دفتروں سے نکال دیا نوجوانوں کو نکاح کی طرف رغبت دلانے کے لئے قرضۂ شادی کے نام سے رقمیں دی گئیں ۱۹۳۴ء میں ایک کروڑ پونڈ کی رقم صرف شادی کے قرضوں پر صرف ہوئی جس کے ذریعہ ٦ لاکھ مردوں اور عورتوں نے فائدہ اٹھایا ۱۹۳۵ء کے قانون کی رو سے طے کیا گیا کہ ایک بچہ پیدا ہونے پر انکم ٹیکس میں ۱۵ فیصد ۲ بچوں پر ۳۵ فیصد، ۳ بچوں پر ۵۵ فیصد ۴ بچوں پر ۷۵ فیصد ۵ بچوں پر ۹۵ فیصد کی کمی کی جائے اور ٦ بچے ہونے پر پورا انکم ٹیکس معاف کر دیا جائے۔

اٹلی میں بھی یہ تمام تدابیر اختیار کر کے شرح پیدائش کی کمی کے اس عظیم نقصان کا تدارک کیا گیا۔

چنانچہ ۱۹۴۸ء کے اعداد وشمار سے عیاں ہے کہ اس کی شرح ولادت گھٹنے کی بجائے بڑھنا شروع ہو گئی۔

مذکورہ سال تک اس کی شرح ولادت ۵ء۱٦ فی ہزار تھی۔ (۱)

۴۔ جنسی بدچلنی اور امراض کی کثرت

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ضبطِ ولادت کا طریقہ طبی لحاظ سے بھی

(۱)......اس سلسلے میں ۱۸۷٦ء سے ۱۹۲٦ء تک اعداد وشمار مودودی صاحب کی کتاب اسلام اور ضبط ولادت سے ماخوذ ہیں اور بعد کے انگریزی کتاب پاک اکنامکس ص: ۲۴۸ سے، انہوں نے بین الاقوامی اعداد وشمار سے نقل کر کے بیان کئے ہیں۔

صحت کیلئے سخت مضر ہے اور جنسی بے راہ روی بھی اس فعل کا لازمی نتیجہ ہے اس لئے یہ دونوں چیزیں ان ممالک میں بکثرت پائی گئیں ڈاکٹر میری شار لیپ اپنے چہل سالہ تجربات کے نتائج ان الفاظ میں بیان کرتی ہے:

> ضبطِ ولادت کے طریقے خواہ وہ فرزجے ہوں یا جراثیم کش دوائیں، یا ربڑ کی ٹوپیاں یا دوسرے طریقے، بہر حال ان کے استعمال سے کوئی فوری نمایاں نقصان تو نہیں ہوتا لیکن ایک عرصہ تک ان کے استعمال کرتے رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھیڑ عمر تک پہونچتے پہونچتے عورت میں عصبی ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے پژمردگی، شگفتگی کا فقدان، افسردہ دلی، طبیعت کا چڑ چڑا پن اور اشتعال پذیری، غمگین خیالات کا ہجوم، بے خوابی، پریشان خیالی، دل ودماغ کی کمزوری، دوران خون کی کمی، ہاتھ پاؤں کا سن ہو جانا، جسم میں کہیں کہیں ٹیسیں اٹھنا، ایام ماہواری کی بے قاعدگی، یہ ان طریقوں کے لازمی اثرات ہیں۔ (۱)

علاوہ بریں چونکہ ضبطِ ولادت کے رواج عام نے ناجائز اولاد کی پیدائش کے خوف کو باقی نہیں رکھا اور حیاء وشرم کا خاتمہ بہت پہلے ہو چکا ہے اس لئے جنسی جرائم کی کثرت ایک لازمی نتیجہ ہونے کی حیثیت سے سامنے آئی۔

چنانچہ انڈیانا یونیورسٹی کے ماہر جنسیات پروفیسر الفریڈ سی کنزے کا بیان ہے کہ:

> امریکہ میں سو سے ۹۵ مرد اور ۸۵ فیصد عورتیں جنسی جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ (۲)

---

(۱)...... اسلام اور ضبط ولادت ص: ۵۳۔

(۲)...... روزنامہ جنگ مجریہ ۹ راگست ۱۹۵۳ء

اور کون نہیں جانتا کہ جنسی جرائم کی اس قدر کثرت صحت اور اخلاق کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

غرض آج سے بہت پہلے انگلینڈ، فرانس، جرمنی، اٹلی اور سویڈن جیسی قومیں فطرت سے غداری کا عبرت ناک انجام دیکھ چکی ہیں پھر بھی اگر ہم یونہی سوچتے رہیں کہ چونکہ ان ''عظیم اقوام'' نے اس پر عمل کیا ہے اس لئے ہم بھی کریں گے تو ہماری مثال اس بے وقوف سے مختلف نہ ہوگی جو کسی پہلوان کو کنویں میں ڈوبتا دیکھ کر بھی یہ سمجھے کہ اس نے ورزش کی ہوگی خود بھی ڈوب مرے۔

۴......حامیانِ ضبط ولادت کے دلائل

اب ذرا ایک نظر ان دلائل پر بھی ڈال لیجئے جو حامیانِ ضبطِ ولادت اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔

شرعی دلائل

ا:...... جو حضرات ضبطِ ولادت کے حامی ہیں ان سے جب اس مسئلہ پر مذہبی زاویۂ نگاہ سے گفتگو کی جاتی ہے تو وہ اپنی دلیل میں وہ حدیثیں سنا دیتے ہیں جن سے عزل (Coitus Interroptus) کا جواز معلوم ہوتا ہے مثلاً حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذیل:

كُنَّا نَعْزِلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَلَغَ ذَالِكَ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمُ فَلَمْ يَنْهَنَا عَنْهُ۔[1]

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عزل کیا کرتے تھے تو اس کی اطلاع آپ کو ہوئی، مگر آپ نے ہمیں اس سے منع نہیں فرمایا۔

لیکن کتنی افسوسناک بات ہے کہ یہ حضرات ان حدیثوں کو قطعی نظر انداز کر جاتے ہیں جن سے عزل کا ناجائز ہونا عیاں ہو جاتا ہے۔

شرعی حیثیت کے باب میں آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہر قسم کی احادیث کو پیش نظر

(۱) صحیح مسلم ص:۴۶۵

رکھ کر کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟ یہ ایک زبردست اصولی غلطی ہے کہ محض ایک دو حدیثوں کو دیکھ کر کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرلی۔ ساحل سمندر پر کھڑے ہو کر پانی کی گہرائی کا اندازہ کرنا حماقت ہے اس کی گہرائی اور وسعتوں کا حال ان سرفروشوں سے پوچھئے جو اپنی جان پر کھیل کر فلک آسا موجوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور گوہر مراد حاصل کر کے ہی چھوڑتے ہیں وہ علماء جنہوں نے حصول علم میں اپنی زندگیاں صرف کی ہیں انھوں نے ان احادیث سے چھان بین کر کے جو نتیجہ نکالا ہے وہ آپ کو شروع ہی میں معلوم ہو چکا ہے آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کا نکالا ہوا نتیجہ اس باب میں زیادہ معتبر ہوگا یا ان کا جنھوں نے ایک دو حدیثوں پر سطحی انداز میں نظریں دوڑائیں اور فتویٰ صادر کر دیا؟

اس اصولی جواب کے بعد اطمینان خاطر کیلئے خاص اس مسئلہ کا جزئی جواب بھی سمجھ لیجئے،

جس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزل کی اجازت دی اس میں اہل عرب مختلف اغراض کے ماتحت انفرادی طور پر عزل کیا کرتے تھے۔

۱:...... ایک یہ کہ باندی سے اولاد نہ ہو، تا کہ گھر کے کام کاج میں حرج نہ پیش آئے۔

۲:...... دوسرے یہ کہ باندی ام ولد نہ بن جائے تو پھر اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا پڑے گا، کیونکہ ام ولد کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

۳:...... زمانۂ رضاعت میں حمل نہ ٹھہر جائے کیونکہ اس سے اہل عرب کو شیر خوار بچے کی صحت پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔

پھر چونکہ عزل ناپسندیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ جائز بھی تھا بشرطیکہ اس سے

کوئی غیر شرعی یا ناجائز چیز مقصود نہ ہو اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا ہاں اگر صحابہ کرام کا اس فعل سے مقصد کوئی اپنی چیز ہوتی جو شریعت کی نگاہ میں غلط ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور منع فرماتے۔

اس بات پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں اپنی بیوی سے عزل کرتا ہوں، آپ ﷺ نے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ اس نے عرض کیا کہ میرا ایک بچہ ہے جس کو وہ دودھ پلاتی ہے مجھے خطرہ ہے کہ حاملہ ہوگئی تو اس کا دودھ بچے کو مضر ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہل فارس اور اہل روم ایسا کرتے ہیں مگر ان کے بچوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ (۱)

اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کے بارہ میں سوال کیا گیا تو آپ نے فوراً جائز یا ناجائز ہونے کا فتویٰ نہیں دیا بلکہ سائل سے دریافت فرمایا کہ اس سے تمہارا منشاء کیا ہے؟...... پھر چونکہ اس کا مقصد کوئی ناجائز کام نہ تھا البتہ اسے دوسرے لوگوں کے تجربے سے فضول ضرور کہا جا سکتا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فضول ہونا واضح فرمایا۔.......... اور اشارۃً کراہت کا اظہار فرمایا۔

اب آپ کی عقل خود بخود اس نتیجے کو پا سکتی ہے کہ اگر عزل کرنے والے

---

(۱)...... حیرت ہے کہ بعض حضرات نے اسی حدیث کے اس طریق سے ضبط تولید کے جواز پر اس استدلال کیا ہے جو مسند احمد میں ہے: ''أخاف علی ولدها'' کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ کہیں اسے مفلسی لاحق نہ ہو جائے، حالانکہ جو شخص حدیث سے کچھ بھی مس رکھتا ہو، ایسی فاش غلطی نہیں کر سکتا، اس لئے کہ حضور ﷺ کے جواب ''لو کان ضاراً لضر فارس والروم'' نے یہ مطلب متعین کر دیا ہے کہ خوف علی الولد سے مراد یہ ہے کہ زمانہ رضاعت میں حمل ٹھہر جانے سے شیر خوار بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، ورنہ اس جواب کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔

کا مقصد کوئی ناجائز اور نصوص شرعیہ کے خلاف ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور روکتے۔

اس توضیح سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ جن حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کی اجازت منقول ہے ان سے موجودہ تحریک ضبطِ ولادت پر عمل کرنے کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اول تو اس لئے کہ ان کا مقصد صحیح تھا۔ دوسرے اس لئے کہ اس زمانہ میں انفرادی حیثیت سے یہ کام کیا جاتا تھا کسی اجتماعی تحریک کی شکل نہ تھی۔ رہا یہ کہ ضبطِ ولادت کا موجودہ مقصد اسلامی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں؟ سو اس کا جواب مندرجہ ذیل قرآنی آیات سے واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے:

۱:......لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ (الاسراء ۱۷: ۱۳) .الخ

اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی رزق دیں گے اور انھیں بھی۔

۲:......وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّھَا وَمُسْتَوْدَعَھَا. (ھود. ۱۱: ۶)

زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو، وہ اس کے عارضی اور مستقل ٹھکانوں کو جانتا ہے۔

۳:......وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ.

(الحجر ۱۵: ۲۱)

کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور ہم اسے ایک مخصوص اندازہ ہی سے اتارتے ہیں۔

ان آیتوں سے غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ رزق کا تمام انتظام وانصرام قادر مطلق نے اپنے ذمہ کیا ہوا ہے وہی ہے جو نہ صرف انسانوں بلکہ کائنات کی ہر جاندار شئ کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر آبادی اور پیداوار کو گھٹا تا بڑھا تا ہے۔

غور کیا جائے تو یہ رب کائنات کا ایک عظیم احسان ہے ورنہ اگر یہ کام بھی انسانوں ہی کے سر ڈالا جاتا تو ایک افراتفری مچ جاتی بے چارے انسان کا محدود علم تمام کائنات کے ذرے ذرے پر کیسے محیط ہو سکتا تھا کہ وہ ہر شے کے وسائلِ رزق مہیا کرنے کا انتظام کرتا، گزشتہ صفحات سے یہ واقعہ بے نقاب ہو چکا ہے کہ وہ بیچارہ تو کھانے پینے والوں میں ذرا سی زیادتی دیکھ کر بوکھلا جاتا ہے اس کے ہوش وحواس پیداوار کی ان امکانی وسعتوں کا ادراک نہیں کر پاتے جو اس علیم وخبیر خالق نے زمین کے سینے میں ودیعت کی ہیں۔

بہر کیف! جب قادر مطلق نے ہر جاندار چیز کا رزق مجموعی طور پر اپنے ذمہ کیا ہوا ہے تو اس نحیف وناتواں انسان کے پاس ایسا کیا سامان ہے جس کے بل پر وہ خدائی تدابیر میں دخل دینے نکلا ہے اور اس عظیم الشان کام کو اپنے ذمے لے رہا ہے جسے انجام دینے کی سکت خدا کے سوا کسی میں نہیں؟

ایک غلط فہمی کا ازالہ

جب حامیانِ ضبطِ ولادت کے سامنے لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ ......الخ والی آیت پڑھی جاتی ہے تو وہ قتل اولاد اور ضبطِ ولادت میں فرق سمجھانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں قتل اولاد کرنے سے منع کیا گیا ہے ضبطِ تولید سے نہیں اور ایک معمولی سی گٹھلی ضائع کرنے والے پر پورے درخت کا تاوان عائد نہیں کیا جا سکتا۔

حالانکہ یہ بڑی غلط فہمی ہے قرآن نے صرف ''لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ'' پر بات ختم نہیں کی آگے کی عبارت کا اضافہ فرما کر ایک مستقل کلیہ کی طرف رہنمائی کی ہے اس سے قطع نظر کرنا ''لَاتَقْرَبُوْا الصَّلٰوۃَ'' کے لطیفے سے کم نہیں۔ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ

مفلسی کے خوف سے

پھر آگے اس کی علت بھی ارشاد فرمائی:

نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ

ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔

اس کلام میں ذرا سا غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ تحدید نسل سے متعلق ہر وہ کام جو مفلسی کے خوف سے کیا جائے ناجائز ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لئے اس پہلو سے غور کیجئے کہ اولاد کو قتل کرنا تو بہر صورت ناجائز ہے خواہ مفلسی کے خوف سے ہو یا کسی اور نیت سے، آگے ''خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ'' اور'' نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ'' کا اضافہ کرنے سے یہ مقصد تو نہیں ہوسکتا کہ مفلسی کے خوف سے اولاد کا قتل کرنا ناجائز ہے اور کسی اور مقصد سے جائز، پھر اس کا کیا مقصد ہے؟

دراصل اس جملے کو بڑھا کر معجزانہ انداز میں اس تخیل باطل کی بیخ کنی کر دی گئی ہے جس کے تحت انسان رزق کی فراہمی کو صرف اپنے بھروسے سمجھتا ہے اور قدرت کی خدائی میں دخل انداز ہوتا ہے۔

خدائے تعالیٰ نے اس واضح پیرایہ میں فرما دیا کہ یہ خیال ہی سرے سے غلط

ہے کہ آبادی کی زیادتی مفلسی پیدا کرتی ہے لہٰذا تحدید نسل خواہ قتل اولاد کے ذریعہ ہو یا جراثیم کشی کے ذریعہ، اگر مفلسی کے خوف سے ہے تو بہر صورت ناجائز ہے۔

۲:......ان دلائل کے علاوہ حامیان ضبط ولادت ایک اور عجیب انداز سے استدلال کرتے ہیں فرماتے ہیں: کہ (۱)

> آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر دعا فرمایا کرتے تھے کہ میں فلاں فلاں چیز سے اور جهد البلاء سے پناہ مانگتا ہوں، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ جهد البلاء کیا چیز ہے؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ''قِلَّةِ اِلْمَالِ وَكَثْرَةِ الْعِيَالِ''

اس میں سب سے پہلے تو ہمیں اس بات پر حیرت اور افسوس ہے کہ جهد البلاء کی تفسیر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کر کے بیان کی گئی ہے حالانکہ ذخیرۂ احادیث میں بلیغ جستجو کے باوجود کہیں آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لفظ کی تشریح نہیں ملتی، بلکہ حضرات محدثینؒ **قلة المال و كثرة العيال** کی تفسیر کو اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ جسے عام طور پر ضعیف کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جهد البلاء وہ حالت ہے کہ جس پر موت کو ترجیح دی جاتی ہے اور بعض لوگوں کو خیال ہے کہ وہ مال کی قلت اور عیال کی کثرت ہے۔ (۲)

اگر یہ تفسیر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی تو یہی متعین تھی، اس کی تشریح میں علماء کے اختلاف کے تو کوئی معنی ہی نہیں، اگر اختلاف ہوتا بھی تو اس قول کو

(۱)...... یہ استدلال جناب خالد محمد خان نے اپنے عربی رسالہ میں ''من هنا نبدأ'' میں ذکر کیا ہے انہیں کی اتباع میں بعض پاکستانی حضرات بھی اسی کو لئے بیٹھے ہیں۔

(۲)...... حاشیہ بخاری کتاب الدعوات ص: ۹۳۹، ج: ۲۔

تضعیف کے الفاظ میں ہرگز ذکر نہ کیا جاتا۔ امام نوویؒ اس کی شرح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

رہا جهد البلاء سو حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کی تفسیر مال کی کمی اور عیال کی کثرت سے کی ہے اور ان کے سوا (سب) نے کہا ہے کہ یہ وہ حالت ہے جو شاق گزرے۔ (۱)

اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے یہ تفسیر مروی ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہوتی تو ابن عمرؓ کے بجائے آپ ﷺ کا حوالہ دیا جاتا۔

دوسرے اگر اس تفسیر کو صحیح مان لیا جائے (کیونکہ ابن عمرؓ سے مروی ہے) تو مال کی کمی اور کثرت عیال سے پناہ مانگنا اس بات کو مستلزم نہیں کہ اس خوف سے ضبط تولید جائز ہو............ اس کو مثال کے ذریعہ یوں سمجھ لیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع پر بڑھاپے سے پناہ مانگی ہے لیکن ساتھ ہی دوسری حدیث میں بڑھاپے کے فضائل بیان فرمائے ہیں دونوں میں بظاہر تعارض سا معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت بات یہ ہے کہ بڑھاپہ واقعی ایک پناہ مانگنے کے لائق مصیبت ہے البتہ اگر یہ مصیبت آپڑے تو جس شخص پر پڑی ہے اسے اللہ تعالیٰ وہی اجر عطا فرماتے ہیں جو دوسری مصیبتوں سے ملتے ہیں، تکلیف پہونچنے سے کون پناہ نہیں مانگتا؟ لیکن پہنچ جائے تو وہی باعث ثواب بھی ہے............ اس سے بھی زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ بخار فی نفسہ ایک بری چیز ہے اس سے پناہ مانگنا چاہئے لیکن جب کسی کو بخار آجائے تو شرعاً بھی اور عقلاً بھی اس پر واویلا کرنا درست نہیں بلکہ صبر سے کام لیا جائے تو یہ دنیوی مصیبت ایک دینی نعمت سے تبدیل ہوجاتی ہے۔............ ایکسیڈنٹ سے

---

(۱)...... منہاج شرح مسلم ؒ ص:۳۴۷، ج:۲۔

زخمی ہونا ایک مصیبت ہے لیکن اس کے خوف سے گھر سے نکلنا ہی بند کر دینا حماقت سے زیادہ نہیں، یہی حال بعینہ اس موقع پر ہے کہ دراصل مال کی کمی اور عیال کی کثرت ایک آزمائش کا موقع ہے جس سے پناہ مانگنی چاہئے لیکن اگر کبھی ایسا ہو جائے تو اس کو ہنسی خوشی برداشت کرنا چاہئے۔ضبطِ ولادت کر کے بے صبری کا مظاہرہ صحیح کام نہیں، چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری احادیث میں فقر کے فضائل بھی بیان فرمائے ہیں۔

۳:......بعض حضرات نے ایک اور دلیل بہت زور وشور سے پیش کی ہے کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ دودھ پلانے والی حاصل کرنے پر قدرت نہ ہو تو اس کے خوف سے عزل کرنا جائز ہے۔

اس دلیل سے بھی موجودہ تحریک ضبطِ تولید پر استدلال نہیں کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ اس جزیئے کا حاصل یہ ہے کہ ظہور حمل سے قبل اگر عورت کا دودھ منقطع ہو گیا اور ہونے والے بچے کا باپ فی الحال دودھ پلانے والی کے حصول پر قادر نہیں تو بچے کی ہلاکت کے تمام اسباب موجود ہیں یہ انفرادی حیثیت سے ایک معقول عذر ہے ،ایسے حالات میں عزل جائز ہے۔

بخلاف زیر بحث صورت کے کہ اس میں اسباب ہلاکت موجود نہیں موہوم ہیں یہ سب خیالات واوہام ہیں کہ آبادی زیادہ بڑھ گئی تو سب مفلس ہو جائیں گے، معاشی تنگی پیدا ہو جائے گی پھر یہاں تو پوری دنیا سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے برتھ کنٹرول نہ کیا تو بچے بھی مفلس ہو جائیں گے اور تم بھی اسی خیال کا خاتمہ قرآن نے ’’نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ‘‘ فرما کر کیا ہے۔

عقلی دلائل اوران کے جوابات

حامیانِ ضبط ولادت کا سب سے بڑا عقلی استدلال تو وہی ہے کہ آبادی بہت زائد ہوچکی ہے اور اگر تولید پر کوئی ضابطہ قانون مقرر نہ کیا گیا تو معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے۔

اس دلیل پر گزشتہ صفحات میں ہر پہلو سے مکمل بحث کی جاچکی ہے قارئین پر واضح ہو چکا ہوگا کہ یہ دلیل کس قدر سطحی اور خلاف واقعہ ہے اس لئے اس دلیل پر مزید بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۲:......اس کے علاوہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آبادی زیادہ ہوجاتی ہے تو قدرت خود توازن پیدا کرلیتی ہے لیکن یہ توازن پیدا کرنا موت کے ذریعہ ہوتا ہے اور وہ ایک تکلیف دہ ذریعہ ہے قدرت کو یہ توازن پیدا کرنے کیوں دیا جائے؟ انسانوں کو پیدا کر کے جنگ یا وبا سے ختم کرانا بہتر نہیں بہتر یہ ہے کہ جراثیم حیات کو پہلے ہی ختم کردیا جائے۔

یہ دلیل اس وقت تو صحیح ہوسکتی تھی جب کہ برتھ کنٹرول کے طریقے ضبط ولادت کے ساتھ ساتھ ''ضبط موت کا فائدہ'' بھی دیتے ہوں، اور جب پیدائش تو گھٹتی چلی جائے لیکن موت کا اٹل قانون بدستور رہے تو کیا اس وقت بھی یہ دلیل کارآمد ہوسکتی ہے؟............اس وقت تو آبادی کی مثال اس خزانے سے مختلف نہیں ہوگی جس کی آمدنی گھٹتی چلی جائے اور خرچ بدستور رہے آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایسا خزانہ کب تک بھرپور رہ سکتا ہے؟ پھر اس دلیل کی بنیاد اس بات پر ہے کہ قدرت نے توازن پیدا کرنے کا جو ذریعہ اختیار کیا ہے وہ معاذ اللہ مضر ہے اور انسانی ذہن سے نکلا ہوا طریقہ مفید، کیا یہ بنیاد کھوکھلی نہیں؟

اولاً تو آپ کے پاس اس بات کی کیا دلیل ہے کہ جس وقت آبادی بڑھے گی اس وقت قدرت اس میں توازن پیدا کرنے کے لئے موت ہی کو کام میں لائے گی، کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ از خود کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرے جو مضر نہ ہو؟ اگر نہیں تو وہ قدرت کہاں رہی؟ اور اگر قادر ہے تو ہمیں اپنی حدود اختیار سے تجاوز کی کیا ضرورت ہے؟ قدرت نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے خود ہی اسے اچھے انداز میں انجام دے گی، ثانیاً اگر یہ کام آپ اپنے ذمہ لیں تو آپ کے پاس آبادی کی حد مناسب مقرر کرنے کا کوئی معیار ہے؟ اگر بالفرض ہے تو کیا آپ اس کے مطابق بچے پیدا کرنے پر قادر ہیں؟ قیاس کی ضرورت نہیں، تجربہ بتلاتا ہے کہ جو قومیں مہذب کہلاتی ہیں اور سائنٹفک ترقیات میں بھی آپ سے بہت آگے ہیں وہ بھی ایسی کوئی حد مناسب نہیں مقرر کرسکیں، جب برتھ کنٹرول کے نتیجے میں لوگوں کے اندر خود غرضانہ ذہنیت پیدا ہوجاتی ہے تو آبادی کی کمی کو ایک حد پر روکے رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۱۶۵۶ء میں سرخ چین نے بہت زور شور کے ساتھ برتھ کنٹرول کی مہم شروع کی لیکن جب ۱۹۵۸ء تک اس کے نقصانات سے دوچار ہوئے تو حکومت اور گرجاؤں نے مل کر کارل مارکس کا نظریہ اختیار کرلیا کہ اضافۂ آبادی خوش حالی کا باعث ہے اس کے بعد جب عوام میں برتھ کنٹرول کی خلاف تبلیغ شروع کی تو عوام پر کچھ اثر نہ ہوا یہاں تک کہ عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ فرقہ جو برتھ کنٹرول کا زبردست حامی تھا اس نے بھی اس کے خلاف احکام جاری کردیئے اس سے بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو فوجی قانون نافذ کئے گئے اس پر بھی اضافہ آبادی میں بہت کم کامیابی حاصل کی۔ (۱)

۳:...... کہا جاتا ہے کہ محدود آمدنی رکھنے والے ماں باپ اپنے بچوں کے لئے

(۱)...... ٹائم ویکلی ۱۱ جنوری ۱۹۶۰ء

عمدہ تعلیم و تربیت، خوشگوار زندگی اور خوش آئند مستقبل کے ضامن نہیں ہو سکتے، اس لئے ظاہری اور باطنی لحاظ سے پریشان حال آدمیوں کی بھیڑ جمع کرنے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی کم ہوں مگر عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ اور خوشگوار زندگی جیسی نعمت سے بہرہ ور ہوں۔

یہ دلیل آج کل لوگوں کو بہت اپیل کرتی ہے لیکن غور کیا جائے تو یہ بھی اپنی پیش رو دلیلوں کی طرح صحیح نہیں۔ اول تو خوشگوار زندگی کا لفظ ہی مبہم ہے ہر شخص اپنے ذہن میں اس کا ایک علیحدہ مفہوم رکھتا ہے اور عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ انسان خوشگوار زندگی کا معیار اپنے سے زیادہ خوش حال لوگوں کے جیسا ہو جانے یا ان سے بھی بڑھ جانے کی بنیاد پر قائم کرتا ہے۔

اس لئے جو شخص خوشگوار زندگی کا طلب گار ہوگا وہ یقیناً یہی فیصلہ کرے گا کہ اس کے ہاں ایک دو بچوں سے زائد اولاد نہ ہو بلکہ بعض حالات میں تو وہ سرے سے بے اولاد رہنا ہی پسند کرے گا۔

اس وقت دنیا میں لاکھوں جوڑے ایسے موجود ہیں جو صرف اس بناء پر بے اولاد رہنا پسند کرتے ہیں کہ ان کے ذہن میں اولاد کی تعلیم و تربیت، عمدہ معاشرت، اور بہتر مستقبل کا معیار اتنا بلند ہے کہ وہ بحالات موجودہ اس تک پہونچنے پر قادر نہیں جب اس ذہنیت پر اولاد پیدا کرنے کی بنیاد ہوگی تو کون سوچے گا کہ ملک وقوم کو کس قدر افراد درکار ہیں؟ اور ملی حالات کتنے اشخاص کا تقاضا کرتے ہیں؟

دوسرے یہ کہ یہ دلیل اصولی لحاظ سے بھی غلط ہے اس لئے کہ کسی قوم کے افراد کا عیش پسند اور راحت طلب ہونا قوموں کی ترقی کے لئے زہر ہے وہ قوم کتنے دن جی سکتی ہے جس کے افراد نزاکت اور عیش پرستی سے ذرا سی تکلیف نہ برداشت

کر سکیں، قوم اور ملک کی ترقی کے لئے ہزار طرح کی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں، مصائب سہنے پڑتے ہیں، اور جب قوم ان تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کی خوگر نہ رہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے عروج واقبال کے دن گنے جا چکے ہیں۔

۴:......اسی دلیل سے قریب قریب یہ دلیل ہے کہ ضبط ولادت کے ذریعہ اچھی قسم کی نسلیں پیدا کی جاسکتی ہیں جن کی صحت اچھی اور قویٰ مضبوط ہوں اور ان میں کام کرنیکی صلاحیت پائی جاتی ہو، مگر اس خیال کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ جس شخص کے ہاں ایک دو بچے ہوں گے، ذہین طباع، تندرست اور توانا ہوں گے اور اگر زیادہ ہوں گے تو سب کے سب بے وقوف، احمق کندۂ ناتراش بیمار اور بے کار ہوں گے لیکن کیا اس مفروضے کی تائید میں کوئی عقلی دلیل یا مشاہدہ وتجربہ ہے؟

یہ چیز تو کلیۃً خدا کے ہاتھ میں ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُ کُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَاءُ

وہی ہے جو تمہیں بطن مادر میں جیسا چاہتا ہے بناتا ہے۔

۵:......بعض لوگ کہتے ہیں کہ زیادہ اولاد پیدا کرنے سے عورت کی صحت پر اچھا اثر نہیں پڑتا، اس کا حسن وجمال ختم ہو جاتا ہے اور صحت خراب ہو جاتی ہے۔

یہ دلیل بھی قابل قبول نہیں، اول تو اس لئے کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عورت کی صحت پر جو برا اثر ضبط تولید سے پڑتا ہے وہ اس مضرت سے کہیں زیادہ ہے جو حد سے زیادہ بچے پیدا کرنے سے رونما ہو سکتی ہے۔

دوسرے اس لئے کہ شرعی حیثیت کے باب میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ اگر بچے پیدا کرنے سے عورت کی صحت خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو یا عورت اتنی کمزور ہو کہ دردزہ کی تکلیف برداشت نہ کر سکے تو ایسی صورت میں ضبط ولادت جائز ہے، یہ

صورت اس صورت سے بالکل مختلف ہے، جو آج کل ضبطِ ولادت کا داعیہ بنی ہوئی ہے مذکورہ صورت میں انفرادی حیثیت سے ضبط ولادت کیا جاتا ہے اور موجودہ تحریک اسے بحیثیت مجموعی تمام قوم پر رائج کرنا چاہتی ہے۔

۶۔ نعم البدل

جب حامیان ضبط ولادت سے یہ کہا جاتا ہے کہ ضبط تولید خدا کے نظام ربوبیت میں دخل اندازی ہے اور خدا ہی تمام موجودات کے رزق کا کفیل ہے تو وہ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ توکل علی اللہ کا صحیح مفہوم یہ نہیں کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے اور ہم ضبط ولادت کو سبب ہی کا درجہ دیتے ہیں۔

ٹھیک ہے! ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسباب سے قطع نظر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسباب کو بجالا کر توکل کرنا چاہئے لیکن کیا توکل کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جو سبب اختیار کیا جائے وہ شرع عقل اور تجربہ کے خلاف ہو؟ ....آپ ایک تنگ مکان کی چھت کو اپنے قد کے مطابق بنانے کے لئے اپنی ہی ٹانگیں کیوں کاٹتے ہیں؟ اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ سیدھی طرح چھت کو اونچا کیجئے۔

ہم یہاں کئی ایسے اسباب کا ذکر کرتے ہیں جو ضبط ولادت کا نعم البدل بن سکتے ہیں اور ان سے اس درد کا درمان بہتر انداز میں ممکن ہے جو ضبط ولادت پر ابھار رہا ہے۔

۱......طرز معاشرت کی اصلاح

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر ہم اپنے طرز بود و باش کو اسلامی سانچے میں ڈھال لیں تو ضبط ولادت کی ضرورت ہی پیدا نہ ہو، ممکن ہے کہ بعض دور اندیش حضرات میری اس تجویز پر بھی یہ طعنہ دیں کہ یہ ایسی شاعری ہے جیسے:

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

لیکن اگر وہ کچھ مزید دور اندیشی سے کام لیں تو ان پر اس بات کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔

ذرا پہلے ایک نظر ان اسباب پر ڈال لیجئے جن کے تحت اہل یورپ برتھ کنٹرول پر مجبور ہوئے۔

ا:...... جب امریکہ کا براعظم دریافت ہوا اور واسکوڈے گاما نے ہندوستان کا وہ راستہ دریافت کرلیا جو افریقہ کے جنوبی سرے سے ہو کر گزرتا ہے تو یورپ نے تجارتی لحاظ سے بڑی ترقی کی، تاجروں اور سوداگروں کا ایک بڑا طبقہ معرض وجود میں آیا اور جب لوگوں کی توجہ زراعت سے ہٹ کر تجارت کی طرف مبذول ہوئی تو اسکے زیر اثر صنعت کو بھی بڑا فروغ حاصل ہوا، بڑے بڑے کارخانے بنے اور جب بھی کوئی بڑا کارخانہ وجود میں آتا، سینکڑوں کی تعداد میں مزدور طلب کرتا، ادھر گاؤں اور دیہات میں بے شمار لوگ جاگیرداروں کے جور وستم سے تنگ آچکے تھے، اس لئے دیہات کی آبادیاں کارخانوں کی مزدوری کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر شہروں میں منتقل ہونے لگیں۔

ان تمام تبدیلیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جاگیری نظام نے دم توڑ دیا اور اس کی جگہ نظام تجاریت نے لے لی، پھر صنعتوں کی طرف توجہ ہونے کی وجہ سے مشین ایجاد ہوئی اور صنعتی انقلاب رونما ہوا۔

اس انقلاب نے ابتداء تو یورپ کی خوشحالی کو خوب بڑھایا لیکن انجام کار اس نے بے شمار معاشی مشکلات پیدا کردیں زندگی کے لئے جدوجہد بڑھ گئی مقابلہ سخت

ہو گیا، معیار زندگی بلند ہوا، ضروریات زندگی میں وسعت ہوئی، اور قیمتیں اس قدر بڑھیں کہ محدود آمدنی رکھنے والوں کے لئے عام معیار زندگی کے مطابق زندہ رہنا دوبھر ہو گیا، اس لئے ہر شخص کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ کسی طرح اپنی محدود آمدنی کو صرف اپنی ذات پر خرچ کرے اس میں دوسرے شرکاء کو جس قدر ہو سکے گھٹائے۔

۲:......ان حالات نے عورتوں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ مرد و عورت کی اس فطری تقسیم کار سے بغاوت کر بیٹھیں کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے، لہٰذا عورتیں بھی تحصیل زر کے لئے میدان میں کود پڑیں، جس کا نتیجہ ایک تو یہ ہوا کہ ان کے لئے بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کا معاملہ فی نفسہ مشکل ہو گیا، دوسرے جب انہیں آزادی ملی اور مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول شروع ہوا تو ان کے اندر ایک عجیب ذہنیت پیدا ہو گئی جس کے تحت ان میں مردوں کے دوش بدوش ہر کام انجام دینے کا شوق پیدا ہوا، گھر کی خدمت اور بچوں کی پرورش جو ان کا فطری وظیفہ تھا اس سے نفرت کرنے اور جی چرانے لگیں ان وجوہ سے ان کی خواہش بھی یہی ہو گئی کہ کسی طرح بچوں کے جنجال سے بچ کر ہی رہیں تو بہتر ہے۔

۳:......جب سرمایہ داری کا دور دورہ ہوا تو امیروں اور دولتمندوں نے اپنی لذت نفس اور عیش و عشرت کے لئے ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے جو نئے ہونے کے ساتھ غریبوں کے لئے مہنگے بھی تھے، ادھر متوسط اور غریب طبقوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی ان پر عمل شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے لئے بہت سے اسباب عیش لوازم حیات بن کر رہ گئے نتیجۃً معیار زندگی اس قدر بلند ہوا کہ ایک متوسط آدمی کے لئے اپنا اور بیوی کا پیٹ پالنا مشکل ہو گیا چہ جائے کہ وہ کھانے پینے والوں میں مزید اضافہ کرے۔

۴:......دہریت اور مادہ پرستی نے لوگوں کے دل میں خدا کا خیال ہی ختم کر دیا

کہ وہ اس بات پر غور کرتے کہ انہیں رزق دینے والا کوئی اور ہے، جو ان کے لئے رزق کا انتظام دور ایسے پوشیدہ مقام سے کرتا رہتا ہے جہاں تک عقل ونظر کی رسائی نہیں ہے یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر اہل یورپ نے برتھ کنٹرول کو ضروری سمجھا، ان اسباب کا مطالعہ کر کے آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انہوں نے شروع میں خود ہی غلطی کی کہ اپنی طرز معاشرت کو سرمایہ داری، لذت پرستی اور مادیت کی کھوکھلی بنیادوں پر تعمیر کیا پھر جب آخر کار مشکلات سے دوچار ہوئے تو دوسری حماقت یہ کر ڈالی کہ اس طرز معاشرت اور تہذیب وتمدن کو برقرار رکھ کر آبادی کو گھٹانا شروع کر دیا۔

اس تشریح سے غالباً آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ تحدید نسل کوئی فطری تقاضا نہیں بلکہ چند مخصوص حالات کی بناء پر اہل مغرب میں رواج پا گیا، یہی وجہ ہے کہ جب پہلے پہل ۱۷۵۸ء میں مالتھس نے یہ نظریہ پیش کیا تو اہل مغرب نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی، پھر ۱۸۷۶ء میں دوبارہ ایک تحریک اٹھی اور ضبط ولادت پر عمل کرنا اس کے بعد سے شروع ہوا، دوسرے آپ اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس کے نتائج ان ممالک میں کیا ظاہر ہوئے؟ اگر یہ کوئی فطری تقاضا ہوتا تو نتیجے میں اچھائیوں کا عنصر غالب رہتا۔

اس لئے اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن کی بناء پر یہ غیر فطری عمل ناگزیر نظر آنے لگے تو توالد وتناسل کا فطری سلسلہ قابل ترمیم نہیں بلکہ وہ حالات بدل ڈالنے کے قابل ہیں جو ایک غیر فطری عمل کی طرف لے جا رہے ہوں۔

اسلام کے اصول معاشرت

اور اگر اسلام کے ان مٹ اصولوں پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے تو وہ حالات ہی پیدا نہیں ہو سکتے جن کی بناء پر تحدید نسل کی ضرورت ہو۔

اسلام نے مغربی تمدن کے بالکل برعکس سرمایہ داری کی جڑیں کاٹی ہیں اس نے سود کو ناجائز قرار دیا ہے ذخیرہ اندوزی کو بدترین جرم کہا، جوئے اور سٹے سے روکا، زکوٰۃ، عشر، خراج اور وراثت کے احکام جاری کئے ان تمام احکام نے ان تمام دروازوں کو بند کردیا جو تحدید نسل کے مذکورہ اسباب میں سے پہلے سبب کی طرف لے جاتے تھے۔

مغرب میں تحدید نسل کا دوسرا داعیہ عورت کا گھر سے نکلنا تھا اسلام نے عورت کو وارث بنا کر اور شوہر پر اس کا نفقہ واجب کر کے عورت کے ذہن سے یہ خیال ہی مٹادیا کہ تجھے بھی کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا ہے، ادھر عورتوں مردوں کے آزادانہ میل جول پر پردے کے ذریعہ بندش قائم کردی، اور ان تمام اسباب کی بیخ کنی کردی جن کے تحت عورت پرورش اطفال اور امور خانہ داری کے فطری فرائض سے انحراف کرسکتی تھی۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات نے انسانوں کو سادہ طرز بود و باش اختیار کرنیکی تلقین کی اور یہی طرز اقتصادی اور طبی لحاظ سے بہت مفید ہے وہ زنا، شراب، رقص وسرود (جو زنا کے قوی ترین محرکات میں سے ہے) کو حرام قرار دیتا ہے اور بہت سی ایسی لایعنی تفریحات سے روکتا ہے جو خالص لذت پرستی اور عیش طلبی کی پیداوار ہوتی ہیں۔

پھر اس نے نوع انسان کے دوسرے فرزندوں کے ساتھ رحم و کرم اور بھائی چارہ کا برتاؤ کرنا سکھایا، غریبوں، ناداروں کی مدد کی تلقین کی اس نے بتایا کہ ہمسایوں کے حقوق یہ ہیں اور اعزاء واقرباء کے یہ۔

ان تمام احکام کے ذریعہ اس نے نفس کی بندگی، عیش پرستی اور خود غرضی کے ان ہلاکت آفریں میدانوں میں قدم رکھنے سے روک دیا۔ جنہوں نے مغربی

تہذیبوں میں تحدید نسل پر لوگوں کو آمادہ بلکہ مجبور کر ڈالا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اس خدا کی یاد دلائی جو سب کا خالق ورازق ہے، اور جس سے قطع کر کے انسان صرف اپنی کوششوں پر بھروسہ کرنے لگتا ہے، اس نے بتادیا کہ تمہارا ایک مالک ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اس نے تمہیں بے خبری میں پیدا نہیں کر دیا بلکہ وہ جانتا ہے کہ تم کہاں بستے ہو؟ کیا کھاتے ہو؟ اسی طرف تمہیں ایک دن لوٹ کر جانا بھی ہے۔

غرضیکہ اسلام نے اپنے ان حکیمانہ اصولوں کے ذریعہ ان تمام سوراخوں کو بند کر دیا جن سے ضبط ولادت کا کوئی خیال داخل ہو سکتا تھا اور ان تمام اسباب کا خاتمہ کر ڈالا جن کے زیر اثر اہل مغرب ضبط ولادت پر آمادہ ہوئے تھے۔

ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھ کر آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ اگر اسلام کے ان زرین اصولوں پر سو فیصد عمل درآمد کیا جائے تو کیا پھر بھی تحدید نسل کی کوئی ضرورت باقی رہتی ہے۔

۲...... پیداوار میں اضافہ

آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ رقبے کے لحاظ سے پاکستان کی آبادی زیادہ نہیں ہے البتہ موجودہ پیداوار کے لحاظ سے کافی سہی، مزید اضافے کی متحمل نہیں اور اس کے لئے ہمیں پیداوار بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہئے۔ جس کی ملک میں بہت گنجائش موجود ہے سب سے پہلے تو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ موجودہ رقبے میں ایسے مؤثر طریقے سے کاشت کی جائے کہ پیداوار زیادہ حاصل ہو، جس قدر سائنٹیفک طریقے ممکن ہوں انہیں بروئے کار لایا جائے اگر جاپان کے رقبے اور تناسب پیداوار کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی نسبت سے بہت زیادہ ہے یہی

حال ہالینڈ میں ہے وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں کاشت کے ترقی یافتہ ذرائع کو استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ضرورت ہو تو مزید خالی رقبے کو زیر کاشت لایا جاسکتا ہے، پاکستان کا غیر مزروعہ رقبہ بیالیس کروڑ تریسٹھ لاکھ تینتالیس ہزار ایکڑ ہے جس کا اکثر حصہ قابل کاشت ہے اور صرف چھ کروڑ اٹھائیس لاکھ سات ہزار ایکڑ زیر کاشت لایا گیا ہے، گویا ابھی تک کل قابل کاشت رقبے کا ۲۵ فیصد حصہ بھی زیر کاشت نہیں آیا۔ غیر مزروعہ حصوں میں کاشت کر کے پیداوار بہت بڑھائی جاسکتی ہے پاکستان کے معاشی ماہرین کا خیال بھی یہی ہے کہ اگر ہم تمام ممکنہ وسائل کو بروئے کار لائیں تو پاکستان کی پیداوار بھی آبادی کی ہر ممکن تعداد کے لئے ضروریات زندگی مہیا کر سکتی ہے۔

۳...... حاصل شدہ وسائل کی حفاظت

پیداوار کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی بڑی اہمیت دینی چاہئے کہ جس قدر سامان یا غذائی پیداوار حاصل ہوئی ہے اس کو ضائع ہونے سے بچایا جائے بظاہر تو یہ ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس پر وسیع نظر کے ساتھ غور وفکر کیا جائے تو درحقیقت یہ ایک بہت وسیع اور جامع بات ہے کسی چیز کا بیکار چھوڑ دینا یا اس کا غلط استعمال، ذخیرہ اندوزی، سرمایہ داری، اسمگلنگ، قمار، یہ تمام چیزیں ضائع کرنے کے مترادف ہیں۔ اب آپ ان میں سے ایک ایک چیز کو دیکھئے کہ ہم ان پر عمل کر کے ایک زبردست غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں یا نہیں؟

ا:...... بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن سے ہم صحیح کام نہیں لیتے اور یونہی چھوڑ ڈالتے ہیں، مثلاً پاکستان (مردان) میں چینی کا اتنا بڑا مل ہے کہ جو ایشیاء کے تمام چینی کے کارخانوں سے فائق ہے لیکن اس میں گنوں سے رس نکال کر بقیہ حصہ بے کار

پھینک دیا جاتا ہے حالانکہ وہ بڑی کارآمد چیز ہے، کنیڈا میں ان ہی گنوں سے رس نکالنے کے بعد جو فضلہ بچتا ہے اس سے کاغذ بنایا جاتا ہے اور اس سے بھی جو میل یا برادہ بچ رہتا ہے اس سے دوائیں تیار کی جاتی ہیں اگر ہم اہل مغرب سے ضبط ولادت کے جدید طریقے سیکھنے کے بجائے یہ تعمیری ہنر سیکھیں تو میرے خیال میں ہماری شان خودی پر کوئی داغ نہیں لگ جائے گا۔

ایک اور مثال سن لیجئے! ہمارے یہاں فصلیں کاٹتے وقت ٹہنیوں کے ساتھ جڑیں بھی اکھاڑ دی جاتی ہیں اور ان کا زیادہ سے زیادہ مصرف یہ ہوتا ہے کہ جانوروں کو کھلا دی جاتی ہیں حالانکہ اس فعل سے زمین کی زرخیزی میں کمی پڑتی ہے دوسرے تمام ممالک میں یہ جڑیں زمین ہی میں رہنے دی جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے زمین میں قوت رہتی ہے۔

۲:......اس کے علاوہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا غلط استعمال کر کے ہم ''کفران نعمت'' کے مرتکب ہوتے ہیں اس کو بھی مثال سے سمجھئے آپ کو معلوم ہو چکا کہ ہمارا کل زیر کاشت رقبہ تقریباً چھ کروڑ اٹھالیس لاکھ ایکڑ ہے، زرعی اعداد و شمار مظہر ہیں کہ اس میں سے ایک لاکھ چورانوے ہزار سات سو اڑتیس ایکڑ زمین میں صرف تمباکو کی کاشت ہوتی ہے جس سے بیس کروڑ تیئس لاکھ سات ہزار تین سو پونڈ تمباکو پیدا ہوتا ہے۔

جس ملک میں بھوک، اضافہ آبادی اور وسائل معاش کی تنگی کا اس قدر رونا رویا جاتا ہو، کیا یہ ظلم نہیں کہ اس ملک کی تقریباً سوا دو لاکھ ایکڑ زمین ایسی اشیاء کی کاشت میں مشغول ہو جو صحت کے لئے تباہ کن ثابت ہو چکی ہیں۔

ان جیسی غیر ضروری بلکہ مضر چیزوں کو سرے سے ختم نہ کیا جائے تو کم از کم ان میں تخفیف تو کی جا سکتی ہے۔

۳:......ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ کرنے والے ملکی صنعت اور پیداوار کو بے کار کر کے جو عظیم نقصان پہنچاتے ہیں وہ ملک کی خوش حالی کے لئے تباہ کن ہے اس میں شک نہیں کہ ملک کے ان غداروں پر قابو پانا ذرا مشکل ہے لیکن اگر ہمیں ملک کو تباہی سے بچانا محبوب ہے تو جتنی جانی اور مالی کوششیں ہم ضبط ولادت کی ترویج پر صرف کرر ہے ہیں اتنی کوششیں اگر خلوص کے ساتھ اس پر کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان بدقماشوں کو کیفر کردار تک نہ پہنچایا جا سکے۔

ممکن ہے بعض ''وسیع النظر'' حضرات ان تمام چیزوں کو معمولی اور موضوع سے دور تصور کرتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام غلطیوں سے جو نعمتیں چھن جاتی ہیں وہ اپنی جگہ پر ہیں ہی، اس کا اثر مزید یہ بھی ہوتا ہے کہ بقیہ وسائل معاش میں بے برکتی ہوتی ہے اور جتنی مقدار ضروریات کو پورا کرنے میں کافی ہونا چاہئے پوری نہیں ہوتی۔

۴......وسائل معاش کی صحیح تقسیم

چوتھی اہم چیز یہ ہے کہ جو پیداوار حاصل ہوا سے اور زمینوں کو خلق خدا میں عدل وانصاف کے ساتھ صحیح طریقے سے تقسیم کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ طاقتور کمزور کا حق اڑا لے، اگر صحیح تقسیم میں گڑ بڑ ہو، تو خواہ پیداوار میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے یا آبادی کتنی ہی گھٹ جائے، ہر صورت میں معاشی تنگی برقرار رہے گی۔

۵......رقبہ اور آبادی میں توازن

آپ کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ رقبے کے لحاظ سے پاکستان کی آبادی زیادہ نہیں لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ ملک کے تمام رقبے اور آبادی میں یہ حال نہیں بلکہ ملک کے مختلف حصوں میں جو رقبے کے لحاظ سے آبادی کا اوسط ہے وہ بہت غیر متوازن

ہے جس کا اندازہ اس سے بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ۸ء۷۷۱ آدمی فی مربع میل میں رہتے ہیں اور ریاست بلوچستان میں ایک مربع میل کے اندر صرف ۸ء۸ آدمی بستے ہیں اس قسم کا تفاوت ملک کے مختلف حصوں کی آبادی میں پایا جاتا ہے اس تفاوت کو دور کر کے توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے، ایسا نہ ہونا چاہئے کہ تمام آبادی کا زور ایک ہی حصے پر رہے اور دوسرا حصہ بالکل خالی رہ جائے۔

توازن پیدا کرنے کے لئے غیر آباد حصوں میں کارخانے قائم کئے جائیں، شہر آباد کئے جائیں اس طرح گنجان آبادی کے علاقوں سے آبادی کا زور ٹوٹ سکتا ہے اور ہر خطہ میں بسنے والے چین وخوشحالی کی زندگی گزار سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کام محنت طلب ہے لیکن کیا ملک کی ترقی اور خوشحالی کیلئے یہ محنت قابل برداشت نہیں؟

اگر ان تمام تعمیری اسباب پر عمل کیا جائے تو دعویٰ کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آبادی خواہ کتنی ہی بڑھ جائے، معاشی تنگی پیدا نہیں ہوسکتی۔

یہ تمام اسباب اس لائق ہیں کہ ضبط ولادت کے تخریبی کام کو چھوڑ کر ان کی طرف توجہ دی جائے ان ہی سے اس تنگی کا مداوا بہت اچھے اسلوب کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جو ضبط ولادت پر برانگیختہ کئے ہوئے ہیں۔

محمد تقی عثمانی

دسمبر ۱۹۶۰ء

۱۷۴ گارڈن ایسٹ کراچی نمبر ۵

۹۸

احکام الخطاب فی بعض احکام اللُّحی و الخضاب

ڈاڑھی کے خضاب

اور کترانے وغیرہ کے احکام

تاریخ تالیف ________ ۶/ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ (مطابق ۱۹۳۲ء)

مقامِ تالیف ________ دارالعلوم دیوبند

مذکورہ دونوں موضوعات پر حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی تحقیق جواہر الفقہ قدیم کا بھی حصہ رہی ہے۔ اب جدید طباعت میں بھی شامل کی جارہی ہے، اہل فتویٰ کے لئے مآخذ و مرجع ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علماء دین مسائلِ ذیل میں:

۱:...... داڑھی منڈانا ایک مٹھی سے کم ہونے کی صورت میں کتروانا کیسا ہے؟

۲:...... داڑھی میں کیا مقدار قُبضہ (مٹھی) ضروری ہے، یا نہیں؟ اور اگر ہے تو قبضہ کہاں سے کہاں تک ہے، کیا ذقن بھی ریش میں داخل ہے، یا نہیں؟ اور اگر قبضہ سے بڑی ہو، تو کیا کوئی حرج فی الدین ہے یا نہیں؟ جیسے کہ بزرگان رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی عموماً قبضہ سے بڑی ہوتی تھیں، اور ہیں۔ شامی والے کا بیوقوف کہنا کیا یہ درست ہے، یا نہیں؟ حضرت عمرؓ کا قول قبضہ کا ہے، اور بعض حدیث میں خَفِّفُوا اللحیة آیا ہے، حالانکہ صحاح میں مطلق واعفوا اللحیٰ یا ایک جگہ طَوِّلُوا اللحیة بھی آیا ہے، تو دفع تعارض یا ترجیح کس کو ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کترانا ثابت ہے، یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا حد ہے؟ بدلائل شرعیہ احادیث شریف وفقہاء احناف کے اقوال سے جواب عنایت فرمائیے گا۔ جواب مفصل ہو۔ بینوا توجروا

الجواب

۱:...... باجماع امت داڑھی منڈانا حرام ہے، اسی طرح ایک قبضہ (مٹھی) سے کم

ہونے کی صورت میں کتروانا بھی حرام ہے، ائمہ اربعہ حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ کا اس پر اتفاق ہے، ملاحظہ ہوں، تصریحات ذیل:

حنفی مذہب:

و یحرم علی الرجل قطع لحیته الخ و اما الاخذ منها و هی مادون القبضة کما یفعله بعض المغاربة و مخنثة الرجال فلم یبحه احد. (فتح القدیر و درمختار وغیرہ)

حرام ہے داڑھی کاٹنا، اور اس حال میں کہ ایک مٹھی سے کم ہو، کترنا کسی کے یہاں مباح نہیں۔

مالکی مذہب:

مذهب السادة المالکیة حرمة حلق اللحیة و کذا قصها اذا کان یحصل به مثلة (الابداع فی منار الابتداع) حرام ہے منڈانا اور کٹانا داڑھی کا جب کہ اس سے مثلہ ہو جاوے۔

شافعی مذہب:

فی شرح العباب قال الاذرعی الصواب تحریم حلقها جملة لغیر علة بها وقال ابن الرفعة بان الشافعی رحمه اللّٰه نص فی الامّ علی التحریم۔ حرام ہے منڈانا داڑھی کا بلا عذر، تصریح کی اس کی امام شافعی رحمہ اللہ نے اُمّ میں (نام کتاب)

حنبلی مذہب:

منهم من صرح بان المعتمد حرمة حلقها و منهم من صرح

بالحرمة و لم یحک خلافاً کصاحب الانصاف یعلم ذالک من شرح المنتھیٰ و شرح منظومة الاداب و غیرھا تصریح کی اس پر کہ حرام ہے منڈانا داڑھی کا تصریح کی حرمت پر اور کسی کا خلاف نقل نہیں کیا۔

ان تصریحات سے ڈاڑھی کے مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے، کسی چیز پر مذاہب اربعہ کے اتفاق کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ امت محمدیہ میں کوئی بھی اس کا مخالف نہیں، اور ہو تو اس کا اختلاف ناقابل التفات ہے، ڈاڑھی کو سر کے بالوں اور پٹھوں پر قیاس کرنا بھی تعلیمات شریعت سے بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے، احادیث سے بال رکھنے نہ رکھنے دونوں کی اجازت ثابت ہے، قال احلقوہ کلہ او اترکوہ کلہ (ترجمہ) مونڈ و تمام سر کو یا چھوڑ دو تمام کو۔ (سنن ابوداؤد باسناد صحیح علی شرط البخاری و مسلم) پٹھے رکھنے نہ رکھنے کا تعلق عادت سے ہے حکم شریعت نہیں، یوں کوئی حضورؐ کے اتباع سے رکھے، تو مستحب اور باعث ثواب ہے۔ (منقول از بعض فتاویٰ)

الجواب............۲

فی الباب العشرین من کراھیة العالمگیریة و لابأس اذا طالت لحیته ان یأخذ من اطرافھا و لابأس ان یقبض علی لحیته فان زاد علی قبضة منھا شئ جزہ و ان کان ما زاد طویلة ترکه کذا فی الملتقط و القص سنة فیھا و ھو ان یقبض الرجل لحیته فان زاد منھا علی قبضة قطعه کذا ذکر محمدؒ فی کتاب الأثار عن ابی حنیفةؒ و قال به ناخذ کذا فی محیط السرخسی عالمگیری، ص: ۳۶۹، ج: ۵. و فی ردالمحتار عن النھایة و ماوراء ذالک (یعنی القبضة) یجب قطعه ھکذا عن رسول اللہ

صلى الله عليه و سلم انه كان يأخذ من اللحية من طولها و عرضها رواه ابوعيسىٰ يعنى الترمذى فى جامعه الخ ثم قال ما استدل به صاحب النهاية لايدل على الوجوب لما صرح به فى البحر وغيره (الى قوله) و هو سنة كما فى الملتقىٰ انتهىٰ و ايضاً فى ردالمحتار (و بهٰذا) يعنى جواز الاخذ فوق القبضة لا دونها وفق فى الفتح بين ما مر و بين ما فى الصحيحين عن ابن عمر عنه صلى الله عليه و سلم احفوا الشوارب و اعفوا اللحىٰ قال لانه صح عن ابن عمر راوى هذا الحديث انه كان ياخذ الفاضل عن القبضة فانه لم يحمل على النسخ كما هو اصلنا فى عمل الراوى على خلاف مرويه مع انه روىٰ عن غير الراوى و عن النبى صلى الله عليه و سلم ان يحمل الاعفاء على اعفائها عن ان ياخذ غالبها او كلها كما هو فعل مجوس الاعاجم يقطعون من لحاهم و يؤيّده ما فى مسلم عن ابى هريرة عنه جزوا الشوارب و اعفوا اللحىٰ خالفوا المجوس فهٰذه الجملة واقعة موقع التعليل الخ شامى كتاب الصوم، ص:۱۲۳، ج:۲. وفى الحظر و الاباحة عن الدر المختار و رد المحتار و السنة فيها القبضة (درمختار) قال الشامى و روى الطبرانى عن ابن عباسؓ رفعه من سعادة المرء خفة لحيته و اشتهر ان طول اللحية دليل على خفة العقل ثم انشد عن بعضهم فيه

شعر شامی، ص: ۲۸۴، ج: ۵. ما احد طالت له لحيته فزادت اللحية في هيبته الا و ما ينقص من عقله اكثر فيما زاد في لحيته۔

عالمگیری کتاب الکراہیۃ کے بیسویں باب میں ہے اس میں کوئی حرج نہیں کہ اگر ڈاڑھی ایک مشت سے بڑھ جائے، تو اس کو کم کر دے، اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ آدمی اپنی داڑھی کو مٹھی میں پکڑ لے، جو کچھ اس سے زائد ہو، اس کو قطع کر دے، لیکن اگر مٹھی سے بڑھی ہوئی داڑھی زیادہ لمبی ہو چکی ہے، تو اب اس کو قطع کرنا مناسب نہیں، بلکہ ویسے ہی چھوڑ دینا چاہئے، ملتقط میں ایسا ہی لکھا ہے، ڈاڑھی کترانا سنت ہے، اگر ایک مشت سے زائد ہو، امام محمد نے امام ابوحنیفہؒ سے کتاب الآثار میں ایسا ہی نقل کیا ہے، اور کہا کہ ہمارا یہی معمول ہے، سرخسی نے محیط میں اسی طرح کہا ہے، اور پھر ردالمحتار میں نہایہ سے منقول ہے کہ ایک مشت سے زائد ڈاڑھی کا کٹوانا واجب ہے، ایسا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ ڈاڑھی کو طول وعرض سے لیا کرتے تھے، روایت کیا، اس کو امام ترمذی نے اور صاحب ردالمحتار نے یہ بھی کہا ہے کہ جس چیز سے صاحب نہایہ نے اس کے وجوب پر استدلال کیا ہے، اس سے وجوب نہیں معلوم ہوتا، جیسا کہ صاحب بحر وغیرہ نے بحوالہ ملتقط اس کے سنت ہونے کی تصریح کی ہے، اور نیز ردالمحتار میں ہے کہ جواز قطع کو ایک مشت سے زائد پر اور عدم جواز کو ایک مشت سے کم پر محمول کیا جاتا ہے، صاحب فتح القدیر نے اس روایت اور صحیحین کی روایت میں جو ابن عمرؓ سے مروی ہے اسی طرح تطبیق کی ہے اور وہ روایت صحیحین کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مونچھوں کو کٹواؤ اور ڈاڑھی کو چھوڑو۔ اور وجہ تطبیق صاحب فتح نے یہ بیان کی ہے کہ راوی حدیث حضرت ابن عمرؓ سے بسند صحیح ثابت ہے کہ وہ اپنی

ڈاڑھی جو ایک مشت سے زائد ہو جاتی، تو قطع کرا دیتے تھے، پس اگر ان کے اس فعل کو حسب قاعدہ حنفیہ نسخ پر محمول نہ کریں، تو اس پر محمول ہوگا کہ ڈاڑھی چھوڑنے کا جو حکم ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ایک مشت سے کم نہ کریں، اور پوری یا زیادہ حصہ ڈاڑھی کا مجوس وغیرہ کی طرح قطع نہ کریں، اور اس کی تائید مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاٹو مونچھوں کو، اور چھوڑو ڈاڑھیوں کو، تاکہ مخالفت کرو مجوس کی۔ پس یہ جملہ علت بیان کرنے کے لئے مذکور ہوا ہے، اور درمختار کتاب الحظر والاباحۃ میں ہے کہ سنت ڈاڑھی میں ایک مٹھی ہے، اور علامہ شامی نے کہا ہے کہ محدث طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ انسان کی نیک بختی کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کی ڈاڑھی بہت زیادہ لمبی نہ ہو، اور یہ بات مشہور ہے کہ ڈاڑھی کا زیادہ لمبا ہونا خفت عقل کی دلیل ہے:

ترجمہ: کسی شخص کی ڈاڑھی حد سنت سے زیادہ ہو کر اس کی شان اور وجاہت میں جتنی زیادتی کرتی ہے، اس سے زیادہ اس کی عقل میں کمی کر دیتی ہے۔

عبارات منقولہ بالا سے مسائل ذیل حاصل ہوئے:

ا:...... ڈاڑھی اگر ایک مٹھی سے زیادہ ہو، تو اس کو قطع کرنا سنت ہے، جیسا کہ عبارت شامی میں مفصل مذکور ہے۔

ب:...... یہ ایک مشت ذقن کے علاوہ معتبر ہوگی، ذقن لحیہ میں داخل نہیں جیسا کہ عبارت عالمگیری سے واضح ہے۔

ج:...... اگر کسی شخص نے ابتداءً داڑھی بڑھنے کے زمانہ میں ایک مشت سے زائد کو کسی وجہ سے قطع نہ کیا، یہاں تک کہ زیادہ طویل ہوگئی، تو اب اس کو قطع کرنا نہ چاہئے، جیسا

کہ عالمگیری میں اس کی تصریح ہے، جن بزرگوں کی ڈاڑھی ایک مشت سے زائد رہی ہے یا اب ہے، وہ اسی صورت پر محمول ہے۔

د:...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مشت سے زائد لحیہ شریفہ کے بالوں کا قطع کرانا ثابت ہے، جیسا کہ عبارت شامی میں بحوالہ ترمذی مذکور ہے۔

ہ:...... جن روایات میں اعفاء لحیہ یا تطویل لحیہ کا حکم وارد ہے، اس سے مراد یہی ہے، کہ ایک مشت تک اعفاء کیا جائے، ورنہ دوسری فعلی روایات جو ترمذی سے نقل کی گئی ہیں، معارض ہوں گی، اور تطبیق کی یہی بہتر صورت ہے کہ تقصیر کی روایت کو ایک مشت سے زائد پر اور تطویل کی ایک مشت کی حد تک پر محمول کیا جائے جیسا کہ عبارت شامی میں بحوالہ فتح القدیر مذکور ہے۔

و:...... اور علامہ شامی نے طویل اللحیہ کو اپنی طرف سے ہرگز بیوقوف نہیں کہا، بلکہ محض ایک مشہور مقولہ نقل کیا ہے، نہ یہ کوئی شرعی حکم ہے، اور نہ اپنا اجتہاد جیسا کہ عبارت شامی سے واضح ہے، اور اگر فی الواقع صحیح بھی ہو، تو اس کی گنجائش ہے کیونکہ حدیث طبرانی مندرجہ عبارت میں ڈاڑھی کے خفیف ہونے کو نیک بختی کی علامت قرار دیا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طویل ڈاڑھی اگر ہو، تو اس کو قطع کرا دیا جائے۔ جیسے طویل قد کو علامت بیوقوفی کہا جاتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طویل القد اپنے قد کو قطع و برید کے ذریعہ کم کردے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ

احقر محمد شفیع

۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ

دارالعلوم دیوبند۔

سوال......خضاب بالسواد جائز ہے یا نہیں؟ اگر بشق اخیر جواب ہو، تو امام ابو یوسف کا خلاف کیوں ہے؟ انی احب ان اتزین لامرأتی سے صریح جواز بلکہ رغبت اور امر محمود معلوم ہوتا ہے، اور اگر شق اول کو اختیار کیا جائے، تو امام ابوحنیفہ و عامۃ الفقہاء رحمۃ اللہ تبارک وتعالیٰ علیہم حرمت کے قائل کیوں ہیں؟ اور فقط غازی کے لئے جائز فرماتے ہیں، اوروں کے لئے ممانعت فرماتے ہیں، اگر جواب ہو، تو ادلہ قویہ سے ہو، حوالہ کتب تحریر فرما دیں۔

جواب

حامداً و مصلیاً اما بعد! خضاب کے متعلق مختلف صورتوں اور مختلف حالات کے اعتبار سے احکام شرعیہ میں کچھ تفصیل ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیاہ رنگ کے سوا دوسرے رنگوں کا خضاب علماء مجتہدین کے نزدیک جائز بلکہ مستحب ہے، اور سرخ خضاب خالص حناء کا یا کچھ سیاہی مائل جس میں کتم شامل کیا جاتا ہے، مسنون ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جمہور محدثین کے نزدیک ایسا خضاب کرنا ثابت ہے، صحابہ میں حضرت انسؓ اور ائمہ اجتہاد میں امام مالکؒ اس عملی ثبوت کا انکار فرماتے ہیں لیکن ناجائز وہ بھی نہیں فرماتے، اور امام احمد بن حنبلؒ نے ان کے انکار کا جواب بھی نہایت کافی دے دیا ہے، جس کے بعض جملے یہ ہیں:

> و قد شهد به غير انسؓ على النبى صلى الله عليه و سلم انه خضب و ليس من شهد بمنزلة من لم يشهد فاحمد اثبت خضاب النبى صلى الله عليه و سلم و معه جماعة من المحدثين و مالك انكره زاد المعاد،

ص: ۱۲۷، ج: ۲.

نیز صحیح بخاری میں عثمان بن عبداللہ ابن موہب سے مروی ہے کہ ہم ام سلمہ رضی

اللہ عنہا کے پاس گئے تو انہوں نے ہمارے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک نکالا، دیکھا تو وہ حناء اور کتم سے خضاب کیا ہوا تھا۔ (زاد المعاد ص:۱۲۶، ج:۲) نیز حدیث صحیح میں ہے، ان احسن ما غیرتم بہ الشیب الحناء و الکتم۔ (رواہ الاربعہ) ترجمہ: بہترین خضاب حناء اور کتم ہے، اسی طرح حضرت صدیق اکبرؓ سے صحیحین میں منقول ہے کہ حناء اور کتم کے ساتھ خضاب کرتے تھے، (زاد) اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص گزرا، جو حناء کا خضاب کئے ہوئے تھا، آپ نے ارشاد فرمایا ما احسن ھذا (یہ کیسا اچھا ہے) پھر دوسرا آدمی گزرا، جو حناء اور کتم کا خضاب کیے ہوئے تھا، اس کو دیکھ کر فرمایا: ھذا احسن من ھذا۔ پھر تیسرا آدمی گزرا جو زرد خضاب کیے ہوئے تھا، تو فرمایا ھذا احسن من ھذا کلہ (یعنی یہ سب سے زیادہ اچھا ہے) احادیث مذکورہ ہی کی بناء پر حنفیہ کا یہ مذہب ہے، اتفق المشائخ رحمھم اللہ تعالیٰ ان الخضاب فی حق الرجال بالحمرة سنة و انہ من سیماء المسلمین و علاماتھم (عالمگیری کتاب الکراہیة ص:۳۶۹، ج:۵) ترجمہ: مشائخ رحمہم اللہ علیہم نے اتفاق کیا ہے اس بات پر کہ سرخ خضاب مردوں کے حق میں سنت ہے، اور یہ مسلمانوں کی خصوصیات میں سے ہے، اور درمختار میں ہے: و یستحب (۱) للرجل خضاب شعرہ و لحیتہ و لو فی غیر حرب فی الاصح و اقرہ الشامی، (ص:۲۹۵، ج:۵۔ کتاب الحظر والاباحۃ)۔ یہاں تک اس خضاب کا بیان تھا، جو خالص سیاہ نہ ہو، اور جو خضاب خالص سیاہ ہو، اس کی تین صورتیں ہیں، ایک باجماع جائز ہے، اور ایک باجماع ناجائز اور ایک مختلف فیہ ہے، جمہور کے نزدیک ناجائز اور بعض ائمہ کے نزدیک جائز پہلی صورت یہ ہے، کہ سیاہ خضاب کوئی مجاہد و غازی بوقت جہاد لگائے تا کہ دشمن پر رعب ظاہر ہو، یہ باجماع ائمہ و باتفاق مشائخ جائز ہے،

(۱) صحیح قول کے مطابق مستحب ہے مرد کے لئے خضاب اپنے بالوں اور ڈاڑھی کا علاوہ لڑائی کے موقع کے بھی،

لما فی العالمگیریة و اما الخضاب بالسواد فمن فعل ذالک من الغزاة لیکون اھیب فی عین العدو فھو محمود منه، اتفق علیه المشائخ رحمھم اللہ تعالیٰ (۱)۔ (عالمگیری کتاب الکراہیة باب ۲۰، ص ۳۶۹، ج: ۵ ومثلہ فی ردالمحتار عن الذخیرة، ص: ۲۹۵، ج: ۵)

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کو دھوکہ دینے کے لئے سیاہ خضاب کریں، جیسے مرد عورت کو یا عورت مرد کو دھوکہ دینے اور اپنے آپ کو جوان ظاہر کرنے کے لئے ایسا کرے یا کوئی ملازم اپنے آقا کو دھوکہ دینے کے لئے کرے، یہ باتفاق ناجائز ہے، کیونکہ دھوکہ دینا علامات نفاق میں سے ہے، اور کسی مسلمان کو دھوکہ دے کر اس سے کوئی کام نکالنا باتفاق حرام ہے، ایک صحیح حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من (۲) غشنا فلیس منا و المکر و الخداع فی النار ۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر و الصغیر باسناد جید، و ابن حبان فی صحیحه و ابوداؤد فی مراسیله عن الحسن مرسلاً مختصر قال المکر و الخدیعة و الخیانة فی النار ۔ (ترغیب وترہیب للمنذری)

نیز حدیث میں ہے، المؤمنون (۳) بعضھم لبعض نصحة و ان بعدت منازلھم و ابدانھم و الفجرة بعضھم لبعض غششة یتخاونون و ان اقتربت

---

(۱)...... لیکن خضاب بالسواد پس جس شخص نے غازیوں میں سے کیا تا کہ دشمنوں پر اس کی ہیبت طاری ہو، تو یہ محمود ہے اتفاق کیا اس پر تمام مشائخ نے۔

(۲)...... جو شخص ہمیں دھوکہ دے وہ ہم سے نہیں، اور مکر وفریب جہنم میں ہے اور دوسری روایت میں ہے مکر وفریب اور خیانت جہنم میں ہے۔

(۳)...... پکے مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں اگر چہ ان کے گھر اور بدن دور ہوں اور بدکار لوگ ایک دوسرے کو دھوکہ دینے والے ہیں کہ آپس میں خیانت کرتے ہیں اگر چہ ان کے گھر اور بدن قریب واقع ہوں۔

منازلھم و ابدانھم رواہ الشیخ ابن حبان فی کتاب التوبیخ کذا فی الترغیب للمنذری۔ نیز صحیح بخاری کی ایک حدیث کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

من(۱) اعظم الفراء ان یدعی الرجل الی غیر ابیہ و یری عینہ مالم تر او تقول علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم ما لم یقل۔

(بخاری ص:۴۹۸،ج:۱)

تیسری صورت یہ ہے کہ یہ ہے کہ محض تزین کے لئے سیاہ خضاب کیا جائے تا کہ اپنی بیوی کو خوش کرے، اس میں اختلاف ہے، جمہور ائمہ و مشائخ اس کو مکروہ فرماتے ہیں، اور امام ابو یوسف اور بعض مشائخ جائز قرار دیتے ہیں، منع کرنے والوں کا استدلال صحیح مسلم کی حدیث ہے،و بعض (۲) الفاظہ غیروا ھذا بشئ و جنبوہ السواد۔(من زاد المعاد ص:۱۲۷، ج:۲) نیز صحیح میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

یکون (۳) قوم یخضبون فی اٰخر الزمان بالسواد و لایریحون رائحۃ الجنۃ۔ رواہ ابوداؤدو النسائی وابن حبان فی صحیحہ والحاکم قال صحیح الاسناد الخ (ترغیب وترہیب للمنذری)

اور جائز رکھنے والے حضرات بعض صحابہ کے فتاویٰ اور تعامل سے استدلال کرتے ہیں، اور حدیث مذکورہ میں یہ تاویل فرماتے ہیں کہ ممانعت اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے، جس میں تلبیس اور دھوکہ دینا مقصود ہو، اور جن حضرات صحابہ سے سیاہ خضاب کرنا منقول ہے، ان میں حضرت حسنؓ اور حسینؓ بھی ہیں۔ ابن جریر نے تہذیب الآثار میں

---

(۱)...... بڑا افتراء یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنے نسب کو منسوب کرے اور آنکھ کو دھوکہ سے وہ چیز دکھلائے جو واقع میں وہ نہیں دیکھتی یا رسول کی طرف ایسی بات منسوب کرے جو آپ نے نہیں فرمائی۔(بخاری)

(۲)...... بالوں کی اس سفیدی کو کسی چیز سے بدل دو اور سیاہی سے اس کو بچاؤ۔

(۳)......ایک قوم آخر زمانہ میں سیاہ خضاب کرے گی اور جنت کی خوشبو اس کو نہ پہنچے گی۔

اس کو نقل کیا ہے۔ کذا فی الزاد نیز حدیث میں عثمان بن عفان اور عبداللہ بن جعفر، سعد بن ابی وقاص، عقبہ ابن عامر، مغیرۃ بن شعبہ، جریر بن عبداللہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم سے ایسا ہی نقل کیا ہے، اور امام ابو یوسفؒ انھیں حضرات کے تعامل سے حجت اختیار کر کے فرماتے ہیں

كما يعجبني ان تتزين لي يعجبها ان اتزين لها۔ (کراہیۃ شامی، ص:۲۹۵، ج:۵) وفي العالمگيرية و من فعل ذالك ليزين نفسه للنساء فيحبب اليهن فذالك مكروه وعليه عامة المشائخ و بعضهم جوز ذالك من غير كراهية و عن ابي يوسفؒ انه قال كما يعجبني ان تتزين لي يعجبها ان اتزين لها كذا في الذخيرة (عالمگیری ص:۳۷، ج:۵)

اور جمہور مشائخ نے اصل احادیث مرفوعہ کو حجت بنا کر مذہب قرار دیا، اور صحابہ مذکورین کے عمل کا یہ جواب دیا کہ ان حضرات کا خضاب خالص سیاہ نہ تھا، بلکہ سرخ سیاہی مائل تھا، اور کیسے ہو سکتا ہے کہ حدیث کی ممانعت اور سخت وعید کے باوجود یہ حضرات اس کا خلاف کرتے، اس لئے احتیاط عمل اور فتویٰ میں یہی ہے کہ خالص سیاہ خضاب غیر غازی کے لئے مکروہ ہے کما مر من العالمگیریۃ ورد المحتار۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کتبہ احقر محمد شفیع غفرلہ

خادم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

۶ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

مسئلہ مذکورہ سے متعلق دو فقہی سوالات کا جواب

سوال: نمبر ۱

باعث تحریر آنکہ اس طرف بعض علماء چار انگشت سے کم داڑھی کٹوانے کو جائز کہتے ہیں، اور صرف منڈانے یا اتنی پست کرنے کی حرمت کے قائل ہیں، جو منڈانے کے مشابہ ہو، ان کی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ حدیث وعبارات فقہاء سے مقدار قبضہ (ایک مشت) کا وجوب اور قص مادون القبضہ کی حرمت ثابت ہوتی ہے، مگر اس کی علت مخالفت مشرکین و تشبہ بالمخنثین ہے۔

۱:.....اخرج الامام البخاری و مسلم فی صحیحیهما عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه و سلم خالفوا المشرکین اوفروا اللحیٰ و احفوا الشوارب و فی روایة انهکوا الشوارب و اعفوا اللحیٰ۔

۲:.....و قال فی الفوائد شرح الکنز فی کتاب الصوم و صرح فی النهایة بوجوب قطع مازاد علی القدر المسنون و هو القبضة و کان ابن عمرؓ یقطع مازاد علی الکف و اما ما فعله الاعاجم و اکثر المغاربة فهو مخالف لاصول الدین کما فی الصحیحین عن ابن عمرؓ احفوا الشوارب و اعفوا اللحیٰ من ان یاخذ غالبها کالرافضة الضالة المضلة قطع الله دابرهم و سوّد وجههم انتهیٰ۔

۳:.....قال فی اللمعات شرح المشکوٰۃ فی باب السواک هل یجوز حلق

اللحية كما يفعل الجوالقيون. الجواب لايجوز ذكره فى جناية الهداية و كراهية التجنيس و ظاهر كلامهم حرمة حلق اللحية ونقصانها من القدر المسنون الخ

۴:......قال فى فتح القدير فى باب الصوم و اما الاخذ منها اى من اللحية و هى دون ذالك اى قدر القبضة كما يفعله بعض المغاربة و مخنثة الرجال فلم يبحه احد انتهىٰ. و كذا ذكره فى الدرالمختار فى كتاب الصوم ناقلا عن الفتح و صاحب فتح المعين شرح المسكين ناقلا عن الفتح و الشرنبلالية۔

۵:......و قال الشيخ المحقق عبد الحق الدهلوى فى اشعة اللمعات شرح المشكوٰة فى باب السواک وحلق کردن لحیہ حرام است وروش فرنج و جوالقیان است کہ ایشاں راقلندریہ گویند۔

۶:......و قال فى فتح البارى و عمدة القارى شرحى البخارى قوله خالفوا المشركين و فى حديث ابى هريرة خالفوا المجوس و هو المراد فى حديث ابن عمرؓ فانهم كانوا يقصون لحاهم و منهم من كان يحلقها انتهىٰ۔

۷:......قال العلامة عبد الغفور الهمايونى فى فتاواه نیز کم کردن لحیہ از قدر قبضہ از آثار مخنثۃ الرجال است۔

۸:......و قال فى موضع آخر نیز درآخر حدیث اعفوا اللحية لفظ خالفوا المشركين واقع است بمنزلہ علت است مر اعفاء اللحیۃ وشک نیست کہ عادت المشرکین حلق ہم بود وقص مادون القبضہ ہم الخ

۹:......و قال موضع آخر پس ازینجا ثابت شد کہ حلق لحیہ وتخفیف آن فعل کفرہ است و تشبہ بکفرہ فجرہ ممنوع است انتہیٰ۔

مذکورہ بالا دلائل سے ثابت ہوگیا کہ حلق وقص مادون القبضہ کی حرمت صرف تشبہ بالمشرکین والمخنثۃ کی وجہ سے ہے، اور زمانہ موجودہ میں کوئی مشرک یا مخنث ایسا نہیں، جو حلق یا قص قریب من الحلق نہ کرتا ہو، لہٰذا قص مادون القبضہ جو حلق کے قریب نہ ہو، اس میں تشبہ نہیں جو علت ہے، حرمت کی اور عدم علت کی وجہ سے معلول بھی معدوم ہوگیا انتہیٰ دلیل الخصم۔ اب قابلِ دریافت یہ امر ہے کہ مقدار قبضہ کی علت تو واقعی مذکورہ بالا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ علت زمانہ موجود میں پائی نہیں جاتی تو کیا ایسا بھی کوئی حکم ہے کہ واجب تو کسی علت کی بناء پر ہو، مگر بعدہ علت کے معدوم ہو جانے کے باوجود اس کا وجوب باقی رہے، اگر ہوسکتا ہے تو اس کے چند نظائر تحریر فرما کر تسکین فرماویں، اور قص مادون القبضہ کے جواز کے مثبت چونکہ اس کے جواز میں فتاویٰ شائع کر رہے ہیں، عوام بلکہ خواص کے بھی فتنہ میں پڑ جانے کا احتمال ہے، لہٰذا جواب پوری تحقیق وتدقیق سے مدلل تحریر فرما کر ممنون فرماویں۔

الجواب (۱)

قرآن وحدیث کے معانی ومفہوم اور خدائے تعالیٰ اور اس کے رسول کی مراد متعین کرنے میں سب سے بڑا اسوہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا تعامل ہے، اس سے قطع نظر کر کے جو مراد ومفہوم سمجھ لیا جائے، اس میں اکثر مغالطے پیش آتے ہیں، جو اصول آپ نے تحریر فرمایا ہے، اگر اس کو اسی طرح عام کر دیا جائے کہ احکام شرعیہ کے اسباب وعلل نکال کر ان پر احکام کو دائر کر دیں، تو احکام شرعیہ کا اکثر حصہ خود بخود ختم ہو جائے گا، نماز کی حکمت وغرض تواضع وعبدیت ہے، روزہ کی علت نفس کی خواہشات کو قابو میں رکھنے اور خلاف شرع سے بچنے کی عادت اور زکوٰۃ کی علت مالی ایثار قرار دے کر اگر کوئی صاحب ان قیود وشرائط سے آزاد ہونا چاہے، جو ان فرائض کی ادائیگی کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً یا عملاً ثابت ہیں، تو کیا کوئی اس کو جائز قرار دے سکتا ہے، اذان

اور اقامت کی علت لوگوں کو جماعت کے لئے بلانا ہے، یہ علت دو کلمے "نماز کے لئے آؤ" کہہ دینے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے، مگر کیا کوئی اہل فہم اس کی اجازت دے گا کہ اذان کے مشروع و مسنون طریقے کو چھوڑ کر اس پر اکتفا کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ احکام شرعیہ میں ہر ایک حکم کے بہت سے اسباب وعلل ہوتے ہیں، ایک سبب یا علت کے موجود و معدوم ہونے پر احکام میں تغیر وتبدل نہیں کیا جا سکتا، دیکھئے تصویر کی ممانعت کی احادیث میں مختلف وجوہ مذکور ہیں، کہیں تشبہ بالکفار، کہیں یہ کہ فرشتے اس سے نفرت کرتے ہیں، کہیں یہ کہ یہ آرائش دنیاوی کی چیز ہے، اور فحش وعریاں تصاویر میں دوسری اخلاقی خرابیاں بھی ہیں کہیں مطلقاً تصویر کھینچنے اور اس کے استعمال کو ممنوع قرار دیا ہے، تو اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم ایسی تصاویر نہیں رکھتے، جن سے بت پرستوں کی مشابہت لازم آوے بلکہ اپنے احباب واقرباء کے فوٹو یا تصویر رکھتے ہیں، تو کیا اس سے تصویر کی اجازت نکل آوے گی؟ نہیں، جب کہ تصویر کی مطلقاً بھی ممانعت ہے، اور مختلف اسباب اس کی ممانعت کے احادیث میں وارد ہیں، تو ایک سبب کا نہ ہونا، اس کو جائز نہیں کر دے گا، جیسے ایک مجرم پر دس دفعات جرم عائد ہوں، حاکم اس کو ایک دفعہ جرم سے بری کر دے، تو یہ لازم نہیں آتا کہ وہ بالکل بری ہو گیا، غرض اپنی طرف سے یا بعض الفاظ حدیث سے کسی حکم شرعی کا کوئی سبب اور کوئی منشاء معلوم کر کے تعامل نبوی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرامؓ سے قطع نظر اس علت وسبب پر حکم دائر کر دینا کسی اہل فہم کے نزدیک جائز نہیں ہو سکتا ورنہ شراب کی حرمت کی علت نشہ ہے، نشہ کے درجہ سے کم پینا جائز کہنا پڑے گا، (معاذ اللہ) ہاں بعض احکام وہ بھی ہیں، جن کے اسباب وعلل خود حدیث میں بتلا دیئے گئے ہیں جس سے یہ بھی ثابت ہے کہ ان احکام کا دارومدار اس علت پر ہے، وہاں حضرات فقہاء نے بیشک علت بدل جانے پر حکم بدل جانے کا فیصلہ کیا ہے، جیسے عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت کا مسئلہ ہے کہ اس کی بناء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں فتنہ کا خوف

غالب نہ ہونے پر تھی اس بناء اور اس علت کی تصریحات خود روایات حدیث میں موجود ہیں، بعد میں حضرات صحابہؓ نے محسوس کیا کہ اب یہ بناء باقی نہیں رہی، اس لئے ممانعت کر دی، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کا ارشاد منقول ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان حالات کا مشاہدہ فرماتے تو منع فرما دیتے۔

اسی بناء پر حضرات فقہاء نے اس علت پر حکم دائر کر دیا، داڑھی کے بارے میں اصل حکم تو یہ ہے کہ داڑھی چھوڑو، اور مونچھیں کٹواؤ، یہ مطلق ہے، اس میں کوئی قید و شرط نہیں ہے کسی روایت میں اس حکم کی ایک حکمت بیان کر دی کہ اس کے ذریعہ تشبہ بالکفار سے حفاظت ہو جائے گی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری جماعت صحابہؓ و تابعین میں کسی ایک سے کسی ایک وقت میں بھی یہ منقول نہیں کہ چار انگشت سے نیچے ڈاڑھی کو کٹوا دیا ہو، اس علت پر کہ اس سے تشبہ بالکفار باقی نہیں رہا، کیونکہ جس طرح آج کل کے کفار داڑھی منڈواتے ہیں، جیسے ہنود یا پوری رکھتے ہیں، جیسے سکھ و یہود، درمیانی حالت کہ کٹوا کر ایک دو انگشت چھوڑ دیں، کسی خاص فرقۂ کفار کا شعار نہیں، اسی طرح قرون مشہود ہ بالخیر میں بھی یہ کیفیت کسی فرقہ کا شعار نہ تھا، اگر محض تشبہ بالکفار سے نکل جانا داڑھی کٹوانے کے جواز کے لئے کافی ہوتا ہے، تو اتنے طویل زمانہ میں لاکھوں، کروڑوں انسانوں میں کوئی تو اس پر اقدام کرتا۔

الغرض احادیث صحیحہ سے تو یہی ثابت ہے کہ ڈاڑھی بالکل نہ کٹوائی جائے، لیکن صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہ ثابت ہوا کہ اس کی مراد یہ ہے کہ ایک مشت سے کم نہ کٹوائیں، اگر اس سے زائد ہو، تو کٹوانے میں مضائقہ نہیں، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل اور قول سے ثابت ہے، اس تعامل صحابہؓ سے حکم حدیث کا مفہوم متعین ہو گیا، اب اس سے کم کر دینا کسی اہل تفقہ کے نزدیک جائز نہیں ہو سکتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

سوال ۔۲

حضرت تھانویؒ نے ترک ما زاد علی القبضہ کو مباح لکھا ہے، کما ہو المشہور فی الخواص ایضاً اور عبارات مندرجہ ذیل سے قص ما زاد کا وجوب اور ترک ما زاد کی حرمت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اپنی تحقیق سے مطلع فرماویں، عبارات مثبت وجوب قص ما زاد علی القبضہ یہ ہیں:

قال فی الفوائد شرح الکنز فی کتاب الصوم و صرح فی النهاية بوجوب قطع مازاد على القدر المسنون و هو القبضة و قال العلامة الطحطاوى فی حاشية الدر المختار فیما یفسد الصوم و ما یکره فیه و صرح فی النهاية بوجوب قطع مازاد على القبضة بالضم و مقتضاه الاثم بترکه الا ان یحمل الوجوب على الثبوت.

قال فی النهر و سمعت من بعض اعزاء الموالی ان قول النهاية بالحاء المهملة و لا باس به قلت و هو الذی فی الشرنبلالية لکن عبارة النهاية قرينة على فهم الوجوب منها لتعبيره بكان المفيدة للمواظبة المفيدة للوجوب و نصها كما فی النهر يجب قطعه هكذا ثبت عن رسول الله صلى الله عليه و سلم انه كان ياخذ من اللحية من طولها و عرضها انتهىٰ۔

نیز جب امر وجوب کے لئے ہوتا ہے اور اعفوا اللحیٰ میں بھی بالاتفاق وجوب پر محمول ہے، قصوا الشوارب میں کس قرینہ کی وجہ سے وجوب نہیں لیا گیا کہ جملہ فقہاء قص الشوارب کے سنت ہونے کے قائل ہیں، وجوب کا کوئی قائل نہیں فقط۔

بینوا و توجروا۔ العبد رشید احمد عفی عنہ

الجواب (۲)

تعامل صحابہؓ ہی سے اس کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ سب صحابہ کرامؓ کا یہ معمول نہیں تھا کہ مافوق القبضہ کو کتروائیں، اس لئے روایت حدیث میں اس کو خاص خاص صحابہؓ کا معمول نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قطع مازاد واجب نہیں، اس لئے عامہ فقہاء نے اباحت ہی کا حکم دیا ہے، اور جس کے کلام میں وجوب کا لفظ آ گیا ہے، اس کے معنی ثبوت کے قرار دیتے ہیں، اور حدیث احفوا الشوارب سے شوارب کو کٹوانا ایسا ہی واجب ہے جیسے ڈاڑھی کو چھوڑنا مجھے کہیں یاد نہیں کہ فقہاء نے اس کے وجوب کا انکار کیا ہے، البتہ تعامل صحابہؓ سے یہاں بھی ایک حد ثابت ہے کہ اس سے زائد کا کٹوانا واجب ہے، اس سے کم رہتے ہوئے گنجائش ہے، اور وہ حد لبوں کا حصہ اسفل ہے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کراچی۔ شوال ۱۳۶۷ھ

۹۹

التصوير لاحكام التصوير

تصویر کے شرعی احکام

جس میں عام کیمرہ کی تصاویر اور فوٹو فلم سے
متعلق شرعی احکام مفصل بیان کئے گئے ہیں

تاریخ تالیف ــــــــــ ۱۳۳۸ھ (مطابق ۱۹۱۹ء)

مقامِ تالیف ــــــــــ دارالعلوم کراچی

تصویر سے متعلق اس رسالہ کا پس منظر خود حضرت قدس سرہٗ کی اپنی تحریر میں آ رہا ہے۔

مُقَدّمَة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی الیہ لو لا ان ھدانا اللہ والصلٰوۃ والسلام علٰی خیر خلقہ وصفوۃ رسلہ الذی فوز الدنیا والاٰخرۃ فی الاقتفاء بھدیہ وھداہ، وعلٰی اٰلہ وصحبہ الذین ھم القُدوۃ والاُسوۃ فی فھم الکتاب والسنّۃ والعمل بمقتضاہ حمدًا وصلٰوۃً لا منتھی لہ الا رضاہ.

زیرِ نظر رسالہ آج سے چوّن سال پہلے ۱۳۳۸ھ میں اُس وقت لکھا گیا تھا، جبکہ یہ ناکارہ گناہگار ضابطہ کی طالب علمی سے ۱۳۳۶ھ میں فارغ ہوکر ابھی طالب علمی اور مدرّسی کے درمیانی برزخ میں بنام معین المدرّسین کچھ ابتدائی اسباق پڑھانے پر دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مأمور تھا۔ اس زمانے میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے ماہنامہ ''معارف'' میں تصویرکشی اور فوٹوگرافی پر شرعی حیثیت سے ایک مکمّل مفصّل بحث حضرت مولانا سیّد سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے کئی قسطوں میں شائع ہوئی، جس میں دورِ حاضر کے اندر تصویر و فوٹو کی فراوانی اور اس میں لوگوں کے ابتلاءِ عام اور بعض ضرورتوں کے پیشِ نظر مساہلت کا موقف اختیار فرمایا، جس کا اختیار کرنا ابتلاءِ عام کے حالات میں قدیم فقہاء سے بھی منقول ہے۔

مگر وہ اس مساہلت میں ایسی حد پر پہنچ گئے کہ جس کی رو سے فوٹو کے ذریعہ حاصل کی ہوئی تصاویر تو سبھی حلال ہوگئیں اور غیر عکسی تصاویر بھی صرف پوجاپاٹ کی

مورتیوں کے سوا اکثر مباح و جائز ہوگئیں، جو صحیح روایاتِ حدیث اور سلف صالحین کے تعامل کے سراسر خلاف تھا۔

اسی زمانہ میں دارالعلوم دیوبند سے ایک ماہنامہ بنام ''القاسم'' حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کی ادارت اور اُستاذِ محترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی نگرانی میں نکلتا تھا، دونوں بزرگوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اس مقالہ پر تنقید لکھوں جس کو ''القاسم'' میں شائع کیا جاوے گا۔

میں اپنی کم عمری اور طالب علمی سے نیا نیا فارغ ہونے کی وجہ سے حضرت ولانا سیّد سلیمان صاحب قدس سرہٗ کے علمی مقام اور بزرگی سے بھی واقف نہیں تھا، میں نے اساتذہ کی تعمیلِ حکم کے لئے بڑی آزادی سے اس مقالہ میں بہت مفصل تنقید لکھی جو دیوبند کے ماہنامہ ''القاسم'' میں ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ سے ماہ صفر ۱۳۳۹ھ تک باقساط شائع ہوئی، اُس وقت یہ کس کو خبر تھی کہ بارہ پندرہ سال کے بعد اس مقدس ہستی کے ساتھ موافقت اور رمرافقت ایسی ہوگی جو لبِ گور تک بلکہ انشاء اللہ آخرت میں بھی چلے گی، جس کا ظہور مولانا موصوف کے تھانہ بھون کی طرف رجوع اور سیّدی حکیم الاُمت کی خدمت میں رہ کر کسبِ فیض سے ہوا۔ بہرحال اُس وقت ایک آزادنہ تنقید اس موضوع پر لکھی گئی اور شائع ہوگئی، اسی عرصہ میں یہ بھی معلوم ہوا کہ مصر کے بعض علماء نے بھی فوٹو کی تصاویر کو جائز قرار دے دیا ہے، جس پر مصر کے دوسرے علماء نے تنقیدیں لکھی ہیں، مگر اتفاق سے اس وقت ان میں سے کوئی چیز میرے سامنے نہیں آئی جس سے بحث و تحقیق میں مدد ملتی۔

یہ تنقیدی مقالہ عام مسلمانوں میں پسند کیا گیا اور اس کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی فرمائشیں مختلف اطراف سے وصول ہوتی رہیں، مگر اس طرح کی قیل و قال اور تنقیدات کو مستقل تصنیف کی شکل دینا طبعاً پسند نہ تھا، نظرِ ثانی کر کے مسئلہ کی مثبت تحقیق کا مواد جمع کرنے کے لئے فرصت درکار تھی، جو اس وقت میسر نہ ہوئی۔

پورے چودہ سال کے بعد جبکہ احقر دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی کے منصب پر مامور ہو کر دن رات فتویٰ کی خدمت میں لگا ہوا تھا اور مشغلہ ہی فقہی مسائل بن گئے تھے، اطراف واکناف سے تصاویر کے متعلق سوالات بکثرت آتے اور مختصر ہی فتویٰ کی صورت میں جواب کے ساتھ لوٹتے تھے، اس وقت پھر بعض احباب کے فرمانے سے یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اس رسالہ کی اشاعت فائدہ سے خالی نہیں، اگر کسی کو بھی عمل کی توفیق نہ ہو تو کم از کم علمِ صحیح ہو کر گناہ کو گناہ تو سمجھے گا، اس کو جائز سمجھنے کے دوسرے اور سخت گناہ سے تو بچے گا، اس کے علاوہ بعض خاص قسم کی تصاویر خاص حالات میں استعمال کر لینے کی گنجائش جو احادیثِ رسولؐ اور تعاملِ سلف سے ثابت ہے، وہ لوگوں کے علم میں آجائے تو دیندار مسلمان تنگی سے بچ جائیں گے۔

چنانچہ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ میں اس مقالہ پر نظرِ ثانی کر کے "التصویر لاحکام التصویر" کے نام سے شائع کر دیا گیا، جس میں جاندار چیزوں کی تصویر بنانے اور اس کے استعمال کرنے کے متعلق روایاتِ حدیث، تعاملِ صحابہؓ و تابعینؒ اور اقوالِ ائمہ مجتہدینؒ کو جمع کر کے مسئلے کے ہر پہلو کو واضح کر دیا گیا، اور بعض خاص حالات میں خاص قسم کی تصویریں جن کے استعمال کی گنجائش روایاتِ حدیث اور اقوالِ ائمہ اور قواعدِ فقہیہ سے ثابت ہوئی، ان کی بھی تفصیل لکھ دی گئی۔

اس مستقل رسالہ کی اشاعت سے کچھ مدت کے بعد حضرت مولانا سیّد سلیمان صاحب ندوی قدس اللہ سرہٗ کا ایک گرامی نامہ میرے پاس پہنچا، جس میں لکھا تھا کہ: اپنا رسالہ "التصویر لاحکام التصویر" جو آپ نے میرے ہی ردّ میں لکھا ہے، اس کا نسخہ مجھے بھیج دیجئے، احقر نے فوراً تعمیلِ حکم کی، یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ حضرت علّامہ سیّد صاحبؒ نے مرشد تھانوی حضرت حکیم الاُمت کی طرف رجوع فرمایا اور تزکیۂ نفس کے لئے بار بار تھانہ بھون حاضری کی نوبت آئی، تزکیۂ ظاہر و باطن کے ساتھ ماضی کے اعمال و افعال پر بھی نظر ہونا اور کوتاہیوں کا تدارک کرنا لوازم میں

سے ہے، حق تعالیٰ نے جب سیّد صاحبؒ کو اس مقام فناء پر سرفراز فرمایا تو اپنے اعمالِ ماضیہ کے جائزے اور تلافیٔ مافات کے ساتھ اپنی چالیس سالہ علمی تحقیقات اور مستقل تصانیف اور مقالات و مضامین اس جائزہ کا مستقل موضوع بنے، اور بالآخر محرّم ۱۳۶۲ھ میں معارف اعظم گڑھ مؤرخہ جنوری ۱۹۴۳ء آپ نے سلف صالحین کی اس سنت کو زندہ فرمایا اور ''رجوع و اعتراف'' کے عنوان سے ایک مضمون اپنی سب تصانیف اور تحریرات و مضامین کے متعلق اجمالاً اور خاص خاص مسائل سے رجوع کے متعلق تفصیلاً شائع فرمایا، اس میں مسئلۂ تصویر کے بارے میں مضمونِ سابق ''معارف'' میں شائع ہوا تھا، اس کے ان اجزاء سے پوری تصریح و وضاحت کے ساتھ رجوع کا اعلان فرمادیا، جو جمہور فقہاءِ اُمت سے مختلف تھے۔

یہ رجوع و اعتراف کا مضمون علامہ سیّد صاحبؒ کے کمالِ علم اور کمالِ تقویٰ کا بہت بڑا شاہکار ہے، اس پر خود مرشد تھانوی سیّدی حکیم الأمۃ رحمۃ اللہ علیہ نے غیر معمولی مسرّت کا اظہار نظم میں فرمایا، اگرچہ یہ مضمون خود ایک نہایت مفید مقالہ ہے جس کو اس جگہ پورا شائع کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن بغرضِ اختصار صرف اتنا حصہ نقل کیا جاتا ہے جتنا مسئلۂ تصویر سے متعلق ہے، یہ مضمون احقر نے محبّ محترم ڈاکٹر غلام محمد صاحب کی تصنیف ''تذکرہ سلیمان'' سے نقل کیا، جس میں موصوف نے حضرت سیّد صاحب کی سیرت کے حالات جمع فرمائے ہیں، اس کے صفحہ: ۱۴۷ پر ہے:-

''مسئلۂ تصویر کے متعلق میں نے ۱۹۱۹ء میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں (۱) ذی رُوح کے فوٹو لینے یعنی عکسی تصویر کشی اور خصوصاً (۲) نصف حصہ جسم کے فوٹو کا جواز ظاہر کیا تھا، اس سلسلہ میں بعد کو ہندوستان اور مصر کے بعض علماء نے بھی مضامین لکھے جن میں سے بعض میرے موافق ہیں اور بعض میرے مخالف، لیکن بہر حال اس بحث کے سارے پہلو سامنے آگئے ہیں، اس لئے سب کو سامنے رکھ کر اب اس سے اتفاق ہے کہ صحیح یہی ہے کہ امرِ اوّل دستی تصویر کی طرح ناجائز ہے اور امرِ ثانی کا کھینچنا

ناجائز اور کھنچوانا باضطرار جائز اور دھڑ کا بغیر سَر اور چہرہ کے دونوں جائز ہیں، پوری تفصیل آئندہ لکھی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔''

اس وقت تک اگرچہ تصویر کشی اور اس کے استعمال میں عوام و خاص کا ابتلاء عام ہو چکا تھا مگر اس کے جواز پر کسی عالم نے بجز سیّد صاحبؒ کے ہندوستان میں قلم نہیں اُٹھایا تھا، اور حضرت سیّد صاحبؒ نے اس سے بوضاحت رجوع کا اعلان فرمادیا۔

دوسری طرف یہ واقعہ بھی تقریباً اسی زمانے میں پیش آیا کہ ابوالکلام آزاد صاحب مرحوم جنہوں نے مدت دراز تک اپنا مشہور اخبار ''الہلال'' باتصویر شائع کیا، جب وہ رانچی جیل میں تھے، آپ کے متعلقین میں سے بعض حضرات نے آپ کی سوانح اور حالات کو بنام ''تذکرہ'' جمع کر کے اس کی اشاعت کا ارادہ کیا تو جدید مصنفین کی رسم کے مطابق انہوں نے رانچی جیل میں آپ کو خط بھیجا کہ مجھے اپنا فوٹو عنایت فرمادیں جس کو میں کتاب کے شروع میں لگانا چاہتا ہوں۔

اس پر علاّمہ ابوالکلام آزاد مرحوم نے جو جواب تحریر فرمایا وہ خود اسی تذکرہ میں ان الفاظ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے:

> ''تصویر کا کھنچوانا، رکھنا، شائع کرنا سب ناجائز ہے، یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھنچوائی اور ''الہلال'' کو باتصویر نکالا تھا، اب میں اس غلطی سے تائب ہو چکا ہوں، میری پچھلی لغزشوں کو چھپانا چاہئے نہ کہ ازسرِنو ان کی تشہیر کرنا چاہئے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے جس صفائی اور صراحت کے ساتھ نہ صرف اپنے سابقہ عمل سے رجوع بلکہ تائب ہونے کا ذکر فرمایا، یہ بھی اُن کی عالی ہمتی اور دین کی فکر کی بڑی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرماویں۔

ان دونوں حضرات کے رجوع کے بعد میری نظر میں اس رسالہ ''التصویر لاحکام التصویر'' کی اشاعت کی کوئی خاص ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

ایک علمی تحقیق اور مسائل و دلائل کے مثبت پہلو کو شائع کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہ تھا، مگر ہوا یہ کہ اس رسالہ کے دو حصے کر دیئے گئے تھے، پہلا حصہ مسائل و دلائل اور بحث کا مثبت پہلو تھا، دوسرے حصہ میں حضرت سیّد صاحبؒ کے دلائل کا جواب انہیں کو مخاطب کر کے ناقدانہ لہجہ میں لکھا گیا تھا، حضرت سیّد صاحبؒ کے اعلانِ رجوع کے بعد اس حصہ کو اسی طرح شائع کر دینا طبعاً گوارا نہ تھا اور نظرِ ثانی کر کے اس کو بدلنا ایک محنت و فرصت چاہتا تھا، اسی لئے بہت سے حضرات کے تقاضے کے باوجود ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ سے ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ تک کے پورے چالیس سال میں یہ رسالہ شائع نہیں ہوسکا۔

اس چالیس سال کی مدت میں زمانہ کہاں سے کہاں پہنچا، حالات میں کیا کیا انقلاب آئے، تصویر اور فوٹو زندگی کا جزو بن گئے، دنیا کی کوئی چیز اس سے خالی نہ رہی، عوام و خواص سبھی اس میں مبتلا ہوگئے، ہندوستان، پاکستان اور خصوصاً عرب ممالک کے بڑے بڑے علماء و فضلاء اربابِ عمائم سبھی کی تصاویر اخباروں اور کتابوں کی زینت بنی ہوئی ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ ان میں بہت سے علماء کو بغیر ان کے علم اور قصد کے فوٹو اسٹیج پر زبردستی لایا گیا ہے، مگر اس میں بھی شبہ نہیں کہ بہت سے علماء خود گروپ فوٹوؤں میں کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں، اس عموم و شیوع اور ابتلاءِ عام کا ایک طبعی تقاضا تو مایوسی اور خاموشی تھا، مگر دوسرا عقلی تقاضا یہ تھا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ متواترہ نے حرام و ناجائز قرار دیا ہے، لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے باخبر کرنے اور مقدور بھر اس گناہ سے بچنے کے لئے کسی کے ماننے نہ ماننے بلکہ طعنے اور فقرے کسنے کی پروا کئے بغیر پوری جدوجہد کی جائے، جو عقل و شرع کا تقاضا ہے، کیونکہ وبائی بیماری کے عام ہوجانے کے وقت اگر حفظِ ماتقدم کے متعلق ساری ڈاکٹری تدبیریں فیل ہوجائیں اور وباء عام پھیل جائے تو کسی عقل مند کے نزدیک ڈاکٹر کا اس وقت یہ کام نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اب لوگوں کو

یہ تلقین کرنے لگے کہ اس بیماری کو بیماری نہ سمجھو، نہ اس کا کوئی علاج کرو، نہ اس سے بچنے کی فکر کرو، بلکہ ڈاکٹر اس عمومِ وباء کے وقت بھی دوا و علاج نہیں چھوڑتے اور ان میں بہت سے کامیاب بھی ہوتے ہیں۔

اسی لئے اس وقت کہ یہ ناکارہ گناہگار اپنی عمر کا اٹھترواں سال شدید امراض اور سقوطِ قویٰ اور ضعفِ عمر کی حالت میں گزار رہا ہے، اپنی بعض تصانیف پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کر کے لیٹے بیٹھے یہ کام شروع کیا تو اس رسالہ کو اس لئے مقدّم رکھا کہ اگر احقر نے اس کو اس حالت میں چھوڑ دیا تو میرے بعد جو کوئی اس کو طبع کرے گا وہ اس کی موجودہ حالت میں جس کی اشاعت مجھے پسند نہیں، اس لئے بنامِ خدا تعالیٰ باوجود ضعفِ شدید نظرِ ثانی اور ضروری ترمیمات کے لئے قلم اُٹھایا، واللہ الموفِّق والمعین!

تنبیہ ضروری

الف:- اس نظرِ ثانی میں یہ بھی ممکن تھا کہ رسالہ کے حصہ دوم کو جو شبہات و اشکالات کے جواب میں ہی ہے، پورا حذف کر دیا جاتا، مگر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو دلائل اور وجوہ حضرت سیّد سلیمان صاحبؒ جیسے بزرگ کو اس مسئلہ میں جمہور سے اختلاف کی طرف لے گئے، وہ دوسرے علماء کو بھی پیش آ سکتے ہیں بلکہ آ رہے ہیں، اس لئے ان کا جواب شافی ضروری ہے، اس لئے احقر نے حصہ دوم کے طرز کو بدل کر شُبہ اور جواب کا عنوان رکھ دیا۔

ب:- اس میں شک نہیں کہ اس زمانۂ ابتلاء میں لوگوں کو تصویر اور فوٹو سے اجتناب کرنے کے لئے کہنا بظاہر اُن کی زندگی کے قدم قدم پر مشکلات کھڑا کرنے کا مترادف معلوم ہوتا ہے، لیکن شریعتِ اسلام کو حق تعالیٰ نے آسان تر بنایا ہے، اس لئے ضرورت کے مواقع میں کہ گنجائشیں بھی روایاتِ حدیث اور اقوالِ سلف و خلف سے ثابت ہیں، اس رسالہ میں ان کو بھی جمع کر دیا گیا ہے، اور آخر میں سیّدی حضرت حکیم

الأمت تھانوی قدس سرہٗ کے ایک وعظ کا خلاصہ بھی بطورِ ضمیمہ کے لگا دیا ہے جس کا نام "نفی الحرج" ہے، یعنی دینِ اسلام میں تنگی نہیں، اس وعظ میں شریعتِ اسلام کی دی ہوئی سہولتوں کو جس طرح لکھا گیا ہے وہ صرف حضرت حکیم الأمت ہی کا مقام تھا، یہ وعظ صرف مسئلۂ تصویر میں نہیں بلکہ زندگی کے ان تمام مسائل میں جن میں بظاہر شریعت پر عمل دشوار نظر آتا ہے، ایک مشفق رہبر کا کام دیتا ہے، اس ضمیمہ کو ضرور ملاحظہ فرمالیا جائے۔

ایک ضروری تنبیہ

تصاویر کی حرمت اسلام میں ہجرتِ مدینہ کے بعد ہوئی

تصاویر سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو معلوم کرنے سے پہلے یہ معلوم کرلینا مناسب ہے کہ:-

الف:- تصاویر کی حرمت شریعتِ اسلامیہ محمدیہ کا مخصوص حکم ہے، پہلے انبیاء کی شریعتوں میں تصاویر ممنوع نہیں تھیں، جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصّہ میں ان کے حکم سے جنّات کا تصاویر بنانا مذکور ہے۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ..... (سبا:۱۳)

ترجمہ:- بناتے ہیں ان کے لئے جو وہ چاہیں، محرابیں اور تصاویر اور حوض جیسے بڑے بڑے ٹب۔

اور ہجرت سے پہلے شریعتِ اسلام میں تصاویر کی حرمت کا ثبوت نہیں ہے، ہجرت کے بعد اَحکام حرمت کے آئے ہیں (کما ذکرہ فی فتح الباری و مرقاۃ شرح المشکوٰۃ) ان اَحکام کی تفصیل آگے ملاحظہ فرماویں۔

تصویر اور تصویر کشی

پر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

۱:- عَنْ مُسْلِمٍ قَالَ: كُنَّا مَعَ مَسْرُوْقٍ فِيْ دَارِ يَسَارِ بْنِ نُمَيْرٍ فَرَأَى فِي صُفَّتِهِ تَمَاثِيْلَ فَقَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَاللهِ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلَ: اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْمُصَوِّرُوْنَ.

(بخاری مع فتح الباری کتاب اللباس ج:۱۰ ص:۳۱۴)

ترجمہ:- مسلمؒ سے روایت ہے کہ: ہم مسروقؒ کے ساتھ یسار بن نمیر کے گھر میں تھے، مسروقؒ نے اُن کے چبوترہ میں کچھ تصاویر دیکھیں تو فرمایا کہ: میں نے حضرت عبداللہؓ سے سنا ہے، اُنہوں نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ: سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے روز تصویر بنانے والے ہوں گے۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے، اس تصویر کے متعلق مسروقؒ کی رائے یہ تھی کہ یہ کسریٰ کی تصویر ہے اور مسلم کا خیال یہ تھا کہ یہ حضرت مریمؑ کی تصویر ہے، حضرت مسروقؒ نے اس کو مجوسی کی بنائی ہوئی تصویر سمجھا اور مسلم نے کسی نصرانی کی (فتح الباری)۔ اس حدیث میں مصوّروں کے لئے "اشد العذاب" کا ذکر اس آیت کے

منافی نہیں جس میں آلِ فرعون کو اشد العذاب میں داخل کرنے کا ذکر ہے، کیونکہ مراد عذابِ اشد میں داخل ہونا ہے، اس میں مصوّر بھی ہوسکتے ہیں آلِ فرعون بھی اور دوسرے مجرم بھی جیسا کہ حافظ نے طحاوی کی روایت سے مرفوعاً نقل کیا ہے: "اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ رَجُلٌ هَجَا رَجُلًا فَهَجَا الْقَبِیْلَةَ بِاَسْرِهَا." مراد یہی ہے کہ ایسا کرنے والا عذابِ اشد میں آلِ فرعون وغیرہ کا شریک ہوگا۔ (فتح الباری ج:۱۰ ص:۳۱۵)

۲:- عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الَّذِیْنَ یَصْنَعُوْنَ هٰذِهِ الصُّوَرَ یُعَذَّبُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یُقَالُ لَهُمْ: اَحْیُوْا مَا خَلَقْتُمْ!

(بخاری مع فتح ج:۱۰ ص:۳۱۶)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ لوگ جو تصاویر بناتے ہیں، قیامت کے روز ان کو عذاب دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ: جو صورت تم نے پیدا کی ہے اس میں جان بھی ڈالو!

۳:- عَنْ اَبِیْ ذُرْعَةَ قَالَ: دَخَلْتُ مَعَ اَبِیْ هُرَیْرَةَ دَارًا بِالْمَدِیْنَةِ فَرَاٰی فِیْ اَعْلَاهَا مُصَوِّرًا یُصَوِّرُ، فَقَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ یَخْلُقُ کَخَلْقِیْ فَلْیَخْلُقُوْا حَبَّةً وَلْیَخْلُقُوْا ذَرَّةً!

(بخاری مذکور)

ترجمہ:- ابوذرعہؒ کہتے ہیں کہ: میں ابوہریرہؓ کے ساتھ مدینہ کے ایک گھر میں داخل ہوا تو اس کی چھت کے قریب ایک مصوّر کو دیکھا جو تصویر بنا رہا تھا، ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اُس سے زیادہ

ظالم کون ہوگا جو میری طرح یعنی اللہ تعالیٰ کی طرح تخلیق کرنے لگا (وہ کسی جاندار کی تخلیق تو کیا کرسکتا) ذرا ایک دانہ، ایک ذرّہ تو بنا کر دکھائے!

۴:- عَنْ قَتَادَةَ قَالَ: كُنْتُ عِنْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ (الٰى قوله) حَتّٰى سُئِلَ فَقَالَ: سَمِعْتُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً فِي الدُّنْيَا كُلِّفَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنْ يَنْفُخَ فِيْهَا الرُّوْحَ وَلَيْسَ بِنَافِخٍ.

(بخاری مع فتح ج:۱۰ ص:۳۲۳)

ترجمہ:- حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا تھا، ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ: میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص دنیا میں کوئی تصویر (جاندار کی) بنائے گا تو قیامت میں اس کو حکم کیا جائے گا کہ اس میں رُوح بھی ڈالے اور وہ ہرگز نہ ڈال سکے گا (تو اس پر شدید عذاب ہوگا)۔

چاروں روایاتِ مذکورہ میں تصویر بنانے والوں کو قیامت میں سخت عذاب ہونے کا بیان ہے اور اس ضمن میں تصاویر کے استعمال کی ممانعت اور برائی کا بھی بیان ہوگیا، کیونکہ جن حالات میں یہ ارشادات آئے ہیں وہ عموماً اس کے ہیں کہ کسی کے مکان یا کپڑے وغیرہ میں تصویر دیکھی تو اس پر مصوّروں کے عذاب کا ذکر فرمایا، جس میں اشارہ اس طرف بھی ہوگیا کہ یہ عذاب کی چیز اپنے گھروں میں اور استعمال میں رکھنا بھی درست نہیں، جیسا کہ یہ مضمون صراحۃً بھی متعدد احادیث میں آگے آرہا ہے۔

ایک تیسری چیز ان روایات میں یہ بھی ہے کہ تصویرسازی یا تصویر کے استعمال کو شریعتِ اسلام نے کیوں حرام قرار دیا؟ اس کی بہت سی وجوہ میں سے ایک وجہ کا بیان ان روایات میں یہ ہے کہ تصویر اور تخلیق اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی خاص صفات

ہیں، جن میں کوئی غیر اللہ شریک نہیں ہوسکتا، حق تعالیٰ کے ننانوے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک خالق اور مصوّر بھی ہے، اور اس پر پوری اُمت کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں اسم حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر اللہ پر ان الفاظ کا اطلاق بھی جائز نہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:- "هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ" (الحشر:۲۴) اس میں خالق اور مصوّر ہونے کی صفت حق تعالیٰ شانہٗ کی مخصوص صفت قرار دی گئی ہے، جن میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شریک نہیں ہوسکتا، تو جس شخص نے کسی جاندار کی تصویر بنائی اُس نے گویا اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق وتصویر میں مداخلت اور شرکت کا عملی دعویٰ کیا، اسی لئے حدیث نمبر:۴ میں اس کا عذاب یہ ذکر فرمایا ہے کہ قیامت کے روز تصویر سازوں کو بطور سزا کے کہا جائے گا کہ جب تم نے ہماری صفتِ تخلیق وتصویر کی نقالی کر کے عملی طور پر خالق اور مصوّر ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو اب تم اس دعویٰ کو پورا کر کے دکھلاؤ کہ ان میں رُوح بھی ڈالو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی بے جان میں جان ڈالنا نہ دنیا میں کسی کی قدرت میں ہے نہ آخرت میں ہوگا، اس لئے وہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں میں جان نہ ڈال سکیں گے تو ان پر عذاب ہوگا۔

اسی حدیث نے یہ بات بھی واضح کردی کہ جس تصویر سازی کی حرمت ان احادیث میں مذکور ہے اس سے مراد کسی جاندار ذی رُوح کی تصویر ہے، بے جان چیزیں جیسے مکانات، پہاڑ اور درخت وغیرہ ان کی تصویر بنانا اس حکم میں داخل نہیں، جیسا کہ آئندہ آنے والی احادیث میں بروایتِ ابنِ عباسؓ اس کی تصریح بھی آنے والی ہے۔

اور وجہ اس فرق جاندار اور بے جان کی یہ ہے کہ اگرچہ حقیقۃً تخلیق ہر چیز اور ہر ذرّہ ذرّہ کی حق تعالیٰ ہی کی خصوصیت ہے، ساری مخلوق مل کر ایک مکّھی اور مچھر بلکہ اس کا پَر بھی نہیں بنا سکتے، لیکن عموماً مادّی چیزوں کی صنعت کاری میں کچھ نہ کچھ دخل غیروں کا بھی ہوجاتا ہے، اگرچہ وہ دخل بھی محض صورۃً ہی ہو حقیقۃً نہ ہو بخلاف کسی بے جان چیز میں جان ڈالنے کے کہ اس میں کسی کی شرکت کا وہم و گمان بھی نہیں

ہوسکتا، اسی لئے حدیث میں فرمایا کہ ان کو کہا جائے گا کہ ایک دانہ (گندم وغیرہ) کا تو پیدا کر کے دکھلائیں، جاندار چیز کا معاملہ تو بہت ہی بعید ہے۔

سورۂ مؤمنون میں حق تعالیٰ نے جہاں تخلیقِ انسانی کے تمام مراحل ابتداء سے انتہا تک الگ الگ شمار فرمائے ہیں، ان میں جتنے تصرّفات کے دور نطفہ کی تخلیق پر گزرے کہ پہلے خون بنا، پھر ایک لوتھڑا بنا، پھر ہڈیاں بنیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا گیا، ان تمام ادوارِ تخلیق کو ایک سلسلے میں بیان فرمانے کے بعد جب رُوح اور جان ڈالنے کا ذکر فرمایا تو قرآن نے طرزِ بیان بدلا، ارشاد یہ ہے:-

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِيْنٍ، ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا، ثُمَّ اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ.

ترجمہ:- ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے گارے سے، پھر کردیا اس کو نطفہ ایک محفوظ جگہ (رحم) میں، پھر پیدا کیا ہم نے نطفہ کو ایک منجمد خون، پھر بنادیا اس منجمد خون کو ایک ٹکڑا گوشت کا، پھر بنادیا گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیاں، پھر چڑھادیا ہڈیوں پر گوشت، پھر پیدا کیا ہم نے اس کو ایک نئی پیدائش، بس مبارک ہے اللہ جو احسن الخالقین ہے۔

اس تفصیل میں غور کیجئے کہ تخلیقِ انسانی کی ابتداء پہلے مٹی سے پھر نطفہ سے کر کے اس کے مکمل جسم بننے تک جتنے دور اس پر گزرے ہیں ان سب کو ایک نسق اور ایک ہی طرز میں بیان فرمایا گیا، آخر میں جب رُوح ڈالنے کا ذکر مقصود ہوا تو طرزِ کلام بدل کر فرمایا کہ: "ثُمَّ اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ" اس طرزِ کلام کے بدلنے میں اشارہ

اس طرف ہوسکتا ہے کہ مادّہ پرست لوگ جو مادّہ کو خود بخود متحرک اور مختلف صورتوں میں ڈھل جانے والی چیز قرار دیتے ہیں، اور دنیا میں جو تغیرات ہو رہے ہیں اُن کو مادّہ ہی کے انقلابات وتغیرات کہتے ہیں، لیکن کسی بے جان جسم میں جان ڈال دینا یہ ایسی چیز ہے کہ اس دہریہ کو کچھ بھی عقل وسمجھ ہو تو اس کو مادّہ کے تطوّرات میں شمار نہیں کرسکتا، جبکہ مادّہ خود بے جان ہے، وہ کسی چیز میں جان کہاں سے ڈالے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ حقیقۃً تو تخلیق ہر ذرّہ حق سبحانہ وتعالیٰ ہی کی خصوصیّت ہے، لیکن اور چیزوں میں کسی کو شبہات نکالنے کی گنجائش ہوسکتی ہے، مگر جسمِ بے جان کے اندر جان ڈال کر اس کو متحرک، حسّاس، سمیع وبصیر، عاقل بنا دینا اس میں تو ادنیٰ عقل وشعور والا کسی کو شریک نہیں کہہ سکتا۔

اس لئے ذی رُوح جان دار چیزوں کی تصویر کو خصوصیت کے ساتھ حرام قرار دیا گیا کہ اس میں تخلیقِ ربّانی کی نقالی اور ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت میں شریک ہونے کا دعویٰ پایا جاتا ہے، تصویر کشی اور اُس کے استعمال کو شریعتِ اسلام نے متعدد وجوہ سے ممنوع وحرام قرار دیا ہے، مذکور الصدر اُن میں سے ایک وجہ ہے، باقی کا بیان آگے آئے گا۔

۵:- عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا: اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمْ یَکُنْ یَتْرُکُ فِیْ بَیْتِهٖ شَیْئًا فِیْهِ تَصَالِیْبُ اِلَّا نَقَضَهٗ.

(بخاری مع فتح ج:۱۰ ص:۳۱۶)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کوئی چیز ایسی جس میں تصالیب ہو بغیر توڑے نہ چھوڑتے تھے۔

لفظ ''تصالیب'' صلیب کی جمع ہے، جس چیز پر صلیب کی شکل بنائی گئی ہو اس کو تصالیب کہتے ہیں، اس معنی کے اعتبار سے اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ

جاندار چیزوں کی تصویریں گھر میں رکھنا تو ممنوع و ناجائز ہے ہی، بے جان چیزوں میں بھی جن چیزوں کی تصویر کی پرستش معروف ہو اس کی تصویر بھی حرام و ناجائز ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ مراد ''تصالیب'' سے تصاویر ہیں جن میں صلیب کی تصویر بھی شامل ہے، چنانچہ بخاری ہی کے ایک نسخہ کشمیہنی میں اس حدیث میں تصالیب کے بجائے لفظ ''تصاویر'' بھی منقول ہے۔　　(فتح الباری)

۶:- عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا قَالَتْ: قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ سَفَرٍ وَقَدْ سَتَرْتُ بِقِرَامٍ لِیْ عَلٰی سَھْوَۃٍ لِیْ فِیْہِ تَمَاثِیْلُ فَلَمَّا رَاٰہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَتَکَہٗ وَقَالَ: اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ الَّذِیْنَ یُضَاھُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰہِ! قَالَتْ: فَجَعَلْنَاہُ وِسَادَۃً اَوْ وِسَادَتَیْنِ.　(بخاری مع فتح الباری ج:۱۰ ص:۳۱۸)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر سے واپس تشریف لائے، میں نے اپنے ایک طاق یا الماری پر ایک پردہ ڈالا ہوا تھا جس میں تصاویر تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کو دیکھا تو پھاڑ ڈالا اور فرمایا کہ: سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے روز وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کی نقل اُتارتے ہیں! صدّیقہؓ فرماتی ہیں کہ: پھر ہم نے اس کے ایک یا دو گدّے بنادیئے۔

مِن سفر: فتح الباری میں بحوالہ بیہقی سفر سے غزوۂ تبوک اور بحوالہ ابوداؤد ونسائی غزوۂ تبوک یا خیبر بیان کیا گیا ہے۔ قرام: منقّش کپڑے کو کہا جاتا ہے، جس کے پردے اور فرش بنائے جاتے ہیں۔ سھوہ: اس طاق یا الماری کو کہا جاتا ہے جو سامان رکھنے کے لئے دیوار میں بنائی جائے۔ تماثیل: تمثال کی جمع ہے، تصویر کو کہا

جاتا ہے، فرق یہ ہے کہ لفظ ''تمثال'' اس تصویر کو بھی شامل ہے جو مجسمہ کی صورت میں بنائی جائے اور اُس کو بھی جو نقش اور رنگ سے کپڑوں میں بنائی جائے اور یہاں یہی مراد ہے۔

۷:- عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَ: قَدِمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَفَرٍ وَعَلَّقْتُ دُرْنُوکاً فِیْهِ تَمَاثِیْلُ فَاَمَرَنِیْ اَنْ اَنْزِعَهٗ، فَنَزَعْتُهٗ. (بخاری مع فتح الباری ج:۱۰ ص:۳۱۸)

ترجمہ:- صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے تو میں نے ایک چھوٹا کپڑا (دیوار پر) لٹکایا ہوا تھا جس میں تصاویر تھیں، آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کو ہٹادوں، میں نے ہٹادیا۔

دُرنوک: بضمِ دال ایسے سوتی کپڑے کو کہا جاتا ہے جو فرش کے طور پر بچھایا جاسکے اور کبھی اس کو پردے کی طرح بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں اس حدیث کے اندر تصاویر کے ذکر کے ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ تصاویر ایسے گھوڑوں کی تھیں جن کے پَر لگے ہوئے تھے۔ (فتح الباری)

حدیث نمبر:۶، ۷ کا مضمون متقارب ہے، دونوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر سے واپس تشریف لانا اور گھر میں معلّق پردے میں تصاویر دیکھنا منقول ہے، فرق یہ ہے کہ نمبر:۶ میں اس پردے کے دوٹکڑے کرکے گدّے بنادینے کا ذکر ہے، اور نمبر:۷ میں صرف اس کا ہٹادینا مذکور ہے، اور آگے حدیث نمبر:۹ میں لفظ قرام کے ساتھ صرف اس کا ہٹادینا مذکور ہے، اور ایک فرق یہ ہے کہ نمبر:۶ میں تصویروں کی کوئی خاص کیفیت مذکور نہیں اور نمبر:۷ میں پَردار گھوڑوں کی تصاویر ہونا بروایتِ مسلم مذکور ہے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہوں، اور یہ بھی

ممکن ہے کہ دو واقعے الگ الگ ہوں، واللہ اعلم!

۸:- عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: اَنَّهَا اشْتَرَتْ نَمْرِقَةً فِيْهَا تَصَاوِيْرُ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْبَابِ فَلَمْ يَدْخُلْ، فَقُلْتُ: اَتُوْبُ اِلَى اللهِ مِمَّا اَذْنَبْتُ! قَالَ: مَا هٰذِهِ النَّمْرِقَةُ؟ قُلْتُ: لِتَجْلِسَ عَلَيْهَا وَتَوَسَّدَهَا! قَالَ: اِنَّ اَصْحَابَ هٰذِهِ الصُّوَرِ يُعَذَّبُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، يُقَالُ لَهُمْ: اَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ! وَاِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا تَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ الصُّوَرُ.

(بخاری مع فتح ج:۱۰ ص:۳۲۰)

وَفِيْ رِوَايَةٍ عِنْدَ الْبُخَارِيْ: "اَتُوْبُ اِلَى اللهِ وَاِلٰى رَسُوْلِهٖ وَمَاذَا اَذْنَبْتُ." (بخاری مع فتح الباری ج:۱۰ ص:۳۲۲)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: انہوں نے ایک گدّا یا تکیہ ایسا خرید لیا تھا جس میں تصاویر تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو گھر میں داخل نہیں ہوئے، دروازے پر رُک گئے، (اور دوسری روایت میں ہے کہ: آپؐ کے چہرۂ مبارک پر ناراضی کے آثار پائے گئے) میں نے عرض کیا کہ: میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف توبہ کرتی ہوں! میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ: یہ گدّا کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: آپؐ کے بیٹھنے اور تکیہ لگانے کے لئے ہے! آپؐ نے فرمایا کہ: ان تصویروں والے قیامت کے روز عذاب دیئے جائیں گے، ان سے کہا جائے گا کہ: جو صورتیں تم نے پیدا کی ہیں ان میں جان بھی ڈالو! اور فرشتے اس مکان میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصاویر ہوں۔

حضرت صدّیقہؓ کا حسنِ ادب

اس روایت میں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ حضرت صدّیقہ رضی اللہ عنہا نے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر ناراضی کے آثار دیکھے تو پہلے عرض کیا کہ میں توبہ کرتی ہوں! بعد میں پوچھا کہ میرا گناہ کیا ہے؟ ازواج کو ایک مقام ناز کا بھی حاصل ہوتا ہے، آج تو کوئی جاں نثار خادم بھی یہ ادب نہیں جانتا، پہلے الزام ثابت کرنے کو کہتا ہے!

۹:- عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ سَتَرَتْ بِهٖ جَانِبَ بَيْتِهَا فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَمِيْطِيْ عَنِّيْ فَاِنَّهٗ لَا تَزَالُ تَصَاوِيْرُهٗ تَعْرِضُ لِيْ فِيْ صَلٰوتِيْ.

(بخاری مع فتح الباری ج:۱۰ ص:۳۲۱)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: حضرت عائشہؓ کا ایک پردہ تھا جس سے اپنے مکان کے ایک حصہ کو ڈھکا ہوا تھا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ: میرے پاس سے دُور کردو، کیونکہ اس کی تصاویر میری نماز میں مخل ہوتی ہیں۔

مذکور الصدر پانچ احادیث میں حدیث نمبر:۵ سے ثابت ہوا کہ جاندار چیزوں کی تصویر کا جیسے بنانا حرام ہے، ویسے ہی اُن کا اپنے گھروں میں زینت کے پردوں وغیرہ میں رکھنا بھی ناجائز ہے، اور یہ کہ جاندار چیزوں کی تصویر کے علاوہ بے جان چیزوں میں جن اشیاء کی پرستش عام طور پر کی جاتی ہو جیسے صلیب اس کا نقش اور تصویر بھی رکھنا جائز نہیں۔

اور حدیث نمبر:۶، ۷، ۸ میں ایک مضمون تو وہی ہے جو پچھلی چار احادیث میں آیا ہے کہ تصویر بنانے والوں کو قیامت میں سخت عذاب دیا جائے گا اور یہ کہ اس

عذاب کی وجہ ان کی یہ حرکت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفتِ تخلیق میں اپنا حصہ لگانے کا دعویٰ عملاً کیا۔

دوسری بات اس میں یہ بھی ثابت ہوگئی کہ صرف تصویر کے بنانے والے ہی مستحقِ عذاب نہیں بلکہ ان کا استعمال کرنا بھی گناہ میں داخل ہے۔

حدیث نمبر:۹ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جس مکان میں تصاویر نمازی کے سامنے یا دائیں بائیں ہوں، اس میں نماز بھی مکروہ ہے، **کما صرح به الفقهاء**۔

احادیثِ عائشہؓ میں اختلافِ الفاظ

پردہ میں تصویر کے متعلق حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی چار حدیثیں نمبر:۶، ۷، ۸، ۹ آئی ہیں، ان میں سے چھٹی اور ساتویں دونوں حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر سے واپسی کا ذکر ہے، یہ بیہقی کی روایت کے مطابق غزوۂ تبوک کا، اور ابوداؤد ونسائی کی روایت کے مطابق غزوۂ تبوک یا خیبر کا سفر تھا۔

اور ان دونوں حدیثوں میں دیوار کے کسی حصہ میں ایک باتصویر پردہ لٹکانے کا ذکر ہے، ایک حدیث میں پردہ کو بلفظ "قرام" اور دوسری میں بلفظ "دُرنوک" بیان کیا گیا ہے۔

اور ان دونوں روایتوں میں سے پہلی میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس مصوّر پردہ کو دیکھا تو خود بدستِ مبارک اس کو چاک کردیا، اور دوسری روایت میں بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عائشہؓ کو اس کے الگ کرنے کا حکم دیا۔ مگر مسندِ احمد میں اسی دوسری حدیث جس میں لفظ "دُرنوک" استعمال کیا گیا ہے، اس میں بھی یہ الفاظ ہیں کہ آپؐ نے اس کو اپنے دستِ مبارک سے پھاڑ دیا۔

اور دونوں ہی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ پھاڑنے کے بعد صدیقہ عائشہؓ نے اس کے دو گدّے یا تکیے بنالئے تھے، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی استعمال

فرماتے تھے، قِـرام والی حدیث نمبر:۹ میں تو اس کے دو تکیے بنالینا خود بخاری و مسلم کے الفاظ میں بھی ہے، اور دُرنوک والی حدیث میں اس کے دو تکیے بنالینا مسندِ احمد کی روایت میں موجود ہے۔ (مسندِ احمد ج:۱۷ ص:۲۸۶)

ان دونوں روایتوں کا واقعہ اتنی چیزوں میں مشترک ہے، جن کا اُوپر ذکر آیا ہے، اس سے ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔

فائدہ:- دُرنوک والی حدیث میں مسندِ احمد کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دُرنوک میں تصویر پَر والے گھوڑوں کی تھی، قِـرام والی حدیث میں اگرچہ کسی تصویر کا ذکر نہیں مگر اس کے منافی بھی نہیں، اس لئے ظاہر یہی ہے کہ یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کی ہیں۔

البتہ حدیث نمبر:۸ جس میں حضرت صدیقہؓ کا ایک مصوّر نمرقہ یعنی گدا خریدنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کو دیکھ کر غضبناک ہونا اور گھر میں داخل ہونے سے رُکنا مذکور ہے، یہ بظاہر دوسرا مستقل واقعہ ہے، اس میں کسی سفر سے واپسی کا بھی ذکر نہیں اور اپنے ہاتھ سے چاک کردینے کا ذکر بھی نہیں، بلکہ اظہارِ ناراضی کے لئے گھر کے اندر تشریف لانے سے رُکنا اور اس پر صدّیقہ عائشہؓ کا متنبہ ہوکر توبہ کرنا منقول ہے، مسندِ احمد کی روایت میں اس نمرقہ کے بھی دو ٹکڑے کرکے دو تکیے بنالینے کا ذکر ہے، مسند کے الفاظ میں نمرقہ کے بجائے نمط کا لفظ آیا ہے۔

اسی طرح چوتھی حدیث نمبر:۹ بروایت انسؓ میں جس مصوّر پردہ کا ذکر ہے اس میں بہت نرم الفاظ آئے ہیں، اس میں یہ بھی ہے کہ اس پردہ میں تصاویر ہونا آپؐ کو پہلے سے معلوم بھی تھا اور اس کے باوجود آپؐ نے اس کو گھر میں باقی رکھا، اور نہ صرف باقی رکھا بلکہ نماز بھی وہاں پڑھتے تھے، ایک روز یہ فرمایا کہ اس کو میری طرف سے ہٹادو کیونکہ اس کی تصاویر میری نماز میں خلل انداز ہوتی ہیں، جو سابقہ تینوں روایتوں سے بالکل مختلف ہے، خصوصاً مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:-

اَنَّهَا كَانَتْ لَهَا ثَوْبٌ فِيهِ تَصَاوِيرُ مَمْدُودٌ اِلَى سَهْوَةٍ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ اِلَيْهِ فَقَالَ: اَخِّرِيْهِ عَنِّيْ!

(فتح الباری ج:۱۰ ص:۳۲۱)

ترجمہ:- حضرت عائشہؓ کے پاس ایک کپڑا تھا، جس میں تصاویر تھیں، یہ ایک طاق یا الماری کی طرف پھیلا ہوا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف نماز پڑھتے تھے، تو آپؐ نے فرمایا کہ: اس کو میری طرف سے ہٹادو!

اس کے متعلق حافظ نے فتح الباری میں فرمایا کہ: اس روایت اور روایاتِ سابقہ میں تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ پہلی روایات کے واقعہ میں جانداروں کی تصاویر تھیں اور اس روایت میں تصاویر ذی رُوح کی نہ ہوں بلکہ درختوں، پھولوں کے نقش و نگار ہوں، اسی لئے اس پردہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم رکھا اور وہ فرشتوں کے داخلہ سے بھی مانع نہیں ہوا، اور نماز میں اس کی طرف رُخ کرنا بھی گوارا کیا گیا، مگر چونکہ نقش و نگار بعض اوقات انسان کی توجہ حق تعالیٰ اور نماز کی طرف سے ہٹا کر اپنے میں مشغول کرلیتے ہیں، اس لئے از راہِ تقویٰ اس کو ہٹانے کا حکم دیا، اور یہ حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض روایاتِ حدیث میں دیوار پر غیر مصوّر پردہ ڈالنے سے بھی اس لئے روکا گیا ہے کہ یہ زہد اور شانِ نبوّت کے خلاف ہے، حضرت فاطمہؓ کے دروازہ پر پردہ دیکھ کر آپ کا واپس ہوجانا جو آگے حدیث نمبر:۲۰ میں آرہا ہے، اس کی بھی یہی توجیہ خود حدیث میں مذکور ہے کہ ہم اور ہمارے اہلِ بیت کو نقش و نگار سے کیا کام ہے، عمدۃ القاری میں علامہ عینیؒ نے بھی روایات کی تطبیق اسی طرح نقل کی ہے۔ (ج:۲۲ ص:۷۴)

اور اگر اس میں بھی ذی رُوح کی تصویریں ہوں تو پھر یہ حدیث تصاویر کی ممانعت سے پہلے ابتداءِ ہجرت کے وقت کی حدیث قرار دی جائے گی، جیسا کہ بہت سے حضرات نے صدّیقہ عائشہؓ کی گڑیوں کے متعلق ایسا ہی فرمایا ہے، جس کا ذکر آگے

حدیث نمبر: ۲۳ میں آرہا ہے۔

۱۰:- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ عَنْ اَبِیْ طَلْحَۃَؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ بَیْتًا فِیْہِ کَلْبٌ وَّلَا تَصَاوِیْرُ۔

(بخاری مع فتح ج:۱۰ ص:۳۱۳)

ترجمہ:- حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابوطلحہؓ سے روایت کیا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: فرشتے اس مکان میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔

۱۱:- عَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ: وَعَدَ جِبْرِیْلُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَرَاثَ عَلَیْہِ حَتّٰی اشْتَدَّ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَخَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَقِیَہٗ فَشَکَا اِلَیْہِ مَا وَجَدَ، فَقَالَ لَہٗ: اِنَّا لَا نَدْخُلُ بَیْتًا فِیْہِ صُوْرَۃٌ وَّلَا کَلْبٌ۔ (بخاری مع فتح ج:۱۰ ص:۳۲۲)

ترجمہ:- حضرت سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک مرتبہ جبریل امین نے آنے کا وعدہ آپؐ سے کیا تھا، مگر مقررہ وقت سے دیر ہوگئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہوئے، آپؐ باہر نکلے تو جبریلِ امینؑ سے ملاقات ہوئی، آپؐ نے تکلیفِ انتظار کی شکایت کی، تو جبریلؑ نے فرمایا کہ: ہم اس مکان میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر یا کتا ہو۔

۱۲:- عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اسْتَاْذَنَ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اُدْخُلْ! فَقَالَ: کَیْفَ اَدْخُلُ وَفِیْ بَیْتِکَ سِتْرٌ فِیْہِ تَصَاوِیْرُ، فَاِمَّا اَنْ تُقْطَعَ رُؤُسُھَا؟ اَوْ تَجْعَلَ بِسَاطًا یُوْطَاُ فَاِنَّا مَعْشَرَ الْمَلٰٓئِکَۃِ لَا نَدْخُلُ بَیْتًا فِیْہِ تَصَاوِیْرُ۔ (رواہ النسائی از تاج الجامع)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک روز جبریلِ امینؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت مانگی، آپؐ نے فرمایا: تشریف لائیے! جبریلؑ نے فرمایا کہ: میں کیسے آؤں؟ جبکہ آپ کے مکان میں ایک پردہ پڑا ہے جس میں تصاویر ہیں، تو آپ یا تو تصاویر کے سر کاٹ دیجئے یا اس پردہ کو پامال فرش بنا دیجئے، کیونکہ ہم جماعتِ ملائکہ اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصاویر ہوں۔

۱۳:- كَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُرُسٌ فِيْهِ تِمْثَالُ رَأْسِ كَبْشٍ فَكَرِهَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَصْبَحَ يَوْمًا وَقَدْ اَذْهَبَهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ.

(اخرجه الطبری کذا فی تلقیح فهوم اهل الاثر لابن الجوزی ص:۲۰)

ترجمہ:- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ڈھال تھی جس میں دنبہ کے سر کی تصویر بنی ہوئی تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار تھی، تو ایک روز آپؐ صبح کو اُٹھے تو بطورِ معجزہ اللہ تعالیٰ نے اس سر کی تصویر کو مٹا دیا تھا۔

حدیث نمبر:۱۰، ۱۱ میں اور اس سے پہلے حدیث نمبر:۸ کے آخر میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فرشتے اُس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو، اور یہ بات ظاہر ہے کہ مقصود اس سے مسلمانوں کو یہ ہدایت دینا ہے کہ اپنے گھروں کو ایسی منحوس چیزوں سے پاک رکھیں جن سے فرشتے نفرت کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کپڑے کو پھاڑ دیا یا ہٹا دینے کا حکم دیا جس میں تصاویر تھیں اور حدیثِ جبریل علیہ السلام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تصویروں کے سر کاٹ دیئے جاویں یا اُس کپڑے کو جس میں تصاویر ہوں پامال فرش بنا دیا جائے تو اس کی بھی

گنجائش ہے، اس جگہ تین سوالات غور طلب باقی ہیں:

اوّل یہ کہ یہ حکم تمام ملائکہ کے متعلق ہے خواہ کرام کاتبین اور انسان کی حفاظت کرنے والے فرشتے اور عزرائیل علیہ السلام ہوں یا صرف ان فرشتوں کے متعلق ہے جو رحمت و مغفرت کے اَحکام لاتے ہیں اور ان کی برکت سے آدمی کو اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کی توفیق ہوتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جن تصاویر کا استعمال شرعاً جائز ہے کیا وہ بھی ملائکۃ اللہ کے آنے سے مانع ہوتی ہیں یا نہیں؟

تیسرے یہ کہ کتّے اور تصویر میں کیا خصوصیت ہے کہ ملائکہ اس مکان میں نہیں جاتے جن میں یہ ہوں؟ ان تینوں سوالوں کا جواب کسی قدر تفصیل سے درجِ ذیل ہے۔

وہ کون سے فرشتے ہیں جو مصوّر مکان میں داخل نہیں ہوتے؟

اس بارہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات کے نزدیک مصوّر مکان میں داخل ہونے سے باز رہنا صرف ملائکہ وحی جبرائیل و اسرافیل وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے عام فرشتوں کا یہ حکم نہیں، اس قول پر یہ اعتراض تو صحیح نہیں کہ زمانۂ وحی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مصوّر مکان میں داخل ہونا اور تصویر کا استعمال کرنا وغیرہ سب جائز ہوجانا لازم آتا ہے، کیونکہ جب وحی بند ہوئی تو ان فرشتوں کا زمین پر آنا بھی بند ہوگیا اور یہ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلۂ وحی بند ہوجانے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ ملائکہ وحی جبرائیل علیہ السلام وغیرہ زمین ہی پر نہ اُتریں، بلکہ بہت سے احادیثِ صریحہ صحیحہ سے ان کا قیامت تک ہر زمانہ میں زمین پر تشریف لانا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ اکثر مفسّرین کے نزدیک

"تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ" میں رُوح سے جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں، ابنِ جوزیؒ نے بروایت حضرت انسؓ اور بیہقی و ابنِ حبان وغیرہ نے بروایت سلمان فارسیؓ اور طبرانی نے بروایت میمونہ بنت سعدؓ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعبارات مختلفہ جبرائیل و میکائیل و اسرافیل وغیرہم کا ہر زمانہ میں زمین پر تشریف لانا نقل کیا ہے، اور حدیث مشکوٰۃ دربارۂ نزولِ جبرائیل علیہ السلام "فی کبکبة من الملئکة" اس بارے میں بالکل واضح ہے، **افادہ مرشدی حکیم الأمة رحمةالله علیه**۔

اور یہ جو مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جبرائیل علیہ السلام زمین پر تشریف نہ لاویں گے اس کو شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ "الاعلام بنزول عیسیٰ علیہ السلام" میں ردّ کردیا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں۔

البتہ اس قول پر قوی اعتراض یہ ہے کہ الفاظِ حدیث عام ہیں، ان میں کوئی قرینہ بھی ملائکۂ وحی کی تخصیص کا نہیں ہے، یہ دعویٰ کہ یہ حکم صرف ملائکۂ وحی کے ساتھ مخصوص ہے محض دعویٰ بلا دلیل ہے، اس لئے جمہور کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔

اس کے مقابلہ میں بعض حضرات کے نزدیک یہ حکم تمام طبقاتِ ملائکہ کو عام ہے، کوئی فرد اس سے مستثنیٰ نہیں، خواہ کرام کاتبین ہوں یا حفاظت کرنے والے فرشتے یا عزرائیل علیہ السلام، محدث قرطبی کا یہی قول ہے۔

لیکن جمہور کی تحقیق اس بارہ میں یہ ہے کہ نہ اس قدر خصوص ہے جو قولِ اوّل میں اختیار کیا گیا اور نہ اس قدر عموم جس کو قولِ ثانی میں قرار دیا گیا ہے، بلکہ احادیثِ کثیرہ کی تطبیق و تحقیق کا مقتضا یہ ہے کہ یہ حکم دراصل ان ملائکۂ رحمت کے متعلق ہے جو انسان کے لئے رحمت و برکت کا سبب بنتے ہیں اور اس کے لئے حق تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔

وہ نامۂ اعمال کے لکھنے والے یا جنّات سے حفاظت کرنے والے فرشتے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جن کے متعلق احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے کہ وہ کسی وقت انسان سے

جدا نہیں ہوتے، سوائے تین اوقات کے، ایک پاخانہ میں، دوسرے بیوی کے ساتھ صحبت کے وقت، تیسرے غسل کے وقت (اخرجہ البزار عن ابن عباسؓ مرفوعاً ومثلہ عن ابن عمر مرفوعاً عند الترمذی وقال حسن غریب، خطابی، منذری، قاضی عیاض، نووی، دمیری، مُلا علی قاری، شیخ الرؤف مناوی، ابن حجر، ہیثمی وغیرہم) علماء تحقیق کا بھی یہی قول ہے۔ (مأخوذ از رسالہ بلوغ القصد والمرام فیما تنفر عنہ الملٰئکۃ الکرام ص:۵) اور فقہاءِ حنفیہ علاّمہ شامیؒ اور صاحبِ بحر نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

دوسرا سوال کہ جن تصاویر کا استعمال شرعاً ممنوع نہیں جیسے سر کٹی ہوئی تصویریں کیا وہ مکان میں دخولِ ملائکہ سے مانع ہیں یا نہیں؟

امام نووی شافعیؒ شارحِ مسلم کی تحقیق تو اس بارہ میں یہ ہے کہ جن تصاویر کے استعمال کو شریعت نے جائز بھی رکھا ہے، وہ بھی مکان میں ملائکہ رحمت کے داخل ہونے سے بالخاصہ مانع ہوتی ہیں، جوازِ استعمال کا فائدہ صرف یہ ہوگا کہ استعمال کرنے والا گناہگار نہیں ہوگا لیکن ملائکۂ رحمت کے انوار و برکات سے محرومی پھر بھی رہے گی کیونکہ وہ تصاویر کا خاصہ لازمہ ہے۔

مگر عام روایاتِ حدیث کی تصریحات و اشارات سے جمہور علماء نے اس کو ترجیح دی ہے کہ جن تصاویر کے استعمال کی شریعت نے اجازت دے دی ہے وہ ملائکۂ رحمت کے مکان میں داخل ہونے سے مانع نہیں ہوتیں۔

حضرت جبریل کی حدیثِ مذکور نمبر:۱۲ میں خود جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ آنے کا مانع تصویر کو بتلایا اور پھر اس مانع کو رفع کرنے کی یہ تدبیر بتلائی کہ یا تو تصویر کا سر کاٹ دیا جائے یا پھر اس کو کسی پامال و ذلیل جگہ میں ڈال دیا جائے۔

نیز حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ جو حدیث نمبر:۶ میں گزرا ہے،

جس میں تصویردار پردہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منع فرمانے پر چاک کرکے دو گدّے یا تکیے بنادینے کا ذکر ہے، اس واقعہ میں مسندِ احمد کے الفاظ میں یہ بھی ہے کہ:-

وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ مُتَّكِئًا عَلٰى اِحْدٰهُمَا وَفِيْهِ صُوْرَةٌ.

(کذا فی البحر ج:۲ ص:۳۰)

ترجمہ:- راوی کہتے ہیں کہ اس مصوّر پردے کے دو تکیے بنادینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر تکیہ لگائے ہوئے دیکھا، حالانکہ اس میں تصویر موجود تھی۔

اس کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تصویر بیچ سے پھٹ کر ناقص رہ گئی تھی، اور یہ بھی کہ بجائے پردہ کے پامال تکیہ گدّے میں استعمال ہونے لگی، تو اس کو نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور نہ وہ ملائکہ کے دخول سے مانع ہوئی، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

تیسرا سوال یہ ہے کہ تصویر اور کتّے کی کیا خصوصیت ہے کہ جس مکان میں وہ ہوں فرشتے اس میں نہیں جاتے؟

اس کا جواب صحیح یہ ہے کہ درحقیقت صرف کتّے اور تصویر کی کوئی خصوصیت نہیں اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن سے فرشتے نفرت کرتے ہیں اور جس مکان میں وہ ہوتی ہیں رحمت کے فرشتے اس میں نہیں جاتے۔ شیخ الاسلام جعفر کنانی مالکیؒ نے اس پر ایک مستقل کتاب "بلوغ القصد والمرام ببیان بعض ما تنفر عنه الملٰئكة الكرام" لکھی ہے، اس میں اس طرح کی بہت سی چیزیں بحوالہ احادیث بیان فرمائی ہیں جن سے فرشتے نفرت کرتے ہیں، مثلاً: جس مکان میں پیشاب کسی برتن میں رکھا ہو یا جس میں کوئی عورت ننگے سر بیٹھی ہو، وغیرہ۔

یہ ضروری نہیں کہ جن چیزوں سے فرشتے نفرت کرتے ہیں وہ گناہ اور مفاسد میں دوسری سب چیزوں سے زیادہ اشد ہی ہوں، بلکہ اس معاملہ کا تعلق فرشتوں

کی طبائع سے ہے، جیسے انسان بہت سی ایسی چیزوں سے گھن کرتا ہے اور ان کا دیکھنا اس کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے جو کوئی بڑی نجاست و غلاظت بھی نہیں جیسے مکھی مچھر وغیرہ، ایسے ہی فرشتے بالطبع بہت سی چیزوں سے گھن اور نفرت کرتے ہیں، کتا اور تصویر بھی اس میں داخل ہیں۔

۱۴:- جَاءَ رَجُلٌ اِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَقَالَ: اِنِّیْ اُصَوِّرُ هٰذِهِ الصُّوَرَ فَاَفْتِنِیْ فِيْهَا. فَقَالَ لَهٗ: اُدْنُ مِنِّیْ ثُمَّ اَعَادَهَا فَدَنَا مِنْهُ فَوَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى رَأسِهٖ فَقَالَ: اُنَبِّئُكَ بِمَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: كُلُّ مُصَوِّرٍ فِی النَّارِ! يُجْعَلُ لَهٗ بِكُلِّ صُوْرَةٍ نَفْسٌ فَتُعَذِّبُهٗ فِیْ جَهَنَّمَ. وَقَالَ: اِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَاصْنَعِ الشَّجَرَ وَمَا لَا نَفْسَ لَهٗ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ:- ایک شخص حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ: میں یہ تصویریں بناتا ہوں (اسی سے میرا معاش قائم ہے) مجھے آپ اس کے معاملہ میں فتویٰ دیں۔ تو ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ: میرے قریب آجاؤ! اور پھر دوبارہ اور قریب آنے کے لئے فرمایا یہاں تک کہ وہ اتنا قریب ہوگیا کہ ابنِ عباسؓ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا کہ: میں تمہیں وہ بات بتلاتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، وہ یہ ہے کہ: ہر مصوّر جہنم میں جائے گا! اور جتنی تصویریں اُس نے بنائی ہیں ہر ایک کے مقابلہ میں ایک شخص مجسم قائم کردیا جائے گا جو اس کو جہنم میں عذاب دے گا۔ اور فرمایا کہ: تمہارا اس کے سوا گزارہ ہی نہیں تو درختوں کی اور ایسی چیزوں کی تصویر بنالیا کرو جس میں رُوح نہیں۔

۱۵:- عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَؓ صَاحِبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا تَدْخُلُ بيتًا فِيْهِ صُوْرَةٌ! قَالَ بُسْرٌ: ثُمَّ اشْتَكٰى زَيْدٌ فَعُدْنَاهُ فَاِذَا عَلٰى بَابِهٖ سِتْرٌ فِيْهِ صُوْرَةٌ فَقُلْتُ لِعُبَيْدِ اللّٰهِ الْخَوْلَانِیِّ رَبِيْبِ مَيْمُوْنَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلَمْ يُخْبِرْنَا زَيْدٌ عَنِ الصُّوَرِ يَوْمَ الْاَوَّلِ؟ فَقَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ: اَلَمْ تَسْمَعْهُ حِيْنَ قَالَ: اِلَّا رَقْمًا فِیْ ثَوْبٍ. (بخاری مع فتح الباری ج:۱۰ ص:۳۲۰)

ترجمہ:- زید بن خالد، حضرت ابوطلحہؓ صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر ہو۔ راویٔ حدیث بُسر کہتے ہیں کہ: اس کے بعد اتفاقاً زید بن خالد بیمار پڑے اور ہم اُن کی عیادت کو گئے تو دیکھا کہ ان کے دروازہ پر ایک پردہ پڑا ہے جس میں تصویر ہے، تو میں نے عبیداللہ خولانی سے، جو حضرت ام المؤمنین میمونہؓ کے ربیب تھے، کہا کہ: کیا زید نے آج سے پہلے ہم سے وہ روایت بیان نہیں کی تھی جس میں تصویر کو ممنوع قرار دیا تھا؟ اس پر عبیداللہ خولانی نے جواب دیا کہ: کیا تم نے اس روایت میں یہ نہیں سنا تھا کہ آپؐ نے ایک استثناء کر کے الا رقما فی ثوب فرمایا تھا۔

تنبیہ:- اس حدیث میں تصاویر سے ایک استثناء بلفظ "رقم فی ثوب" مذکور ہے، فتح الباری میں نوویؒ سے اور عمدۃ القاری میں خطابی سے نقل کیا ہے کہ: رقم سے مراد بے جان چیزوں، درختوں وغیرہ کے نقوش و اشکال ہیں۔ عربی لغت کے اعتبار سے بھی یہی لفظ رقـــــم اس معنی کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ لسان العرب اور

قاموس میں لفظ "رقم" کے معنی یہ لکھے ہیں: "اَلرَّقْمُ ضَرْبٌ لِخُطَطٍ مِنَ الْوَشْيِ" یعنی رقم دھاری دار منقش کپڑے کو کہتے ہیں۔ زرقانی نے شرح موطا میں رقم کا ترجمہ "نقشًا و وشيًا" سے کیا ہے۔ اور حافظ نے فتح الباری میں ایک احتمال یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ حدیث ممانعت سے پہلے کی ہو، اور عمدۃ القاری میں طحاوی سے یہ احتمال نقل کیا ہے کہ اس سے مراد وہ تصویر ہوسکتی ہے جو کسی پامال فرش یا گدّے وغیرہ میں ہو جس کی اجازت حدیثِ جبریل مذکور نمبر:۱۲ سے معلوم ہوتی ہے۔

اور اس سے پہلے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیثِ مذکور نمبر:۱۴ میں حضرت ابنِ عباسؓ کے کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ درختوں اور بے جان چیزوں کی تصویر جائز ہے، نیز حضرت فاطمہؓ کا واقعہ جو بروایت ابنِ عمرؓ حدیث نمبر:۲۰ میں آگے آرہا ہے اس میں بھی نقش و نگار کے پردہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "رقم" سے تعبیر فرمایا ہے، یہ مرفوع حدیث خود اس حدیث کی شرح ہوگئی کہ "رقم فی ثوب" سے مراد درختوں اور پھولوں کے نقش و نگار ہیں، اور آگے حدیث نمبر:۱۹ میں خود ابوطلحہؓ کا جو واقعہ آرہا ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ "رقم فی ثوب" سے مراد بے جان چیزوں کی تصویر ہے۔

تنبیہ:- اور بعض لوگوں نے جو اس لفظ "رقمًا فی ثوب" کی یہ تشریح کی ہے کہ جو تصویر مجسمہ نہ ہو بلکہ رنگ اور نقش سے بنائی گئی ہو وہ مراد ہے، یہ اس لئے قطعاً غلط ہے کہ صحیح بخاری کی روایات کپڑوں کی تصویر ہی کے بارے میں آئی ہیں، جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے ہیں اور پھاڑ ڈالا ہے، فتح الباری میں اس قول کو مذہبِ باطل فرمایا ہے۔

۱۶:- عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: وَاعَدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ سَاعَةٍ يَأْتِيْهِ فِيْهَا، فَجَاءَتْ تِلْكَ السَّاعَةُ وَلَمْ يَأْتِهِ وَفِيْ

يَدِهٖ عَصًا فَاَلْقَاهَا وَقَالَ مَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلَا رُسُلُه، فَاِذَا جِرْوُ كَلْبٍ تَحْتَ سَرِيْرِهٖ، فَقَالَ: يَا عَائِشَةُ! مَتٰى دَخَلَ هٰذَا الْكَلْبُ هٰهُنَا؟ فَقَالَتْ: وَاللّٰهِ مَا دَرَيْتُ! ثُمَّ اَخَذَ مَاءً فَنَضَحَ مَكَانَهٗ فَجَاءَ جِبْرِيْلُ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَاَعَدْتَّنِيْ فَجَلَسْتُ لَكَ فَلَمْ تَأْتِ! فَقَالَ: مَنَعَنِي الْكَلْبُ الَّذِيْ كَانَ فِيْ بَيْتِكَ، اِنَّا لَا نَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا صُوْرَةٌ.

(رواہ مسلم وابوداؤد وغیرہ، التاج الجامع ج:۳ ص:۱۶۷)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جبرائیلِ امین نے آنے کا وعدہ ایک مقررہ وقت کے متعلق کیا تھا، مگر وہ وقت آچکا اور جبرائیل امین نہ آئے (جس سے آپؐ کو تشویش ہوئی)، ایک لاٹھی آپؐ کے ہاتھ میں تھی اُس کو ڈال دیا اور فرمایا کہ اللہ اور اُس کے قاصد فرشتے وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے (پھر کیا بات ہے کہ جبرائیل نہیں آئے؟) اچانک نظر پڑی کہ چارپائی کے نیچے ایک کتے کا بچہ ہے، آپ نے عائشہؓ سے فرمایا کہ: یہ کتا یہاں کب آگیا؟ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ: مجھے اس کی بالکل خبر نہیں ہوئی! آپؐ کے حکم سے یہ کتا نکال دیا گیا پھر آپؐ نے کچھ پانی لے کر اس جگہ پر ڈال دیا، اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام آئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انتظار اور جبرائیل کے نہ آنے کی شکایت کی تو جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ: ہم اُس گھر میں نہیں جاتے جہاں کتا یا تصویر ہو۔

۱۷:- امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت

کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں تھے، اس وقت صحابہ کرامؓ کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا کہ: آپ لوگوں میں کوئی ایسا آدمی ہے جو مدینہ شہر میں جائے اور (تین کام کرکے آئے) اوّل یہ کہ کوئی بت بغیر توڑے نہ چھوڑے، اور کوئی قبر جو زیادہ اونچی ہو اس کو برابر کرکے چھوڑے، اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جس کو کسی چیز سے لتھیڑ کر خراب نہ کردے! ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں، یہ سب کام کروں گا۔ اہلِ مدینہ اس کی جرأت و ہمت سے حیرت میں پڑ گئے، چنانچہ یہ صاحب گئے اور سب کام کرکے لوٹے تو آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:-

يَا رَسُوْلَ اللهِ! لَمْ اَدَعْ بِهَا وَثَنًا اِلَّا كَسَرْتُهٗ وَلَا قَبْرًا اِلَّا سَوَّيْتُهٗ وَلَا صُوْرَةً اِلَّا لَطَخْتُهَا. ثُمَّ قَالَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللّٰهَ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ عَادَ اِلٰى صُنْعِهٖ شَيْءٍ مِنْ هٰذَا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ! (صلى الله عليه وسلم). قال الحافظ المنذری: اسناده جيّد.

(از بلوغ القصد والمرام ص:۲۲)

ترجمہ:- یا رسول اللہ! میں نے مدینہ میں کوئی بت نہیں چھوڑا جس کو توڑ نہ دیا ہو، اور کوئی (اُونچی) قبر نہیں چھوڑی جس کو برابر نہ کردیا ہو، اور کوئی تصویر نہیں چھوڑی جس کو کسی چیز سے لتھیڑ کر خراب نہ کردیا ہو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جس شخص نے ان چیزوں میں سے کوئی چیز پھر بنائی (گویا) اُس نے اس وحی کا انکار کردیا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی۔

مسئلہ:- قبر کے معاملہ میں سنت یہ ہے کہ معمولی اُونچی کوہان پشت انداز کی بنائی جائے، قبروں کو زیادہ اُونچا کرنا اس ارشادِ نبوی کے خلاف ہے جس میں آپ نے ایسی قبروں کو عام قبروں کے برابر کردینے کا حکم فرمایا ہے۔

۱۸:- عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا اشْتَكَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَكَرَ بَعْضُ نِسَائِهِ كَنِيْسَةً يُقَالُ لَهَا مَارِيَةُ، وَكَانَتْ أُمُّ سَلْمَةَ وَأُمُّ حَبِيْبَةَ أَتَتَا أَرْضَ الْحَبْشَةِ فَذَكَرَتَا مِنْ حُسْنِهَا وَتَصَاوِيْرِ فِيْهَا، فَرَفَعَ رَأْسَهُ فَقَالَ: أُولٰئِكَ إِذَا مَاتَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ أُولٰئِكَ شِرَارُ خَلْقِ اللّٰهِ. (متفق علیہ از مشکوٰۃ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار تھے تو بعض ازواجِ مطہرات نے ایک کنیسہ کا ذکر کیا جس کا نام ماریہ تھا، اور ازواج میں حضرت اُمِ سلمہ اور اُمّ حبیبہ حبشہ گئی تھیں وہاں یہ کنیسہ دیکھا تھا تو اس کی تصاویر اور خوبصورتی کا ذکر کرنے لگیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر مبارک اُٹھایا اور فرمایا کہ: ہاں! ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنادیتے اور اس مسجد میں اس کی تصویر رکھ دیتے تھے (کہ ان کو دیکھ کر ہم بھی عبادت کا اہتمام کریں گے، انجامِ کار بعد کے لوگ خود اسی تصویر کی عبادت کرنے لگتے) یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بدتر ہیں۔

اس حدیث میں تصویر کے حرام ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ شرک و بُت پرستی کا ذریعہ بنی ہے۔

۱۹:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی دعوت کی، وہ تشریف لائے تو گھر میں دیوار پر ایک پردہ پڑا دیکھا، تو ابنِ عمرؓ نے ان کے سامنے بطورِ عذر کے کہا کہ: "غَلَبَنَا علیہ النساء" (یعنی یہ پردہ

میں نے بالقصد نہیں ڈالا، گھر کی عورتیں ہم پر غالب آ گئی ہیں کہ اس طرح کی زینت کی چیزیں استعمال کرنے لگیں)۔ حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا کہ: یہ بات کوئی اور کہتا تو گنجائش بھی تھی، آپ کے متعلق میں کبھی یہ گمان نہ کرتا تھا کہ آپ ایسا بے جا عذر کریں گے کہ عورتوں نے آپ پر غالب آ کر ایسا کام کرلیا، اور فرمایا:

وَاللهِ! لَا اَطْعَمُ لَکَ طَعَامًا. (بخاری، کتاب النکاح)

ترجمہ:- خدا کی قسم! میں تمہارا کھانا نہیں کھاؤں گا۔

۲۰:- اَبُوْطَلْحَة رضی اللہ عنہ دَعَا اِنْسَانًا یَنْزِعُ نِمْطًا تَحْتَہٗ وَھُوَ مَرِیْضٌ فَقَالَ لَہٗ سَھْلُ بْنُ حُنَیْفٍ: لِمَ تَنْزِعُہٗ؟ قَالَ: لِاَنَّ فِیْہِ تَصَاوِیْرَ وَقَالَ فِیْہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا عَلِمْتَ. قَالَ سَھْلٌ: اَوَ لَمْ یَقُلْ اِلَّا مَا کَانَ رَقْمًا فِیْ ثَوْبٍ؟ قَالَ: بَلٰی! وَلٰکِنَّہٗ اَطْیَبُ لِنَفْسِیْ.

(مالک، والترمذی، والنسائی۔ جمع الفوائد ج:۱ ص:۸۲۶)

ترجمہ:- حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو بلایا کہ اُن کے نیچے سے ایک گدّا نکال لیں جس پر وہ بحالتِ بیماری لیٹے ہوئے تھے، سہلؓ بن حنیف نے فرمایا کہ: یہ آپ کیوں نکلواتے ہیں؟ تو فرمایا کہ: اس میں تصاویر ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ تصاویر کے معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا ہے۔ اس پر حضرت سہلؓ نے فرمایا کہ: کیا آپؐ نے تصاویر کی ممانعت کے ساتھ یہ استثناء نہیں فرمایا کہ مگر جو رقم ہو کپڑے میں؟ حضرت ابوطلحہؓ نے کہا کہ: ہاں! یہ تو مجھے معلوم ہے مگر میرے دل کو پسند یہی ہے کہ اس کو نکال دوں۔

رقمًا فی ثوب کے معنی اور پوری تحقیق حدیثِ مذکور نمبر:۱۵ کے تحت میں آچکی ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ اس سے مراد درختوں، پھولوں کے نقش و نگار ہیں

جو جائز ہیں، اور طحاویؒ کے قول کے مطابق ایسے کپڑے کی تصویر ہے جو پامال ہو۔

حضرت زیدؓ (ابوطلحہ) کے نیچے گدّے میں یا تو نقش و نگار تھے جن کو انہوں نے از راہِ تقویٰ اپنے نیچے بچھانا پسند نہیں کیا، جیسا کہ حضرت فاطمہؓ کے واقعہ مندرجہ حدیث نمبر:۲۱ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نقش و نگار والے پردہ کو پسند نہیں فرمایا اور بقول طحاویؒ یہ بھی ممکن ہے کہ جاندار ہی کی تصویر ہو مگر نیچے بچھنے والے گدّے میں اس کا استعمال از راویٔ حدیثِ جبرائیل نمبر:۱۲ جائز معلوم ہوتا ہے، مگر حضرت زیدؓ نے از راہِ تقویٰ اس کو بھی پسند نہ فرمایا ہو۔

۲۱:- عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتٰی بَيْتَ فَاطِمَةَ فَوَجَدَ عَلٰی بَابِهَا سِتْرًا مُوَشًّيا فَلَمْ يَدْخُلْ فَجَاءَ عَلِيٌّ فَرَاٰهَا مُهْتَمَّةً فَاَخْبَرَتْهُ فَاَتَاهُ عَلِيٌّ فَذَكَرَ لَهٗ ذٰلِكَ وَقَالَ: قَدِ اشْتَدَّ عَلَيْهَا! فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا لَنَا وَلِلدُّنْيَا وَمَا اَنَا وَالرَّقْمُ! فَذَهَبَ اِلٰی فَاطِمَةَ فَرَدَّتْهُ اِلَيْهِ تَقُوْلُ فَمَا تَاْمُرُنَا بِهٖ فِيْهِ؟ قَالَ: تُرْسِلِيْنَ بِهٖ اِلٰی اَهْلِ حَاجَةٍ. للبخاری و ابوداؤد.

(جمع الفوائد ج:۱ ص:۸۲۶)

ترجمہ:- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لائے تو وہاں دروازے پر ایک منقّش پردہ پڑا پایا، آپؐ مکان کے اندر نہ تشریف لے گئے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ آئے تو دیکھا کہ فاطمہؓ مغموم بیٹھی ہیں اور واقعہ کا ذکر کیا، حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ظاہر فرمایا کہ فاطمہؓ پر یہ بات بہت شاق اور بھاری گزری، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ: ہمیں دنیا سے کیا واسطہ؟ ہم کہاں اور نقش و نگار کہاں!
حضرت علیؓ نے واپس آکر فاطمہؓ کو یہ بات بتلائی تو حضرت فاطمہؓ نے
دوبارہ حضرت علیؓ کو یہ پوچھنے کے لئے بھیجا کہ پھر اس پردہ کے
کپڑے کا ہم کیا کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی
ضرورت مند شخص کو دے دیں۔"

تنبیہ:- یہ بات ظاہر ہے کہ اس پردہ میں کوئی تصویر نہ تھی، صرف نقش و نگار تھے جو گناہ نہیں، مگر زیب و زینت کی چیز ہے، اس لئے اس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہلِ بیت کے لئے پسند نہیں فرمایا، اور اگر تصویر ہوتی تو کسی دوسرے حاجت مند کو بھیجنے کا جو ارشاد فرمایا یہ بھی نہ ہوتا، کیونکہ وہ حاجت مند کے لئے بھی جائز نہیں۔

بعض خاص قسم کی تصاویر کی رُخصت و اجازت

۲۲:- اَبُوْھُرَیْرَۃَ رَفَعَہٗ فِی التَّمَاثِیْلِ رَخَّصَ فِیْمَا
کَانَ یُوْطَأُ وَکَرِہَ مَا کَانَ مَنْصُوْبًا للاوسط بضعف.

(جمع الفوائد ج:۱ ص:۸۲۷)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جو تصاویر محلِ اہانت میں پامال ہوں
اُن کی اجازت ہے، اور جو کھڑی ہوں وہ ناجائز ہیں۔

۲۳:- اور مسند احمد میں حضرت صدّیقہ عائشہؓ کے مصوّر پردے کے قصہ میں جس میں پردہ کو پھاڑ کر دو گدّے بنا دینا مذکور ہے، یہ الفاظ بھی ہیں:-

فَکَانَ فِی الْبَیْتِ یَجْلِسُ عَلَیْہِ وَفِیْہِ صُوْرَۃٌ.

(مسند احمد)

ترجمہ:- یہ گدا گھر میں رہا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھتے تھے حالانکہ اس میں تصویر موجود تھی۔

۲۴:- حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کھڑی ہوئی تصویروں کو ناجائز سمجھتے تھے اور پامال میں کوئی مضائقہ نہیں جانتے تھے۔

(فتح الباری بحوالہ ابن ابی شیبہ ج:۱۰ ص:۳۴۶)

یہی مضمون فتح الباری میں بحوالہ ابنِ ابی شیبہ حضرت ابنِ سیرین اور سالم بن عبداللہ اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے۔

۲۵:- عَنِ اللَّيْثِ قَالَ: دَخَلْتُ عَلٰى سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللهِ وَهُوَ مُتَّكِئٌ عَلٰى وِسَادَةٍ فِيْهَا تَمَاثِيْلُ طَيْرٍ وَوَحْشٍ فَقُلْتُ: اَلَيْسَ يُكْرَهُ هٰذَا؟ قَالَ: لَا! اِنَّمَا يُكْرَهُ مَا نُصِبَ نَصْبًا. (مسند احمد مع فتح ربانی ج:۱۷ ص:۲۷۷)

ترجمہ:- حضرت لیث فرماتے ہیں: میں حضرت سالم بن عبداللہؒ کے گھر گیا تو وہ ایک تکیہ سے کمر لگائے بیٹھے تھے جس میں پرندوں اور وحشی جانوروں کی تصویریں تھیں، میں نے عرض کیا کہ: کیا ان کا استعمال مکروہ و ناجائز نہیں ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں! بلکہ ناجائز وہ تصویریں ہیں جو کھڑی ہوں۔

۲۶:- طبقات ابنِ سعد جزء تابعین ص:۱۳۶ میں ہے کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے بٹن میں آدمیوں کے چہرہ کی تصویریں تھیں۔

۲۷:- اسد الغابہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے حالات میں ہے کہ ان کی انگوٹھی کے نگینہ پر ایک شیر غرّاں کی تصویر بنی تھی۔

۲۸:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی انگوٹھی میں جو نگینہ تھا اس میں دو مکھیوں کی

تصویر بنی تھی۔

۲۹:- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک انگوٹھی دستیاب ہوئی تھی جس کے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ دانیال نبی کی انگوٹھی ہے، اور اس کے نگینہ میں ایک مُرقع تھا کہ دو شیر دائیں بائیں کھڑے تھے بیچ میں ایک لڑکا تھا، حضرت عمرؓ نے یہ انگوٹھی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو عنایت فرمائی۔ (منقول از معارف اعظم گڑھ)

۳۰:- ابوداؤد باب اللعب بالبنات میں حضرت صدّیقہ عائشہؓ سے بروایت عروہؓ منقول ہے (از بذل المجهود ج:۵ ص:۲۶۴):-

قَالَتْ: كُنْتُ اَلْعَبُ بِالْبَنَاتِ فَرُبَمَا دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدِیْ الْجَوَارِیْ فَاِذَا دَخَلَ خَرَجْنَ وَاِذَا خَرَجَ دَخَلْنَ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی، بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور میرے ساتھ کھیلنے والی لڑکیاں ہوتیں جب آپؐ اندر آتے تو وہ باہر چلی جاتیں، جب آپؐ باہر جاتے تو وہ پھر آ جاتی تھیں۔

اور اسی باب میں بروایت ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

قَالَتْ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ اَوْ خَيْبَرَ وَفِیْ سَهْوَتِهَا سِتْرٌ فَهَبَّتِ الرِّيْحُ فَكَشَفَتْ نَاحِيَةَ السِّتْرِ عَنْ بَنَاتٍ لِعَائِشَةَ لَعَبٍ فَقَالَ: مَا هٰذَا يَا عَائِشَةُ! قَالَتْ: بَنَاتِیْ! وَرأى بَيْنَهُنَّ فَرَسًا لَهٗ جَنَاحَانِ مِنْ رِقَاعٍ، فَقَالَ: مَا هٰذَا الَّذِیْ اَرٰی فِیْ وَسْطِهِنَّ؟ قَالَتْ: فَرَسٌ! قَالَ: وَمَا هٰذَا الَّذِیْ عَلَيْهِ؟ قُلْتُ: جَنَاحَانِ! قَالَ: فَرَسٌ لَهٗ جَنَاحَانِ؟ قَالَتْ: اَمَا سَمِعْتَ اَنْ لِسُلَيْمَانَ

خَيْلاً لَهَا اَجْنِحَةٌ! قَالَتْ: فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى رَأَيْتُ نَوَاجِذَهُ (ابوداؤد)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک یا خیبر سے واپس آئے تو میرے طاق پر پردہ پڑا ہوا تھا اتفاقاً ہوا چلی، جس نے پردہ کا ایک حصہ کھول دیا جہاں سے وہ گڑیاں عائشہؓ کی سامنے آگئیں، آپؐ نے پوچھا: عائشہ! یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: میری گڑیاں ہیں! اور آپؐ نے ان کے بیچ میں ایک گھوڑا دیکھا جس کے دو پَر کاغذ کے لگے ہوئے تھے، تو فرمایا: یہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ: گھوڑا ہے! پھر آپؐ نے فرمایا: اس گھوڑے کے اوپر یہ کیا لگے ہوئے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ: دو بازو ہیں! آپؐ نے تعجب سے فرمایا کہ: گھوڑے کے بازو ہوتے ہیں؟ عائشہؓ نے عرض کیا کہ: کیا آپؐ نے نہیں سنا کہ سلیمان ں کے گھوڑوں کے پَر لگے تھے! صدّیقہؓ فرماتی ہیں کہ: آپؐ ہنس پڑے، یہاں تک کہ میں نے آپؐ کے دندان مبارک دیکھے۔

۳۱:- اور مشکوٰۃ کتاب النکاح باب الولی فی النکاح میں صحیح مسلم کی یہ حدیث خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے:-

اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم تَزَوَّجَهَا وَهِيَ بِنْتُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَزُفَّتْ اِلَيْهِ وَهِيَ بِنْتُ تِسْعِ سِنِيْنَ وَلُعَبُهَا مَعَهَا وَمَاتَ عَنْهَا وَهِيَ بِنْتُ ثَمَانِيَ عَشَرَةَ. (مرقاۃ جدید ج:۶ ص:۲۰۵)

ترجمہ:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدّیقہ عائشہؓ سے نکاح کیا جبکہ ان کی عمر سات سال کی تھی، اور رُخصتی ہوئی جبکہ

ان کی عمر نو سال کی ہوئی، رُخصتی کے وقت ان کی گڑیاں بھی ان کے ساتھ آئیں، اور آپؐ کی وفات ہوگئی جبکہ ان کی عمر کل اٹھارہ سال کی تھی۔

امام نوویؒ نے فرمایا کہ: مشہور یہ ہے کہ نکاح چھ سال کی عمر میں ہوا تھا، مگر یقینی یہ ہے کہ اُس وقت چھ سال سے چند ماہ زائد عمر تھی، کسر کا اعتبار کیا جائے تو سات سال کہہ سکتے ہیں۔

یہ کل اکتیس احادیث ہیں جو معمولی تلاش و تفتیش سے جمع کی گئیں جن میں بیس احادیث مطلقاً تصاویر کی حرمت میں آئی ہیں، اور دس احادیث و آثار میں بعض خاص قسم کی تصاویر کے بارے میں اجازت و رخصت کے الفاظ ہیں مجموعی طور پر تصویر کی حرمت متواتر المعنی احادیث سے ثابت ہے۔

یعنی اگرچہ فرداً فرداً یہ روایات خبرِ واحد میں داخل ہیں، مگر ان کے مجموعہ سے مضمون حرمتِ تصویر کا متواتر ہوجاتا ہے، (کما صرح بہ العلماء) اسی لئے اس کی حرمت پر پوری اُمت کا اجماع ہے جس کو حافظؒ نے فتح الباری میں، عینیؒ نے عمدۃ القاری میں، اور شرح مسلم میں شیخ الاسلام نوویؒ نے نقل کیا ہے، جو آگے لکھا جائے گا۔

احادیثِ رُخصت سے فقہاءِ اُمت نے کیا سمجھا

۱:- احادیثِ حُرمت میں خود جبرائیلِ امین کی تلقین سے معلوم ہوا کہ جن تصاویر کا سر کاٹ دیا جائے یا کسی رنگ روغن سے لتھیڑ دیا جائے، اس کا استعمال جائز ہے (کما فی حدیث نمبر:۱۲ رواہ النسائی وحدیث علی نمبر:۱۷ رواہ احمد فی مسندہ)۔

اسی لئے سرکٹی ہوئی تصاویر کے جواز پر پوری اُمت کا اجماع ہے اس کو حضرت جبرائیلؑ نے خود ہی درختوں اور غیر ذی رُوح چیزوں کے حکم میں کر دیا ہے۔

۲:- دوسری رُخصت وہ ہے جو احادیث نمبر:۲۲ تا ۲۵ میں مذکور ہے کہ

تصاویر سالم ہی رہیں مگر ان کو محلِ اہانت و ذلّت میں مثلاً: پامال فرش یا گدّا وغیرہ جس کے اُوپر بیٹھا جائے بنادیا جائے، ان کے جواز پر بھی اُمت کا اجماع ہے۔

۳:- تیسری رُخصت احادیث نمبر:۲۶ تا ۲۹ سے یہ ثابت ہے کہ بہت چھوٹی تصویریں جیسے بٹن یا انگوٹھی کے نگینے پر یا روپیہ پیسہ پر اس کے استعمال کی گنجائش ہے (اس پر بھی تقریباً تمام فقہاء کا اتفاق ہے)۔

۴:- چوتھی رُخصت حدیث نمبر:۳۰، ۳۱ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ لڑکیاں جن گڑیوں سے کھیلتی ہیں یہ کھلونے استعمال کرنا بھی جائز ہے، مگر اس میں حضراتِ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

اقوالِ فقہاء ومحدّثین

علامہ عینیؒ نے شرحِ بخاری میں "اِلَّا رَقْمًا فِیْ ثَوْبٍ" والی حدیث کے ذیل میں فرمایا ہے:-

وَقَالُوْا کَرِہَ علیہ السلام مَا کَانَ سِتْرًا وَلَمْ یَکْرَہْ مَا یُدَاسُ عَلَیْہِ وَیُوْطَاءُ. بِھٰذَا قَالَ سَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ وَسَالِمٌ وَعُرْوَۃُ وَابْنُ سِیْرِیْنَ وَعَطَاءٌ وَعِکْرِمَۃُ. قَالَ عِکْرِمَۃُ یُوْطَاءُ مِنَ الصُّوَرِ ھُوَ ذِلٌّ لَھَا. وَھٰذَا اَوْسَطُ الْمَذَاھِبِ وَبِہٖ قَالَ مَالِکٌ وَالثَّوْرِیُ وَاَبُوْحَنِیْفَۃَ وَالشَّافِعِیُّ.

(عمدۃ القاری طبع قدیم ج:۱۰ ص:۳۱۳)

ترجمہ:- حضراتِ صحابہ و تابعین نے فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تصاویر کو ناجائز قرار دیا ہے جو پردہ کی صورت میں معلّق (اور کھڑی) ہوں، اور ان تصاویر کو ناجائز نہیں کیا جو پامال ہوں اور ان پر بیٹھا لیٹا جائے۔ یہی قول ہے

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت سالم بن عبداللہؒ اور عروہؒ اور ابن سیرینؒ کا اور حضرت عطاءؒ اور عکرمہ کا۔ عکرمہؒ نے فرمایا کہ: جو تصاویر پاؤں میں روندی جائیں یہ اُن کی ذلّت ہے۔ یہی مذہب ہے امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ اور ابوحنیفہؒ و شافعیؒ کا۔

مسئلۂ تصویر کے بارہ میں جمہور اُمت کا اجماع اور ائمۂ اربعہ کا مذہب شرحِ بخاری عمدۃ القاری میں بالفاظ ذیل منقول ہے:-

وَفِي التَّوْضِيحِ قَالَ اَصْحَابُنَا وَغَيْرُهُمْ: تَصْوِيْرُ صُوْرَةِ الْحَيْوانِ حَرَامٌ اَشَدَّ التَّحْرِيْمِ وَهُوَ مِنَ الْكَبَائِرِ وَسَوَاءٌ صَنَعَه' لِمَا يُمْتَهَنُ اَوْ لِغَيْرِهٖ فَحَرَامٌ بِكُلِّ حَالٍ لِاَنَّ فِيْهِ مُضَاهَاتٍ بِخَلْقِ اللهِ، وَسَوَاءٌ كَانَ فِيْ ثَوْبٍ اَوْ بِسَاطٍ اَوْ دِيْنَارٍ اَوْ دَرَاهِمَ اَوْ فَلْسٍ اَوْ اِنَاءٍ اَوْ حَائِطٍ وَاَمَّا مَا لَيْسَ فِيْهِ صُوْرَةُ حَيَوَانٍ كَالْبَحْرِ وَنَحْوِهٖ فَلَيْسَ بِحَرامٍ، وَسَوَاءٌ كَانَ فِيْ هٰذَا كُلِّهٖ مَا لَه' ظِلٌّ وَمَا لَا ظِلَّ لَه'، وَبِمَعْنَاه' قَالَ جَمَاعَةُ الْعُلَمَاءِ مَالِكٌ وَالسُّفْيَانُ وَاَبُوْحَنِيْفَةَ وَغَيْرُهُمْ انتهٰى. (عمدۃ القاری ج:۲۲ ص:۷۰ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر)

ترجمہ:- توضیح میں ہے کہ ہمارے فقہاء وغیرہم نے فرمایا ہے کہ: جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے شدید الحرمت اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے، خواہ ایسی تصویریں ہوں جن کو عادۃً ذلیل و ممتہن رکھا جاتا ہے یا ایسی نہ ہوں، پس وہ بہرحال حرام ہے، اس لئے کہ اُس میں مشابہت خلق اللہ ہے، اور برابر ہے کہ وہ تصویر کپڑے میں ہو یا فرش میں، دینار، درہم اور پیسوں میں ہو یا برتنوں میں اور دیواروں

میں، اور برابر ہے کہ وہ مجسم مورت ہو جس کا سایہ پڑتا ہے یا محض نقش اور رنگ کی صورت میں ہو، یہی فرمایا ہے جماعتِ علماء امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ اور امام ابوحنیفہؒ وغیرہم نے۔

اور شیخ الاسلام نوویؒ نے شرحِ مسلم میں لکھا ہے اور حافظؒ نے فتح الباری میں اسی کی توثیق کی ہے (فتح الباری ج:۱۰ ص:۳۱۵):-

قَالَ اَصْحَابُنَا وَغَیْرُھُمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ تَصْوِیْرُ صُوْرَةِ الْحَیَوانِ حَرَامٌ شَدِیْدُ التَّحْرِیْمِ، وَھُوَ مِنَ الْکَبَائِرِ لِاَنَّہٗ مُتَوَعَّدٌ عَلَیْہِ بِھٰذَا الْوَعِیْدِ الشَّدِیْدِ اَلْمَذْکُوْرِ فِیْ الْاَحَادِیْثِ وَسَوَاءٌ صَنَعَہٗ بِمَا یُمْتَھَنُ اَوْ بِغَیْرِہٖ فَصَنْعَتُہٗ حَرَامٌ بِکُلِّ حَالٍ لِاَنَّ فِیْہِ مُضَاھَاتٌ بِخَلْقِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَسَوَاءٌ مَا کَانَ فِیْ ثَوْبٍ اَوْ بِسَاطٍ اَوْ دِرْھَمٍ اَوْ دِیْنَارٍ اَوْ فَلْسٍ اَوْ اِنَاءٍ اَوْ حَائِطٍ اَوْ غَیْرِھَا وَاَمَّا تَصْوِیْرُ صُوْرَةُ الشَّجَرِ وَرِحَالِ الْاِبِلِ وَغَیْرِ ذٰلِکَ مِمَّا لَیْسَ فِیْہِ صُوْرَةُ الْحَیَوانِ فَلَیْسَ بِحَرَامٍ ھٰذَا حُکْمُ نَفْسِ التَّصْوِیْرِ اَمَّا اتِّخَاذُ الْمُصَوَّرِ فِیْہِ صُوْرَةُ حَیَوَانٍ فَاِنْ کَانَ مُعَلَّقًا عَلٰی حَائِطٍ اَوْ ثَوْبًا مَلْبُوْسًا اَوْ عِمَامَةً وَنَحْوَ ذٰلِکَ مِمَّا لَا یُعَدُّ مُمْتَھِنًا فَھُوَ حَرَامٌ وَاِنْ کَانَ فِیْ بِسَاطٍ یُدَاسُ وَمِخَدَّةٍ وَوِسَادَةٍ وَنَحْوِھَا مِمَّا یُمْتَھَنُ فَلَیْسَ بِحَرَامٍ، وَلَا فَرْقَ فِیْ ھٰذَا کُلِّہٖ بَیْنَ مَا لَہٗ ظِلٌّ وَمَا لَا ظِلَّ لَہٗ، ھٰذَا تَلْخِیْصُ مَذْھَبِنَا فِی الْمَسْئَلَةِ وَبِمَعْنَاہُ قَالَ جَمَاھِیْرُ الْعُلَمَاءِ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِیْنَ وَمَنْ بَعْدَھُمْ وَھُوَ مَذْھَبُ الثَّوْرِیْ وَمَالِکٌ وَاَبِیْ حَنِیْفَةَ وَغَیْرِھِمْ۔

(نووی مع مسلم ج:۲ ص:۱۹۹)

ترجمہ:- ہمارے حضرات اور دوسرے علماء نے فرمایا ہے کہ: جاندار کی تصویر بنانا سخت حرام ہے اور وہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اس لئے کہ اس پر ایسی وعیدِ شدید وارد ہے جو بہت سی احادیث میں مذکور ہے، اور اس میں برابر ہے کہ ایسی چیز کی تصویر بنائی جائے جو عادۃً ذلیل و پامال رکھی جاتی ہے یا اور کسی چیز کی، بہرحال بنانا اس کا حرام ہے، اس لئے کہ اس میں حق تعالیٰ کی صفتِ خلق کی نقل اتارنا ہے، اور یہ بھی برابر ہے کہ کپڑے میں ہو یا فرش میں، اور درہم و دینار یا پیسہ میں ہو یا برتن اور دیوار وغیرہ میں، لیکن درختوں کی، اُونٹ کے کجاوہ وغیرہ کی ایسی چیزوں کی جو ذی رُوح نہیں تو اس کی تصویر بنانا حرام نہیں، یہ تو تصویر بنانے کا حکم ہے، لیکن ان چیزوں کا استعمال جن میں ذی رُوح کی تصویر بنی ہو تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ دیوار پر معلّق یا پہنے ہوئے کپڑے یا عمامہ وغیرہ ایسی چیزوں میں ہو جو عادۃً ذلیل وحقیر نہیں سمجھی جاتی تو ان کا استعمال حرام ہے، اور اگر پامالِ فرش یا کسی گدّے اور تکیہ وغیرہ میں ہو جو عادۃً ذلیل و پامال ہوتے ہیں تو یہ حرام نہیں، اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ یہ تصویر مجسم ہو جس کا سایہ پڑتا ہے یا مجسمہ نہ ہو بلکہ محض نقش و رنگ ہو، یہ خلاصہ ہے ہمارے مذہب کا مسئلہ تصویر میں اور یہی مذہب ہے جمہور علماء کا صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے علماء میں سے اور یہی مذہب ہے امام ثوریؒ اور مالکؒ اور ابوحنیفہؒ وغیرہم کا۔

وَفِي الدُّرِ الْمُخْتَارِ اَوْ كَانَتْ صَغِيرَةً لَا تَتَبَيَّنُ تَفَاصِيلُ اَعْضَائِهَا لِلنَّاظِرِ قَائِمًا وَهِيَ عَلَى الْاَرْضِ. ذَكَرَهُ

الْحَلَبِیُّ وَقَالَ الشَّامِیُّ وَھٰذَا اَضْبَطُ لِمَا فِی الْقُھِسْتَانِیْ (وَمِثْلُہٗ فِی الطَّحْطَاوِیْ عَلَی الدُّرِ وَشَرْحِ الْمُنْیَۃِ).

ترجمہ:- اور درمختار میں ہے کہ اس تصویر کا استعمال بھی جائز ہے جو اتنی چھوٹی ہو کہ اس کو زمین پر رکھ کر آدمی کھڑا ہو کر دیکھے تو اس کے اعضاء کی تفصیل نظر نہ آئے۔

طحطاوی اور شرح مُنیہ میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

یہ مذہب حنفیہ کا نقل کیا گیا ہے، مالکیہ کا بھی یہی مذہب رسالہ "بُلُوْغُ الْقَصْدِ وَالْمَرَامِ بِمَا تَنْفَرُ عَنْہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ الْکِرَامُ" میں شیخ الاسلام ابوجعفر کتانیؒ نے نقل کیا ہے، شوافع اور حنابلہ سے بھی اس کے خلاف کوئی قول نظر سے نہیں گزرا، یہ تین قسم کی تصاویر کی رُخصت تقریباً سب فقہاء میں متفق علیہ ہے، البتہ چوتھی رُخصت یعنی لڑکیوں کے کھیلنے کی گڑیاں، اس میں حضراتِ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ: گڑیاں بھی عام تصاویر کی طرح حرام ہیں اور صدّیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اس زمانے کی ہے جبکہ تصاویر کی حرمت کا حکم نہیں تھا۔ یہ قول محدّث امام بیہقی، ابن جوزی، منذری، حلیمی، ابن بطّال اور محدّث داؤدی رحمہم اللہ وغیرہ کا ہے، اور ابوزید نے حضرت امام مالکؒ سے بھی یہ نقل کیا ہے کہ آپ لڑکیوں کے لئے گڑیاں خریدنے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ امام بیہقیؒ نے حضرت عائشہؓ کی گڑیوں کی حدیث نقل کرنے کے بعد فرمایا:-

ثَبَتَ النَّھْیُ عَنِ اتِّخَاذِ الصُّوَرِ فَتُحْمَلُ عَلٰی اَنَّ الرُّخْصَۃَ لِعَائِشَۃَؓ فِیْ ذٰلِکَ کَانَتْ قَبْلَ التَّحْرِیْمِ. وَبِہٖ جَزَمَ ابْنُ الْجَوْزِیْ. (فتح الباری ج:۱۰ص:۵۲۷)

ترجمہ:- چونکہ تصاویر کے استعمال کی حرمت نصوص سے ثابت ہوچکی ہے، اس لئے حدیثِ عائشہؓ کو اس پر محمول کیا جاوے گا کہ یہ حرمتِ تصاویر کے حکم سے پہلے کا واقعہ تھا جو منسوخ ہوگیا۔ ابن جوزیؒ نے اسی کو قولِ فیصل قرار دیا ہے۔

اور مسندِ احمد کی ایک مرفوع روایت سے بھی اس کی تائید ہوئی:

عَنْ رَجُلٍ مِنْ قُرَيْشٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّه، كَانَ مَعَ اَبِىْ هُرَيْرَةَ فَرَأى اَبُوْهُرَيْرَةَ فَرَسًا مِنْ رُقَاعٍ فِىْ يَدِ جَارِيَةٍ فَقَالَ: اَلَا تَرىٰ هٰذَا؟ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّمَا يَعْمَلُ هٰذَا مَنْ لَا خَلَاقَ لَهٗ. (مسند احمد مع فتح ربانی ج:۱۷ ص:۲۷۸)

ترجمہ:- ایک شخص حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ تھے، دیکھا کہ ایک لڑکی کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا گھوڑا تھا، ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ: تم نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: یہ کام ان لوگوں کا ہے جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

بعض نے فرمایا ہے کہ: اس سے صرف نابالغ لڑکیوں کے معاملہ میں مساہلت کا معاملہ معلوم ہوتا ہے، نابالغ لڑکیاں جو اَحکام کی ابھی مکلّف نہیں، اُن کو گڑیوں کے کھیل سے منع نہ کیا جاوے گا، صدّیقہ عائشہؓ کا یہ واقعہ بھی اُن کی نابالغی کے زمانے کا ہے، بالغوں کے لئے ان کا استعمال حسبِ عمومِ احادیث حرام ہوگا۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ: صدّیقہ عائشہؓ کے لئے گڑیوں کی رُخصت دینے کا سبب یہ تھا کہ وہ گڑیاں درحقیقت مکمل تصویریں نہ تھیں، کچھ یوں ہی نام گڑیوں کا رکھ دیا گیا تھا، اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پوچھا کہ: یہ کیا چیزیں ہیں؟ اور ان کے درمیان جو چیز رکھی ہے یہ کیا ہے؟

اگر یہ مکمّل تصویریں ہوتیں تو اس سوال کی کیا ضرورت تھی؟ دیکھتے ہی خود معلوم ہو جاتا کہ یہ عورتوں یا گھوڑوں کی تصویریں ہیں (کذا ذکرہٗ مولانا محمد یحییٰؒ فی تعلیقہ علی ابی داؤد ناقلاً عن الشیخ الگنگوھیؒ)۔ حافظ منذریؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے کہ صدّیقہ عائشہؓ کی گڑیاں مکمل تصویریں نہیں تھیں۔ (فتح الباری)

اور بعض علماء نے مطلقاً گڑیوں کی تصاویر کو عام حرمت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، جیسا کہ پامال تصاویر مستثنیٰ کی گئی ہیں۔

اور امام نوویؒ نے شرحِ مسلم میں حضرت عائشہؓ کی حدیث نمبر:۳۱ کی تشریح میں لکھا ہے:-

اَلْمُرَادُ هٰذِهِ اللُّعَبُ الْمُسَمَّاةُ بِالْبَنَاتِ الَّتِیْ تَلْعَبُ بِهَا الْجَوَارِیْ الصِّغَارِ مَعْنَاه' التَّنْبِیْهُ عَلٰی صِغْرِ سِنِّهَا قَالَ الْقَاضِیْ وَفِیْهِ جَوَازُ اتِّخَاذِ اللُّعَبِ وَاِبَاحَةِ لُعَبِ الْجَوَارِیْ بِهِنَّ وَقَدْ جَاءَ اَنَّه' عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ رَأی ذٰلِکَ لَمْ یُنْکِرْه'، قَالُوْا وَسَبَبُه' تَدْرِیْبُهُنَّ لِتَرْبِیَةِ الْاَوْلَادِ وَاِصْلَاحِ شَأنِهِنَّ وَبُیُوْتِهِنَّ.

ترجمہ:- مراد لُعَبْ سے وہ ہیں جن کو گڑیاں کہا جاتا ہے، جن سے چھوٹی لڑکیاں کھیلتی ہیں اور مطلب اس روایت کا اس پر متنبہ کرنا ہے کہ صدّیقہ عائشہؓ اس وقت بہت صغیر سن تھیں۔

قاضی عیاض نے فرمایا ہے کہ: اس روایت سے جواز ثابت ہوتا ہے گڑیاں رکھنے اور چھوٹی بچیوں کے ان سے کھیلنے کا کیونکہ اس حدیث میں ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا اور اس پر نکیر و اعتراض نہیں کیا۔ علماء نے فرمایا کہ: سبب اس کا لڑکیوں کو خانہ داری کا انتظام اور بچوں کی پرورش سکھانا ہے۔

اور مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ہے:-

وَيَحْتَمِلُ اَنْ يَكُونَ مَخْصُوصًا مِنْ اَحَادِيْثِ النَّهْيِ مِنِ اتِّخَاذِ الصُّوَرِ لِمَا ذُكِرَ مِنَ الْمَصْلِحَةِ وَيَحْتَمِلُ اَنْ يَكُوْنَ قَضِيَّةُ عَائِشَةَ فِيْ اَوَّلِ الْهِجْرَةِ قَبْلَ تَحْرِيْمِ الصُّوْرَةِ. (مرقاۃ طبع جدید ملتان ج:٦ ص:٢٠٦)

ترجمہ:- اور مرقاۃ میں مُلّا علی قاریؒ نے فرمایا کہ: یہ بھی احتمال ہے کہ گڑیوں کی حدیث عام حرمتِ تصاویر سے مستثنیٰ اور مخصوص ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ واقعہ حرمتِ تصاویر سے پہلے کا ہو، اور بعد احادیث حرمت کے وہ منسوخ ہوگیا ہو۔

فِيْ مُتَفَرِّقَاتِ الْبُيُوْعِ مِنَ الدُّرِّ الْمُخْتَارِ وَفِيْ اٰخِرِ حَظْرِ الْمُجْتَبٰى عَنْ اَبِيْ يُوْسُفَ يَجُوْزُ بَيْعُ اللُّعْبَةِ وَاَنْ يَّلْعَبَ بِهَا الصِّبْيَانُ اِنْتَهٰى. قَالَ الشَّامِيُّ: وَنِسْبَتُهٗ اِلٰى اَبِيْ يُوْسُفَ لَا تَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الْاِمَامَ يُخَالِفُهٗ لِاِحْتِمَالِ اَنْ لَّا يَكُوْنَ فِي الْمَسْئَلَةِ قَوْلٌ.

(ردالمحتار ج:٢ ص:٢٩٧ طبع استنبول، ومثلہ فی مکروہات الصلوٰۃ ج:١ ص:٦٠٨)

ترجمہ:- اور درمختار کی کتاب البیوع کے متفرقات میں مجتبیٰ کے حوالہ سے ابویوسفؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: گڑیا کی بیع جائز ہے، اور بچوں کا ان سے کھیلنا بھی جائز ہے، اور علامہ شامی نے فرمایا کہ: یہاں ابویوسفؒ کا قول کسی اختلاف کے بیان کے لئے نہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں کوئی صریح قول منقول ہی نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ لڑکیوں کی گڑیوں کے معاملہ میں فقہاء کے چار اقوال ہیں، ایک یہ کہ وہ بھی عام تصاویر کی طرح حرام ہیں، اور صدّیقہ عائشہؓ کی روایت تصاویر کی حرمت سے پہلے زمانہ کے متعلق ہے، جو بعد میں منسوخ ہوگئی، زیادہ تر محدّثین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

اور ایک قول اس کے بالمقابل قاضی عیاضؒ کا ہے کہ اسی حدیث کی رُو سے بچوں کی گڑیاں حرمتِ تصویر سے مستثنیٰ کردی گئی ہیں، وہ جائز ہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ نابالغ بچیوں کے لئے اجازت ہے، عام اجازت نہیں ہے، حنفیہ کا مسلک مذکورہ عبارت درمختار سے یہی معلوم ہوتا ہے، یہ حضرات صدّیقہ عائشہؓ کے اس قصّہ کو بلوغ سے پہلے کا قصّہ قرار دیتے ہیں، کیونکہ صدّیقہ عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں چھ، سات سال کی عمر میں آئی ہیں، جو وقت بلوغ کا نہیں تھا اسی زمانہ میں یہ واقعہ ہوسکتا ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ صدّیقہ عائشہؓ کی روایت میں جن گڑیوں کا ذکر ہے وہ مکمّل تصاویر تھی ہی نہیں، اس لئے حرمتِ تصاویر کی روایات سے اس کا کوئی تعارض نہیں، لیکن پہلے اور تیسرے قول پر ابوداؤد کی روایت جو ابومسلم کے طریق سے منقول ہے اس میں اس واقعہ کی تاریخ غزوۂ خیبر یا غزوۂ تبوک سے واپسی بتلائی ہے جو ۷ھ یا ۹ھ میں ہیں، اس وقت تک تصاویر کی حرمت کے اَحکام نہ ہونا یا حضرت صدّیقہ عائشہؓ کا نابالغ ہونا دونوں چیزیں نہایت بعید ہیں۔

لیکن جب اس روایت کے دوسرے طرق کو دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گڑیوں کے واقعہ میں غزوۂ خیبر و تبوک کا ذکر کہیں بجز اس ایک طریق ابوداؤد کے اور کسی کتاب میں نہیں، یہ واقعہ صحیحین بخاری و مسلم میں بھی آیا ہے، اور مسندِ احمد وغیرہ میں بھی، ان میں سے کسی میں سفرِ خیبر و تبوک کا کوئی ذکر نہیں اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوداؤد کے اس طریق میں کسی راوی کو مغالطہ پیش آیا ہے کہ دراصل سفر

تبوک یا خیبر کا حوالہ اُس وقعہ میں آیا ہے جو حضرت صدّیقہ عائشہؓ کے ایک مصوّر پردہ (قرام یا دُرنوک) اپنے گھر میں کسی طاق یا الماری پر ڈالا تھا، ان دونوں روایتوں میں صحیحین بخاری ومسلم کی روایت میں سفر سے واپسی کا ذکر ہے اور فتح الباری میں اس سفر کو بحوالہ بیہقی سفر تبوک اور بحوالہ ابوداؤد خیبر یا تبوک لکھا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک ابوداؤد کی روایت میں غزوۂ خیبر یا تبوک کا تعلق صدّیقہ عائشہؓ کی گڑیوں کے واقعہ سے نہیں بلکہ مصوّر پردہ کے واقعہ سے ہے، راوی کو مغالطہ کی وجہ شاید یہ پیش آئی ہو کہ قرام اور دُرنوک کے واقعہ میں صحیح مسلم کے الفاظ میں یہ بھی ہے کہ اس پر ایک پروں والے گھوڑے کی تصویر تھی اور حضرت عائشہؓ کی گڑیوں میں بھی کوئی ایسی چیز تھی جس کو انہوں نے پروں والا گھوڑا قرار دیا تھا، اس سے راوی کو یہ اشتباہ ہوجانا کچھ بعید نہیں اور خود ان دو واقعات کے الفاظ اور بیان کو دیکھئے تو وہ اس پر کھلی شہادت دیں گے کہ یہ گڑیوں کا واقعہ صدّیقہ عائشہؓ کے ابتدائی بچپن کے زمانہ کا ہے اور قرام و دُرنوک کا واقعہ اس کے بعد کا ہے، صحیح مسلم کتاب النکاح کی حدیث میں صدّیقہ عائشہؓ کے ساتھ بلوغ سے پہلے گڑیاں ہونا اور رُخصتی کے وقت ان کا ساتھ آنا مذکور ہے، یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے بالکل ابتدائی زمانہ کا ہے۔

الفاظ اور بیان کا تقابل کیجئے کہ پردہ کے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر ناگواری کے آثار دیکھتے ہی سب سے پہلے جو کلمہ صدّیقہ عائشہؓ نے بولا وہ توبہ کے متعلق ہے، یہ بات بھی بعد میں پوچھی کہ میرا گناہ کیا ہے؟ اور گڑیوں کے واقعہ میں بالکل بچوں کی طرح ان کی گفتگو ہے۔

ان سب قرائنِ قویہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ صدّیقہ عائشہؓ کی گڑیوں کا واقعہ بالکل ابتداءِ ہجرت کے زمانے میں پیش آیا جبکہ تصاویر کی حرمت کے اَحکام نہ تھے، نیز حضرت صدّیقہ صغیر السن لڑکی تھیں اس لئے جن حضرات نے اس حدیث کو احادیثِ حرمت سے منسوخ قرار دیا، یا جنھوں نے اس کو صرف نابالغ لڑکیوں کی

خصوصیت قرار دیا، ان کے کلام کی گنجائش بلاشبہ موجود ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمۂ فقہاءؒ نے ان احادیثِ رخصت سے یہ نتائج نکالے ہیں:-

تصویر کشی اور تصویر سازی کسی جاندار کی کسی حال میں جائز نہیں، صرف غیر ذی رُوح بے جان چیزوں کی تصاویر بنا سکتے ہیں۔

اور تصاویر کے استعمال میں مندرجہ ذیل قسم کی تصاویر کی اجازت دی ہے:-

۱:- سر کٹی ہوئی تصویر جو درخت کے مشابہ ہو جائے۔

۲:- پامال تصاویر جو جوتے کے تلے یا فرش وغیرہ میں ہوں۔

۳:- بہت چھوٹی تصویریں جیسے انگوٹھی اور بٹن کی تصویریں، وہ بھی عام نقش و نگار کے حکم میں ہیں۔

۴:- بچیوں کے کھیلنے کی گڑیاں اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض حرام فرماتے ہیں، بعض جائز، اور بعض خاص شرائط کے ساتھ اجازت دیتے ہیں۔

لیکن اصل مسئلہ تصویر کی حرمت کا سب کے نزدیک متفق علیہ ہے، یہ کسی نے نہیں کہا کہ ان سے احادیثِ حرمت کو منسوخ قرار دے کر اصل تصویر ہی کو جائز کر ڈالا ہو، یا جائز تصویروں کی کوئی ایسی علّت نکالی ہو جس کی وسعت میں عام تصویریں بھی حلال ہو جائیں۔

مگر آج کل کے جدید مصنّفین نے ان احادیثِ رخصت کو عام تصاویر کی حلّت کا حیلہ بنالیا ہے، اور ایک نیا حیلہ تو ایسا ایجاد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ تصاویر کی ساری ہی بحث ختم ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ آج کل جس طرح تمام مصنوعات جو پہلے زمانے میں دستی بنائی جاتی تھیں اب مشینوں اور آلات کے ذریعہ بنتی ہیں، اسی طرح

تصاویر سازی کے فن کو اس مشینی دور نے ترقی دے کر فوٹو گرافی اور عکّاسی کی صورت دے دی ہے، بعض علماءِ مصر نے پھر بعض علماءِ ہند نے بھی اس کے متعلق یہ فرمادیا کہ فوٹو کے ذریعہ جو تصویر لی جاتی ہے وہ تصویر کے حکم میں داخل ہی نہیں، وہ تو ایک ظل اور سایہ ہے جیسے آئینہ اور پانی میں انسان کی شکل دیکھی جائے، اس کے حرام و ناجائز ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

اور یہ فتنہ ایسا عام ہوا کہ بہت سے علماء وصلحاء بھی کاغذی پیراہنوں میں دنیا بھر میں چلتے پھرتے نظر آنے لگے اور اربابِ عمائم وقبا کے فوٹو دنیا میں عام ہو گئے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض علماء کو اس فوٹو کے اسٹیج پر زبردستی ان کے علم و قصد کے خلاف لایا جاتا ہے، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے حضرات بالقصد اس میں شریک ہوتے ہیں، اس لئے پہلے اسی مسئلہ کے متعلق لکھا جاتا ہے جس کا مستقل نام بھی رکھ دیا ہے تاکہ علیحدہ بھی بصورتِ رسالہ شائع ہو سکے۔

کشف السجاف
عن
وجه فوتوغراف

فوٹو کے متعلق شرعی اَحکام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج کل آخرت سے غفلت اور فسق و فجور اور گناہوں کے عموم وشیوع کا زمانہ ہے، جو اپنی جگہ خود ایک مصیبت ہے، لیکن اس وقت ایک نئی مصیبت اس مشینی دور نے کھڑی کردی کہ جو چیزیں پہلے دستی صنعت سے بنائی جاتی تھیں اب وہ مشینوں کے ذریعہ پہلے سے زیادہ صاف ستھری اور جلد سے جلد بن کر تیار ہوتی ہیں، ان مشینوں کے ذریعہ تیار ہونے والی چیزوں کے عموماً نام بھی الگ رکھ دیئے گئے۔

جن چیزوں کو شریعتِ اسلام نے کسی خاص نام اور عنوان سے حرام کیا تھا، اب وہ نام وعنوان نہ رہا تو کچھ لوگوں نے اس کو حیلۂ جواز بنالیا، اور یہ وہی آفت ہے جس کے واقع ہونے کی خبر علاماتِ قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دے چکے ہیں، آپؐ نے ارشاد فرمایا:-

> میری اُمت کے کچھ لوگ شراب کو اُس کا نام بدل کر پئیں گے، اُن کے سامنے راگ باجے اور گانے والی عورتیں ہوں گی، اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو زمین میں دھنسادیں گے اور بعض کی

صورتیں مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنا دیں گے۔

(رواہ ابن ماجہ و ابن حبان فی صحیحہ

کذا فی الترغیب للمنذری ج:۳ ص:۱۸۷)

آج کل لوگوں نے یہی معاملہ شراب کے علاوہ دوسرے گناہوں اور فسق و فجور کے ساتھ کرلیا ہے کہ اُن کی شکلیں، صورتیں نئی نئی نکال کر اُن کے نام بدل ڈالے اور گناہ اور ثواب کے فکر سے فارغ ہوگئے۔

سود اور قمار کی اس دنیا نے ایک سے ایک نئی صورت اختیار کی، سودخواری کا نام ''بینکنگ'' رکھ دیا، قمار کی ہزاروں صورتیں ایجاد ہوگئیں، لاٹری کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوگئے، عرف میں ان کو قمار و جوا نہیں کہا جاتا، یہاں تک کہ حکومت کے قوانین میں بھی اگرچہ قمار اور جوا ممنوع قرار دے رکھا ہے، لیکن ان نئی صورتوں کو قمار کے مفہوم سے خارج سمجھ کر کھلے بندوں استعمال کی جاتی ہیں۔

گھوڑوں وغیرہ کی ریس (گھڑ دوڑ) پر بڑی بڑی رقموں کی بازی لگائی جاتی ہے، سٹہ کا بازار رات دن یہی سود اور قمار کا کام کرنے کے لئے کُھلا ہوا ہے، ''حل معما'' کا جوا بہت سے رسائل اور اخبارات کا کاروبار بنا ہوا ہے، جن میں جوئے اور قمار کی پوری حقیقت موجود ہوتے ہوئے صرف اس کا نام بدلنے سے بہت سے لوگ مغالطہ میں اور بہت سے محض حیلہ جوئی کے مد میں ان کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کھلے طور پر سود اور قمار کا کاروبار نہیں کرتے، کچھ بھی سہی کم از کم اس کا نام تو سود و قمار نہیں ہے، اس لئے ہمارا گناہ ہوا بھی تو ہلکا ہوگا، لیکن حقیقت اس کے بالکل برخلاف یہ ہے کہ اَحکامِ شرعیہ کی خلاف ورزی اس طرح کی حیلہ جوئی کے ذریعہ کھلے طور پر کرنا یہ ایک گناہ کو دو گناہ بنا دیتا ہے، ایک اصل گناہ، دوسرے اس گناہ کو حلال سمجھنے سمجھانے کی کوشش! اور یہ دوسرا گناہ پہلے گناہ سے بھی زیادہ اشد ہے:

کارہا باخلق آری جملہ راست
با خدا تزویر وحیلہ کے رواست

یہی معاملہ ہمارے زیرِ بحث مسئلہ ''فوٹوگرافی'' میں ہوا ہے کہ یہ تصویرسازی کی ایک مشین ایجاد ہوئی جس میں اصل شے کا سایہ فوٹو کے شیشہ پر لے کر اس کو رنگ اور مسالہ کے ذریعہ پائیدار بنادیا جاتا ہے، اس طرح تصویر بالکل نقل مطابق اصل بھی ہوجاتی ہے اور قلم گھسنے کی محنت و دیدہ ریزی سے بھی نجات ہوجاتی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ فوٹوگرافی فنِ تصویرسازی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور تصویرکشی کے گناہ کو اُس نے آسان اور سستا کرکے ایک وبائی مرض بنادیا ہے۔

مگر کچھ حضرات ہیں جنہوں نے فلسفہ یہ اختیار کیا کہ جب کوئی مرض وبائی صورت اختیار کرلے اور عام ہوجائے تو اس کو مرض ہی کہنا چھوڑ دو، نہ اس کے علاج کی ضرورت ہے، اور نہ اس سے بچنے کی کوشش ضروری ہے، اور حیلہ یہ نکالا کہ فوٹو کی تصویر درحقیقت تصویر نہیں وہ تو ایک سایہ اور ظِل ہے، جیسے آئینہ وغیرہ شفّاف چیزوں میں انسان کا چہرہ اور پورا بدن بے کم و کاست سامنے آجاتا ہے، اسی طرح فوٹو کے آئینہ پر انسان کی تصویر آجاتی ہے، تو جس طرح آئینہ اور پانی میں اپنی یا کسی دوسرے کی تصویر دیکھنا، استعمال کرنا کسی کے نزدیک تصویرسازی یا استعمالِ تصویر کے گناہ میں شامل نہیں اسی طرح فوٹو سے حاصل شدہ تصاویر بھی ایک ظِل اور سایہ ہیں، ان کے حاصل کرنے اور استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن یہ بات کچھ زیادہ غور وفکر کی محتاج نہیں کہ آئینہ، پانی وغیرہ کے اندر آئے ہوئے عکس اور فوٹو سے حاصل کی ہوئی تصویر میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا محض ایک فریب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ظِل اور سایہ قائم و پائیدار نہیں ہوتا بلکہ صاحبِ ظِل کے تابع ہوتا ہے، جب تک وہ آئینہ کے مقابل کھڑا ہے تو یہ ظِل بھی کھڑا ہے، جب وہ یہاں سے الگ ہوا تو یہ ظِل بھی غائب اور فنا

ہوگیا۔ فوٹو کے آئینہ پر جو کسی انسان کا عکس آیا اس کو عکس اُسی وقت تک کہا جاسکتا ہے جب تک اس کو رنگ و روغن اور مسالہ کے ذریعہ قائم اور پائیدار نہ بنادیا جائے، اور جس وقت اس عکس کو قائم اور پائیدار بنادیا اُسی وقت یہ عکس ''تصویر'' بن گئی، تصویر سازی کے لئے رنگ و روغن قلم سے لگایا جائے یا کسی مشین سے، اس سے مسئلہ کی صورت نہیں بدلتی، اس کی مثال تو بالکل یہ ہے کہ ایک شخص کو کسی آئینہ کے بالمقابل کھڑا کرکے اس کی صورت شکل کو کسی روغن کے ذریعہ اس آئینہ پر مرتسم کردیا جائے تو یہ عکس جب تک رنگ و روغن کے ذریعہ قائم اور پائیدار نہیں تھا اس وقت تک عکس تھا، اُس میں کوئی حرمت و ممانعت نہ تھی، اور جب اس عکس کو رنگ و روغن کے ذریعہ شیشہ پر مرتسم پائیدار بنادیا تو اب یہی عکس ''تصویر'' بن گئی، اس لئے اس کے بعد وہ ذی ظِل کے تابع نہیں رہتی، صاحبِ ظِل یہاں سے چلا جاتا ہے مگر تصویر آئینہ پر قائم رہتی ہے۔

فوٹو کے جواز کی ایک دوسری وجہ

بعض حضرات نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ فوٹو گرافر اعضاء کی تخلیق و تکوین نہیں کرتا اور حدیث میں تصویر کشی کو حرام قرار دینے کی وجہ یہی بیان فرمائی ہے کہ تصویر سازی میں اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کی نقالی اور گویا ہمسری کا ادّعا ہے اس لئے اس کا عذاب یہ ہوگا کہ اس کو اپنی بنائی ہوئی تصویر میں جان ڈالنے کے لئے کہا جائے گا، جب وہ اس سے عاجز ہوگا تو عذاب دیا جائے گا۔

لیکن ذرا بھی غور سے کام لیں تو اعضاء کی حقیقی تخلیق و تکوین تو کوئی مصوّر بھی نہیں کرتا، اعضاء کی ظاہری سطح نقش کے ذریعہ بنادیتا ہے، نہ اس میں رگیں پٹھے بنتے ہیں نہ ہڈی اور گوشت بنتا ہے، اس ظاہری سطح کا نقش بنادینے ہی کا نام شریعت نے ''تصویر'' رکھا ہے، جس کو حرام قرار دیا ہے، تو فوٹو میں اعضاء کی سطح کو رنگ و روغن کے ذریعہ قائم کردینے اور قلم سے رنگ بھر دینے میں کیا فرق ہے؟ حدیث کے الفاظ

میں بھی اس کو تخلیق نہیں بلکہ "مُضَاهَاتُ خَلْقِ اللّٰهِ" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، یعنی تخلیقِ خداوندی کی مشابہت پیدا کرنا اور نقالی کرنا اس میں ظاہر ہے کہ وہ قلم کے ذریعہ کی جائے یا کسی مشین کے ذریعہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، جس طرح لوہے پیتل وغیرہ کے تصویری مجسّمات لوگ ہاتھ سے بناتے ہیں، اسی طرح بعض سانچوں اور مشینوں کے ذریعہ بھی ڈھالے جاتے ہیں، اعضاء کی تخلیق وتکوین الگ الگ ان سانچوں مشینوں میں بھی نہیں ہوتی مگر مشین تھوڑی دیر میں بہت سے بت بنا دیتی ہے، کیا اس کو جائز کہا جاسکتا ہے؟

اس کے علاوہ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جس صورت میں مصوّر اعضاء کی تخلیق و تکوین نہ کرے تو وہ تصویر کشی جائز ہوجائے، کیونکہ احادیثِ رسولؐ میں حرمتِ تصاویر کی متعدد وجوہ بیان کی گئی ہیں، جو بیانِ احادیث کے بعد اوپر لکھ دی گئی ہیں، اگر کسی تصویر میں بالفرض ایک وجہ حرمتِ تصویر کی موجود نہ ہو تو اس سے وہ تصویر حلال نہیں ہوجاتی کیونکہ دوسری وجوہِ حرمت وہاں بھی موجود اور قائم ہیں، مثلاً: اُن کا ذریعۂ شرک ہونا اور رحمت کے فرشتوں کے داخلہ سے مانع ہونا وغیرہ۔

خلاصہ یہ ہے کہ فوٹوگرافی کو تصویرسازی سے الگ کوئی چیز سمجھنا اور بذریعہ فوٹو حاصل شدہ تصاویر کو تصاویر نہ کہنا ایک بدیہی غلطی اور خالص نفس کا فریب ہے، جس میں بہت سے متدیّن حضرات اور بعض علماء تک مبتلا ہوگئے ہیں۔

اس جگہ مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ خط یاد کیجئے جو انہوں نے رانچی جیل سے اپنے کسی خاص آدمی کو لکھا ہے جس میں اپنا فوٹو دینے سے یہ کہکر انکار کیا ہے کہ تصویر کھینچنا کھنچوانا اور اس کا رکھنا سب حرام ہیں، جس سے واضح ہوا کہ اس دنیا کے روشن خیال حضرات بھی فوٹو کو تصویر کشی ہی قرار دیتے ہیں۔

عرب ممالک میں فوٹو کا رواج وبائی مرض کی طرح ہوچکا ہے، لیکن وہاں بھی علمائے حق نے اس کی ممانعت وحرمت پر رسالے اور مقالے لکھے ہیں، ریاض نجد

کے ایک عالم شیخ عبدالرحمٰن بن فریان کا ایک مستقل رسالہ حال میں نظر سے گزرا جس میں فوٹو کی تصاویر کو حرام قرار دے کر دردمندانہ فریاد کی ہے کہ اگرچہ یہ بلا عام ہوچکی ہے مگر مسلمانوں کو ہمت نہیں ہارنا چاہئے، خود بچیں دوسروں کو بچانے کی فکر کریں، کسی گناہ کا عام رواج پاجانا اس کو حلال نہیں کردیتا بلکہ اور زیادہ خطرہ عذابِ الٰہی کا اس سے ہوجاتا ہے۔

حق تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین کی فہمِ سلیم اور اس پر عملِ مستقیم کی توفیق عطا فرمائیں، واللہ المستعان وعلیہ التکلان!

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

اَحادیثِ رُخصت جدید مصنّفین کی نظر میں

اَحادیثِ حرمت منسوخ ہیں

بعض علماء نے حضرت صدّیقہ عائشہؓ کی حدیث مصوّر پردہ کے مختلف الفاظ قرام، دُرنوک اور دونوں میں بیانِ واقعہ کے کچھ کچھ فرق کو باہم ٹکرایا ہے کہ اس اضطراب کے ہوتے ہوئے اس سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوسکتا، اور جبکہ یہ معلوم ہے کہ روایات جس طرح حرمتِ تصاویر کے لئے آتی ہیں ایسے ہی بعض روایات میں حلّت کا بھی بیان ہے، تو پھر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ حرمت ابتدائے اسلام میں ہو، جو تصاویر کے ذریعہ بت پرستی ہونے کی بناء پر تھی، بعد میں جب یہ اندازہ ہوگیا کہ اب توحید مسلمانوں میں راسخ ہوچکی ہے، شرک میں مبتلا ہونے کا احتمال نہیں رہا اس لئے اجازت دے دی گئی ہے۔

لیکن ان متواتر احادیثِ حرمت کے پورے ذخیرہ کو بغیر کسی قوی دلیل کے محض اپنے گمان اور تخیل سے منسوخ کہہ دینا علم کی شان سے بہت بعید ہے، خصوصاً جبکہ تصاویر کی حرمت اور اس کے واقعات صحابہؓ وتابعینؒ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے بعد بھی جاری اور نافذ رہے ہوں اور جب کہ مرضِ وفات میں بھی آپؐ سے تصاویر پر وعید منقول ہے۔

اسی لئے جمہور اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ تصاویر جیسے پہلی اُمتوں میں حرام نہ تھی، حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے جنّات اُن کے لئے محرابیں اور تصاویر بنایا کرتے تھے اس کی تصریح قرآن میں موجود ہے، اسی طرح ابتداءِ اسلام میں ایک وقت تک تصاویر کو حرام نہیں قرار دیا گیا، جس کی مدت مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ہجرت کے ابتدائی زمانہ تک بتلائی ہے، وجہ یہ ہے کہ بہت سی وہ چیزیں جو شریعتوں میں اس لئے جائز تھیں کہ خود ان میں کوئی خاص مفسدہ نہیں تھا، مگر بعد میں وہ مفاسد کا ایسا ذریعہ بن گئیں کہ اس سے پوری اُمت گمراہ ہوگئی، شریعتِ اسلام چونکہ ابدی شریعت ہے اور نبوّت اور سلسلۂ وحی ختم ہو چکا ہے، اس لئے جن افعال کے ذریعہ پچھلی اُمتوں میں گمراہی پھیلنے کا تجربہ ہو چکا تھا اگرچہ خود وہ کام حرام نہ تھے، شریعتِ اسلام میں ایسے افعال کو بھی سدِّ ذرائع کے طور پر حرام کر دیا گیا ہے۔

تصاویر کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے کہ ان کی تعظیم و تکریم پچھلی اُمتوں کی گمراہی اور شرک و بت پرستی میں ابتلاء کا سبب بنی تھی اس لئے اس اُمتِ مصطفویہ میں اس فعل ہی کو حرام کر دیا گیا۔

عورتوں کا بے پردہ پھرنا اپنی ذات میں کوئی گناہ نہ تھا، مگر پچھلی اُمتوں میں اس کے ذریعہ سخت فواحش میں ابتلاء کا تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے اسلام نے عورتوں پر پردہ لازم کر دیا۔

اور اکثر ایسے مسائل میں اسلامی شریعت بھی ابتدائی زمانہ میں سابقہ شریعتوں کی طرح رہی بعد میں سدِّ ذرائع کے طور پر ایسی چیزوں کو بھی حرام قرار دے دیا جو اگرچہ اپنی ذات میں گناہ بھی نہ ہوں مگر گناہوں میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہوں، شریعتِ اسلام میں اس کے نظائر بہت ہیں۔ فقہاءؒ نے سدِّ ذرائع کو ایک

مستقل باب کی حیثیت سے لکھا ہے۔

اس کا مقتضا یہی ہے کہ ہجرت کے ابتدائی زمانہ تک اسلام میں بھی تصویر کی ممانعت نہ تھی، بعد میں حرمت کے احکام آئے، اس کی شہادت کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے جس مصوّر پردہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے اور اُس کو پھاڑ ڈالا یہ واقعہ اکثر محدثینؒ کے نزدیک غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ہوا ہے، اور غزوۂ تبوک ۹ ہجری کا واقعہ ہے، اور مرض الموت میں حضرت اُمِ سلمہؓ وغیرہ کا کنیسہ ماریہ حبشہ کا ذکر کرنا اور اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تصویر سازی پر عذاب کا ذکر فرمانا مذکور ہے، یہ سب کھلے شواہد ہیں کہ تصاویر کی اجازت کا تعلق ابتداءِ اسلام سے تھا اور ممانعت بعد میں آئی، اگر اسی اصول سے کام لینا ہے کہ جو احکام بعد میں آئے ان کو پچھلے کا ناسخ قرار دے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ احادیثِ رُخصت سبھی منسوخ مانی جائیں اور کسی طرح کی رُخصت بھی تصویر کے متعلق نہ ہو، مگر جمہور اُمت نے اس معاملہ میں ناسخ ومنسوخ کے احکام جاری کرنے کے بجائے حرمت سے خاص خاص قسم کی تصاویر کو مستثنیٰ قرار دے دیا ہے، واللہ اعلم!

تصاویر میں مشرکانہ اور غیر مشرکانہ کی تفریق

بعض علماء نے احادیثِ حرمت واجازت دونوں میں تطبیق اس طرح دی کہ حرام وممنوع صرف وہ تصاویر ہیں جو عبادت وپرستش کے کام میں آتی ہیں، جیسے حضرت عیسیٰ ومریم علیہما السلام کی تصویر یا بتوں کی تصاویر، باقی دوسری تصویریں جن میں عبادت وبت پرستی کا کوئی شائبہ نہیں وہ سب جائز ہوں، لیکن اجازتِ مذکورہ میں ذرا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ جن تصاویر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا اور اس پر ناراض ہوئے، بدستِ خود اس کپڑے کو چاک کردیا، اس میں اس کا کوئی احتمال نہیں کہ پوجاپاٹ کی تصویریں ہوں، اگر ایسا ہوتا تو صدیقہ عائشہؓ

اور دوسرے حضراتِ صحابہؓ جن کے پاس یہ تصویریں دیکھ کر ممانعت کی گئی وہ خود ہی اُن سے پرہیز کرتے، کیا کسی صحابی کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ بتوں اور معبوداتِ باطلہ کی تصویروں کو اپنے گھروں میں جگہ دیں گے؟ کلّا و اللہ!

اور اگر بالفرض یہ تصویر بھی ایسی ہی مشرکانہ تھی تو گدا بنانے کے بعد بھی یہ تصویر اس میں موجود تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو استعمال فرماتے تھے، تو کیا یہ مشرکانہ تصویر کا استعمال نہیں ہوا؟

بات اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو تصاویر صدّیقہ عائشہؓ یا دوسرے صحابہؓ کے پاس دیکھ کر اظہارِ ناراضی کیا گیا اور اُن کو ممنوع قرار دیا وہ سب تصاویر محض زینت کے لئے تھیں، مشرکانہ تصاویر کا وہاں کوئی احتمال نہیں، اس لئے یہ فرق کرنا کہ حرام صرف وہ تصویریں ہوں جن کی پوجاپاٹ کی جاتی ہے، باقی سب جائز ہوں، کسی طرح احادیثِ مذکورہ میں اس کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی، البتہ جبریلؑ نے اس کی خود تلقین کی کہ یا تو اس تصویر کا سر کاٹ دیجئے یا پھر اس کو پامال گدّے اور فرش کی صورت میں استعمال کیجئے، اس سے اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ تصویروں کا استعمال ان کے کھڑے ہونے کی صورت میں ایک گونہ اس کی تعظیم ہے، اور تصویروں کی تعظیم ہی دنیا میں شرک و بت پرستی کا ذریعہ بنی ہے، اس لئے مشرکین کی مشابہت کم از کم اس طرح کے استعمال میں ہوجاتی ہے، اس مشابہت کا قلع کرنے کے لئے ان کو پامال کر کے استعمال کرنے کی اجازت دے دی، یہ کسی ایک حدیث کے ایک جملہ میں بھی نہیں کہ فلاں تصویر مشرکانہ تھی اس لئے اس کو حرام کیا گیا، فلاں مشرکانہ نہیں تھی اُس کی اجازت دے دی گئی۔ واقعۂ جبریل میں بھی جبریل علیہ السلام نے یہ کہہ کر تصویر پر نکیر نہیں کیا کہ یہ مشرکانہ تصویر ہے، اس لئے اس کو ہٹایئے، یہ کہیں نہیں کہا کہ فرشتے اس مکان میں نہیں جاتے جس میں مشرکانہ تصاویر ہوں۔

پھر معلوم نہیں کہ یہ مشرکانہ اور غیر مشرکانہ کی تفریق اور دونوں کے اَحکام میں

فرق کتاب و سنت اور شریعتِ اسلام کی طرف کس طرح منسوب کیا گیا؟ ہاں! ان تمام روایات سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ تصویر خواہ مشرکانہ ہو یا غیر مشرکانہ اس کا استعمال معلّق پردے کی صورت میں یا بڑے تکیے پر کھڑے ہونے کی صورت میں حرام وممنوع ہے، لیکن جب اس کو پامال کر کے محلِ ذلت میں ڈال دیا جائے تو اس کی اجازت ہوجاتی ہے، کیونکہ اس طرح کے استعمال میں تصویر کی عبادت کا کوئی احتمال نہیں رہتا اور تصویر کی پرستش کرنے والوں کے ساتھ مشابہت بھی نہیں رہتی۔

اور یہ بھی تو دیکھئے کہ احادیثِ رسولؐ جو تصویر بنانے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت کے لئے آئی ہیں اور جن کا ایک بڑا حصہ اوپر نقل کیا گیا ہے، ان میں خود اس ممانعت اور حرمت کی جو وجوہ بیان ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:-

۱:- تصویر سازی میں اللہ جل شانہ کی مخصوص صفتِ تخلیق و تصویر کی مشابہت اور نقالی ہوتی ہے، جو عملی طور پر حق تعالیٰ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ ہے۔

۲:- یہ کہ بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ لوگوں نے اپنے بزرگوں کی تصاویر بطورِ یادگار کے اپنے مکانوں اور مسجدوں میں آویزاں کیں تاکہ ان کو دیکھ کر ان ہی کی طرح عبادت کی توفیق ہو اور ایک زمانہ تک ایسا ہوتا بھی رہا، مگر بعد میں آنے والی نسلوں نے اپنے باپ دادوں کو ان تصاویر کی تعظیم و تکریم کرتے دیکھا تھا، وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ ہمارے باپ دادے انہیں تصویروں کی پرستش کرتے تھے۔

آپ غور کریں کہ اس بناءِ حرمت میں تصویر کے مشرکانہ یا غیر مشرکانہ ہونے کا کیا دخل؟ صفتِ تخلیق میں ربّ العزت کے ساتھ دعویٰ ہمسری کیا صرف عیسیٰ و مریم علیہما السلام کی تصاویر بنانے میں ہوتا ہے، دوسری تصاویر اس مضاہاتِ خلق اللہ سے خالی ہیں؟

اور کیا جس وقت عیسیٰ و مریم کی تصویر لوگوں نے بطورِ یادگار لگائی تھی اس وقت یہ تصویریں معبود مانی جاتی تھیں جن کو مشرکانہ کہا جاسکے یا اس وقت یہ تصویریں

بھی غیر معبود اور غیر مشرکانہ تھیں، مرورِ ایام کے بعد مشرکانہ بن گئیں؟ خلاصہ یہ ہے کہ تصویر کی حرمت و جواز میں مشرکانہ اور غیر مشرکانہ کی تفریق قرآن و سنت اور عقل و قیاس کسی رو سے بھی صحیح نہیں۔

ایک نامکمّل روایت سے غلط استدلال

بعض علماء نے مسند ابوداؤد طیالسی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ ایک چادر اُوڑھے ہوئے تھے جس میں تصویریں بنی تھیں، ایک شخص نے اعتراض کیا تو انہوں نے کہا کہ: میں نے دیکھا نہیں تھا! اس کے بعد فرمایا کہ: میں سمجھتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے اس کو منع فرمایا ہے کہ اس سے غرور و فخر پیدا ہوتا ہے، اور بحمداللہ ہم لوگ ایسے نہیں لیکن چونکہ ان بزرگوں کے نزدیک یہ بھی خلافِ تقویٰ تھا، اس لئے ابنِ عباسؓ نے حکم دیا کہ اس کی صورت بگاڑ دی جائے۔

اس روایت کو نقل کر کے بعض علماء نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ تصاویر کا استعمال ابنِ عباسؓ جیسے عظیم الشان صحابی بھی اپنے لباس میں کرتے تھے اور جب کسی نے اعتراض کیا تو عذر یہ بتلایا کہ اس کی ممانعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے فرمائی تھی کہ اس کے استعمال میں تکبر و غرور پیدا ہوتا ہے، اور الحمدللہ ہم اس مرض سے مامون ہیں، اس لئے اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، جب ابنِ عباسؓ اس میں مضائقہ نہ سمجھیں تو ان سے زیادہ متّقی کون ہے جو اس کو حرام کہے؟

اور واقعہ یہ ہے کہ مسند ابوداؤد طیالسی میں یہ روایت بہت ہی ناقص اور نامکمّل بیان ہوئی ہے جس سے یہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے، پورا واقعہ مسندِ احمد میں بروایتِ شعبہ یہ ہے کہ:-

> مسور بن مخرمہؓ حضرت ابنِ عباسؓ کی عیادت کے لئے ان کے گھر گئے، ابنِ عباسؓ کسی درد میں مبتلا تھے، دیکھا تو وہ ایک ریشمی

چادر اُوڑھے ہوئے تھے، میں نے عرض کیا: ابنِ عباس! یہ کپڑا کیسا ہے؟ ابنِ عباسؓ نے پوچھا: کیوں اس میں کیا بات ہے؟ تو مسور بن مخرمہؓ نے عرض کیا کہ: یہ تو ریشمی کپڑا ہے! تو ابن عباسؓ نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ: "وَاللہِ مَا عَلِمْتُ بِہٖ!" خدا کی قسم! مجھے اس کی خبر نہیں ہوئی کہ یہ ریشمی کپڑا ہے۔ اور پھر دوسری بات یہ کہی کہ: میرا گمان یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے صرف اس لئے منع فرمایا ہے کہ اس سے تکبر وغرور پیدا ہوتا ہے، اور ہم بحمداللہ اس تکبر وغرور سے بری ہیں۔ پھر حضرت مسورؓ نے عرض کیا کہ: آپ کی بھٹی یا چولھے کے پاس تصاویر کیسی ہیں؟ تو فرمایا کہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان تصویروں کو جلا دیا ہے! مسورؓ کو تو ابنِ عباسؓ نے یہ جواب دے کر رُخصت کردیا مگر ان کے جانے کے بعد لوگوں سے کہا کہ: یہ کپڑا میرے پاس سے ہٹادو اور تصویروں کے سر قطع کردو! لوگوں نے عرض کیا کہ: ابنِ عباس! اگر آپ ان کے سر کاٹ کر خراب نہ کریں بلکہ اسی طرح بازار میں بھیج کر فروخت کردیں تو اچھی قیمت اُٹھ جائے گی۔ مگر ابن عباسؓ نے اس کو بھی پسند نہ فرمایا، اور تصاویر کے سر کٹوادیئے۔ (مسندِ احمد مع فتح ربانی ج:۱۷ ص:۲۸۷)

معلوم ہوا کہ اس واقعہ میں دو چیزیں زیرِ بحث تھیں ایک ریشمی کپڑا جس کا ابنِ عباسؓ نے خود علم نہ ہونا بیان فرمایا، اور یہی اصل عذر تھا، کیونکہ ابنِ عباسؓ کی بینائی آخر عمر میں نہ رہی تھی اس لئے ریشمی کپڑے کو دیکھا نہیں، کسی نے دے دیا آپؓ نے استعمال کرلیا، اور پھر اسی کے متعلق یہ عذر بھی پیش کیا کہ اس کی ممانعت غرور وتکبر کی وجہ سے کی گئی تھی، وہ ہم میں ہے نہیں، اس لئے ہمارے واسطے گنجائش ہے۔ یہ ابنِ عباسؓ کا اپنا خیال تھا، مگر دوسری احادیثِ صحیحہ سے مردوں کے لئے ریشمی کپڑا استعمال

کرنے کی حرمت مطلقاً ثابت ہے، اس لئے ترجیح اسی کو ہوگی۔

دوسرا معاملہ تصاویر کا تھا جو ان کی بھٹی اور چولہے کے قریب رکھی تھیں، اُن کا پہلا عذر تو یہ بیان کیا کہ ہم نے ان کو آگ سے جلا رکھا ہے، لیکن پھر ان دونوں اعذار پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ حضرت مسور بن مخرمہؓ کے جانے کے بعد یہ کپڑا بھی اپنے پاس سے ہٹا دیا اور تصویروں کے سر بھی کٹوا دیئے، ان کو بعینہٖ رکھ کر فروخت کرنا بھی گوارا نہ کیا۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اس ناقص روایت سے دیکھنے والے پر کیا تأثر ہوتا ہے؟ اور پورا واقعہ پوری روایت سننے والا اس سے اسی نتیجہ پر پہنچے گا جو جمہور فقہائے اُمت کا مسلک ہے۔

یہ مختصر سا بیان ان مغالطوں کا ہے جو اس زمانے کے بعض علماء نے مسئلۂ تصویر کے جواز کے لئے پیش کئے ہیں، احقر ناکارہ نے جو روایاتِ حدیث اور اقوالِ فقہاء اُوپر جمع کر دیئے ہیں، میں اُمید کرتا ہوں کہ ان کو دیکھتے ہوئے کوئی مسلمان ان مغالطوں کا شکار نہ ہوگا، واللہ ولی التوفیق!

اس بیان میں مسئلہ تصاویر سے متعلق احادیث و روایات مع تشریحات کے آچکی ہیں اور ان پر پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا جواب بھی ایک حد تک ہوگیا ہے، مگر کم فرصت عوام جو صرف مسائل و اَحکام کے متلاشی ہوں، مباحث میں اُلجھنا پسند نہ کریں، ان کے لئے مذکور الصدور پورے رسالہ کا خلاصہ بنام ''اَحکامِ تصاویر'' علیحدہ لکھا جاتا ہے، واللہ المستعان وعلیہ التکلان!

اَحکامِ تصاویر

اس باب میں دو چیزیں ہیں، جو مستقل طور پر قابلِ بحث ہیں، ایک تصویر کشی دوسرے استعمالِ تصویر، دونوں کے اَحکام کسی قدر تفصیل سے لکھے جاتے ہیں۔

تصویر کشی

اس بحث میں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ تصویر کشی صرف اسی کا نام نہیں کہ قلم سے تصویر بنائی جائے یا پتھر وغیرہ کا بُت تراشا جائے، بلکہ وہ تمام صورتیں تصویر کشی میں داخل ہیں جن کے ذریعہ تصویریں تیار ہوتی ہیں، خواہ وہ آلاتِ قدیمہ کے ذریعہ ہو یا آلاتِ جدیدہ فوٹوگرافی اور طباعت وغیرہ سے، کیونکہ آلات و ذرائع کی تخصیص ظاہر ہے کہ کسی کام میں مقصود نہیں ہوتی، اَحکام کا تعلق اصل مقصد سے ہوتا ہے، اس لئے جیسے قلم ذریعۂ تصویر کشی ہے، ایسے ہی طباعت اور آلاتِ فوٹوگرافی ذریعۂ تصویر سازی ہیں، بلکہ بلاواسطہ آلہ کے تو کوئی تصویر بھی نہیں بنتی، کیا قلم آلہ نہیں ہے؟ پھر آلات کے اَحکام مختلف ہونے کے کوئی معنی نہیں، اس بیان سے مسائلِ ذیل مستفاد ہوتے ہیں:

مسئلہ:- جیسے قلم سے تصویر کھینچنا ناجائز ہے ایسے ہی فوٹو سے تصویر بنانا یا پریس پر چھاپنا یا سانچہ اور مشین وغیرہ میں ڈھالنا یہ بھی ناجائز ہے۔

تصویر کشی میں ذی رُوح و غیر ذی رُوح کی تفصیل

غیر ذی رُوح سے مراد اس جگہ وہ چیزیں ہیں جن کو عرفاً بے جان کہا جاتا

ہے کہ اگر چہ درحقیقت (موالیدِ ثلاثہ) حیوانات و نباتات و جمادات سب میں رُوح اور ادراک موجود ہے اور عقلاً اور نقلاً یہی صحیح ہے، لیکن درجہ اور مقدار کا تفاوت مشاہد اور نا قابلِ انکار ہے، اسی تفاوت کی وجہ سے بعض چیزوں کا احساس وادراک اور رُوح اس قدر خفی ہوگئی کہ عام نظریں اس کو محسوس نہیں کرسکتیں، اور اسی بناء پر کائناتِ عالم کی یہ تقسیم سمجھی جاتی ہے کہ بعض جان دار ہیں اور بعض بے جان۔

شریعتِ غراء کے اَحکام میں بھی اس تفاوتِ درجات ومراتب کا لحاظ رکھا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام کائنات ذی رُوح و ذی ادراک میں سے اَحکامِ شرائع کا مکلّف صرف انسان اور جنّات کو بنایا گیا ہے، جن میں یہ ادراک و رُوح سب سے زیادہ کامل ہے، دوسری مخلوقات بھی اگر چہ بشہادت تجارب و مشاہدات عقل سے خالی نہیں لیکن ان کی عقل اس درجہ کی کامل نہیں ہے کہ جس پر تکلیفِ شرائع کی بنیاد رکھی جاسکے، اسی طرح اگر چہ فی نفسہٖ روح سے کوئی جسم خالی نہیں مگر نباتات اور جمادات میں وہ اس قدر کم اور مخفی ہے کہ اس کو غیر ذی رُوح سے تعبیر کرنا غلط نہیں، یہاں تک کہ بعض اَحکامِ شرعیہ بھی اس فرق کی وجہ سے متفاوت ہوگئے، مثلاً: مسئلہ زیرِ بحث میں صرف حیوانات کو ذی رُوح قرار دے کر ان کی تصاویر کو ناجائز کردیا گیا اور نباتات و جمادات کو غیر ذی رُوح کے حکم میں رکھ کر ان کی تصویر بنانے کو جائز رکھا گیا، اور یہ تفصیل خود حدیثِ صحیح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، جیسا کہ حدیث نمبر:۱۲ میں جبریل علیہ السلام کا واقعہ نیز حدیث میں حضرت ابنِ عباسؓ کا فتویٰ مفصل مذکور ہوچکا ہے، ائمۂ اربعہؒ اور جمہور فقہاءؒ کا بھی اس پر اتفاق ہے (صرح به في صلٰوة ردالمحتار والبحر والفتح والهنديه وغيرها)۔

صرف حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں یہ مذہب ہے کہ پھل دار درخت کی تصویر کو بھی ناجائز فرماتے ہیں، مگر جمہور کے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ لما في صلٰوة البحر كره مجاهد تصوير الشجرة المثمرة خلافًا للجمهور. (بحر ج:۲ ص:۳۱)

مسئلہ:- وہ چیزیں جو غیر ذی رُوح نباتات یا جمادات میں سے ہیں لیکن ان کی عبادت کی جاتی ہے جیسے شمس وقمر اور ہندوستان میں پیپل کا درخت اور دریائے گنگا وغیرہ، ان کی تصویر بنانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، علامہ شامی ردالمحتار میں اس کو جائز قرار دیتے ہیں، اور شیخ مُلّا علی قاریؒ شرحِ مشکوٰۃ میں باقتضائے قواعد(۱) اس کو بھی ناجائز فرماتے ہیں عبارت شامی کی یہ ہے:-

او بغیر ذی روح لا یکرہ لانہا لا تعبد (درمختار) فان قیل عُبِد الشمس والقمر والکواکب والشجرۃ الخضراء، قلنا عبد عینہ لا تمثالہ فعلی ھذا ینبغی ان یکرہ استقبال عین ھذہ الاشیاء معراج، ای لانھا عین ما عبد بخلاف مالو صوّرھا واستقبل صورتھا. (شامی مکروھات الصلوٰۃ ج:۱ ص:۶۰۷)

اور عبارت مرقاۃ شرحِ مشکوٰۃ کی یہ ہے:-

واما ما عبد من دون اللہ ولو کان من الجمادات کالشمس والقمر فینبغی ان یحرم تصویرہ.

(مرقاۃ ج:۴ ص:۴۸۶)

لیکن از روئے قواعد علامہ شامیؒ کا فیصلہ زیادہ واضح اور مختار للفتویٰ ہے، اور خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جن چیزوں کی خود تصاویر پوجی جاتی ہیں، ان کی تصویر بنانا جائز نہیں، اگرچہ غیر ذی رُوح میں سے ہوں، لیکن جن کی تصاویر کی پرستش نہیں ہوتی اگرچہ خود ان چیزوں کی پرستش ہوتی ہے تو ان کی تصویر جائز ہے، مثلاً: چاند، سورج یا پیپل اور گنگا کی پرستش کی جاتی ہے، مگر ان کی تصاویر کی پرستش نہیں ہوتی، تو ان چیزوں کی تصویر بنانا جائز رہے گا، اور صلیب کی تصویر بھی پوجی جاتی ہے اس لئے اس

---

(۱) کما یستفاد من قولہ ینبغی۔۱۲ مرشدی

کی تصویر بنانا اور پاس رکھنا بھی جائز نہیں، اگرچہ وہ بھی غیر ذی رُوح کی تصویر ہے۔ "لما فی ردالمحتار والظاهر انه یلحق به الصلیب وان لم یکن تمثال ذی روح لان فیه تشبها بالنصارىٰ ویکره التشبه بهم فی الزی وان لم یقصده." (شامی ج:۱ ص:۶۰۶ طبع استنبول) اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو بابِ دوم میں حضرت صدّیقہ عائشہؓ سے روایت کی گئی ہے:-

ان رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم کان لا یترک فی بیته شیئا فیه صلیب. (بخاری، ابوداؤد، والنسائی کتاب اللباس)

ترجمہ:- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کوئی ایسی چیز نہ چھوڑتے تھے جس میں صلیب کی تصویر ہو۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اسی قسم کی چیزوں کے متعلق فرمایا ہے:- "فان کل ما عظم بالباطل من مکان او زمان او حجر او شجر او بلیة یجب قصد اهانته کما تهان الاوثان المعبودة." (فتاویٰ ابن تیمیہ ج:۲ ص:۷۵)

تصویر کشی میں قصداً اور تبعاً کا فرق

بیانِ مذکور سے ثابت ہوا کہ ذی رُوح کی تصویر بنانا مطلقاً ناجائز ہے خواہ قلم سے ہو یا آلات فوٹو و پریس وغیرہ سے، لیکن ان آلاتِ جدیدہ کے بارہ میں اس جگہ ایک نیا سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ ذی رُوح کی تصویر بنانا کبھی تو بالقصد والاختیار ہوتا ہے اور کبھی بلاقصد یا تبعاً بھی ان آلات میں ذی رُوح کی تصویر آجاتی ہے، مثلاً: کسی مکان یا باغ یا بازار یا محاذِ جنگ وغیرہ کا فوٹو لینا ہے اور وہاں پر کثرتِ آمد و رفت کی بناء پر تمام انسانوں اور جانوروں کو علیحدہ کرنا اختیار میں نہیں ہوتا تو مکان یا بازار کی تصویر کے ذیل میں تبعاً کچھ انسانوں اور جانوروں کی تصویر بھی آجاتی ہے، یا کسی نے احتیاط بھی کی اور سب کو علیحدہ بھی کردیا یا ایسے وقت فوٹو لیا جبکہ کوئی ذی رُوح سامنے

نہ تھا، لیکن عین فوٹو لیتے وقت کوئی انسان یا جانور سامنے آگیا تو ان صورتوں میں ذی رُوح کی تصویر بلاقصد و ارادہ تبعاً چھپ جاتی ہے، تو کیا یہ بھی ناجائز ہوگا یا اس میں شرعاً کوئی سہولت کی جاوے گی؟

کتبِ حنفیہ میں باوجود پوری تلاش و تفتیش کے خاص اس بارہ میں کوئی جزئیہ نہیں ملا، لیکن قواعدِ کلیہ سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ (کما یستفاد من القاعدة الثامنة من الاشباه والنظائر من قوله: **الامور بمقاصدها وعَدَّ لها نظائر عديدة من الجزئيات الفقهية**) اور سیّدی حکیم الأمت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ جواز بایں معنی ہے کہ تصویر کشی کا گناہ نہ ہوگا، لیکن بعمومِ حدیث ولا تمثالا الا طمسه اس کا ابقاء جائز نہ ہوگا۔

بچوں کے کھلونے اور گڑیاں بنانے کا حکم

اس میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے عام تصاویر کی طرح ان کو بھی مطلقاً ممنوع قرار دیا ہے، اور بعض نے یہ تفصیل کی ہے کہ چھوٹی لڑکیوں کے لئے اس شرط پر جائز ہے کہ مکمل تصویر نہ ہو، اور بڑی لڑکیوں کے لئے مطلقاً ناجائز ہے، اور اسی طرح جس میں تصویر کامل ہو وہ بھی مطلقاً ناجائز ہے (کما صرح في بلوغ القصد والمرام بكونهما روايتين في مذهب مالك وكون الثاني معتمدا عند المالكية وفيه عن الزرقاني فيجوز عملها (يعني اللعب) وبيعها لان في ذلك تدريب طباع النساء من صغرهن على تربية الاولاد)۔

ناقص تصویر بنانے کا حکم

کتبِ حنفیہ میں غیر مکمل اور ناقص تصویر کے استعمال کرنے اور گھر میں رکھنے کے متعلق تو اَحکام مفصل مذکور ہیں لیکن اس کے بنانے اور کھینچنے کے متعلق کوئی صریح حکم نہیں ملتا، البتہ روایاتِ حدیث کی تصریحات اور عام کتبِ حنفیہ کی عبارتوں سے یہ

معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناقص تصویر جس میں سر نہ ہو تصویر کے حکم میں نہیں رہتی بلکہ نقوش اور بیل بوٹوں کے حکم میں ہوجاتی ہے، اور اسی بناء پر اس کے استعمال کی اجازت سب کتبِ مذہب میں عام طور سے مصرّح ہے، اس سے ظاہر یہی ہے کہ اس تصویر کے بنانے کا بھی وہی حکم ہوگا جو بیل بوٹے اور عام نباتات کی تصویر بنانے کا ہے، یعنی جیسے وہ جائز ہیں، یہ بھی جائز ہوں گی، (وھٰذہ بعض نصوص الحدیث)۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی حدیث جو بروایت حضرت ابوہریرہؓ نمبر: ۱۲، ۱۳ پر بحوالہ ابوداؤد ونسائی وترمذی گزر چکی ہے اس کے بعض الفاظ یہ ہیں:-

ومُر برأس التماثیل الذی فی البیت یقطع فیصیر کھیئۃ الشجرۃ.

ترجمہ:- اور حکم فرمادیجئے کہ تصاویر جو گھر میں ہیں ان کا سر کاٹ دیا جائے تو وہ درخت کی صورت میں ہوجائیں گی۔

اور فقہ حنفی کی نہایت معتمد اور مشہور کتاب بدائع میں ہے:-"فان کانت مقطوعۃ الرؤس فلا بأس بالصلوٰۃ فیھا لانھا بالقطع خرجت من ان تکون تماثیل والتحقت بالنقوش والدلیل علیه ما روی من محو وجه الطیر الذی کان فی ترسه علیہ السلام." (بدائع مکروہات الصلوٰۃ ج:۱ ص:۱۱۶)

اور بحر الرائق کی اسی بحث میں ہے:"او مقطوع الرأس ای سواء کانت من الاصل او کان لھا رأس فمحی." (بحر ج:۲ ص:۳۰)

سر کٹی ہوئی تصویر کا بنانا

عباراتِ مرقومہ میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں کی سر کٹی ہوئی تصویروں کا بنانا بھی جائز ہے، لیکن جس علت کی بناء پر ان کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، اور وہ علت خود حدیث میں منصوص ہے، اس کا اقتضاء یہ ہے کہ ایسی تصویر کا بنانا بھی جائز ہو،

اور مذہبِ مالکیہ میں اس کی تصریح ہے کہ ایسی ناقص تصویریں اور ان کے وہ اعضاء جو ذی رُوح کے لئے مدارِ حیات نہ ہوں، مثلاً: ہاتھ، پیر یا آنکھ، ناک وغیرہ ان کی تصویر بنانا بھی جائز ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام جعفر کتانی مالکیؒ نے اپنے رسالہ "بلوغ المقصد والمرام ببیان بعض ما تنفر عنه الملئكة الكرام" میں ایک طویل تحقیق کے ذیل میں لکھا ہے:- "فان قيل قد ذكرت لنا ما يمنع دخول الملئكة من الصور ولم تذكر حكم اتخاذ بها والاقدام علىٰ استعمالها (الىٰ قوله) فنقول (الىٰ ان قال) ولو فُقِدَ القيد الثاني بان كانت غير كاملة الاعضاء الظاهرة اللتى لا يعيش الحيوان بدونها كما (۱) لو كانت مقطوعة الرأس او النصف جازت لذهاب الصورة المعتبرة شرعًا وزوال هيئتها الممنوعة وفى حاشية الشيخ احمد الزرقاني على المختصر عند قوله فى الوليمة وصور على الجدار بعد ان نقل ما يأتى عن صاحب التوضيح من التفصيل فى الصور ما نصه الشيخ ابوالحسن وهذا فى الصور الكاملة وانظر هل بعض الصورة كاليد والرجل كالصورة ام لا؟ انظر النص علىٰ اباحة اتخاذ بعض الصورة اذا كان ذلک البعض كيد او رجل ونحوهما مما لا تستقر فى الحيوٰة وهو ظاهر." (بلوغ القصد ص:۲۴)

اور ایسے مسائل میں جس کا حکم اپنے مذہب میں منصوص نہ ہو، دوسرے ائمۂ مجتہدین کے مذہب پر عمل کرلینا جائز ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ (۲) نے مختلف مواضع میں اس کی تصریح فرمائی ہے، بالخصوص مذہبِ مالکیہ تو مذہبِ حنفی کے ساتھ بہت زیادہ

---

(۱) اس مثال سے بظاہر اشارہ اسی طرف پایا جاتا ہے کہ نصفِ اعلیٰ یا چہرہ اور سر کی تنہا تصویر بنانا اُن کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

(۲) "كما فى رد المحتار من باب الرجعة فصل التحليل ذكر الفقيه ابوالليث فى تأسيس النظائر اذا لم يوجد فى مذهب الامام قول فى المسئلة يرجع الىٰ مذهب مالک، لانه اقرب المذاهب اليه." (شامی ج:۲ ص:۵۸۳)

ملتا جلتا اور متناسب ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ ناقص تصویر جس میں سر نہ ہو اس کا بنانا جائز ہے، خواہ ہاتھ پاؤں یا تنہا آنکھ ناک وغیرہ اعضاء کی تصویر ہو یا علاوہ سر کے اور باقی سب بدن کی تصویر ہو۔

صرف چہرہ کی یا نصفِ اعلیٰ کی تصویر

جیسا کہ پاسپورٹ وغیرہ کے فوٹو میں استعمال کی جاتی ہے جس کو انگریزی میں ہاف ٹون یا بسٹ کہتے ہیں، اس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ اس کا بنانا اور استعمال کرنا سب ناجائز ہیں، بجز ان خاص صورتوں کے جن کا استثناء احادیثِ مذکورہ میں آچکا ہے اور آئندہ اس کی تفصیل آنے والی ہے، دلائل اس کے حسبِ ذیل ہیں۔

معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:-

الصورة الرأس، فكل شيء ليس له رأس فليس بصورة. (معانی الآثار ج:۲ ص:۳۶۶)

ترجمہ:- تصویر سر کا نام ہے جس چیز میں سر موجود نہ ہو وہ تصویر نہیں۔

اور شیخ علی متقی ہندیؒ کی مشہور کتاب کنز العمال میں معجم اسماعیلی کے حوالہ سے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ روایت کئے ہیں:-

الصورة الرأس، فاذا قطع الرأس فلا صورة.

(کنز ص:۴۰)

ترجمہ:- تصویر سر کا نام ہے، جب سر قطع کردیا گیا تو تصویر نہیں رہتی۔

اور علامہ زبیدیؒ نے احیاء العلوم کی شرح میں سند کے ساتھ حضرت عکرمہؓ کا

بھی یہی قول نقل کیا ہے:-

حدثنا احمد بن الحجاج قال: قلت لابی عبدالله: الیس الصورة ذا ید او رجل؟ فقال عکرمة: کل شیء له رأس فهو صورة. (اتحاف السادة ج:۷ ص:۵۹)

ترجمہ:- احمد بن حجاج کہتے ہیں کہ: میں نے ابوعبداللہ سے کہا کہ: کیا وہ تصویر نہیں جس میں ہاتھ اور پیر ہوں؟ انہوں نے کہا: حضرت عکرمہؒ نے فرمایا ہے کہ: جس تصویر میں سر موجود ہو وہ تصویر ہے۔

امامِ حدیث وفقہ خطّابی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:-

المراد من الصورة التی فیها الروح مما لا یقطع رأسه او یمتهن. (عمدۃ القاری ج:۱۰ ص:۳۰۷)

ترجمہ:- مراد تصویرِ ممنوع سے ان چیزوں کی تصویر ہے جن میں رُوح ہو، جبکہ اس کا سر نہ کاٹ دیا گیا ہو یا پامال و ذلیل کرکے استعمال نہ کیا گیا ہو۔

اور بدائع الصنائع میں ہے:-

وان لم تکن مقطوعة الرأس فتکره الصلٰوة فیه. (بدائع ج:۱ ص:۱۱۵)

ترجمہ:- اگر مقطوع الرأس نہ ہوتو نماز اس میں مکروہ ہوگی۔

اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں فرمایا کہ:-

ونقل الرافعی عن الجمهور ان الصورة اذا قطع رأسها ارتفع المانع. (فتح ج:۱۰ ص:۳۲۶)

ترجمہ:- رافعیؒ نے جمہور سے نقل کیا ہے کہ تصویر کا جب

سر کاٹ دیا جاتا ہے تو مانع رفع ہوجاتا ہے، یعنی ممانعت نہیں رہتی۔

اور خود جبریلِ امین علیہ السلام کی حدیثِ مذکور نمبر:۱۲ میں مرفوعاً یہی مذکور ہے کہ استعمالِ تصویر کی اجازت بغیر سر قطع کئے ہوئے نہیں، یا پھر اس کو کسی پامال فرش وغیرہ میں استعمال کیا جائے۔

اور مذکور الصدر احادیث میں حدیث نمبر:۱۳ میں ابنِ جوزیؒ جیسے ناقد محدّث کے حوالہ سے یہ روایت آچکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ڈھال تھی جس میں دُنبہ کے سر کی تصویر بنی ہوئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے ناگواری تھی، اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ ظاہر فرمادیا کہ وہ تصویر خود بخود مٹ گئی۔

مذکور الصدر تمام روایاتِ مرفوعہ اور آثارِ صحابہؓ سے بھی ثابت ہوا کہ صرف چہرہ یا سر کی تصویر یا ایسی ناقص تصویر جس میں سر موجود ہو، بنانا بھی حرام ہے، اور اس کا استعمال بھی ناجائز ہے، بجز ان خاص صورتوں کے جن کی اجازت بطورِ استثناء آگے آنے والی ہے، جیسے پاسپورٹ کی تصویر وغیرہ۔

بعض فتاویٰ میں بحوالہ حاشیہ رملی جلد ثالث یہ الفاظ مذکور ہیں:-

ویحرم علیه ان یصور وجه انسان بلا بدن.

ترجمہ:- حرام ہے کہ کسی انسان کے صرف چہرہ کی تصویر بغیر باقی بدن کے بنائے۔

اور فتح الباری میں جو ایک جگہ یہ فرمایا ہے:-

وفی هٰذا الحدیث ترجیح قول من ذهب الٰی ان الصورة التی تمنع الملٰئکة التی تکون باقیة علٰی هیئتها مرتفعة غیر ممتهنة اما لو کانت ممتهنة او غیر ممتهنة لٰکنها قد غُیّرت عن هیئتها اما بقطعها من نصفها او بقطع رأسها فلا امتناع. (فتح الباری ج:۱۰ ص:۳۲۹)

ترجمہ:- اس حدیث میں ان فقہاء کے قول کی ترجیح معلوم ہوتی ہے جنہوں نے فرمایا کہ: وہ تصویر جو دخولِ ملائکہ سے مانع ہے وہ ایسی تصویر ہے جو اپنی ہیئت وصورت پر باقی اور تعظیم کے ساتھ رکھی ہوئی ہو لیکن اگر وہ پامال اور ذلیل ہو یا پامال نہ ہو تو اس کی ہیئت بدل دی گئی ہو خواہ اس کا سر کاٹ کر یا اس کا نصف دھڑ کاٹ کر۔

اس میں نصف سے قطع کرنے کی مراد نصفِ اعلیٰ کا قطع کرنا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے قطع رأس کا بالتخصیص ذکر کرنا اس کا قرینہ ہے، اور یہ قرینہ اس کا مقتضی بھی ہے کہ نصف سے مراد نصفِ اعلیٰ قرار دیا جائے۔

دورِ حاضر کے بعض علماء نے اس عبارت سے نصف دھڑ کی تصویر بنانے کے جواز پر جو استدلال کیا ہے، وہ سراسر غلط ہے، واللہ اعلم!

پاسپورٹ کی ضرورت کے لئے فوٹو کھنچوانا

بعض ممالکِ بعیدہ کے سفر کے لئے عام حکومتوں کی طرف سے مسافر کو مجبور کیا جاتا ہے کہ پاسپورٹ حاصل کرے اور اپنا فوٹو کھنچوائے، اگر یہ سفر کسی ضرورتِ شرعی کے لئے یا معاش کی شدید ضرورت کے لئے ہو تو بوجہ اضطرار کے فوٹو کھنچوانا جائز ہے، لما فی شرح السیر الکبیر وان تحققت الحاجۃ الٰی استعمال السلاح الذی فیہ تمثال فلا بأس باستعمالہ لان موضع الضرورۃ مستثناۃ من الحرمۃ کما فی تناول المیتۃ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو جن چیزوں کو شریعت نے حرام کیا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کے لئے انسان اپنی معاشی زندگی میں حقیقی طور پر مجبور و مضطر ہو محض سہولت دیکھ کر فوٹو کی تجویز حکومتوں نے کر لی ہے، ورنہ جب دنیا میں فوٹو ایجاد نہ ہوا تھا اُس وقت کیا دنیا کے کاروبار نہ چلتے تھے؟

رہا دھوکا فریب تو غور کرنے سے ثابت ہوگا کہ وہ اس فوٹو کے زمانہ میں جتنا زیادہ ہوگیا ہے سادگی کے زمانہ میں اس کا کوئی بڑا حصہ نہیں تھا، خصوصاً عورتوں کے فوٹو دینے کو مسلمانوں نے اپنی دینی غیرت کا مسئلہ سمجھا اور انگریز کی لادینی حکومت کو بھی عام مسلمانوں کے احتجاج پر عورتوں کے پاسپورٹ فوٹو سے مستثنیٰ کردیئے گئے۔

مگر جب سے زمامِ کار خود مغرب زدہ مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی ہے، وہ ہر چیز، ہر کام میں فوٹو کی پابندیاں بڑھاتی جارہی ہے، حال میں معلوم ہوا ہے کہ موجودہ حکومت نے ہر شہری پر ایک شناختی کارڈ رکھنے کی پابندی لگادی ہے، جس میں اُس کو اپنا فوٹو بھی رکھنا ہوگا، اس سے نہ عورتیں مستثنیٰ ہیں نہ کوئی عالم یا پیر فقیر، وجہ یہ ہے کہ خود اہلِ دین میں دینی اقدار کی اہمیت نہ رہی تو رائے عامہ کی مخالفت کا خطرہ نہ رہا، اور آج کل اربابِ اقتدار کا ''خدا'' رائے عامہ ہی ہے، اسی کی طرف جھکتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ تصویر کھینچنا، کھنچوانا مطلقاً حرام ہے، بغیر اضطرار و مجبوری کے جائز نہیں، جہاں اضطرار ہو اُس کے ازالہ کی کوشش بھی ضروری ہے، کوشش ناکام ہوجائے تب اضطرار سمجھا جائے گا۔

تنبیہ

خلاصۂ کلام دربارہ تصویر کشی یہ ہے کہ چہرہ کے سوا باقی اعضاءِ بدن ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک وغیرہ کی تصویر بنانا جائز ہے، اور محض سر کی یا نصفِ اعلیٰ کی تصویر بنانا حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں۔

البتہ پاسپورٹ وغیرہ کی شدید ضرورت کے لئے اس کے کھنچوانے کی گنجائش ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ باوجود تصویر کے اس قدر عموم و شیوع کے کہ آج کل وہ معیشت کا رکن بن گئی ہے، لیکن دائرۂ شریعت میں رہتے ہوئے بھی

کوئی انسانی ضرورت جو واقع میں ضرورت ہو، اس کی وجہ سے بند نہیں ہوتی۔

استعمالِ تصاویر

وہ تصویریں جن کا استعمال شرعاً جائز ہے!

گزر چکا ہے کہ بجز ناقص اعضائے تصویر کے اور کسی قسم کی تصویر کھینچنا جائز نہیں، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، محلِ اعزاز میں ہو یا ذلّت کی جگہ، لیکن تصویر کے گھر میں رکھنے اور استعمال کرنے میں کسی قدر تفصیل ہے، یہ بات تو اُوپر معلوم ہو چکی ہے کہ غیر ذی رُوح جیسے درخت، مکان وغیرہ ان کی تصویر بنانا اور اس کا استعمال کرنا مطلقاً جائز ہے، اور ذوی رُوح کی تصویر کو استعمال کرنے میں تفصیل ہے، اُس کی چند قسموں کا استعمال شریعتِ مطہرہ نے جائز رکھا ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:-

بہت چھوٹی تصویریں

جو تصویریں اس قدر چھوٹی ہوں کہ اگر وہ زمین پر رکھی ہوں اور کوئی متوسط بینائی والا آدمی کھڑا ہو کر دیکھے تو تصویر کے اعضاء کی تفصیل دکھائی نہ دے، ایسی تصویر کا گھر میں رکھنا اور استعمال کرنا جائز ہے، اگرچہ بنانا اس کا بھی ناجائز ہے، جیسا کہ حدیث نمبر: ۲۵، ۲۶ میں گزر چکا ہے کہ بعض صحابہؓ کے بٹنوں پر اور بعض کی انگشتری پر تصویر تھی، چھوٹی تصویر کی تعریف میں جو قول ہم نے نقل کیا ہے یہ زیادہ جامع ہے اور تعیین وتحدید اس طرح سہل ہو جاتی ہے، ورنہ اس کے علاوہ چھوٹی کی تحدید میں اور بھی اقوال ہیں۔

لما فی الدر المختار او کانت صغیرة لا تتبین تفاصیل اعضائها للناظر قائما وهی علی الارض ذکره الحلبی. قال الشامی: هٰذا اضبط لما فی القهستانی (الٰی قوله) ثم قال: لٰکن فی الخزانة ان کانت الصورة مقدار طیر یکره وان کان اصغر فلا یکره. (شامی مکروهات الصلوٰة ج:ا

ص:۲۰۷) ومثله فی حاشية الطحطاوی علی الدر وفی شرح المنية فی هٰذا الباب وكذا لو كان علٰی خاتمه (ای لا بأس به).

پامال و ممتہن تصویریں

جو تصاویر کسی ایسی چیز یا ایسی جگہ میں بنی ہوئی ہوں کہ وہ عادۃً پامال اور ذلیل و حقیر سمجھی جاتی ہیں، مثلاً: پامال فرش یا بستر ہ میں یا بیٹھنے کے گدّے، تکیے و کرسی وغیرہ میں یا جوتے کے تلے میں یا برتنوں کے نیچے تلی میں ہو تو اُن کا گھر میں رکھنا اور استعمال کرنا جائز ہے، اگرچہ بنانا اس کا بھی ناجائز ہے، جیسا کہ بابِ اوّل میں احادیثِ رخصت کے ذیل میں متعدد احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصوّر پردہ کو پھاڑ کر بیٹھنے کے لئے گدّا بنالیا تھا اور اُس پر تشریف فرما ہوتے تھے، حالانکہ اُس میں تصویر موجود تھی۔ (از فتح القدیر بحوالہ مسندِ احمد)

ومثله فی خلاصة الفتاویٰ حيث قال: ثم التمثال اذا كان علٰی وسادة لا بأس باستعمالها وان كان يكره اتخاذها لٰكن لا يسجد علی الصورة.

(خلاصہ ج:۱ ص:۵۸) ومثله فی ردالمحتار عن البحر (شامی ج:۱ ص:۶۰۶)

مسئلہ:- لیکن جو فرش محلِ اہانت میں نہ ہو مثلاً: مصلّٰی وغیرہ تو اُس میں تصویر رکھنا جائز نہیں، لما فی الهداية وفی المصلّٰی المطلق الكراهة فی المبسوط لان المصلّٰی معظم۔

مسئلہ:- اسی طرح اگر مصوّر تکیے بڑے بڑے ہوں جن پر بنی ہوئی تصویر کھڑی نظر آئے تو اُن کا استعمال بھی ناجائز ہے، لما فی البدائع ج: ۱ ص:۱۱۶ من مكروهات الصلٰوة وان كان الصورة علی البسط والوسائد الصغار وهی تداس بالارجل لا تكره لما فيه من اهانتها ومثله فی الشامية ج:۱ ص:۶۰۶ مطبوعه استنبول۔

مسئلہ:- برتنوں میں جو تصویریں تلے کے سوا کسی جگہ ہوں وہ پامال و ممتہن کے حکم میں نہیں، اس لئے اگر وہ بڑی تصویریں ہوں تو ان برتنوں کا استعمال بھی جائز نہیں، لما فی بلوغ القصد والمرام: الصور فی الاوانی لیست بممتهنة۔ (ص:۱۷، ۱۸)

بچّوں کی گڑیاں

بچّوں کی گڑیاں اور چھوٹے کھلونے اگر مصوّر ہوں تو اُن کی خرید و فروخت اور بچوں کا کھیلنا اُن سے جائز ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کے واقعہ مذکورہ حدیث نمبر:۲۴ سے ثابت ہو چکا ہے، اس میں فقہاء کے اختلاف کی تفصیل اُوپر آچکی ہے، حنفیہ کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچّوں کے لئے اس کی اجازت دی گئی ہے عام نہیں، اور اکثر حضرات کے نزدیک ان کا بھی عدمِ جواز ہی راجح ہے۔ فی متفرقات البیوع من الدر المختار فی اٰخر حظر المجتبٰی عن ابی یوسف یجوز بیع اللعبة وان یلعب بها الصبیان انتهٰی. قال الشامی: ونسبته الٰی ابی یوسف لا تدل علٰی ان الامام یخالفه لاحتمال ان لا یکون فی المسئلة قول۔ (شامی استنبولی ج:۴ ص:۲۹۷، ومثله فی مکروهات الصلوٰة ج:۱ ص:۶۰۸)

مسئلہ:- مٹی کی تصویریں یا ایسی مورتیاں جو باقی رہنے والی نہیں، اسی طرح مٹھائی یا دوسری کھانے کی چیزیں اگر بشکلِ تصویر بنائی گئی ہوں تو ان کا استعمال اور خرید و فروخت بھی بچّوں کے عام کھلونے اور گڑیوں کی طرح جائز ہوگا یا نہیں؟ کتبِ حنفیہ میں اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں، اور بلوغ القصد والمرام میں فتح الباری سے اس بارہ میں اختلافِ اقوال نقل کرنے کے بعد عدمِ جواز کی ترجیح نقل کی ہے، اس لئے یہ سب تصویریں ناجائز الاستعمال ہیں۔ (بلوغ القصد ص:۱۹)

مسئلہ:- اور عہودِ محمدیہ میں ہے کہ بچّوں کو اس کی اجازت نہ دینی چاہئے کہ

وہ کھانے کی چیزیں بشکل تصویر بنائیں یا مختلف رنگ کے مصوّر نقشے خریدیں بلکہ جس کو حق تعالیٰ وسعت عطا فرمائیں اُس کے لئے مناسب ہے کہ مٹھائی وغیرہ کے جو کھلونے بازاروں میں فروخت ہوتے ہیں اُن کو خرید کر توڑ دے اور لوگوں کو کھلا دے۔ (از بلوغ القصد والمرام ص:۲۲)

سرکٹی ہوئی ناقص تصویریں

ناقص تصویریں جن میں چہرہ نہ ہو خواہ باقی بدن تمام موجود ہو اُس کا استعمال اور گھر میں رکھنا بھی جائز ہے، جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی حدیثِ مذکورہ سے ثابت ہو چکا ہے، لما فی الخلاصة ج:۱ ص:۵۸ وکذا لو محی وجه الصورة فهو لقطع الرأس بخلاف ما اذا قطع یداها او رجلاها اھ ومثله فی شرح المنیة الکبیر ص:۳۴۷ واوضح منه فی مکروهات الصلوٰة من البدائع ج:۱ ص:۱۱۶ وقد مرت عبارته، ومثله فی البحر ج:۲ ص:۳۰ والهندیة ج:۱ ص:۱۰۰۔

لیکن اگر ناقص تصویر میں چہرہ موجود ہو خواہ باقی بدن نہ ہو تو ایسی تصویر کا استعمال اکثر فقہاء کے نزدیک جائز نہیں، مگر بعض حضراتِ حنفیہ اور اکثر مالکیہ اس کے استعمال کو بھی جائز فرماتے ہیں۔ کما فی مکروهات الصلوٰة من ردالمحتار وقال القهستانی فیه اشعار بانه لا تکره صورة الرأس وفیه خلاف کما فی اتخاذها کذا فی المحیط (شامی ج:۱ ص:۶۰۲)، وفی العالمگیریة من الباب الرابع من الکراهیة اختلف المشائخ فی رأس الصورة بلا جثة هل یکره اتخاذه والصلوٰة عنده انتهٰی۔

نصفِ اعلیٰ کی تصویر جو عام طور پر مروّج ہے اس کا استعمال حنفیہ کے نزدیک بالاتفاق ناجائز ہے، کیونکہ یہ دراصل ناقص تصویر میں داخل نہیں بلکہ مستور البعض ہے وقد مر منا ما فیه عن المالکیة۔

وہ تصویریں جو کسی چیز میں پوشیدہ ہوں

تصویریں اگر کسی غلاف یا تھیلی وغیرہ میں پوشیدہ ہوں یا کسی ڈبہ وغیرہ میں بند ہوں تو اس تھیلی یا ڈبہ وغیرہ کا گھر میں رکھنا جائز ہے، اور ملائکہ رحمت کے دخول سے مانع نہیں، اگرچہ بنانا اور خریدنا ان کا بھی ناجائز ہے۔ لما فی مکروھات الصلوٰۃ من ردالمحتار عن البحر اذا کان فوق الثوب الذی فیه صورۃ ثوب ساتر له فلا تکرہ الصلوٰۃ فیه لاستتارھا بالثوب (شامی ج:۱ ص:۶۰۷). وفیه ایضاً وفی المعراج امامۃ من فی یدہ تصاویر لانھا مستورۃ بالثیاب لا تستبین فصارت کصورۃ نقش خاتم. اھ

یعنی جس شخص کے بدن پر کوئی تصویر گدی ہوئی ہو مگر کپڑوں میں مستور ہو تو اُس کی امامت جائز ہے۔

عبارتِ مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن تصاویر کے استعمال کو جائز لکھا گیا ہے اَولیٰ اور افضل یہی ہے کہ اُن سے بھی تابمقدور اجتناب کیا جائے۔

مسئلہ:- عباراتِ مرقومہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر تصویریں کسی کتاب یا رسالہ یا اخبار کے اوراق میں مستور ہوں تو اُن کا گھر میں رکھنا بھی جائز ہے(۱)، رہا یہ امر کہ ایسی کتاب اور رسالہ کا دیکھنا بھی جائز ہے یا نہیں؟ اس کا حکم آگے آتا ہے۔

تصویر سازی اور فوٹوگرافی کی اُجرت

جاندار کی تصویر بنانے اور فوٹو لینے کی اُجرت لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں، لقولھم لو استأجر مصورا فلا اجر له لکون عمله معصیة کذا عن محمد اھ وفی اجارۃ العالمگیریة اُجرۃ التصویر تجب اذا کان الاصباغ من

(۱) کیونکہ حسبِ تصریح عبارت معراج پوشیدہ تصاویر بھی چھوٹی تصاویر کے حکم میں ہیں۔ ۱۲ منہ

الصور والا لا۔ (عالمگیری کشوری ج:۲ ص:۱۱۳۶)

مسئلہ:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس پریس میں جاندار چیزوں کی تصاویر چھپتی ہوں اُس کی ملازمت بھی طباعت کے کام میں جائز نہیں، (البتہ صاحبِ عیال اور حاجت مند آدمی کے لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے جائز ملازمت کی تلاش کرے، جب مل جائے اُس وقت اس ملازمت کو ترک کرے)۔

مسئلہ:- اگر کسی نے تصویر بنوالی تو شرعاً اُس کی اُجرت دینا اُس کے ذمہ واجب نہیں، ہاں! رنگ وغیرہ جو مصوّر نے خرچ کیا اس کی قیمت دی جائے گی۔

مسئلہ:- جن تصاویر کے بنانے کی اجازت اُوپر عنوان "تصویر کشی" کے ذیل میں بیان کی گئی ہے، مثلاً: سر کٹی ہوئی ناقص تصویر یا بچوں کی ناقص گڑیاں وغیرہ اُن کے بنانے کی اُجرت لینا اور دینا سب جائز ہیں۔

تصاویر کی تجارت

بیع و شراء میں اگر تصاویر خود مقصود نہ ہوں بلکہ دوسری چیزوں کے تابع ہوکر آجائیں جیسے اکثر کپڑوں میں مورتیں لگی ہوتی ہیں یا برتنوں اور دوسری مصنوعاتِ جدیدہ میں اس کا رواج عام ہے، تو اس کی خرید و فروخت تبعاً جائز ہے، **کما یستفاد من بلوغ القصد والمرام معزیا للهیثمی** (بلوغ ص: ۱۸) **ولما هو من القواعد المسلّمة من فقه الاحناف ان کثیرا من الافعال لا یجوز قصدا ویجوز تبعا کما صرحوا فی جواز بیع الحقوق تبعا للدار ولا اصالة وقصدا۔**

لیکن جبکہ خود تصاویر ہی کی بیع و شراء مقصود ہو تو خریدنا اور فروخت کرنا دونوں ناجائز ہیں، اور اگر تصویر مٹی کی بنی ہوئی ہو تو شرعاً اُس کی کچھ قیمت کسی کے ذمہ واجب نہیں ہوتی، البتہ اگر کسی دھات یا لکڑی وغیرہ کی ہو تو اتنی قیمت واجب ہوتی ہے جس قدر اس لکڑی یا دھات کی قیمت تصویر سے قطع نظر کر کے ہوسکتی ہے۔

البتہ بچوں کے کھلونے اگر مصور ہوں تو اُن کی بیع وشراء (حسبِ تصریح امام ابویوسفؒ) کے جائز ہے، اور یہی جمہور کا مذہب ہے، لیکن امام مالکؒ سے منقول ہے کہ بچوں کے کھلونے اور ناقص تصاویر فروخت کرنے ہی کو پیشہ بنالینا بھی مکروہ ہے (ھذا ھو التطبیق بین قول مالک وقول الجمھور) (کذا فی البلوغ ص: ۱۲) لما فی البلوغ عن نوازل ابن رشد ما نصہ لا یحل عمل شیء من ھٰذہ الصور ولا یجوز بیعھا ولا التجارۃ لھا والواجب ان یمنعوا من ذٰلک (بلوغ ص: ۲۰) وفیہ قبل ذٰلک فی توجیہ قول مالک وھٰذا محمول علی الاکتساب بھا وتنزیہ ذوی المروات عن تولی بیع ذٰلک (بلوغ ص: ۱۲) ولما فی متفرقات البیوع من الدر المختار ج: ۴ ص: ۴۹۷ ما نصہ اشتری ثورا او فرسًا من خزف لاجل استیناس الصبی لا یصح ولا قیمۃ لہ ولا یضمن متلفہ وقیل بخلافہ یصح ویضمن قنیہ وفی اخر خطر المجتبٰی عن ابی یوسف یجوز بیع اللعبۃ وان یلعب بھا الصبیان (درمختار) قال الشامی ونسبتہ الی ابی یوسف لا تدل علٰی ان الامام یخالفہ لاحتمال ان لا یکون فی المسئلۃ قول۔

تصاویر کے دیکھنے کا حکم

جن تصاویر کا بنانا اور گھر میں رکھنا ناجائز ہے، اُن کا ارادہ اور قصد کے ساتھ دیکھنا بھی ناجائز ہے، البتہ تبعاً بلاقصد نظر پڑجائے تو مضائقہ نہیں، جیسے کوئی اخبار یا کتاب مصور ہے، مقصود اُس کا مضمون دیکھنا ہے، بلاارادہ تصویر بھی سامنے آجاتی ہے، اس کا مضائقہ نہیں۔

وھذا کلہ مصرّح فی مذھب المالکیۃ ومؤید بقواعد مذھبنا، ونصہ عن المالکیۃ ما ذکرہ العلامۃ الدردیر فی شرحہ علٰی مختصر الخلیل حیث قال یحرم تصویر حیوان عاقل او غیرہ اذا کان کامل

الاعضاء اذا کان یدوم و کذا ان لم یدم علی الراجح کتصویرہ من نحو قشر بطیخ ویحرم النظر الیہ اذ النظر الی المحرم لحرام. اھ

(از بلوغ القصد والمرام ص:۱۹)

مسئلہ:- اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سینما کا دیکھنا اگر دوسری خرابیوں سے قطع نظر بھی کی جائے تو اُس کی ممانعت کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ اُس میں تصاویر دکھلائی جاتی ہیں، پھر جب حالات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں اس سے بھی زیادہ بہت سے منکرات و محرّمات خود عمل میں آتے ہیں، اور بہت سے معاصی کے لئے اس کا دیکھنا سببِ قریب بنتا ہے، اس لئے اس تماشے کا دیکھنا اور دکھلانا سب ناجائز ہے، اس کی خرابیوں کی پوری تفصیل اور اُس کے مہلک نتائج کو سیّدی وسندی حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ علامہ تھانوی دامت برکاتہم نے ایک مستقل رسالہ "تصحیح العلم فی تقبیح الفلم" میں تحریر فرمادی ہے، یہ رسالہ بغرض اتمامِ فائدہ اس رسالہ کے آخر میں بطورِ ضمیمہ لگادیا گیا ہے۔

جس مکان میں تصاویر ہوں اُس میں داخل ہونا

آثارِ صحابہؓ اس بارہ میں مختلف ہیں، مگر عام طور پر حضراتِ صحابہؓ سے منقول ہے کہ وہ جب کسی ایسے گھر میں پہنچے جس میں تصاویر ہوں تو اندر داخل نہیں ہوئے بلکہ واپس چلے آئے، جیسا کہ روایاتِ حدیث مذکورہ میں بعض ایسے واقعات و آثار نقل کئے گئے ہیں۔ اس لئے مذہب جمہور فقہاء و مجتہدین کا اس بارہ میں یہی ہے کہ ایسے مکان اور خیمہ وغیرہ میں داخل ہونا جائز نہیں جس میں تصاویرِ ممنوعہ موجود ہوں۔ لما فی ردالمحتار یکرہ الدخول الیٰ بیت فیہ صور علیٰ سقفہ او حیطانہ او علی الستور والازر والوسائد العظام (الیٰ قولہ) و کذا لنفس التعلیق لتلک الصور والازر علی الجدار ووضع الوسائد العظام علیہ مکروہ (شامی مکروھات الصلوٰۃ) قال الحافظ البیت اعم من الخیمۃ والبناء کذا فی

بلوغ القصد ص: ۳، ومثله فی البدائع ج:۱ ص:۱۱۶۔

مسئلہ:- تصویر والے مکان میں اگر کوئی مریض ہو تو اُس کی عیادت کرنے کے لئے بھی بغیر ضرورت کے وہاں جانا جائز نہیں، کما ثبت من اثار الصحابة وهو المصرح فی البلوغ حیث قال عیادة مریض فی بیته صور (بلوغ ص:۲۰)۔ اور مستدرکِ حاکم کتاب معرفة الصحابة میں مذکور ہے کہ ایک گاؤں والا دہقان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، جب آپؓ کو دیکھا تو سجدہ میں گر گیا، فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ: یہ سجدہ کیسا ہے؟ تو اُس نے کہا کہ: ہم بادشاہوں کی تعظیم اسی طرح کیا کرتے ہیں! حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: سجدہ صرف اپنے اُس ربّ کو کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ پھر اُس نے عرض کیا کہ: ہم نے آپ کے لئے کچھ کھانا پکایا ہے، آپ تشریف لے چلیں! حضرت فاروقؓ نے فرمایا کہ: کیا تمہارے گھر میں عجمیوں کی عادت کے موافق تصاویر ہیں؟ اُس نے عرض کیا کہ: ہاں! وہ تو ہیں۔ حضرت فاروقؓ نے فرمایا کہ: پھر ہم تمہارے گھر میں نہیں جائیں گے، تمہارا جی چاہے تو کھانا یہاں بھیج دو، مگر صرف ایک قسم کا کھانا ہو زائد نہ ہوں! دہقان نے ایسا ہی کیا۔ حاکمؒ نے یہ روایت مستدرک میں نقل کر کے فرمایا کہ: یہ روایت صحیح الاسناد ہے مگر بخاری و مسلم نے اس کو نہیں لیا، اور حاشیہ مستدرک میں ذہبیؒ نے اس کی سند کے ایک شخص کے متعلق لکھا ہے کہ وہ متروک ہے۔

مسئلہ:- لیکن ضرورتِ شدیدہ بہرحال مستثنیٰ ہے، مثلاً: کسی تصویر والے مکان میں جانا کسی معاش یا معاد کی ضرورت کے لئے ضروری ہے، اور اس پر قدرت نہیں کہ وہاں سے تصاویر ہٹادے، تو ایسے وقت مصوّر مکان میں داخل ہونا جائز ہے، لما فی مصنّف ابن ابی شیبةؒ باب من رخص ان یدخل البیت فیه تصاویر. حدثنا معتمر عن ابیه قال: سمعت الحسن یقول: او لم یکن اصحاب محمد یدخلون الخانات فیها التصاویر. وفیه عن ابی الضحی قال:

دخلت (۱) مسروق صفة فیها تماثیل فنظر الیٰ تماثیل منها فقال: ما هٰذا؟ قالوا: تمثال مریم! (مصنّف ابن ابی شیبة باب التصویر ج: ۲) ومن هٰهنا قال الحافظ ابن تیمیة فی الاختیارات العلمیة (ص:۲۵) ویستثنیٰ منها مواضع الضرورة اهـ ومثله مر منا نقلا عن السیر الکبیر۔

مسئلہ:- عباراتِ مرقومہ سے ثابت ہوا کہ اگر کسی دوسرے شخص کے مکان میں تصاویرِ ممنوعہ موجود ہوں اور وہاں جانے کے لئے کوئی ضرورت داعی ہو اور اس پر قدرت نہ ہو کہ تصاویر ہٹادے تو پھر ایسے مکانات میں جانا اور بقدرِ ضرورت بیٹھنا جائز ہے۔

مصوّر کپڑے یا مکان میں نماز پڑھنا

مسئلہ:- مصوّر کپڑا پہن کر نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، البتہ بہت چھوٹی تصویر کا جس کی تفصیل اُوپر گزرگئی ہے، مضائقہ نہیں۔

مسئلہ:- جس مکان میں ممنوعہ تصویریں لگی ہوں یا معلّق ہوں اُس میں نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، البتہ اگر تصویریں قدموں کے نیچے ہوں تو اگر سجدہ تصویر پر نہ کیا گیا تو بعض حضرات کے نزدیک جائز ہے، اور بعض اس کو بھی مکروہ فرماتے ہیں۔

(ہدایہ و شامی ج:۱ ص:۶۰۶)

مسئلہ:- تصویر کے تحت القدم ہونے کے علاوہ سب صورتوں میں نماز مکروہ ہے، لیکن کراہت کے درجات مختلف ہیں، سب سے زیادہ سخت کراہت اُس تصویر میں ہے جو نمازی کے سامنے جانبِ قبلہ میں ہو، پھر وہ جو نمازی کے سر پر معلّق ہو، پھر وہ جو اُس کے داہنے ہو، پھر وہ جو بائیں جانب ہو، اور سب سے کم کراہت اس میں ہے

(۱) هٰکذا فی الاصل الذی نقل الینا من مکتبة سنده لعل الصحیح دخل۔ ۱۲ منه

کہ نمازی کے پیچھے کسی دیوار وغیرہ میں ہو (کذا فی ردالمحتار عن البحر ج:۱ ص:۶۰۶) لیکن یہ تفاوتِ کراہت صرف نماز کے متعلق ہے، ان تصاویر کے گھر میں رکھنے کا گناہ سب صورتوں میں برابر ہے (کما مر من کتب الفقه و الله سبحانه وتعالیٰ اعلم!)۔

دوسرے شخص کے مکان میں سے تصاویر مٹادینا

اگر کسی شخص کے مکان میں تصاویرِ ممنوعہ موجود ہوں تو ہر مسلمان کے لئے اجازت ہے کہ وہ ان تصاویر کو ہٹادے یا خراب کردے، بلکہ اگر قدرت ہو یعنی کسی فتنہ اور جھگڑے کا اندیشہ نہ ہو تو ایسا کرنا واجب ہے۔ لما فی مکروهات الصلوٰة من ردالمحتار قال فی النهر عن الخلاصة لمن رایٰ صورة فی بيت غيره ان يزيلها وينبغی ان يجب عليه. (شامی ج:۱ ص:۶۰۸) ومثله فی البحر ج:۲ ص:۳۱، والله سبحانه وتعالیٰ اعلم!

خاتمہ

آخر میں اس رسالہ کو حضرت سیّدی حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے ایک وعظ کی تلخیص اور ایک مستقل رسالہ پر ختم کرتا ہوں، وعظ میں یہ ثابت کردیا گیا ہے کہ دینِ اسلام میں کوئی تنگی نہیں ہے، چونکہ تصاویر کے عام رواج سے لوگوں کے ذہن میں یہ خطرہ پیدا ہوسکتا تھا کہ اسلام پر عمل کرنا تو زندگی کے بہت سے اُمور سے ہاتھ دھونے کے بغیر نہیں ہوسکتا، اس لئے یہاں اس وعظ کی تلخیص شامل کردی گئی اور دوسرا مستقل رسالہ ہے جو سینما کے ناجائز ہونے کے متعلق ہے، والله المستعان وعليه التكلان!

بندہ محمد شفیع خادم دارالعلوم کراچی
بوقتِ نظرِ ثالث جو آج ۸؍ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ کو پوری ہوئی

خلاصۂ وعظ نفی الحرج

اس خلاصہ میں اکثر عبارت حضرتؒ کے مطبوعہ وعظ کی بعینہا ہے، کہیں حذفِ مضمون کے بعد ربط کے الفاظ بڑھائے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سب سے پہلی بات تو قابلِ غور یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دین و مذہب کی حقیقت اور اس کی پابندی کے بیش قیمت نتائج اور ابدی راحت میں غور کرے تو اس کو مذہب کی کوئی بات بھی سخت معلوم نہ ہوگی اور ہر سخت سے سخت حکم اس کی نظروں میں آسان ہوجائے گا، ہر شخص اپنے روزمرّہ کے کاموں میں غور کرے تو اسے معلوم ہوجائے گا کہ ایک تھوڑی دیر کی راحتِ فانیہ کے لئے وہ کس قدر تکلیفیں اُٹھاتا اور محنتیں کرتا ہے، ملازمت پیشہ اپنی ملازمت میں، اور تجارت پیشہ تجارت میں، اور زراعت پیشہ زراعت میں جس قدر سختیاں برداشت کرتے ہیں اور کڑی سے کڑی جھیلتے ہیں کسی سے مخفی نہیں، مگر مہینہ یا فصل کے ختم پر جو ایک نفع کی توقّع بندھی ہوتی ہے وہ ان سب تکالیفِ شاقّہ کو آسان سمجھتا ہے:

رنج راحت شد چو مطلب شد بزرگ
گرد گلہ توتیائے چشم گرگ

ولنعم ما قیل:

گر در طلبش ما را رنج برسد شاید
چوں عشق حرم باشد سہل ست بیابانہا

دیکھئے! اگر کسی مریض کے لئے طبیب نے ایک نسخہ تجویز کیا ہو کہ اس کے مرض کے لئے وہی مناسب ہو اور مریض یہ کہے کہ: حکیم صاحب یہ تو بہت دشوار ہے اور سخت علاج ہے، کوئی آسان تدبیر بتلایئے! انصاف سے بتلایئے کہ حکیم صاحب اس کو کیا جواب دیں گے؟ ظاہر ہے کہ نسخہ چاک کر کے پھینک دیں گے اور کہیں گے: معلوم ہوتا ہے کہ تجھ کو مریض ہی رہنا پسند ہے، جو ذرا سی دشواری سے گھبراتا ہے! خلاصہ یہ ہے کہ دین اور اَحکامِ شرعیہ کے بارے میں تنگی اور دشواری کے شبہ کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اگر فی الواقع دشوار اور تنگ بھی ہو جب بھی خواصِ مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل کے لئے اس کی دشواری کو برداشت کرنا چاہئے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ دین میں دشواری ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟ کیونکہ اس کے دو درجے ہیں، ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے، اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہے، تو اسلام میں کون سی دشواری ہے؟ آیا یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو تسلیم ہے، کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو، مثلاً: جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا وقت دس بجے سے ہے، تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی؟ ضرور ہوتی ہے! اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلّت کی چیز ہے! مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی چھوڑ نہ دیا، تو جب قانون کی پابندی ہوگی اس میں ضرور دشواری ہوگی، تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے، بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں: "لَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى" اور اس سے صاف "اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ" غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے؟ یہ تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے، کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے احدیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے۔ مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے، ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے، دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے، اسی طرح ایک

لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا، ایک سوار اِدھر سے گزرا، لیٹے ہوئے نے پکارا کہ: میاں سوار! ذرا یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈال دو۔ اُس کو اس آرام طلبی سے سخت حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ یہ حیرت ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا، اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ: بھائی! تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے۔ وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ: جناب! میری آپ کی لڑائی ہوجاوے گی، آپ کو کیا خبر یہ میرے ساتھ کیسا ہے؟ کل میں لیٹا تھا، یہ بیٹھا تھا، مجھ کو جو جمائی آئی اس سے منہ کھل گیا، ایک کتا آکر منہ میں موتنے لگا، یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹادے، میں ضرور اس کے منہ میں بیر دوں گا، سوار حیرت میں غرق ہوگیا اور لاحول پڑھتا ہوا چل دیا۔

تو حضرت! اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو کھانا بھی مشکل ہے، ہمارے ایک عزیز کے دو بھائی ہیں، ایک چھوٹے ایک بڑے، بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ: میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا، تو ایسی نظیریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی، تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں، مثلاً: یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ، اور ڈکیتی نہ ڈالو، مگر اس کو کسی نے نہ کہا کہ بڑا سخت قانون ہے، وجہ یہ ہے کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے، اس لئے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا، اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے، لیکن جو ڈکیتی پیشہ ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں، اسی طرح ایک جماعت بیہودوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو، حالانکہ ضرورتِ سلطنت کا قانون امرِ فطری ہے، مگر یہ ان کو گراں ہے، تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں، تو محض پابندی سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا پھر اسلام ہی پر کون سا اعتراض ہے؟

دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت تو تسلیم اور یہ سختی نہیں مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے، تو واقعی یہ دشواری، دشواری ہے، مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو، اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوئی ہے، قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے۔

مثلاً: یہ قانون ہوجاوے کہ اگر چھٹانک بھر سے زیادہ کوئی کھاوے تو پھانسی ہوگی، یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی سب کو تکلیف ہو، اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجاوے اور وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرور تنگی ہوگی کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے، تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشا اُن باغیوں کی بغاوت ہے، مثلاً: کوئی اگر ایسی جگہ پہنچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں اور یہ شخص وہاں پہنچ کر کوئی چیز خریدے اور دام دے دے، پھر اس سے کہا جائے کہ گو قانونِ سلطنت یہ ہے پورے دام لے کر پوری چیز دو مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے اس لئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔

تو ایمان سے کہئے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا اُن بدمعاشوں کی بدمعاشی کی؟ قانون کا منشا تو یہ ہے کہ سیر بھر دو مگر ان بدمعاش لوگوں نے بدمعاشی کی اور سیر بھر کی آدھ سیر دی، تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو بُرا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں؟ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے، اگر پچاس قیامتیں بھی آجاویں

جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے، صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے، مثلاً: قرض کی ضرورت ہوئی اب جس کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ، تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کئے کو اسلام پر تھوپنا ایسا ہے کہ: ؎

حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد

ہم چو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

مثنوی میں شیر کی ایک حکایت لمبی چوڑی لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا کہ میں تمہارے راتب کے لئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا، راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا، شیر کو غصہ آیا کہ بتلا وہ کہاں ہے؟ اُس نے ایک کنوئیں پر لے جا کر کھڑا کر دیا، واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا، بس شیر اس کنوئیں میں جا کودا، اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اُوپر حملہ کیا تھا، مولانا اسی کو فرماتے ہیں:-

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد

ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے، اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے ایک آئینہ دیکھا، اس میں اپنی صورت نظر پڑی، آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بدشکل تھا تب تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔ ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا، لوٹے میں ایک ٹکڑا گر گیا، جھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی، سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے، باپ سے کہا: ابا! اس نے میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھیننے اُٹھے جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل، بولے کہ: لعنت خدا کی! بڈھا ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا، تف ہے تیری اوقات پر! سو وہ کس کو تف کہہ رہے تھے؟ اپنے کو!

اسی طرح ہم لوگوں نے آئینۂ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا اور وہ تنگی اپنی صفت تھی اس کو شریعت کی تنگی سمجھا، حضرت! یہ ہے حقیقت تنگی کی۔ اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے، مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر سب کی اجازت دے دے، ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جاویں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی ممانعت ہوگی، اتفاق سے ایک دیہاتی پہنچا کہ صاحب! کھاؤں کیا؟ جواب دیا: بکری کا گوشت پالک۔ وہ بولا: یہ تو ملتا نہیں! کہا: مونگ کی دال۔ کہا: یہ بھی نہیں ملتی! کہا: فیرنی۔ کہنے لگا: یہ بھی نہیں ہے! پھر خود ہی پوچھا: بیگن کھالوں؟ کہا: ہرگز نہ کھانا! کریلا پوچھا، اس کو بھی منع کیا، آلو سے بھی منع کر دیا، تو دیہاتی نے کہا کہ: صاحب! ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں! طبیب نے کہا کہ: فتویٰ طبّ کا تو یہی ہے! دیہاتی نے باہر آ کر کہا کہ: صاحب! یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ، وہ بھی نہ کھاؤ! تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے؟ یا یہ کہا جاوے گا کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں کی سب کی اجازت دے دی لیکن وہ مقام ایسا کوردہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں۔ تو یہ طبّ کی تنگی تو نہیں اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔ اسی طرح حاجتِ ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری سبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں، اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت یجوز کہے گی، اور پانچ کو لا یجوز، لیکن اگر آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور بیس کو متروک کر دیں تو یہ تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانونِ شریعت کی؟

پس یہ الزام تو بحمد اللہ بوجہ احسن و اکمل رفع ہوگیا، اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو علمِ دین پڑھئے اس سے معلوم ہوگا کہ شریعت نے ابوابِ معاش میں کس قدر توسّع کیا ہے۔ اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے، اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو، وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں مگر حالتِ موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر

عمل نہیں کرتے عارضی دشواری تو ہوگئی تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہنچ گیا، البتہ اعتقاد درست ہوگیا کہ شریعت میں دشواری نہیں مگر عمل کس طرح سے کریں؟ کیا لین دین چھوڑ دیں؟ کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز، معاملات اکثر ناجائز، تجارت اکثر ناجائز، تو یہ ایک فریاد قابلِ استماع ہے۔ سو اس کے متعلق بھی سن لیجئے! اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کردیا کہ سب ہی دشوار ہے، غیر مسلّم ہے، سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے، اور ایک وہ کہ ان کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں، مثلاً وضع شریعت کے مطابق بنائے، نماز روزہ کرے، حج کرے، تکبر نہ کرے، باجا گانا چھوڑ دے، تو بتلائیے! اس میں معاش کا کیا نقصان ہے؟ تو اس میں تو آپ آج ہی سے اصلاح کرلیجئے، پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہوجائیں گے کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہِ بے لذت ہیں کہ خواہ مخواہ آپ نے ان کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے، آگے دس ہی رہ جائیں گے، اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمالِ صالحہ کا موجود ہوچکا ہے اس لئے حق تعالیٰ سے اُمید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب وقلیل ہیں درست فرمادیں گے، جیسے ایک شعلۂ جوالہ کو دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے، حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی، مگر جب نور وظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے، اور اس درستی میں گویا کہا جاسکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذبِ حدید ہے، پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمالِ صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کردیتے ہیں تو اس کا دعویٰ ہوسکتا ہے، مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمالِ صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے، اور صحابہؓ کی ترقی کا راز یہی ہے، ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اُٹھا نہیں جاتا مگر نماز کے وقت بلاتکلف

کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں، خوب کہا ہے: ؎

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے! غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی، مگر جب قوت ہوگی تو تمام موانع مضمحل ہو جائیں گے اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جائے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے، جیسے کسی نے یہ سن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے!

غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے، یہ ہے وہ راز! اور اگر بالفرض اصلاح بھی نہ ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جائے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمتی چلی جائے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی، اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے، اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو ٹل سکتے ہیں مگر ایک نہیں ٹل سکتا، تو کیا کوئی یہ کہے گا کہ چوآب از سرگزشت چہ یک نیزہ چہ یکدست، ہرگز نہیں! بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے، تو اسی طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے دس ہی کے مجرم رہ گئے۔

اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو اوّل تو چونکہ آپ کو شریعت کے اَحکام نہیں معلوم ہیں، اس وجہ سے بہت افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں، اگر آپ اَحکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے سے تغیر سے وہی جائز ہو جائے گا، مثلاً: اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے، اب اگر کہئے کہ صاحب! اچھا مسئلہ سنا کہ نرخ کے حساب سے تو سو روپیہ کی چاندی ایک سو بیس بھر آتی مگر اب

سو روپیہ کی سو ہی روپیہ بھر ملی، اچھا عمل کیا کہ بیس روپیہ کا خسارہ ہوا، اب ساری عمر کے لئے مولویوں کو خیر باد کہہ دیں گے۔ تو سنئے! بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب! چاندی میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا، کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے؟ تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ: ان روپیوں میں ایک گنّی بھی ملا لو تو ایک سو بیس بھر جو چاندی آئے گی تو پچاس روپیہ بھر تو پچاس روپیہ کی آئے گی، اور باقی کو اس گنّی میں شریعت محسوب کردے گی، تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں، شریعت خود فیصلہ کرچکی ہے۔ تو اب بتلایئے کہ کیا نقصان ہوا؟ اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں، صاحبو! پوچھتے تو رہو، اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہہ دیں گے، کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے جائز کردیں، جیسا کہ ایک مطوّف سے ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی سعی میں کہا تھا کہ: مولوی صاحب! اب تو معاف کردو!!

اسی طرح بعض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علمائے ہند مثل بعض علماءِ مصر کے کرنے لگیں، ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے، سب جائز! تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں علماء سے۔ جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اس کی تصدیق کرکے توجیہ کردیا کرو، چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے نکلا کہ ہم شکار کو گئے، ایک ہرن پر گولی چلائی، وہ اس کے سُم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی، سب اہلِ مجلس ہنسنے لگے کہ سُم اور ماتھے کا کیا جوڑ؟ نوکر بولا: سچ ہے حضور! وہ اس وقت سُم سے پیشانی کھجلا رہا تھا۔ تو حضور! علماء سے تو ایسی نوکری ہوتی نہیں، نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کرے کہ ہوں۔

تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ سب کو جائز کہہ دیں مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جائے گا، تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا اس

طرح ختم ہوجائے گا، ہاں! بعض اُمور پھر بھی ایسے رہ جائیں گے کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے مگر اس میں بھی دو درجے ہیں، ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں، پس اس کو تو چھوڑ دیا جائے، کیونکہ اس کا چھوڑنا مضرِ حوائجِ ضروریہ نہیں، اور ایک درجہ وہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ دوسرے کام اس کے حوائجِ ضروریہ کو کافی نہیں تو بادلِ ناخواستہ اس کو کرتے رہو، اور گو یہ جائز تو نہ ہوں گے مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہوجائیں گے، وہ یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنا چاہئے، ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کیا کرے، اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے، توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پچھتائے اور دعا کیجئے کہ اے اللہ! مجھے معاف کیجئے مؤاخذہ نہ فرمایئے، تو یہ کیوں نہیں کرتے؟ کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہوجاؤ گے؟ ہرگز نہیں! بلکہ تم نوکر ہی رہو گے۔

دوسرے یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ! کوئی دوسری سبیل میرے لئے نکال دیجئے تو اس میں یا تو کوئی سبیل نکلے گی اور جو کوئی دوسری سبیل نہ نکلی تو یہ شخص شرمندہ گناہگار کی فہرست میں تو لکھا جائے گا، جری گناہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جائے گا، اور یہ توسّع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور اس توسع میں رازِ شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جائے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہِ شدید میں مبتلا ہوجائے، مثلاً یہی کہ چلو آریہ بنیں، تو یہ توسّع ''ایں بلا دفع بلاہائے بزرگ'' کا مصداق ہے اور میں کفر سے بچارہا ہوں کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اس کو سوجھتا ہے!

ہمارے حضرت حاجی صاحب جب تھانہ بھون میں رہتے تھے، ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائیداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے، حضرت دعا فرمادیتے، ایک بار آکر کہنے لگا کہ: اب تو اس نے حد ہی کردی اور جائیداد غصب کرنے کو ہے، حضرت نے فرمایا: بھائی صبر کر!

اس نے کہا: بہت اچھا! دفعتہً حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا: ہرگز صبر مت کرنا! جاؤ نالش کرو اور ہم دعا کریں گے، اور حضرت سے فرمایا کہ: آپ تو صابر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے، اس میں تو اتنی قوت نہیں یہ اگر اسبابِ معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستاوے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا، چوری کرے گا، تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے۔ تو یہ اصل راز ہے اس توسّع کا، آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ سنیں گے مگر یہ اس لئے ظاہر کردیا گیا کہ یہ کفر سے بچاتا ہے، لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معاصی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ جز تو بہت اچھا ہاتھ آیا، بات یہ ہے کہ اوّل تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاصی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہوسکتا، دوسرے اس میں یہ قید بھی تو لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو، جیسے کوئی پاخانہ میں بیٹھا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی، ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انہوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے، آخر ضرورت سے پاخانہ میں گئے تو چٹخنی لگ گئی اور ان کے کھولنے سے نہ کھلی، بڑے پریشان، لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کردیا، آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم کھلائی، یہ بھی نہ دیکھا کہ پائخانہ ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں تو جس طرح وہ پائخانہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو، کیا کوئی پائخانہ میں جاکر فخر کرتا ہے، بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں؟ بس اس کی یہ حالت ہوگی کہ: ؎

چونکہ برمیخت بہ بند دبستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

تو نکلنے کی فکر تو کرو! کوشش تو کرو! گو کچھ اُمید بھی نہ ہو، اسی کو فرماتے ہیں: ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

یوسف علیہ السلام کا قصہ یہ ہوا کہ جب زلیخا نے دروازہ بند اور مقفل کرلیا اور آپ نکلنے کے لئے دوڑے ہیں، عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے، اس کو فرماتے ہیں:

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا، ٹکر بھی لگ گئی، اتنے پر بھی فضل ہوجائے گا۔

اب بتلایئے! اس میں کون سی چیز مشکل ہے؟ میں تو نوکری نہیں چھڑاتا مگر نفور رہیں سو یہ کیا مشکل ہے؟ اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے، بیباکی ہے، سو یہ فخر کیسا اور تکبر کیسا؟ اور اہلِ دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے؟ سو اہلِ اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا، مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟ تو اب کون سا مرتبہ اختلاف کا رہ گیا، نرا قانون تو دشوار ہے نہیں اور قانون سخت نہیں صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہوجاتی ہے تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں مخل ہی نہیں اور جو مخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہوسکتا ہے، اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہوسکے وہ اوّلاً مختصر، ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پچھتانا اور توبہ کرتے رہنا، تو اب وہ کون سا جز ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے؟ تو بحمداللہ بے غبار یہ ثابت ہوگیا کہ:

"وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ" الآیہ۔

تمت خلاصہ نفی الحرج

مسئلہ زیرِ بحث یعنی مسئلۂ تصویر بھی اس عام ضابطہ سے خارج نہیں ہوسکتا، جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس رسالہ کے آخری باب میں ملاحظہ فرمائیں گے کہ باوجود اس عالمگیر وباء کے جو تصاویر کی صورت میں پھیلی ہوئی ہے اور بظاہر دنیا کا کوئی کام اس سے بچا ہوا نہیں، لیکن اس وقت بھی اگر کوئی شخص شرعی فتویٰ کی پابندی کرنا چاہے تو اس کا کوئی ضروری مقصد فوت نہیں ہوتا، واللہ ولی التوفیق وعلیہ التکلان!

ضمیمہ

تصحیح العلم فی تقبیح الفلم

از

افاضات حضرت مجدد الملّت حکیم الامۃ فقیہ العصر
حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ اگر بائسکوپ کے پردہ پر خلفائے اسلام، شاہانِ اسلام اور رہنمایانِ اسلام کی تصویریں متحرک، بولتی گاتی اور ناچتی دکھائی جائیں اور خواتینِ اسلام کو بائسکوپ کے ذریعہ سے پبلک میں بے پردہ پیش کیا جائے تو کیا شریعتِ اسلامیہ اس فعل کو جائز قرار دیتی ہے یا شریعتِ اسلامیہ کے نزدیک یہ فعل ناجائز ہے؟ اور کیا حکم دیتی ہے شریعتِ اسلامیہ اُن حضرات کے بارہ میں جو اس فعل کے جواز کی حمایت میں پروپیگنڈا کرتے ہیں اور مسلمانوں کو متحرک تصاویر اور بولتی تصاویر کی طرف رغبت دلاتے ہیں؟ بیّنوا توٴجروا!

الجواب:- شریعتِ اسلامیہ میں جاندار کی تصویر بنانا مطلقاً معصیت ہے خواہ کسی کی تصویر ہو، اور خواہ مجسمہ ہو یا غیر مجسمہ۔

فی جمع الفوائد من الستة عن عائشة قدم صلی اللہ علیہ وسلم من سفر وقد سترت بقرام علیٰ سھوة لی فیه تصاویر فنزعه وقال: اشد الناس عذابا یوم القیامة الذین یتضاھون بخلق اللہ۔ اور کسی مسلمان کی تصویر بنانا اور زیادہ معصیت ہے کہ اس میں ایسے شخص کو آلۂ معصیت بنانا ہے جو اس کو اعتقاداً قبیح جانتا ہے، اور اسی اصول پر حق تعالیٰ کی قسم معصیت پر کھانے پر خاص تشنیع فرمائی گئی ہے،

فی تفسیر الجلالین: ولا تجعلوا اللہ عرضة لایمانکم ای نصبا لھا بان تکثروا الحلف به ان لا تبروا وتتقوا وتصلحوا بین الناس. فی الکمالین: نصبا ای علما للایمان. فی القاموس: النصب بضمتین کل ما جعل علما ای لا تجعلوا اللہ معرضا لایمانکم۔ اگرچہ اُس تصویر کی طرف کوئی امرِ مکروہ بھی منسوب نہ کیا گیا ہو محض تفریح وتلذذ ہی کے لئے ہو، کیونکہ محرماتِ شرعیہ سے تلذذ بالنظر بھی حرام ہے، فی الدر المختار کتاب الاشربة وحرم الانتفاع بھا (ای بالخمر) ولو لسقی دواب او لطین او نظر للتلھی۔ اور اگر اس کی طرف کسی نقص یا عیب کو بھی منسوب کیا جائے تو اُس میں ایک دوسری معصیت یعنی غیبت بھی منضم ہوگئی، کیونکہ غیبت صرف کلام ہی میں منحصر نہیں، نقوشِ قلم یعنی کتابت سے بھی ہوتی ہے اسی طرح اُس عیب کی ہیئت بنانے سے بھی ہوتی ہے بلکہ یہ سب سے اشد ہے۔

فی احیاء العلوم: بیان الغیبة لا تقتصر علی اللسان اعلم ان الذکر باللسان انما حرم لان فیه تفھیم الغیر نقصان اخیک وتعریفه بما یکرھه فالتعریض به کتصریح والفعل فیه کالقول والاشارة والایماء والغمز والھمز والکتابة والحرکة وکل ما یفھم المقصود فھو داخل فی الغیبة وھو حرام فمن ذٰلک قول عائشة علینا امرأة فلما ولت ومات بیدی انھا قصیرة فقال علیہ السلام: اغتبتیھا. (ابن ابی الدنیا وابن مردویه من روایة

حسان ابن مخارق وحسان ووثقه ابن حبان وباقيهم ثقات كذا في تخريج العراقي باختلاف يسير في بعض الالفاظ) ومن ذٰلك المحاكاة كان يمشي متعارجًا او كما يمشي فهو غيبة بل هو اشد في الغيبة لانه اعظم في التصوير والتفهيم ولما راى صلی اللہ علیہ وسلم عائشة حاكت امرأة قال ما يسرني اني حاكيت انسانا ولي كذا وكذا (تقدم في الآفة الحادية عشر عن ابي داؤد والترمذي وصححه كذا في تخريج العراقي) وكذٰلك الغيبة بالكتابة فان القلم احد اللسانين وذكر المصنف شخصا معينا وتهجين كلامه في الكتاب غيبة ..... الخ۔ اسی طرح اُس منسوب الیہ کی تصویر کی کوئی خاص ہیئت بنانا بھی ایسا ہی ہے جیسے خود اُس شخص کی طرف اُس وصف کو منسوب کرنا مثلاً: مخدّرات کی تصاویر کو بے پردہ ظاہر کرانا۔ في صحيح البخاري غزوة الفتح عن ابن عباس ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لما قدم الى ان يدخل البيت وفيه الألهة فامر بها فاخرجت فاخرج صورة ابراهيم واسماعيل في ايديهما من الازلام فقال النبي صلی اللہ علیہ وسلم قاتلهم الله لقد علموا ما استقسما بها قط ثم دخل البيت، الحديث ۔ اگرچہ وہ نقص یا عیب واقع میں بھی اُس میں ہو تب بھی اُس کی غیبت باقسامہا حرام ہے، اور اگر واقع کے خلاف ہو تو غیبت سے بڑھ کر وہ بہتان ہے۔ عن ابي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: اتدرون ما الغيبة؟ قالوا: الله و رسوله اعلم! قال: ذكر احدكم اخاه بما يكره! فقال رجل: ارأيت ان كان في اخي ما اقول؟ قال: ان كان فيه ما تقول فقد اغتبته وان لم يكن فيه ما تقول فقد بهتّه. (جمع الفوائد عن ابي داؤد والترمذي) ۔ اور جس کی طرف کوئی نقص یا عیب منسوب کیا گیا ہے اگر علاوہ مسلمان ہونے کے اس میں اور کوئی وجہ بھی احترام کی ہو جیسے سلاطینِ اسلام میں ان کی اہانت اور زیادہ موجبِ انتقامِ خداوندی ہے۔

لحدیث: من اهان سلطان الله فی الارض اهانه الله۔ (ترمذی) اور جس کی تنقیص یا اہانت مذموم ہے اُس کی طرف جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ منسوب ہیں اُن کی اہانت کا بھی وہی حکم ہے جیسے اُن کی بیبیاں وغیرہا، چنانچہ کفارِ عرب حضراتِ صحابہؓ کی بیبیوں کے نام اپنے اشعار میں عشق بازی کے عنوان سے ذکر کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُس کو ایذاءِ قبیح میں شمار فرمایا۔ فی الجلالین: ولتسمعن من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم الیهود والنصارىٰ ومن الذین اشرکوا من العرب اذی کثیرًا من السب والتشبیب بنسائکم۔ اور زوجیت یا قرابت کی نسبت تو بڑی چیز ہے، استعمال کی نسبت بھی حرمتِ تنقیص کے لئے کافی ہے، جیسے کسی کے استعمالی کپڑے میں عیب نکالنا۔ فی احیاء العلوم: بیان معنی الغیبة وما فی ثوبه فکقولک انه واسع الکم طویل الذیل وسخ الثیاب۔ اور اگر وہ تصویر کسی مشتہاہ کی ہو تو نظرِ بد کی معصیت کا اُس میں اور اضافہ ہوجاتا ہے، اور تصویر تو صاحبِ تصویر کی پوری حکایت ہے، اجنبیہ کے تو کپڑے کو بھی بدنفسی سے دیکھنا حرام ہے۔

فی ردالمحتار باب الحظر والاباحة مفاده ان رؤیة الثوب بحیث یصف حجم العضو ممنوعة ولو کثیفا لا تری البشرة منه وفیه فی بحث النظر الی الاجنبیة من المرأة او الماء بخلاف النظر لانه انما منع منه حیثیة الفتنة والشهوة وذٰلک موجود هٰهنا وفیه فی احکام ستر العورة ان النظر الی ملائة الاجنبیة بشهوة حرام۔ بالخصوص اگر غیرمسلموں کو خواتین مسلمات کی تصاویر کی طرف بدنفسی (بدنیتی) کے ساتھ نظر کرنے کا موقع دیا جائے، کیونکہ بدنفسی سے نظر کرنا شریعت میں ایک گونہ بدکاری ہے بنص الحدیث، اور ایسی بدکاری کہ مرد غیرمسلم ہو اور عورت مسلم بلکہ ایسے موقع پر نکاح بھی اس درجہ امر شدید ہے کہ اس کے اَحکام علماء مجتہدین کے لئے محلِ بحث ہوگئے ہیں اور جس کو مسلمان کے مرتد بنانے اور اسلام اور قرآن میں طعن کرنے اور حربیوں سے سازش کرنے کے برابر قرار دیا گیا

ہے، نمونہ کے طور پر اُس کے متعلق ایک روایت نقل کی جاتی ہے۔

فی الدرالمختار فصل الجزیة قلت ومذهب الشافعیة ما فی المنهاج وشرحه لابن حجر ولو زنی بمسلمة او اصابها بنکاح او دل اهل الحرب علیٰ عورة المسلمین او فتن مسلما عن دینه واو طعن فی الاسلام او القراٰن ..... الخ ۔ اور ان سب سے بڑھ کر شناعت میں وہ صورت ہے جس میں مقتدایانِ دین کی اہانت ہو کہ درحقیقت وہ اہانت اسلام کی ہے جس کا تحمل کسی طرح طبعاً اور شرعاً ممکن نہیں۔ فی جمع الفوائد عن الکبیر عن ابی امامة رفعه ثلثة لا یستخف بهم الا منافق ذوالشیبة فی الاسلام وذو العلم وامام مقسط وفیه عن الترمذی عن عبدالله بن مغفل مرفوعًا الله الله فی اصحابی من اذاهم فقد اٰذانی ومن اٰذانی فقد اٰذی الله ومن اٰذی الله فیوشک ان یأخذه۔

اور جب ایسی فلموں کے قبائح معلوم ہوگئے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ بقدر اپنی قدرت کے گو وہ قدرت حکومت سے استعانت ہی کے طور پر ہو ان کے انسداد میں کوشش کریں، اور تماشا دیکھنے والوں کو ان قبائح پر مطلع کر کے شرکت سے روکیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ سب عقابِ خداوندی میں گرفتار ہوں۔ ابوداؤد مرفوعًا ما من قوم یعمل فیهم بالمعاصی ثم یقدرون علیٰ ان یغیروا ثم لا یغیرون الا یوشک ان یعمهم بعقاب ۔ (مشکوٰۃ) اور جب ساکتین کے لئے یہ وعید ہے تو ترغیب دینے والے کس درجہ کی وعید کے مستحق ہوں گے؟ روی ابوداؤد عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا عملت الخطیئة فی الارض من شهدها فکرهها کان کمن غاب عنها ومن غاب فرضیها کان کمن شهدها (ای) باشرها وشارک اهلها۔

اشرف علی

۱۸ر شعبان ۱۳۵۰ ہجری نبوی

۱۰۰

آلات جدیدہ کے شرعی احکام

تاریخ تالیف ______ ۱۳۵۷ھ (مطابق ۱۹۳۸ء)

مقامِ تالیف ______ کراچی

عصر حاضر میں ایجاد ہونے والے جدید آلات مثلاً لاؤڈ اسپیکر، فونو گراف، گراموفون، فوٹو گرافی، فلم، روزہ میں انجکشن، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ پر تلاوت قرآن، ٹیلی فون، ہوائی جہاز وغیرہ اور مریض کے بدن میں انسانی خون کے استعمال وغیرہ سے متعلق شرعی احکام مع دلائل شرعیہ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب خود کئی ضمنی رسائل کا مجموعہ ہے جو الگ الگ ناموں کے ساتھ اس کتاب میں شامل ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اَمَّا بَعْدُ !

ایجاداتِ جدیدہ کی مذہبی حیثیت

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا...الایة (۲:۲۹)

وہ ذاتِ پاک ایسی ہے کہ جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے، سب کا سب۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِیْ الْاَرْضِ وَالْفُلْکَ تَجْرِیْ فِیْ الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ وَیُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ......الآیة (۲۲:۶۵)

کیا تجھ کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے کام میں لگا رکھا ہے زمین کی چیزوں کو، اور کشتی کو کہ وہ دریا میں اس کے حکم سے چلتی ہے اور وہی آسمانوں کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے، ہاں! اگر اس کا حکم ہو جائے تو خیر۔

اَلَمْ تَرَوْ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً..الآية (۳۱:۲۰)

کیا تم کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اس نے تمہارے اوپر نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر رکھی ہیں۔

آیاتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ یہ جہان جس میں انسان بھی آباد ہے، اور کروڑوں قسم کے بحری اور برّی جانور بھی ہیں، اور جس میں آفتاب و ماہتاب وغیرہ سیارات کی گردش بھی ہے، اور تمام فلکیات کا ایک مضبوط و محکم نظام بھی، برق و باراں کے پُر کیف و نفع بخش سما بھی ہیں، اور عناصر کے عجیب و غریب تطورات و انقلابات بھی، کائنات عالم میں نباتات و جمادات وغیرہ کے دلفریب مظاہر بھی ہیں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے محیر العقول مناظر بھی، لیکن ان سب چیزوں کی بادشاہت مالک الملک والملکوت نے اس ضعیف البیان انسان ہی کو سپرد فرمائی ہے، آسمان و زمین کی کل کائنات اَجرامِ فلکیہ اور عناصر کی کل طاقتیں اُس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، تا کہ یہ تمام کائنات پر حکمرانی کرنے والا ضعیف البُنیان ذرا تأمل اور فکر کرے تو اسے محسوس و مشاہدہ ہو جائے کہ میں اس تمام کائنات کا خالق و مالک نہیں، اور محض اپنی طاقت و قوت سے ان سب کو مسخر کر کے اس سے خدمت لے لینا میرے بس کی بات نہیں، اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہو ہی سکتا کہ مالک الملک والملکوت ہی نے ان سب چیزوں کو میرا مسخر اور خدمتگار بنا دیا ہے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُوْنَ. وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَ مِنْهَا يَاْكُلُوْنَ.

(القرآن ۳۶:۷۱)

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اُن کے لئے چوپائے جانور پیدا کئے جو ہمارے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ہیں، پھر یہ لوگ (بعطائے خداوندی) اُن کے مالک بن گئے، (اور مالک بن کر بھی ان سے کام لینا انسان کے

بس میں نہ تھا) ہم نے اُن کو انسان کا تابع بنادیا، سو یہ اُن پر سوار بھی ہوتے ہیں اور ان کو (ذبح کرکے) کھاتے بھی ہیں۔

اور جب اُس نے یہ سمجھ لیا تو لازمی طور پر اس کا ذہن اِدھر منتقل ہونا چاہئے کہ خالق و مالک جل وعلا شانہٗ نے ان سب چیزوں کو میرے لئے بنایا ہے تو مجھے بھی ضروری کسی کام کے لئے بنایا ہوگا، یہ نہیں ہوسکتا کہ ساری کائنات کی قوتیں جس کی خدمت میں لگادی گئی ہیں وہ بیکار پیدا کیا گیا ہو۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ.

القرآن (۲۳:۱۱۵)

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے؟

اور یہی [۱] وہ منزل ہے جہاں ایک بھٹکا ہوا انسان راہ پر لگ جاتا ہے، اور مخلوق کا رشتہ خالق سے جڑ جاتا ہے، وہ سمجھ لیتا ہے کہ کل کائنات میرے لئے بنائی گئی ہے، تو مجھے رب العزت کی طاعت وعبادت ہی کے لئے بنایا گیا ہے:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. القرآن (۵۱:۵۶)

ہم نے انسانوں کو اور جنوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

---

(۱) عرصہ ہوا اس مضمون پر احقر نے ایک نظم لکھی تھی جس کے چند اشعار اس جگہ نقل کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ یہ ہیں:۔

یہ زمین میرے لئے ہے آسماں میرے لئے
اور رہے مصروفِ خدمت کل جہاں میرے لئے

حرکتِ افلاک و انجم، دورِ شمسی کا نظام
چل رہا ہے دیر سے یہ کارواں میرے لئے

ایک میرے دَم سے ہے اس بزمِ عالم کا فروغ
وقفِ خدمت ہے یہ سب کون و مکاں میرے لئے

میری ہستی میں ہے مضمر ہستیٔ عالم کا راز
ہے یہ سب ایجادِ شورِ کُن فکاں میرے لئے

کیوں نہ ہو روزِ ازل میں ہوچکی تقسیمِ کار
میں ہوں مالک کے لئے اور دو جہاں میرے لئے

اس طرح تمام ایجاداتِ عالم ایک بصیر انسان کے لئے آئینہ حقیقت اور درسِ عبرت بن سکتی ہیں، حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو فرمایا ہے: ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغلفت نخوری

ہمہ از بہرِ تو سرگشتہ و فرمانبردار شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

اس لئے حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کے لئے خام مواد ہی پیدا نہیں کیا بلکہ اِس کو ان سے کام لینے اور ان کے ذریعہ اپنی ضروریات اور استعمال کی چیزیں ایجاد کرنے کا سلیقہ بھی عطا فرمایا، سائنس قدیم ہو یا جدید، وہ اسی سلیقے کا دوسرا نام ہے، ظاہر ہے کہ کوئی سائنس کسی چیز کی تخلیق نہیں کرتی بلکہ اس کا کام اتنا ہی ہے کہ رب العزب کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا صحیح اور مناسب حال استعمال کرنا بتلا دے۔

آدم علیہ السلام کے زمین پر اُترنے کے ساتھ ہی انسان کی بنیادی ضرورتوں سے متعلق ایجادات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، اور جوں جوں ان کی نسل پھیلتی رہی اور زمین کی آبادی بڑھتی گئی، نئی نئی ضرورتیں سامنے آتی رہیں، اور اُن کے متعلق ایجادات ہوتی رہیں، یہاں تک کہ جب دنیا کی آبادی اپنی انتہائی کثرت و وسعت کے قریب پہنچی تو ضرورتیں بھی طوفان کی طرح بڑھیں، اور ایجادات ومصنوعات کا سلسلہ بھی اپنے کمال کو پہنچنے لگا، یہ ایک فطری تقاضا ہے جو اپنی طبعی رفتار سے آگے بڑھتا رہا، اسی کو یورپ کے کسی حکیم نے ان الفاظ سے بیان کیا ہے کہ: ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے!'' اس میں نہ پچھلے لوگوں کی بے قوفی یا بے علمی کی کوئی دلیل ہے، نہ موجودہ صناعوں کے کمالِ عقل و دانش پر کوئی شاہد، آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے نے جس طرح چاہا اپنے غیر متناہی اور غیر محدود خزانوں سے انسانی ضروریات بقدرِ ضرورت نازل فرمائیں۔

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ.

القرآن (۱۵:۲۱)

۴

ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں، مگر ہم ان میں سے (بتقاضائے حکمت) ایک خاص مقدار اُتارتے ہیں۔

اسی طرح زمین اور عناصرِ اربعہ میں جو جو قوتیں ودیعت رکھی تھیں اُن کو بھی حسبِ ضرورت اپنے اپنے وقت میں ایک خاص حکمت کے ماتحت انسانی صنعت گری کے پردے سے ظاہر فرمایا۔

ایک بصیر انسان جو تعلیمِ قرآنی کے موافق آسمان وزمین اوران کی مخلوقات پر گہری نظر ڈالے تو بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے:۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا. القران (۳:۱۹۱)

اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ چیزیں فضول نہیں پیدا فرمائیں۔

اور اُس کو اس یقین کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ جس طرح آسمان اور زمین اور عناصرِ اربعہ سے بننے والی کروڑوں مخلوقات دستِ قدرت کی بلا واسطہ مصنوعات ہیں، اسی طرح وہ چیزیں جن کو انسان اپنی مصنوعات سمجھتا ہے، درحقیقت وہ بھی ایک واسطہ اور پردے کے ساتھ اسی بدیع السمٰوات والارض کی صنعت گری کا نتیجہ ہیں:۔

؎ کارِ زلفِ تُست مشک افشانی اما عاشقان مصلحت را تہمتے برآہوئے چیں بستہ اند

؎ ایں قدر مستی و مدہوشی نہ حدِّ بادہ بود باحریفاں آنچہ کرد آں نرگسِ مستانہ کرد

الغرض کائناتِ عالم کی تمام مخلوقات ومصنوعات اور قدیم وجدید ایجادات حق جل وعلا شانہ، کی نعمائے عظیمہ اور آئینہ جمالِ قدرت ہیں، دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان چاہئیں!

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا. القران (۱۸:۷)

ہم نے جتنی چیزیں زمین پر ہیں اُن کو زمین کی زینت بنایا ہے، تاکہ ہم

انسانوں کی آزمائش کریں کہ کون اچھے عمل کرتا ہے؟

ان آیاتِ قدرت اور عظیم الشان نشانیوں کو نظرِ حقیقت شناس سے دیکھنا ایمان کا پہلا قدم ہے، اسی لئے قرآن حکیم میں بار بار مختلف عنوانات سے اس پر تنبیہ فرمائی گئی ہے، اور اکابرِ سلف نے اپنے اپنے طرز میں اس کو بیان فرمایا ہے۔

حضرت مولوئ معنوی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

شکر از نے میوہ چوب آوری — از منی مُردہ بتے خوب آوری
درمیانِ خون دردوہ فہم و عقل — کے تواند کرد جز فضلِ تو نقل

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مصنوعات وایجادات، قدیم ہوں یا جدید جن سے انسان کی معاشی فلاح کا تعلق ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمتیں ہیں جو انسان کو عطا ہوئی ہیں، عاقل انسان کا کام یہ ہے کہ اُن نعمہائے الٰہیہ سے فائدہ اٹھائے، اور اس کا شکر گزار ہو، اور ادنیٰ شکر گزاری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو اس کی نافرمانیوں اور گناہوں میں صرف نہ کرے، اور اس نکتے کو ہمیشہ پیش نظر رکھے کہ جس نے ہمیں یہ نعمتیں دی ہیں وہ ہم سے ان کا حساب بھی لے گا۔

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ. القرآن (۱۰۲: ۸)

پھر قیامت کے دن تم سے نعمتوں کا سوال کیا جائے گا۔

بلکہ نعمہائے الٰہیہ سے تمتع (فائدہ اُٹھانا) بھی شکر گزاری کا ایک درجہ ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان میں مشغول ہو کر خود مُنعم کو نہ بھلا بیٹھیں، بقول اکبر:

تم شوق سے کالج میں پلو، پارک میں پھولو — جائز، کہ غباروں میں اُڑو، چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کی رہے یاد! — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو!

ہمارے دانایانِ فرنگ، مصنوعات وایجادات کے پیچھے پڑے تو زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے، مگر ٹھوکر یہاں لگی کہ یہ ''روشنی طبع'' ہی اُن کے لئے ''بلا'' اور جو چیز

معرفتِ حق کا ذریعہ بننا چاہئے تھی اُن کے لئے پردہ بن گئی، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لئے فرمایا ہے:۔

ہمہ اندر زمن ترا زیں است   کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

یہ لوگ برق و بھاپ کے دھندے میں لگ کر ان قویٰ کے خالق و مالک سے قطعاً غافل ہوگئے، بقول اکبر:۔

چھوڑ کر بیٹھا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اُس نے برق کو اور بھاپ کو

شریعتِ اسلام ان ایجادات و مصنوعات میں صرف یہ چاہتی ہے کہ خدا کی ان نعمتوں سے اس کی دی ہوئی عقل کے ذریعہ نئی نئی ایجادیں کریں، معاشی آسانیاں حاصل کریں، مگر دو شرطوں کے ساتھ، ایک یہ کہ اس کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کی نافرمانیوں میں استعمال نہ کریں، دوسرے عطا کرنے والے منعم حقیقی کو نہ بھولیں۔

آلات وایجاداتِ جدیدہ کے اَحکام

ا:۔ جو آلات ناجائز اور غیر مشروع کاموں ہی کے لئے وضع کئے جائیں، جیسے آلاتِ قدیمہ میں ستار، ڈھولکی وغیرہ، اور آلاتِ جدیدہ میں اسی قسم کے آلاتِ لہو وطرب، ان کی ایجاد بھی ناجائز ہے، صنعت بھی، خرید و فروخت بھی اور استعمال بھی۔

۲:۔ جو آلات جائز کاموں میں بھی استعمال ہوتے ہیں، ناجائز میں بھی، جیسے جنگی اسلحہ اسلام کی تائید و حمایت میں بھی استعمال ہوسکتا ہے، مخالفت میں بھی یا ٹیلی فون، تار، موٹر، ہوائی جہاز، ہر قسم کی جائز و ناجائز، عبادات و معصیت میں استعمال ہوسکتے ہیں، اُن کی ایجاد، صنعت، تجارت، جائز کاموں کی نیت سے جائز ہے، اور جائز کاموں میں ان کا استعمال بھی جائز ہے، حرام اور معصیت کی نیت سے بنایا جائے یا اس میں استعمال کیا جائے تو حرام ہے

۳:۔ ایسے آلات جو اگرچہ جائز کاموں میں بھی استعمال ہو سکتے ہیں، لیکن عادۃً ان کو لہو و لہب اور ناجائز کاموں ہی میں استعمال کیا جاتا ہے، جیسے گراموفون وغیرہ، ان کا استعمال کراہت سے خالی نہیں، جیسے گراموفون میں قرآن کا ریکارڈ سننا بھی مکروہ ہے، کیونکہ یہ کام اگرچہ اپنی ذات میں جائز، بلکہ موجبِ ثواب ہے، لیکن جس آلے کو عادۃً لہو ولعب اور طرب کے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے اس میں قرآن سننا، اور قرآن کو لہو ولعب کی صورت دینا ایک قسم کی بے ادبی ہے۔

آلۂ مکبّر الصوت

آلات کی مذکورہ الصدر تین قسمیں معلوم ہونے کے بعد آلۂ مکبّر الصوت کا حکم معلوم کرنا کچھ دشوار نہیں رہا، کیونکہ وہ ظاہر ہے کہ قسم اوّل میں داخل نہیں، اور اس کے عام استعمال سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وہ قسم سوم میں بھی شامل نہیں، اس لئے قسم دوم میں داخل ہونا متعین ہوگیا، یعنی وہ آلات جو جائز و ناجائز دونوں طرح کے کاموں میں مساوی طور پر استعمال کئے جاتے ہیں، اس لئے اس کا یہ حکم ہوگا کہ جائز کاموں میں اس کا استعمال جائز، اور ناجائز کاموں میں ناجائز، اور طاعت کے کاموں میں طاعت، اور معصیت کے کاموں میں معصیت ہے، اگر آلہ مکبّر الصوت کے ذریعہ قرآنِ کریم کی آیات یا اس کی تفسیر یا احکامِ دین یا وعظ و نصیحت یا عام مسلمانوں کی ضرورت کی کوئی چیز دور کے سامعین کو پہنچائی جائے تو یہ جائز بلکہ موجب ثواب ہے، (عباداتِ مقصودہ نماز وغیرہ میں اس کے استعمال کا معاملہ علیحدہ ہے، جس کی مفصل تحقیق آگے آتی ہے) اور اگر اس کو گانے بجانے یا عورتوں کی آواز دور تک پہنچانے میں یا اور کسی غیر مشروع و ناجائز کلام کے پہنچانے میں استعمال کیا جائے تو ناجائز و گناہ ہے۔

ریڈیو

ریڈیو کا استعمال اگرچہ عام حکومتوں اور عوام کی بدمذاقی سے مخرب اخلاق اور

غیر مشروع چیزوں میں زیادہ تر کیا جارہا ہے، لیکن خبروں اور دوسری مفید اور جائز معلومات کا درجہ بھی اس میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لئے اس کا حکم بھی وہی ہے جو قسم دوم کے آلات کا ہے کہ جائز کاموں میں اس کا استعمال جائز اور ناجائز کاموں میں ناجائز ہے، اور اس کی صنعت وتجارت مطلقاً جائز ہے، بشرطیکہ اپنی نیت جائز کاموں کی ہو، اگرچہ خریدنے والا اس کو ناجائز میں استعمال کرے۔

مسئلہ:۔ ریڈیو پر قرآن مجید کی محض تلاوت معاوضہ لے کر جائز نہیں، اور ایسی قراءت کا سننا بھی اعانتِ گناہ ہے۔

عام آلات وایجاداتِ جدیدہ کے شرعی اَحکام کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کے متعلق تفصیلی مباحث لکھے جاتے ہیں، جو اس رسالے کی اصل غرض ہے۔وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِیْنُ !

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آلات جدیدہ اور مسلمان

جب سے دنیا آباد ہے، کسی زمانہ میں کسی فن کا اور کسی زمانہ میں کسی فن کا عروج رہا ہے۔ یہ زمانہ صنعت وایجادات کی ترقی وعروج کا ہے روزانہ نئی نئی حیرت انگیز ایجادات کے مظاہرے ہوتے ہیں اور ظاہر پرست نظروں نے آجکل فضل وکمال کا انحصار اسی میں سمجھ رکھا ہے یہاں تک کہ بہت سے ناواقف مسلمان بھی اس دھوکہ میں ہیں کہ خلفاءِ اسلام اور مسلمان سلاطین جن کے زمانہ میں یہ چیزیں ایجاد نہ ہوئی تھیں اُن کو (معاذ اللہ) بے وقوف یا کم ازکم ان ایجادات سے عاجز اور اُن کے دماغوں کو نارسا خیال کرتے ہیں۔ بلکہ بعض بے باک اور ناعاقبت اندیش تو جب کسی آلۂ جدیدہ کے کچھ فوائد عباداتِ اسلامیہ کے بارے میں مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ صحابہ کرام اور اسلافِ اسلام (معاذ اللہ) یا تو ان چیزوں کی ایجاد پر قادر نہ تھے۔ اور یا انہوں نے غفلت کی کہ ایسی فائدہ مند چیزوں کو بہم نہ پہنچایا جن سے نہ فقط دنیوی راحت وآسائش کا سامان بہم پہنچتا ہے بلکہ بہت سی طاعات وعبادات بھی اُن کے ذریعہ بوجہ اکمل ادا ہوسکتی ہیں۔ لیکن یہ ایک بیہودہ خیال ہے جس کے نتائج نہایت خطرناک ہیں اس لئے اس کے متعلق مختصراً اظہارِ واقعہ ضروری معلوم ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے خیالات اس شخص کو پیدا ہوتے ہیں جس نے اسلام کی غرض وغایت اور مقصد ومطلب کو نہیں سمجھا۔ اور جس کو یہ معلوم نہیں کہ آسمانی مذہب کس لیے بھیجا جاتا ہے اور انبیاو رُسل کس غرض کے لئے دُنیا میں تشریف لاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے

نظروں میں تفاوتِ عظیم ہے۔ وہ جس چیز کو معراجِ کمال سمجھے ہوئے ہیں آسمانی ملت اس کو انتہائی تنزل وانحطاط قرار دیتی ہے:۔

معشوقِ من آنست کہ نزدیک تو زشت ست

بات یہ ہے کہ اسلام بلکہ ہر آسمانی مذہب وملت انسان کو اس کی ہدایت کرتا ہے کہ مادیات کا استعمال واشتغال صرف اسی قدر رکھو جس کے بغیر کام نہ چلے۔ باقی اوقات صرف اپنے مالک وخالق کی یاد میں گزارو کہ یہی حقیقی صلاح وفلاح ہے اور یہی انسان کی اصل ترقی ہے۔ اور نظرِ حقیقت شناس میں صرف وہی لمحاتِ فرصت کام میں آنے والے ہیں جو ربُّ الارباب کی یاد میں گزر جائیں۔

دن وہی دن ہے شب وہی شب ہے جو تری یاد میں گذر جائے

اس کے علاوہ کسی چیز کی طلب میں منہمک اور پریشان ہونا بے عقلی اور ناعاقبت اندیشی اور جانِ عزیز کو ذلیل کرنا ہے:۔

سَهَرُ الْعُيُوْنِ لِغَيْرِ وَجْهِكَ بَاطِلٌ
وَبُكَائُهُنَّ لِغَيْرِ فَقْدِكَ ضَائِعٌ

تیری طلب کے سوا کسی اور کام کیلئے شب بیداری بیکار ہے
اور تیری جدائی کے سوا کسی چیز کیلئے رونا لغو ہے

فخر الاولین والآخرین سید الانبیاء والمرسلین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کرام کے فقر وفاقہ کے قصے سن کر شاید کسی ناواقف کو یہ خیال ہو کہ (معاذ اللہ) یہ بیچارے اگر سادہ زندگی نہ گذارتے تو اور کیا کرتے اُن کو تو اتنی بھی گنجائش نہ تھی کہ جو دنیوی سامان اسوقت رائج تھا وہی جمع کرلیں نئی ایجادات تک تو اُن کے خیالات کہاں پہنچے؟

لیکن جس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صحابہ کی تاریخ اور ان کے

قابلِ تقلید زندگی کے ہر دور کا اطمینان کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ یہ شیطانی وساوس اُس کے قلب میں نہیں آسکتے کیونکہ وہ ان حضرات کے مجموعی حالات کو پڑھ کر یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان حضرات کا فقر و فاقہ محض اختیاری تھا۔ وہ اگر چاہتے تو دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ سے زیادہ سامانِ عیش جمع کر سکتے تھے۔

مگر انہوں نے مادیات کے اشتغال اور سامانِ دنیا کی فراہمی کو ہیچ اور لغو و ذلیل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اُن سب چیزوں کے عوض صرف ایک ذات اور اُس کی رضا جوئی کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا:۔

دام میں یار کے میں دیدہ و دانستہ پھنسا
مجھ کو نادان نہ سمجھیں دلِ دانا والے

یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے پاس بسا اوقات لاکھوں روپیہ جمع ہو گیا مگر انکی زندگی ہر حال میں فقیرانہ ہی رہی۔

یہ موقع تاریخی واقعات جمع کرنے کا نہیں ورنہ صحابہ کرامؓ کی جماعت میں سینکڑوں حضرات ایسے ہیں کہ اُن کے تموّل کے حالات بیان کئے جائیں تو حیرت ہو جائے۔ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ ہزار ہا روپیہ آپ نے ایک ہی مجلس میں تقسیم کر ڈالا۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جب باذنِ خداوندی آپ سے عرض کیا کہ اگر آپ چاہیں تو میں مدینہ کے پہاڑوں کو خالص سُونا بنا دوں؟ تو مسکنت کی زندگی پسند کرنے والے اور مساکین کے زمرے میں ملے جلے رہنے والے، سُلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی عرض کیا کہ مجھے یہ تموّل پسند نہیں۔

الغرض یہ محض ایک شیطانی خیال ہے کہ ان حضرات کا دنیوی سامانِ عیش سے اجتناب بوجہ افلاس کے تھا۔ نہیں بلکہ افلاس اسوجہ سے تھا کہ وہ ان مادیات کے اشتغال وانہماک سے متنفر ہو کر یہ دعائیں مانگا کرتے تھے:۔

اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِىْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِىْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِىْ فِىْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنَ.

یا اللہ مجھ مسکینی کی حالت میں زندہ رکھیئے اور اسی حالت میں موت دیجئے اور مساکین ہی کی جماعت میں میرا حشر کیجئے۔

الغرض اسلام اور ہر مذہب حق انسان کو بہ بانگ بلند یہ دعوت دے رہا ہے کہ ناز و نعم اور عیش و عشرت میں منہمک رہنا، پیٹ بھرنے یا شہوات و لذائذ کی طلب میں سرگرداں پھرنا انسان کا کام نہیں۔ بلکہ اس کام میں تو بہت سے حیوانات انسان سے زیادہ امتیاز رکھتے ہیں۔ بلکہ حیوانات میں بھی مسکین گدھا جو سب سے زیادہ حقیر ہے وہی شہوت اور پیٹ بھرنے میں ضرب المثل ہے۔

شہد کی مکھی کا مسدّس گھر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے پرکار لیکر اُس کے اضلاع کو ٹھیک کیا ہے مکڑی کے کاتے ہوئے باریک اور اس کے بُنے ہوئے جالے کو دیکھئے تو مانچسٹر اور لنکا شائر کی مشینیں اُن کے مقابلے میں فیل نظر آتی ہیں۔

غرض عیش پرستی اور اس کے لئے طرح طرح کی ایجادات کو سرمایۂ فضل و کمال سمجھنا اُسی شخص کا کام ہے جو حقیقی فضل و کمال سے محروم ہے۔ کیونکہ انسان کی سعادت و فضیلت صرف اس میں ہے کہ اپنے مالک کے حق کو پہچانے، اُس کی یاد اور اطاعت و عبادت میں اپنے اوقات کو مشغول رکھے، دنیوی سامان صرف اُسی قدر جمع کرے جس کے بغیر کام نہیں چلتا۔

حضرت لقمان حکیم علیہ السلام نے اس مضمون کو ایک نہایت بلیغ جملہ میں اس طرح ارشاد فرمایا ہے:۔

اِعْمَلْ لِدُنْيَاكَ بِقَدْرِ بَقَائِكَ فِيْهَا، وَاعْمَلْ لِاٰخِرَتِكَ بِقَدْرِ بَقَائِكَ.

دنیا کے لئے اسی قدر کام کرو جس قدر تمہیں اُسمیں رہنا ہے اور آخرت

کیلئے اسقدر سامان جمع کرو جس قدر تمہیں وہاں رہنا ہے (اور ظاہر ہے کہ دنیا کا قیام چندروزہ اور آخرت کا دائمی ہے اُس کے لیے سامان بھی زیادہ چاہئے)۔

یہی وجہ ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی کسی مذہب پرست قوم نے ان مادی ترقیات پر دل نہیں دیا اور اس میں مذاہبِ حقہ سے گذر کر مذاہب باطلہ بلکہ قدیم فلاسفہ تک شریک ہیں کہ وہ اگر چہ علمی تحقیق کے درجہ میں عالمِ عناصر و افلاک کے ہر شعبۂ طبقات الارض، کائنات الجو، نجوم و حرکاتِ نجوم پر گزرے اور ایسی دقتِ نظر اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ گذرے کہ باقرارِ اہلِ یورپ اگر آج اُن کے انکشافات سائنس جدید کے سامنے نہ ہوتے تو دنیا میں اُس کا وجود ہی نہ ہوتا۔ یہ ساری حیرت انگیز ایجادات اور نئے نئے انکشافات اُنہیں اصولِ قدیمہ کے پھل پھول ہیں جو قدیم فلاسفہ کے قائم کیے ہوئے ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اُن کی تمامتر توجہ الٰہیات کی طرف رہی اور انسان کا اصلی کمال اسی کی معرفت کو سمجھا اور اُس کے لیے چونکہ ریاضات و مجاہدات کے ذریعہ اصلاح نفس کو ضروری سمجھا اس لیے عملاً بھی عموماً یہ لوگ تارک الدنیا ہو کر ریاضات میں مشغول رہے۔ یہ دوسری چیز ہے کہ بدقسمتی سے اُنہوں نے الٰہیات کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کرنے میں محض اپنی عقل کی رہبری کو کافی سمجھ لیا۔ نبوت و وحی کے واسطہ کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس لیے ٹھوکریں کھائیں اور مُہلک غاروں میں جا پڑے۔

الغرض ہر مذہب وملت کی تو بنیاد ہی ترکِ دنیا اور توجہ الی اللہ پر ہے۔ فلاسفہ جو کوئی مذہبی طبقہ نہیں وہ بھی محض باقتضاءِ عقل اسی زہد و ریاضت کو کمالِ انسانی سمجھتے تھے۔

یہی اور صرف یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں نے کل پرزوں کی ساخت اور مشینوں موٹروں کی ایجاد میں مشغول ہونے کو تضیعِ وقت اور ایک لغو مشغلہ سمجھ کر چھوڑ دیا نہ کہ یہ چیزیں اُنکی قدرت سے خارج تھیں۔ یا اُن کے دماغوں کی رسائی اس حد تک نہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ سلطنتِ اسلامی کے آخری دور میں جب دنیا اس نظریئے سے محروم ہونے لگی اور عیش وعشرت اور ناز ونعم کو انسان کی انتہائی سعادت سمجھ لیا گیا تو تھوڑے ہی عرصہ میں سینکڑوں ایسی ایجادیں سامنے آگئیں کہ اُن میں سے بعض کی تو سائنسِ جدید نقل بھی نہیں کرسکی اور بعض کی نقل اُتار کر ایجاد کا سہرا اپنے سر رکھ لیا۔

دمشق کی تعمیراتِ قدیمہ، اندلس کی حیرت انگیز ایجادات وتکلفات کی اگر کچھ تفصیل سامنے رکھ دیجاوے تو موجودہ سائنس کے متعلق شاید ہر شخص کہہ اُٹھے کہ:ے

اپنی یکتائی پہ نازاں تھا وہ شوخ
آئینہ دیکھا تو حیرت ہو گئی

اور یہ کہ :ے

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے
چشم نرگس کی، دہن غنچہ کا، حیرت میری

کیونکہ اُس وقت معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کی مفید اور ضروری ایجادات بیشتر عربوں اور مسلمانوں کی مرہونِ منت ہیں اور وہ اس وقت ایجاد ہوئی ہیں جبکہ متمدن دنیا میں کہیں یورپ واہلِ یورپ کا ذکر تک نہ تھا۔ بطور نمونہ چند مثالیں اس وقت سامنے لائی جاتی ہیں۔

اعلیٰ قسم کے کپڑے

دمشق، شام، اشبیلیہ، اندلس اور ہندوستان کی دیدہ زیب اور نفیس وبہترین صناعت اس بارہ میں اسقدر مشہور ومعروف ہے کہ بیان کی حاجت نہیں خود انگریز اس کے معترف ہیں۔ اندلس پر عربوں کی حکومت کے زمانہ میں ۱۵۱ء میں ایک اشبیلیہ کے اندر سولہ ہزار کارخانے بہترین کپڑا تیار کرتے تھے جن میں ایک لاکھ تین ہزار ماہرِ فن بُننے والے اور مزدور کام کرتے تھے (غابر الاندلس وحاضرہا ص:۷۸)

اندلس ہی کے بعض شہر مریہ وخیرہ میں چھ ہزار کارخانے صرف ریشمی کپڑے اور اطلس و بانات وغیرہ بُنتے تھے۔ اور آٹھ سو کارخانے صرف کشیدہ کاری اور چادروں کے حواشی پر بیل بوٹے نکالنے کا کام کرتے تھے ململ وغیرہ باریک اور نفیس کپڑے سرقسطہ میں بکثرت بُنے جاتے تھے۔ اہل یورپ نے اُن کی نقل اُتاری اور آج تک بھی اُن کی طرف منسوب ہے۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے DAMESSER (یعنی دمشقی طرز پر کپڑا)۔

برتن اور آرائشی چیزیں

چینی اور کانچ کے نفیس برتن اور آرائش کی عجیب عجیب چیزیں جو آج انگریزوں کی برکات سمجھی جاتی ہیں۔ یہ اُن کے تمدنی وجود سے صدیوں پہلے عرب صناعین کے ہاتھوں وجود میں آئی ہیں۔ شہر مالقہ اسی صنعت کے لیے مشہور و معروف ہے۔ یہاں کے خوبصورت نفیس برتن دنیا بھر میں جاتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے آج تک بلادِ عرب میں عمدہ پلیٹوں اور برتنوں کو ''مالقی'' کہتے ہیں۔ اس کا پہلا موجد عباس بن فرناس حکیم الاندلس ہے۔
(غابر الاندلس)

کاغذ

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کاغذ کے کارخانے یورپ کی ایجاد ہیں ان سے پہلے وہی رُوکھے کاغذ جو عام طور پر قدیم کتابوں میں نظر پڑتے ہیں رائج تھے۔ لیکن تاریخ دیکھو تو حقیقت معلوم ہو کہ اس صنعت کو اوج کمال پر پہنچانے والے اہلِ شاطبہ ہیں (شاطبہ بلادِ اندلس میں سے ایک شہر کا نام ہے)۔

وَفِیْ شَاطِبَۃِ یُعْمَلُ الْکَاغَذُ الْجَیِّدُ وَ یُحْمَلُ مِنْھَا اِلٰی سَائِرِ بِلَا دِ الْاُ نْدُلُس.

شہر شاطبہ میں نفیس کاغذ بنایا جاتا ہے اور یہیں سے تمام بلاد اندلس میں جاتا ہے۔ (غابر الاندلس)

مطبع اور چھپائی کی ایجاد

چھپائی کی مشین اور مطابع کی ایجاد عام طور پر یورپ کا فیض سمجھا جاتا ہے اور گوتمبرگ کو اس کا موجد قرار دیا جاتا ہے لیکن تاریخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے پہلے موجد مسلمان ہیں۔ اندلس میں اس کی ایجاد ہوئی۔ مگر افسوس کہ اُس کی تفصیلات ہمیں نہیں ملیں۔ موجودہ تاریخ اندلس اس اجمال کا پتہ دیتی ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے سلطان ناصر کے وزیر اعظم عبدالرحمٰن بن بدر، شاہی فرامین کو لکھ کر چھپنے کے لئے بھیجتے تھے اور چھپنے کے بعد اُس کی ایک ایک کاپی اپنی قلمرو میں بھیجا کرتے تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ گوتمبرگ سے چار سو برس پہلے مسلمان اس کو ایجاد کر چکے تھے۔

فرش کے لئے منقش پتھر

یوروپین مؤرخ میجون لکھتا ہے کہ اندلس میں فرش کے لئے منقش پتھروں کی صنعت عجیب وغریب ہے (عابر الاندلس)

ہیئت وریاضی آسمان اور ستارے بنانا

عربِ اندلس اس فن میں دنیا کے مسلّم اُستاد ہیں۔ انہیں میں سے عباس بن فرناس حکیم اندلس نے ایک مکان میں آسمان اور زمین اور ستاروں کی ہیئت بنائی تھی جس میں رعد و برق اور ابر و باراں کی پوری نقل دکھائی تھی۔ بادلوں کا بننا اور برسنا مشاہد کرایا تھا۔

ہوائی جہاز

انسان کے ہوا میں پرواز کرنے کا سب سے پہلا مُوجد بھی یہی حکیمِ اندلس ہے۔ اس نے ایسے پر ایجاد کیے تھے کہ انکو انسان اپنے بازوؤں پر لگالے تو اطمینان کے ساتھ پرواز کر سکتا تھا۔ موجودہ ہوائی جہازوں میں جو خطرات مضرات ہیں یہ پر اُن سے بالکل محفوظ تھے۔

فنِ زراعت و آبپاشی

اس فن کو عرب اندلس نے اسقدر مکمل کر دیا تھا کہ آج متمدن دنیا اسکی نظیر نہیں لا سکتی۔ اندلس کے تمام بلاد میں آب پاشی کا وہ انتظام کیا گیا تھا کہ بارانی اور نہری زمینیں یکساں کام دیتی تھیں اور بجائے دو فصلوں کے سال میں تین فصلیں پیدا کرتی تھیں۔
(غابر الاندلس)

صیقل گری اور پالش

یہ صنعت شام میں بہت ممتاز تھی یہیں سے عربِ اندلس نے اس کو حاصل کیا اور ترقی دیکر اس حد کو پہنچا دیا کہ آج بھی یہ صنعت انہی کے نام کی طرف منسوب ہے۔ انگریزی میں باختلافِ الفاظ کہا جاتا ہے۔ DAMAQUINACE یا DAMUSQUINERI یا DAMUSQUINER یعنی لوہے چاندی سونے کا جڑاؤ یا اس پر ملمع و پالش کرنا۔

چمڑے کی چیزیں اور اُس کے کارخانے

قرطبہ میں چمڑے کی رنگائی اور اُس سے طرح طرح کی استعمالی چیزوں کی ساخت اسقدر مشہور تھی کہ یہاں کی مصنوعات تمام دنیا میں تحفہ بن کر پہنچتی تھیں۔

فنِ تعمیر انجینئری

آج کی نئی نئی تعمیرات اور اُن میں استعمال ہونے والے جدید آلات کو دیکھ کر ممکن ہے کہ وہ شخص کچھ تعجب میں پڑے جو قدیم تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے حالات سے بالکل ہی بے خبر ہو۔ لیکن جس شخص نے بعض آثارِ قدیمہ یا اُنکی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اول نظر میں یقین کریگا کہ یورپ نے ان تمام کاروبار میں عربوں اور مسلمانوں کی نقل اتارنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ آج تک کامیاب نہیں ہوئے۔ اور ان تمام فنون میں عرب ہی یورپ

کے اُستادِ اول ہیں اور آج تک یورپ میں عربوں کے طرزِ تعمیر کا درس دیا جاتا ہے اور وہ اُن کی تعمیرات کی مضبوطی، بلندی حسن ونزاکت اور نقش ونگار پر فریفتہ وحیرت زدہ نظر آتے ہیں۔

اس وقت میرے سامنے اندلس کی تاریخ کا اجمالی نقشہ دکھانے والا مختصر رسالہ ''غابر الاندلس و حاضرھا'' ہے۔ اسی میں بلادِ اندلس، قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ اور مجریط کی عالیشان وحیرت انگیز تعمیرات، قصر حمراء، زہراو غیرہ کا مطالعہ کیجئے تو بڑے سے بڑا ماہرِ فن انجینئر حیران رہ جاتا ہے کہ ان کے بنانے والوں نے کیا جادو کیا ہے۔ دُور نہ جائیں ہندوستان ہی کے آثار قدیمہ پر نظر ڈالیں تو انہیں سے کتنے ایسے نکلیں گے کہ اہلِ یورپ آج کل اُن کی نقل بھی نہیں اُتار سکتے۔

لوہے پیتل اور کانچ کے آلات اور برتن

شہر مریہ میں یہ چیزیں نہایت مضبوط، خوشنما، اتنی انواع واصناف کی بنتی تھیں کہ احاطہ نہیں ہوسکتا، انگریز مؤرخین خود اس کے معترف ہیں۔

رنگ

مختلف قسم کے گہرے اور ہلکے نفیس وحسین رنگ کی ایجاد بھی اندلس مسلمانوں کی رہینِ منت ہے۔ یہیں سے تمام ممالک عرب وعجم اور مشرق ومغرب میں ان کی مصنوعات تجارتی جہازوں کے ذریعہ جاتی تھیں۔

تجارتی جہازوں کا انتظام

اندلس کے تجارتی جہازوں کا ایک خاص انتظام تھا۔ ہر ساحل پر پہنچنے اور ٹھہرنے کے اوقات مقرر تھے جن کے ذریعہ وہ اپنا مال دوسرے ممالک دیتے اور وہاں کی مخصوص چیزیں اپنے مُلک لیجاتے تھے۔

گھڑی کی ایجاد

گھڑی کی ایجاد اہلِ یورپ کی اقرار و شہادت سے خلیفہ ہارون رشید کے عہد میں ہوئی ہے۔ الفلسفۃ العربیہ کی مصنفہ نے اس پر اہل یورپ کی شہادتیں نقل کی ہیں اور غابر الاندلس کے مصنف نے نقل کیا ہے کہ حکیم اندلس عباس بن فرناس نے ایک بینظیر گھنٹہ ایجاد کیا تھا جو آجکل عام گھنٹوں کی طرح لٹکن سے چلتا تھا۔ اور صحیح وقت دینے میں بے مثل مانا گیا تھا۔

آرائشِ بلدہ، صفائی و روشنی کا اعلیٰ انتظام

عرب اندلس نے اس کام کو اُسوقت مکمل و منظم کیا تھا کہ یورپ اور اُس کے تمدن کا کہیں نام تک نہ لیا جاتا تھا۔ عام سڑکوں کی درستی اور خوبصورت و مضبوط بنانے کا انتظام سب سے پہلے اہل قرطبہ نے کیا اور اسی طرح تمام شہر میں روشنی کا انتظام بھی عربِ اندلس کی یادگار ہے۔ قرطبہ شہر کی روشنی کا یہ حال تھا کہ شہر سے باہر تقریباً آٹھ نو میل تک چلنے والوں کو روشنی کی حاجت نہ تھی شہر قرطبہ کی روشنی میں راستہ قطع کرتے تھے۔ (غابر الاندلس ۱۰۱)

توپیں اور بارود

اس کے پہلے موجد عرب اندلس ہیں۔ بارود کی تحقیق اور اُس سے کام لینے کی سب سے پہلی ایجاد انہی لوگوں کی رہینِ منت ہے۔ ان لوگوں کی بنائی ہوئی توپیں جن کے ذریعہ انہوں نے غرناطہ کے قلعوں سے مدافعت کا کام لیا آج تک ہسپانیہ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔

عورتوں کی تعلیم اور درست کاری

شہر قرطبہ کے صرف ایک ربضِ شرقی میں ایک سو ستر عورتیں تھیں جن میں سے ہر ایک

قرآن مجید کو عمدہ خط کوفی میں لکھتی تھی یہ صرف ایک جانب کا حال ہے بقیہ جوانب کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ تعلیمِ نسواں اور اُن کی گھریلو صنعت کا کیا حال تھا!

اسلامی اندلس کی تمدنی ترقی پر اہل یورپ کی چند شہادتیں

ایک یورپین فاضل کا باتون لکھتا ہے:۔

ہسپانیہ میں عرب کا تمدن تمام امورِ مادیہ میں نہایت شاندار تھا اندلس کی غیر آباد زمینوں کے آباد اور کارآمد بنانے میں جو ذرائع اور آلات اُنہوں نے استعمال کیے۔ اگر ہم عرب کو اُن کا موجد بھی تسلیم نہ کریں تو اس سے کسی طرح انکار نہیں ہوسکتا کہ اُنہوں نے اس فن کو انتہائی ترقی دی اور نقصانات کو رفع کیا۔ جیسا کہ ریشمی کپڑے۔ اور چمڑے کا سامان اور چینی وکانچ کے برتن۔ رُوئی اور اون اور مختلف درختوں کے گودے سے دھاگہ پیدا کر کے اس سے کپڑے کے کارخانوں کے پہلے موجد عرب ہیں۔ عربوں نے بیشمار معابدِ عامہ ایسے چھوڑے ہیں کہ آج آٹھ سو برس گذرنے کے بعد بھی وہ قابل حیرت واستعجاب نظر آتے ہیں۔

(غابر الاندلس ۸۱)

ایک یورپین مؤرّخ لکھتا ہے:۔

اندلس میں اسلامی تمدن کے زمانہ میں چار کروڑ آدمی کارخانوں میں کام کرنیوالے تھے اور آج یورپ کے عروج کے زمانہ میں اسکی کل آبادی دو کروڑ دس لاکھ ہے۔ اُنہی کے زمانے میں اندلس کے بڑے بڑے ایسے شہر آباد ہوئے کہ آج اُنکے ویران کھنڈروں کو دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ اُن کے زمانہ میں فنِ زراعت نہایت کامیاب اور آب پاشی کا انتظام نہایت مکمل تھا۔　(غابر الاندلس ۸۲)

ایک دوسرا یورپین مورخ لکھتا ہے:۔

ہسپانیہ کا وہ دور جو عرب کے زیرِ حکومت گزرا ہے اسکا سب سے مبارک زمانہ تھا۔ (غابر الاندلس ۸۲)

ایک اور یورپین مورخ لکھتا ہے:۔

اسلامی عہد کے ہسپانیہ کے باشندے باستثناءِ قلیل سب کے سب لکھے پڑھے تھے جبکہ مسیحی یورپ کا طبقۂ اعلیٰ بھی باستثناءِ چند بالکل ناخواندہ اور اُمی تھا۔ (غابر الاندلس ۸۷)

ایجادات وصنائع اور تمدنی ترقیات کے متعلق جو کچھ اسوقت لکھا ہے یہ تمام ممالک اسلامیہ کا حال نہیں بلکہ صرف ایک خطۂ اندلس اور اُس کے بھی مخصوص شہروں کے بعض بعض حالات ہیں۔ جو صرف ایک چھوٹے سے رسالہ سے بلا کسی خاص اہتمام تلاش کے نقل کیے گے ہیں۔ جسکی غرض صرف یہ ہے کہ آج کل کی یُورپ زدہ نظریں جو برق و بھاپ کی نئی تشکیل کو انسانی معراج سمجھتی ہیں۔ اُن کے سامنے ایک معمولی سا نمونہ اس کا بھی آجائے کہ مسلمانوں نے جس وقت (اپنی محرومی و بے نصیبی سے) عہدِ سلف کا سبق بُھول کر ایجادات وصنائع کو ترقی سمجھ لیا تھا تو ایک ہی حرکت میں اُنکا قدم ساری دُنیائے تمدن سے آگے تھے اور آج بھی ماہرین سائنس کو اُنکا لُوہا ماننے سے چارہ نہیں اور موجدین یُورپ اُن کی حیرت انگریز ترقی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

اور سلفِ صالح صحابہؓ وتابعینؒ اور خلفاء راشدینؓ نے جو ان چیزوں کو نظر انداز کیا تھا تو پوری بصیرت کے ساتھ یہ سمجھ کر کیا تھا کہ انسان کی اصلی سعادت اور فضل وکمال، عقل و دانش کو ان چیزوں سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ نئی نئی حیرت انگریز ایجاد تو لایعقل جانور بھی کر لیتے ہیں۔ انسان کی ترقی اور انتہائی کمال حق تعالیٰ کی رضا جوئی ہے اور بس۔

ہاں! اسی کے ساتھ یہ شریعتِ اسلام کی ہمہ گیری کا طُرۂ امتیاز ہے کہ باوجود ان

چیزوں کو کمال نہ سمجھنے کے جب یہ ایجادات سامنے آگئیں تو یہ نہیں کیا کہ انکے استعمال کو مطلقاً ناجائز یا ناپسند ٹھہرا دیا جائے بلکہ دوسری نعمائے الٰہیہ کی طرح ان کے استعمال کی بھی اجازت دی گئی۔ مگر صرف ایک شرط سے کہ وہ اصل مقصدِ انسانی یعنی رضائے حق تعالیٰ کے خلاف استعمال نہ کئے جائیں۔ وللّٰہِ الحمدُ والمنّۃُ۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ۔

محرم ۱۳۵۸ھ

آلۂ مکبّر الصوت

کے

شرعی اَحکام

یہ مقالہ ۱۳۸۷ھ میں مستقل شائع ہوا تھا، ۱۳۸۱ھ میں اسے موجودہ مجموعے یعنی ''آلاتِ جدیدہ'' کا جزو بنادیا گیا، اور اس میں بہت سے اضافے کئے گئے، ہیں جن کی تفصیل مقالے کے مقدمے میں آرہی ہے۔

مقدمہ طبع ثالث از مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ رسالہ پہلی مرتبہ ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا تھا، جبکہ نہ آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال میں ابتلاءِ عام تھا، اور نہ اس کی حقیقت کا پورا انکشاف ہوا تھا، اس میں آلے کے نماز میں استعمال کی ممانعت کے ساتھ یہ بھی لکھا گیا تھا کہ جو نماز اس کی مدد سے ادا کی جائے وہ نماز فاسد ہے، اس وقت بھی بعض اکابر علماء نے فسادِ نماز کے حکم سے اختلاف کیا تھا، مگر فساد میں احتیاط کا پہلو تھا، اس لئے فوری طور پر اس معاملے میں زیادہ بحث ونظر کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔

اس کے بعد جب اس کا استعمال دنیا کی عام مساجد میں بالخصوص حرمین محترمین میں ہونے لگا، اور حجاج وزائرین کو ابتلاءِ شدید پیش آیا، تو اطرافِ عالم کے سوالات اور تقاضوں سے اس کی ضرورت شدید ہوتی چلی گئی کہ اس پر مکرر غور وفکر اور بحث ونظر کر کے اگر اُصولِ فقہیہ کے ماتحت کوئی گنجائش نکلتی ہے تو عام مسلمانوں کی نمازوں کو فاسد کہنے کی بجائے رُخصت وگنجائش سے کام لیا جائے، چنانچہ اُستاذِ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ اور احقر ناکارہ نے مسئلے کے ہر پہلو پر اپنی مقدرت وبصیرت کی حد تک دوبارہ غور کیا، اس میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس آلے کی آواز متکلم کی اصلی آواز ہے یا اس کا عکس اور شبیہ؟ اور چونکہ اس مسئلے کا تعلق سائنس جدید سے تھا، پہلی مرتبہ بھی مسئلے کا حکم لکھنے کے وقت اس معاملے کی تحقیق اُس وقت کے محدود وسائل کی حد تک کر لی گئی تھی، اس مرتبہ پاکستان میں اس تحقیق کے زیادہ مواقع فراہم تھے، اُن سے بھی کام لیا گیا، جدید تحقیقات کے نتیجے میں یہ ظاہر ہوا کہ ''مکبر الصوت'' سے سنی ہوئی آواز متکلم کی اصلی آواز ہوتی ہے،

جس کی وجہ سے فسادِ نماز کے حکم کی اصل بنیاد ہی منہدم ہوگئی۔

اس کے علاوہ دوسری فقہی وجوہ ایسی بھی سامنے آئیں کہ اگر یہ اصلی آواز نہ ہو بلکہ مصنوعی ہو تب بھی فسادِ نماز کا حکم نہیں ہونا چاہئے، احقر نے ان نئی تحقیقات اور دوسری وجوہِ فقہیہ کے ساتھ اپنے رسالے کو دوبارہ ترتیب دیا، اور اس کا مسودہ دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، خیر المدارس ملتان وغیرہ اہم مدارسِ اسلامیہ میں حضراتِ علماء کے غور وفکر اور استصواب رائے کے لئے بھیج دیا، ان سب حضرات نے جزوی اختلافات کے ساتھ اصل مسئلہ عدمِ فسادِ نماز میں اتفاق ظاہر فرمایا تو بنامِ خدا تعالیٰ یہ رسالہ ۱۳۷۲ھ میں شائع کر دیا گیا۔

اس اشاعت کے بعد ہندوستان و پاکستان سے بعض علماء کی ایسی تحریریں وصول ہوئیں جن میں ''مکبر الصوت'' کی آواز کو متکلم کی آواز سے غیر، ایک مصنوعی آواز ثابت کیا گیا، میرے رسالہ میں عدمِ فسادِ کا حکم اگرچہ اس پر موقوف نہ تھا، بلکہ دوسری وجوہِ فقہیہ بھی لکھی تھیں، جن کی رُو سے غیرِ آوازِ متکلم ہونے کی صورت میں بھی فسادِ نماز کا حکم نہیں ہونا چاہئے، لیکن اُس وقت حکمِ فسادِ کی بنیاد ہی منہدم سمجھ کر اُن وجوہِ فقہیہ پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی، اب جبکہ بعض علماء نے اختلاف کا اظہار فرمایا، خصوصاً قاضی شمس الدین صاحب ہری پور ہزارہ نے خاص ماہرین صوتیات کی ایک مفصل تحریر ارسال فرمائی جس میں اس کا مصنوعی آواز ہونا ثابت کیا گیا، جس کو آخرِ رسالہ ضمیمہ ثانیہ میں پورا نقل کر دیا گیا ہے، نیز احقر کی لکھی ہوئی وجوہِ فقہیہ پر بھی تنقید فرمائی، اس لئے ضرورت پیش آئی کہ ان جزئیات پر تفصیلی بحث کی جائے، احقر نے اپنی ناچیز تحقیق وبصیرت کی حد تک اس کی تفصیل لکھ کر مولانا موصوف کے پاس بھیج دی، اس پر مولانا موصوف نے استدراکِ تحریر فرمایا، احقر نے مولانا کی تنقیدات سابقہ اور استدراکِ لاحق کا بغور مطالعہ کیا، جس سے کئی جگہ اپنی فرد گزاشت یا غلطی کا علم ہوا، اور کہیں کہیں عبارت کے اجمال وابہام سے شبہات پیدا ہوئے احقر نے مولانا موصوف کے شکریہ کے ساتھ ان اَغلاط واجمال کی اصلاح اصل

رسالے میں کردی، مگر ان میں سے اکثر لفظی اور جزوی مناقشات تھے، جن کا اثر اصل مسئلہ پر کچھ نہ تھا، بہر حال نفسِ مسئلہ میں اب بھی میری رائے نہیں بدلی، مزید احتیاط کے لئے احقر نے اپنی تحریر اور مولانا موصوف کی تمام تنقیدات اپنے دارالعلوم کراچی کے ایک ماہر فن محقق مدرّس مولانا مفتی رشید احمد صاحب کے سپرد کردی کہ سب پر غور کر کے مجھے رائے دیں، مولانا رشید احمد صاحب نے بھی چند جگہ لفظی تنقیدات تو تحریر فرمائیں جن کی اصلاح کردی گئی، مگر اصل مسئلہ میں ان کی رائے بھی احقر سے متفق اور وہی رہی جو رسالۂ مذکورہ میں شائع کی گئی تھی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

> نماز میں آلہ مکبّر الصوت کے استعمال میں بہت سے مفاسد ہیں، اس لئے اس سے اجتناب کیا جائے، اور سنّت کے سیدھے سادے طریقے پر آواز کو دور تک پہنچانے کے لئے مکبّر الصوت پر نماز ادا کرلی گئی تو نماز فاسد، واجب الاعادہ نہیں ہے، اور استعمال کرنے والوں کو کم از کم یہ لازم ہے کہ مکبّرین کا پورا انتظام رکھیں کیونکہ علماء کی ایک جماعت اس کو مفسد قرار دیتی ہے، اُن کے خلاف سے خروج کی فکر کرنا چاہئے۔

اس لئے اپنی قدرت واستطاعت کی حد تک بحث ونظر کر کے اب بھی احقر کی آخری رائے یہی ہے جو اُوپر مذکور ہوئی، اور مولانا قاضی شمس الدین صاحب کا شکر گزار ہوں کہ اپنی بصیرت افروز تحریرات سے بہت سی مفید معلومات عطا فرمائیں، آپ کی مرسلہ تحقیق متعلقہ آواز مکبّر الصوت کو ضمیمہ ثانیہ کا جزو بنا کر مکمل شائع کیا جاتا ہے، اور لفظی یا جزوی مناقشات اور اُن کے جوابات کو بخوفِ تطویل رسالہ کا جزو نہیں بنایا گیا۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان!

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا لْبَاطِلَ بَاطِلاً وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ.

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

یوم عرفہ ۱۳۸۱ھ

آلۂ مکبّر الصوت کے شرعی اَحکام

مقدّمہ میں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ آلہ اُن مصنوعات میں سے ہے جو جائز اور مباح کاموں میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور ناجائز وحرام میں بھی، اس لئے عام حالات میں جائز کاموں کے اندر اس کا استعمال جائز، اور ناجائز کاموں میں ناجائز ہے، لیکن یہ بحث ابھی باقی ہے کہ عبادات میں اس کا استعمال کیسا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے:۔

آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال عبادات میں

اس مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے چند اُمور سمجھ لینے ضروری ہے:۔

۱:۔ عبادات دو قسم کی ہیں، ایک عباداتِ مقصودہ اصلیہ، جن کی اصل وضع اور مشروعیت محض عبادت یعنی رضائے الٰہی کے لئے ہوئی ہے، اُن پر جو آثار وثمرات دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں وہ مقصودِ اصلی نہیں، بلکہ وہ خاص اعمال وافعال اور ان کے ادا کرنے کا وہ خاص طریقہ جو قرآن وحدیث میں منقول ہے، اور اُن کی خاص ہیئت وصورت جو سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ خود مقصود ہے، اگر ان اعمال وافعال کے جو خواص وثمرات ہیں، وہ کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل ہو جائیں، تب بھی اُن اعمال کا ترک جائز نہیں اور اعمال کرنے پر بالفرض وہ آثار مرتب نہ ہوں تو بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اعمال ضائع ہو گئے، مثلاً: روزہ کا مشہور فائدہ انسان کی بہیمی قوت کو توڑنا ہے، اگر کسی کو بلا روزہ یہ کیفیت حاصل ہو جائے تب بھی روزہ اس پر بدستور فرض رہے گا، اذان کی اصلی غرض محلّہ والوں کو نماز کیلئے جمع کرنا ہے، لیکن اگر کسی موقع پر سارے اہلِ محلّہ مسجد میں موجود ہوں پھر بھی اذان کا چھوڑ دینا جائز نہیں، اسی طرح خطبۂ جمعہ کا مشہور فائدہ مسلمانوں کو اَحکام شرعیہ کی تعلیم وتذکیر ہے، لیکن اگر کسی مجمع میں علماء فقہاء ہی ہوں جن کو سب اَحکام معلوم بھی

ہوں اور یاد بھی، خطبۂ جمعہ اس وقت بھی فرض ہے، اس کو چھوڑ دیں گے تو جمعہ ادا نہ ہوگا۔

دوسری قسم عبادات کی وہ ہے کہ جو کسی عبادت کا ذریعہ بن جانے کے سبب عبادت کہلاتی ہے، اپنی ذات میں عبادت نہیں، اس طرح کی عبادت کا نہ کوئی خاص طریقہ شریعت میں مقرر ہے، نہ کوئی خاص نوع، بلکہ دنیا کا ہر کام کھانا پینا، سونا جاگنا، زراعت، تجارت، صنعت کے کل کاروبار اگر ان کو ذرائعِ عبادت سمجھ کر (جیسا کہ حقیقت میں ذرائع ہیں) کیا جائے تو وہ سب اس دوسرے معنی میں عبادت کی فہرست میں آ جاتے ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ ان میں کوئی ایسی صورت اختیار نہ کی جائے جو شرعاً ناجائز ہو، اسی لئے اگر وہ عبادت ایک ذریعہ کے بجائے کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل ہو جائے تو اس کی ضرورت نہیں رہتی۔

مثلاً: حج ایک عبادتِ مقصودہ ہے، اس کا ایک خاص طریقہ اور خاص اعمال وارکان واجبات وسنن کی تفصیل کے ساتھ قرآن وحدیث میں مذکور ہیں، یہاں یہ اعمال وافعال خود مقصود ہیں، اُن پر مرتب ہونے والے ثمرات جو ایک بین الاقوامی اجتماع سے ہو سکتے ہیں، یا عشقِ الٰہی کا ایک مظاہرہ جو حج کے تمام اعمال وارکان میں مشاہد ہے، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس کو مقصود حج قرار دیا جا سکے، اسی لئے اگر یہ فوائد مکہ مکرمہ کے علاوہ کسی دوسرے شہر یا ملک میں یا ایامِ حج کے علاوہ دوسرے ایام میں اس خاص ہیئت کے علاوہ دوسری ہیئت میں حاصل ہو سکیں تو فریضۂ حج ساقط نہیں ہو سکتا۔

اسی لئے باجماع امت افعالِ حج کی جو صورت اور جو طریقہ شریعت میں منقول ہے، اسی کو ادا کرنا فرض وضروری ہے، ان میں کسی قسم کے تغیر، تبدل اور کمی بیشی کا کسی کو اختیار نہیں۔

لیکن اسی فریضۂ حج کے ساتھ کچھ اور اعمال وافعال بھی ہیں، جو عبادتِ مقصودہ نہیں بلکہ محض ذریعۂ عبادت ہونے کی وجہ سے عبادت سمجھے جاتے ہیں، مثلاً: حج کے لئے روپیہ جمع کرنا، ضروریاتِ سفر مہیا کرنا، اور آج کل بکنگ آفس میں جانا، وہاں کی ہدایات وشرائط کو

پورا کرنا، پھر ہوائی یا بحری جہاز پر سوار ہونا، جدہ پہنچنا، پھر وہاں سے سفر کا انتظام کر کے مکہ مکرمہ میں داخل ہونا، یہ سارے کام عبادات ہیں مگر عباداتِ مقصودہ نہیں، اسی لئے جو شخص مکہ مکرمہ میں موجود ہے یا کسی دوسرے شخص نے اس کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے کر اس کو بسہولت مکہ مکرمہ پہنچا دیا تو اس کے ذمہ ان تمام کاموں میں سے کوئی کام نہیں رہ جاتا، اس کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب تک یہ سارے کام کر کے نہ آؤ گے حج ہی نہ ہوگا، یا تمہارے حج میں کوئی نقصان رہے گا۔

اسی طرح نماز ایک عبادتِ مقصودہ ہے، اس کے لئے چل کر مسجد میں جانا بھی بوجہ ذریعۂ عبادت ہونے کے عبادت ہے، لیکن اگر کوئی شخص مسجد ہی کے حجرے میں رہتا ہے تو چل کر جانے کی عبادت غیر مقصودہ اس سے ساقط ہوگئی، کیونکہ اصل عبادت بغیر اس ذریعہ کے حاصل ہوگئی۔

عباداتِ مقصودہ و غیر مقصودہ میں فرق واضح ہو جانے کے بعد اب اُن کے متعلقہ اَحکامِ شرعیہ کا فرق سمجھئے۔

عباداتِ غیر مقصودہ یعنی ذرائعِ عبادت کے متعلق شریعت میں بڑی وسعت ہے، ان کا کوئی خاص طریقہ یا خاص وضع لازم و مقرر نہیں، ان میں کمی بیشی بھی کوئی جرم نہیں جبکہ اصل عبادت میں کمی بیشی نہ ہو، اور ان میں ضروریاتِ زمانہ و اختلاف مقام کی وجہ سے تغیر و تبدیل بھی کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ یہ تغیر خود کسی شرعی حکم کے خلاف نہ ہو۔

مثلاً: حج کے لئے سفر اُونٹوں کی سواری کے بجائے موٹر، ریل، ہوائی جہاز وغیرہ میں کیا جائے تو بلا کراہت درست ہے، اس کو بدعت نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ یہ سفر خود کوئی عبادت نہیں بلکہ عبادت حج کا ذریعہ ہے، علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاعتصام میں اسی مضمون کو بالفاظِ ذیل تحریر فرمایا:

لو كان ثم من يسير الى فريضة الحج طيرانا فى الهواء او مثيا على الماء لم يعد مبتدعا.

اسی طرح فریضۂ جہاد کے لئے تیر اور نیزوں کے بجائے آج رائفل اور توپ یا ٹینک اور بم استعمال کئے جائیں تو کوئی ممانعت نہیں بلکہ ضروری اور مستحسن ہیں، کیونکہ تیر چلانا خود کوئی عبادت نہیں، بلکہ عبادت جہاد کا ایک ذریعہ ہے، وہ ضرورتِ زمانہ کے اعتبار سے بدلا جاسکتا ہے۔

اسی مضمون کو بعض علماء و محققین نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے کہ حدیث میں ''اِحْدَاث فِی الدِّیْن'' یعنی دین میں کوئی نئی چیز پیدا کرنے کو بدعت قرار دیا گیا ہے، ''احداث للدین'' یعنی دین کی ضرورت کے لئے کوئی نیا ذریعہ پیدا کرنا اس میں داخل نہیں۔

یہ حکم عباداتِ غیر مقصودہ کا ہے جو اصل میں خود عبادت نہیں، بلکہ ذریعۂ عبادت ہونے کے سبب عبادت کہلاتی ہیں۔

اب عباداتِ مقصودہ کو لیجئے! تو ان کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے، یہاں جس طرح یہ عبادات خود مقصود ہیں اُن کی وہ ہیئت اور صورت بھی مقصود ہے جو شریعت میں بتلائی گئی ہے، ان ادنیٰ تغیر و تبدل بھی اپنی رائے سے جائز نہیں، ان میں جس طرح کوتاہی و کمی حرام ہے اسی طرح زیادتی و اضافہ بھی حرام ہے، ظہر کی نماز کی جیسے چار کے بجائے تین رکعت پڑھنا جرم ہے، اسی طرح پانچ پڑھنا بھی جرمِ عظیم ہے، پھر رکعات کی کمی بیشی ہی پر نہیں اُن کی شکل و صورت، ترتیب وغیرہ میں بھی ادنیٰ تغیر کرنے کی اجازت نہیں، قیام وقعود، رکوع و سجود کی ہیئت جو سنت سے ثابت ہے اس کے خلاف کرنا جرم ہے۔

حج ہی کو لیجئے کہ سفرِ حج میں تو یہ توسّع ہے کہ چاہے پیدل کرلے چاہے سواری پر، اور اُونٹ پر سوار ہوکر یا موٹر پر یا ہوائی جہاز پر، لیکن ارکانِ حج کی ادائیگی مثلاً: طواف و سعی میں یہ آزادی نہیں کہ جس کا جی چاہے بجائے پیدل طواف کرنے کے طیارہ میں بیٹھ کر بیت اللہ کے گرد طواف کرے، یا صفا و مروہ کے درمیان سعی کرلیا کرے، بلکہ ارکانِ حج میں بلا عذرِ

شرعی ایسا کرنا درست نہیں۔

آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال عباداتِ غیر مقصودہ میں

مذکورہ الصدر تفصیل کے بعد اُصول شرعیہ کے ماتحت یہ معلوم کر لینا کچھ مشکل نہ رہا کہ عباداتِ غیر مقصودہ، وعظ، تقریر، درس و تدریس وغیرہ میں آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال ایسا ہی جائز ہے جیسے سفرِ حج میں موٹر و ہوائی جہاز کا یا جہاد میں ٹینک اور بم کا، اب بحث طلب چیز یہ رہ جاتی ہے کہ عباداتِ مقصودہ میں اس قسم کے آلات کا استعمال کیسا ہے، اور ظاہر ہے کہ عباداتِ مقصودہ میں نماز ہی ایسی عبادت ہے جس میں آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال کا سوال پیدا ہو سکتا ہے، روزہ اور زکوٰۃ یا حج کے کسی رُکن میں اس آلے کے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے اس پر نظر کرنا ہے، اور در حقیقت محلِ بحث و نظر اور تصنیفِ رسالہ کا اصل مقصد اسی مسئلہ کا بیان کرنا ہے، اس لئے اس کو ذرا وضاحت اور تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

آلہ مکبّر الصوت کا استعمال نماز میں

ظاہر ہے کہ یہ آلہ ایک نئی ایجاد ہے، عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم و خلافتِ راشدہ میں اس کا وجود نہ تھا، اس لئے اس مسئلہ کا حکم صریح الفاظ میں جواز یا عدمِ جواز کا قرآن و حدیث میں نہیں مل سکتا، اُصول و قواعدِ شرعیہ کی رُو سے ہی اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

عباداتِ مقصودہ سے متعلق اُصول شرعیہ میں غور کرنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عبادات کا مدار سادگی، بے تکلفی، یسر و سہولت پر رکھا گیا ہے جس میں ہر طبقہ کے مسلمان لکھے پڑھے اور جاہل، شہری اور دیہاتی، غریب اور امیر، ہر زمانے اور ہر خطے پر یہ عبادت یکسانیت و مساوات کے ساتھ بسہولت ادا کر سکیں، یہی وجہ ہے کہ عبادات کی ادائیگی میں زیادہ تر قدرتی اور فطری چیزوں سے کام لیا گیا ہے، جن میں انسانی صنعت کا کوئی دخل نہیں، فلسفہ اور ریاضی یا ہیئت و سائنس کی فنی تدقیقات یا اُن کے متعلق قدیم و جدید

آلات پر کسی اسلامی عبادت کا مدار نہیں رکھا گیا، بلکہ ادائے عبادات کے لئے ان بحثوں میں اُلجھنے کو پسند بھی کیا گیا۔

نماز کے لئے اوقات کا تعین اسلام میں ایک اہم چیز ہے، نماز کے جواز و فساد، کراہت وفضیلت کا اس پر مدار ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان واقعات کا تعین اور سردی گرمی میں اُن کا تغیر یا مقامات کے اختلافات سے اُن میں تفاوت یہ فنِ ریاضی کا مسئلہ ہے، جنتری بنانے کے اُصول پر اُن کو ہر زمانے اور ہر جگہ کے لئے حساب کر کے متعین کیا جا سکتا ہے، اور اس فن کے ماہرین عہدِ رسالت اور مابعد میں بکثرت موجود بھی تھے، لیکن شریعت اسلام نے ان سب چیزوں سے قطع نظر کر کے اوقاتِ نماز کے تعین کا مدار طلوع وغروبِ آفتاب اور اس کے سایہ سے گھٹنے بڑھنے پر رکھا ہے، جو محسوسات ومشاہدات سے ہے، ہر جاہل گنوار یا لکھا پڑھا، گھڑی گھنٹے والے متمدن شہری اور بے سروسامان اور غریب دیہاتی، ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس کو بغیر کسی حساب کے پہچان سکتا ہے۔

اسی طرح رُویتِ ہلال کا مسئلہ جس پر بہت سے اَحکامِ شرعیہ روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ موقوف ہیں یہ بھی ریاضی کا مسئلہ ہے، اس کے مقررہ اُصول وضوابط سے اس کو منضبط کیا جا سکتا ہے، لیکن رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس سے ہٹا کر صرف مشاہدے اور رُویت پر اس کا مدار رکھ دیا، فرمایا:-

صُومُوا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاَتِمُّوْا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلٰثِيْنَ.

چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور دیکھ کر ہی افطار کرو، اگر کسی وجہ سے چاند مشتبہ ہو جائے یا نظر نہ آئے تو شعبان کے تیس دن پورے کر کے ماہِ شعبان کو ختم کر کے رمضان کو شروع سمجھا جائے۔

اسی طرح مکہ معظمہ سے دور ممالک میں سمتِ قبلہ کا استخراج فنِ اصطرلاب کا مسئلہ

بن جاتا ہے، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اپنے قول اور عمل سے یہ واضح کر دیا کہ اس میں بھی حسابی تدقیق میں پڑنے کی ضرورت نہیں، بلکہ سادہ طور پر بغیر طولِ بلد اور عرضِ بلد کا حساب کئے ہوئے بستی کی قریبی مساجد سے ایک اندازہ قائم کر کے دوسری مساجد بنائی جائیں، اسی طرح ایک بستی سے دوسری قریبی بستی میں مساجد کا سلسلہ جاری کیا جائے، یا مشرق و مغرب، شمال و جنوب، کی جہت متعین کر کے طلوع و غروب وغیرہ علاماتِ ظاہرہ سے سمت متعین کر لی جائے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب ممالکِ عجم کو فتح کیا، تو اسی سادہ طریق پر مساجد کی بنیاد ڈالی، کہیں منقول نہیں کہ ماہرین ریاضی واصطرلاب سے اس میں مدد لی گئی ہو۔

اور یہ اس بناء پر نہیں کہ اُس زمانے میں فنِ ریاضی، اصطرلاب، ہیئت کا رواج نہ تھا، یا جاننے والے نہ تھے، بلکہ ان فنون کے ماہرین کے موجود ہوتے ہوئے فلسفیانہ تدقیقات کو اسلامی یسر و سہولت اور عوام کے مذاق پر ایک بار سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

نماز کے وقت اہلِ محلّہ یا اہلِ بستی کو جمع کرنے اور جماعت کے وقت کی اطلاع دینے کے لئے بہت سے آلات موجود تھے، جو بظاہر اذان کے کلمات پکارنے سے زیادہ بہتر صورت میں اس ضرورت کو پورا کر سکتے تھے، مثلاً: گھنٹہ بجا دینا وغیرہ، اور اس قسم کی چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی پیش کی گئیں، مگر پیغمبر اسلامؐ نے کسی کو پسند نہ فرمایا، اللہ تعالیٰ نے فرشتے کے ذریعے اذان کے کلمات کی تلقین فرما دی، وہی ہمیشہ کے لئے سنت بن گئے، اور آج بھی قسم قسم کے گھڑی گھنٹے، لاؤڈ اسپیکر، ریڈیو، ٹیلی فون وغیرہ خبر رسانی اور اطلاع کے لئے سینکڑوں آلات ایجاد ہونے کے باوجود باجماعِ اہلِ اسلام نماز کے لئے اذان ہی مسنون صورت ہے، صرف جنتری کے اوقات اور گھنٹہ منٹ کی مقرر کردہ تعین کو اذان کی جگہ نہیں دی جا سکتی، اور نہ کوئی مسلمان اُس کو قبول کر سکتا ہے، کہ مؤذن اپنے حجرے میں بیٹھ کر مائیکروفون پر اذان کے کلمات کہہ دے، اور اس کے ہارن مسجد کے

میناروں پر لگا دے جن سے آواز سب جگہ پہنچ جائے، بلکہ دین کی ادنیٰ فہم رکھنے والا بھی اذان کی مسنون ہیئت کو ترک کرنا گوارا نہیں کرے گا۔

جہری نمازوں میں امام کی قراءت مقتدیوں کو سنانا مقصود ہے، اسی لئے امام کو حاضرین کی تعداد کے اندازہ پر اپنی متوسط طاقت کے ساتھ آواز بلند کرنے کا حکم بھی ہے، اگر چہ آخر صفوف تک آواز پہنچانا نہ ضروری ہے، نہ امام کے ذمہ لازم ہے، جیسا آگے آتا ہے، ہاں امام کی تکبیراتِ انتقالیہ کا آخری صفوف تک پہنچانا ضروری ہے، تاکہ پچھلی صفوف کے نمازی امام کے ساتھ نقل وحرکت کر سکیں، اور اسی لئے جب نمازیوں کی صفیں دُور تک پہنچ جائیں تو درمیانی صفوف میں مکبّر کھڑے کرنا ضروری ہیں، جو امام کی تکبیرات کے وقت بلند آواز سے تکبیرات کہہ کر پچھلی صفوف کو باخبر کردیں، یہ طریقہ عہدِ رسالتؐ سے آج تک چلا آیا ہے، اور اُمّت اسی پر عمل کرتی رہی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت ایجاد ہونے کے بعد اس ضرورت کو قدیم طریقۂ مسنونہ کے بجائے اس آلہ کے ذریعہ پورا کرنا شریعت کی نظر میں بہتر ہوگا یا قدیم سنتِ مسلوکہ کے مطابق عمل کرتے رہنا پسندیدہ سمجھا جائے گا؟

نماز میں آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال کے مفاسد

ا:۔ مذکورہ الصدر اُصولِ اسلام کا مجریٰ یہ ہے کہ نماز جیسی عباداتِ مقصودہ کو اس قسم کے آلات کے استعمال سے علیحدہ رکھنا اور قدیم طریقۂ مسنونہ پر قائم رہنا ہی بہتر ہے۔

علاوہ ازیں نماز میں آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال میں اگر ایک طرف آواز پہنچانے کی آسانی ہے تو دوسری طرف مختلف قسم کی خرابیاں اور مفاسد بھی ہیں، مثلاً:

۲:۔ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ یہ آلہ فیل ہوجاتا ہے، کبھی خود آلہ کے خراب ہوجانے کی وجہ سے، کبھی کنکشن قطع ہوجانے سے، کبھی دوسرے اسباب سے وعظ وتقریر کے دوران

میں، تو ایسے وقت ایک طرف چند منٹ کے لئے تقریر بند کردی جاتی ہے اور دوسری طرف اس کے درست کرنے والے دوڑتے ہیں، درست کرلیا جاتا ہے، لیکن اگر نماز میں اس آلہ کا استعمال ہو تو مسجد میں سب مسلمان شریک نماز ہوں گے، آلہ کے درستی کی فکر کون کرے؟ اور کس طرح کرے؟ اور بالفرض کوئی انتظام درست کرنے کا رکھ بھی لیا جائے تو جب تک آلہ کام کرنے لگے اس وقت تک نماز کو درمیان میں ملتوی تو نہیں کیا جاسکتا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تکبیرات انتقالیہ کے آخری صفوں میں ملتوی تو نہیں کیا جاسکتا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تکبیرات انتقالیہ کے آخری صفوں تک پہنچانے کا انتظام بذریعہ لاؤڈ اسپیکر کرلیا جاتا ہے تو درمیانی مکبّرین کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، اور کہیں احتیاطاً مکبّرین کا تقرر کر بھی دیا جائے تو عادۃً مکبّرین سب آلہ مکبّر الصوت کے اعتماد پر بے فکر ہوتے ہیں، جب تک وہ اس سے باخبر ہوں کہ یہ آلہ فیل ہوگیا ہے، اس وقت تک کئی تکبیریں اور ارکانِ نماز ہو چکتے ہیں۔

اِن حالات میں ظاہر ہے کہ پچھلی صفوف کے نمازیوں کا کیا حال ہوگا کہ امام سجدے میں ایک مقتدی رکوع میں، ایک قیام میں، ایسی گڑبڑ پھیلتی ہے کہ عموماً لوگوں کی نماز فاسد ہو کر رہتی ہے۔

۱۳۷۰ھ و ۱۳۷۱ھ میں احقر کو خود مسجدِ نبویؐ میں اس کا مشاہدہ ہوا کہ مختلف نمازوں میں بار بار یہ آلہ فیل ہوگیا، اور ایامِ حج کے عوام کا ہجوم جو شریک نماز تھا اس نے کیا کیا حرکتیں کیں؟ اور کس کس طرح لوگوں کی نمازیں فاسد ہوئیں؟ یہ سب حاضرین دیکھ رہے تھے۔

آج کل کے دانایانِ یورپ ایک سطحی نظر اور عجلت پسند مذاق رکھتے ہیں، کسی چیز کا ایک فائدہ سامنے آتا ہے تو اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں، اس کی تہہ میں دوسرے نقصانات کیا کیا ہیں؟ اس سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں، اور ہمارا تعلیم یافتہ روشن خیال طبقہ، ابھی تک اس کی نقالی سے آزاد نہیں ہوا، حقائق پر پیغمبرانہ گہری نظر اور منافع ومضار کے مجموعہ کے دیکھنے کے بعد کسی چیز کے متعلق فیصلہ جو مسلمان کو شیوہ ہونا چاہئے، آج ہم اس کو ہاتھ سے

کھو چکے ہیں، اسی لئے ہمارے نوجوانوں کا اصرار ہے کہ جب یہ آلہ ایجاد ہو گیا اور ہماری نمازوں میں اس سے ایک سہولت پیدا ہو سکتی ہے تو کیوں نہ اس سے کام لیا جائے؟ لیکن ذرا غور کریں کہ:۔

الف:۔ کوئی مسلمان یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ نماز کے لئے یہ آلہ ضروری ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، اور نہ کوئی مسلمان اس کی جرأت کرے گا کہ تیرہ سو برس کے تمام مسلمانوں کی نماز کو فاسد قرار دے۔

ب:۔ کوئی سمجھدار مسلمان اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتا کہ آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال سے نماز میں زیادتی، ثواب یا افضلیت کا دعویٰ کرے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اور تمام اُمتِ ماضیہ کی نمازیں اس افضلیت و ثواب سے خالی تھیں، مکبّر الصوت کے موجدین نے اسلام پر یہ احسان کیا کہ تیرہ سو برس کے بعد نماز کا ثواب مکمل ہوا۔

ج:۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس آلہ کے ذریعہ انتظام جماعت بہ نسبت اقامتِ مکبّرین کے ایک سہولت پیدا کر دیتا ہے۔

د:۔ لیکن اس سہولت کے مقابلے میں اگر دوسری خرابیوں سے قطعِ نظر اسی ایک مفسدہ پر نظر کی جائے کہ عین نماز میں یہ آلہ فیل ہو جائے تو سینکڑوں مسلمانوں کی نماز خراب ہو جائے گی، اور عوام کے مجمع میں بکثرت ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ نماز فاسد ہو گئی، اس کا اعادہ کرنا چاہئے، بعضے بے فکرے بھی ہوتے ہیں کہ جاننے کے باوجود پھر قضا کا اہتمام نہیں کرتے، تو اس موہومہ سہولت کے لئے اس جیسے مفسدہ کو گوارا کرنا کیا کوئی دانشمندانہ فعل ہو گا؟

۳:۔ یہ بات کسی مسلمان پر مخفی نہیں کہ نماز میں خشوع وخضوع کی بڑی تاکید قرآن وحدیث میں وارد ہے، اور درحقیقت وہی روحِ نماز ہے، نماز کے بہت سے آداب وسنن

محض تحصیلِ خشوع ہی کے لئے ہیں، اور بہت سے چیزیں اس لئے نماز میں مکروہ ہیں کہ وہ خشوع کے خلاف ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق تو یہ ہے کہ خشوع نماز کے اَرکان میں سے ہے، امام حدیث ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اس پر ایک مستقل رسالہ "الخشوع فی الصلوٰۃ" تصنیف فرمایا ہے۔

تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہے کہ اکثر اوقات آلۂ مکبّر الصوت کا نماز میں استعمال خشوع کو فوت کر دیتا ہے، جبکہ امام کو یہ فکر رہے کہ اس کی آواز مائیکروفون پر پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ خصوصاً رکوع وسجود کی حالت میں کہ مائیکروفون امام کے مواجہ میں نہیں رہتا بجز اس کے کہ دو مائیکروفون رکھے جائیں، ایک اونچا جو کھڑے ہونے کے وقت امام کی آواز کو لے سکے، دوسرا نیچے زمین پر جو سجدہ اور قعود کی حالت میں آواز کو پکڑ سکے، یا اتنا تیز اور اعلیٰ قسم کا مائیکروفون جو ہر حالت میں امام کی آواز کو پکڑ لے۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ عام مساجد میں نہ اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ نہ ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں یا تو امام اس کا اہتمام رکھے کہ ہر کلمہ مائیکروفون کی طرف منہ کر کے کہے تو نماز کا خشوع برباد ہوا یا اور اگر ایسا نہ کیا تو بعض تکبیرات تو پچھلی صفوں کو پہنچیں گی، بعض نہ پہنچیں گی، اس صورت میں پچھلی صفوں کی نماز میں خلل آئے گا۔

۴:۔ایک بڑی بات قابلِ غور یہ بھی ہے کہ عام اسلامی عبادات میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ ہر طبقے اور ہر حیثیت کے مسلمان عبادت کو یکسانیت اور مساوات کے ساتھ ادا کر سکیں، حج میں خصوصیت کے ساتھ اس وحدت کا مظاہرہ ہے، اسی لئے لباسِ اِحرام وہ تجویز کیا گیا ہے جو ہر غریب وامیر یکساں حاصل کر سکے۔

اگر نمازوں میں لاؤڈاسپیکر کا رواج ہو اور اس کو مستحسن سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ پیسے والے ہی اس کا انتظام کرسکیں گے، غریب بیچارے اپنی نماز میں بھی امیر سے پیچھے رہیں گے، کوئی مسجد امیر کہلائے گی کوئی غریب، اور عین نماز میں جس کی بڑی حکمت شاہ وگدا کو

ایک صف میں کھڑا کر دینا تھا اس میں بھی امیر و غریب کی تفریق نظر آنے لگے گی۔

۵:۔ ایک اور بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ کسی جگہ قریب قریب میں دو یا دو سے زائد مسجدیں ہیں، اور ہر مسجد میں نماز مکبّر الصوت پر ہو رہی ہے، تو ایک مسجد کے امام کی آواز دوسری مسجد کے امام کی آواز سے ٹکرائے گی، اور بعض اوقات تکبیراتِ انتقالیہ میں یہ التباس پیش آئے گا کہ یہ "اللہ اکبر" ہمارے امام نے کہا ہے یا دوسری مسجد کے امام نے؟ اور یہ محض احتمالی یا موہوم مفسدے نہیں بلکہ ایک پیش آیا ہوا حادثہ ہے۔

کراچی میں احقر جس مسجد میں نماز پڑھتا ہے، باب الاسلام کہلاتی ہے، اس سے کچھ فاصلے پر آرام باغ کے مغربی گوشے میں ایک جماعت ہوا کرتی ہے، دونوں جگہ جمعہ ہوتا ہے، ہر ہفتے ان میں یہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ باب الاسلام میں نماز جمعہ پہلے شروع ہو جاتی ہے اور آرام باغ میں ابھی خطبہ سے پہلے کی تقریر یا خطبہ ہوتا ہے، مسجد باب الاسلام کے نمازیوں سے پوچھئے کہ اُن پر کیا گزرتی ہے؟ ایک طرف اپنا امام قراءت کر رہا ہے، دوسری طرف سے کہیں اشعار، کہیں وعظ یا خطبہ کی آواز اس سے ٹکرا رہی ہے، خصوصاً جب ہوا تیز ہوتی ہے تو امام کی قراءت پر دوسری آواز غالب آ جاتی ہے، وہ تو شکر کا مقام ہے کہ دونوں جگہوں میں صرف تقریر و خطبہ آلۂ مکبّر الصوت پر ہوتا ہے، نماز میں دونوں جگہ اس کا استعمال نہیں ہوتا، اور پھر نماز کے اوقات آگے پیچھے ہیں، ورنہ آواز کے تصادم اور التباس سے شاید دونوں جگہ میں سے کسی کی بھی نماز نہ ہوتی، اسی مسجد میں رمضان المبارک میں صبح کی نماز ذرا جلدی ہو جاتی ہے، یہاں سے کافی فاصلے پر اسلم روڈ کی ایک مسجد میں اس وقت کوئی مولوی صاحب وعظ و بیان کرتے ہیں، اور ستم یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کے بمبو منارے کے اوپر لگائے ہوئے ہیں، سناٹے کا وقت ہوتا ہے، وہ پوری آواز اس مسجد میں آتی ہے، اور بارہا یہ نوبت آئی کہ ہمارے امام کی آواز پر غالب آ کر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ امام کیا پڑھ رہا ہے؟ یہ اُس حالت میں ہے کہ اُس طرف تقریر اور اس طرف نماز ہوتی ہے، جس میں امتیاز کچھ دشوار

نہیں، اگر دونوں جگہ نماز اسی آلہ پر ہوتی اور بیک وقت ہوتی تو یقیناً اس قدر التباس پیش آتا کہ شاید کسی جگہ کے نمازیوں کی نماز صحیح نہ ہوتی۔

مسجد باب الاسلام اور آرام باغ تو قریب قریب ہیں، یہ مسجد کافی فاصلہ پر ہونے کے باوجود تصادمِ اصوات کی یہ آفت ہے، اگر کہا جائے کہ اس میں آلہ مکبّر الصوت کا قصور نہیں، اس کے بے جا استعمال کا قصور ہے کہ بمبوا تنے اونچے یا اس طرح لگائے کہ آواز باہر پھیلے، انتظام کیا جائے تو اس مفسدہ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ بات اگرچہ اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن جب عام مسلمانوں میں یہ احساس مکمل ہو اور ہر مسجد والے اس کی فکر کریں کہ دوسری مسجد والوں کو ہماری آواز سے تشویش نہ ہو، مگر آج کل مسلمانوں کے جو حالات ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں، مذکور الصدر مساجد کے معاملہ میں ان مساجد کے منتظمین کو بار بار توجہ دلانے اور عرض کرنے کے باوجود نتیجہ کچھ نہ نکلا، بلکہ بار بار توجہ دلانے سے تلخی بڑھ جانے کا اندیشہ ہو گیا، اس لئے صبر کیا گیا۔

یہ جو واقعات ہم پر گزرے ہیں اگر خدانخواستہ اس آلہ کے استعمال فی الصلوٰۃ کا رواج عام ہو گیا تو بہت سے محلوں میں مسجدیں اتنی اتنی قریب ہیں کہ وہاں دو یا زیادہ مساجد کی آوازیں بالکل گڈمڈ ہو کر ایک عجیب تماشا بن جائیں گی، اور یہ جدّت پسندی اور روشنی طبع بلائے جان بن جائے گی۔

مذکور الصدر مفاسد اور بالخصوص مفسدہ نمبر ۲ ایسے ہیں کہ ایک طرف اُن پر نظر کی جائے اور دوسری طرف صرف یہ فائدہ کہ امام کی قراءت آخری صفوف تک سنی جائے گی، جو شرعاً نہ ضروری ہے اور نہ اُس کے نہ سننے سے کسی کی نماز میں ادنیٰ کراہت کا خطرہ ہے، یا یہ کہ تکبیراتِ انتقالیہ کے آخری صفوں تک پہنچانے کا انتظام بہ نسبت مکبّرین کے اس آلہ کے ذریعہ آسان ہے۔

ان مفاسدِ کثیرہ اور ایک فائدہ کا مقابلہ کر کے دیکھیں تو کوئی سمجھدار انسان اس کے

نماز میں استعمال کو مستحسن نہیں کہہ سکتا، کسی چیز کے مفاسد سے قطع نظر کر کے اس کے سطحی فائدے کو دیکھنا اور اس کے پیچھے پڑ جانا کسی دانشمند کا کام نہیں ہوسکتا۔

٦:۔ فقہاء کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں ائمہ مجتہدین یا علماء میں اختلاف ہو تو مقتضائے احتیاط یہ ہے کہ خروج عن الخلاف کی کوشش کی جائے، یعنی عمل میں جہاں تک ممکن ہو ایسی صورت اختیار کی جائے جو کسی کے نزدیک فاسد نہ قرار پائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے تمام اعمال میں اس کی رعایت فرماتے تھے، اور دوسروں کو بھی مشورہ دیتے تھے، مسئلہ مکبّر الصوت میں اگرچہ ہماری تحقیق و تفتیش کا نتیجہ یہی ہوا کہ نماز فاسد نہیں، لیکن بہرحال بہت سے علماء کی تحقیق اور ان کا فتویٰ آج بھی یہ ہے کہ یہ اصلی آواز نہیں اور نماز میں اس کا اتباع مفسدِ نماز ہے تو مسلمہ قاعدہ فقہیہ کا مقتضا یہ ہے کہ ایسی چیز سے اجتناب کیا جائے جس میں بعض علماءِ حق فسادِ نماز کا حکم کرتے ہوں، تاکہ ہماری نماز فساد کے شبہ میں نہ پڑے۔ (بدائع الصنائع)

خلاصۂ کلام

یہ ہے کہ قواعدِ اُصولِ شرعیہ و عقلیہ کا مقتضا اس معاملہ میں یہ معلوم ہوتا ہے...... واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم...... کہ آلہ مکبّر الصوت کا استعمال نمازوں میں درست و مناسب نہیں، اس سے اجتناب کرنا چاہئے، سادہ طریقۂ مسنونہ کے ساتھ بڑی جماعتوں میں مکبّرین کے ذریعہ تکبیراتِ انتقالیہ کی آواز آخری صفوف تک پہنچائی جائے، یہی جامعِ خیرات و برکات اور مفاسد سے پاک طریقہ ہے، اسی کو اختیار کرنا چاہئے۔

البتہ اس طریقہ کو عام لوگوں کی بدانتظامی نے خراب کر رکھا ہے کہ اکثر جماعتوں میں مکبّرین کا پہلے سے انتظام نہیں کیا جاتا، جس کا جی چاہے تکبیر کہنے لگتا ہے، کسی صف میں ایک سے زیادہ بولتے ہیں، کوئی صف بالکل خالی رہتی ہے، بعض جگہ بچے تکبیرات بے موقع پکارنے لگتے ہیں، جس سے نماز میں خلل آتا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ نماز سے پہلے ہر

تین چار صف کے بعد صف کے داہنے بازو پر دو مکبّر مقرر کردیئے جائیں اور باقی تمام نمازیوں کو ہدایت کردی جائے کہ اور کوئی صاحب تکبیر نہ پکاریں، جتنا اہتمام آلہ مکبّر الصوت کے لئے کیا جاتا ہے، اگر اس کا تہائی، چوتھائی اہتمام مکبّرین کے تقرر میں کرلیا جائے تو بہترین نظم اور سکون کے ساتھ نماز ادا ہو جائے۔ واللّٰہ الموفق للسّداد وبیدہ المبدأ والمعاد

اب ایک اہم مسئلہ غور طلب باقی رہ گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی مجبوری سے جیسے حجاج کو آج کل حرمین میں پیش آتی ہے یا ناواقفیت یا محض اپنی رائے سے لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھ لی، تو اس کی نماز ہوگئی یا فاسد واجب الاعادہ ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف شروع سے ہے، اس لئے زیادہ محلِ بحث ونظر ہے، اس کو تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ واللّٰہ ولی التوفیق!

کیا مکبّر الصوت کی آواز پر نماز ادا کرنا مفسدِ نماز ہے؟

بلاشبہ قرآن مجید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات قیامت تک پیش آنے والی تمام ضروریاتِ ملت پر حاوی اور سب کے لئے کفیل ہیں، دنیا میں کتنے ہی انقلاب آئیں، سائنس کتنی ہی ترقیاں کرلے، آلات نئے سے نئے ایجاد ہوں، اُن کی وجہ سے کتنے ہی مسائل پیدا ہوں، قرآن وحدیث کی رُو سے فقہائے کرامؒ کے بتلائے ہوئے اُصول ان سب کے جواب پر حاوی ہیں، اب اہل فتویٰ علماء کا کام یہ رہ جاتا ہے کہ پیش آنے والے نئے مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ کر ان اصولِ مسلمہ سے اُن کا جواب نکالا جائے، موجودہ مسئلہ کسی اصول کے تحت میں داخل کرنے اور اس کا حکم نکالنے ہی میں فکر ونظر اور تفقہ کی ضرورت پیش آتی ہے، اس لئے اس میں رایوں کا اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔

نماز میں آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال کا سوال جب زیرِ بحث آیا تو انہی وجوہِ مذکورہ کی بنا پر اس میں علماء کی رائیں مختلف ہوگئیں، بعض نے جوازِ کا فتویٰ دیا، بعض نے فسادِ نماز کا، دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرّس حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہم نے

فتویٰ فسادِ نماز کا تحریر فرمایا، جس کا مبنیٰ مندرجہ ذیل اُمور تھے:۔

ا:۔ نماز میں کسی ایسے شخص کی آواز کا اتباع کرنا جو داخلِ نماز نہ ہو مفسدِ نماز ہے۔ اس لئے اگر کسی جگہ امام کو سہو ہو اور کوئی ایسا شخص جو امام کے ساتھ جماعت میں شریک نہیں لقمہ دے دے تو امام کو اس کا لقمہ لینا جائز نہیں اگر لے لیا تو نماز فاسد ہو جاتی ہے (شامی وغیرہ کتبِ فقہ میں اس کی تصریح ہے)۔

۲:۔ جو آدمی شریکِ نماز بھی ہو اور امام کی آواز دُور کے مقتدیوں تک پہنچانے کے لئے تکبیر بآواز بلند کہہ رہا ہو، اس کے لئے بھی فقہاء نے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اپنی تکبیر سے نیت تکبیر تحریمہ اور عبادت کی کرے، اور اگر محض دوسروں کو آواز پہنچانے کی نیت سے تکبیر پکار دی تو نہ اس کی نماز ہوگی اور نہ اُن مقتدیوں کی جو اس کی آواز پر نماز ادا کر رہے ہیں، علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ردالمحتار میں اس کی پوری وضاحت فرمائی ہے، اور دوسرے فقہاء نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

۳:۔ آلۂ مکبّر الصوت سے نکلی ہوئی آواز بعینہٖ امام کی آواز نہیں، بلکہ صدائے بازگشت کی طرح ہے، اور حضراتِ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ صدائے بازگشت کو اس آدمی کی اصل آواز نہیں کہا جا سکتا جس کی یہ بازگشت ہے، اسی لئے اگر کوئی شخص آیتِ سجدہ کی تلاوت کسی گنبد یا پہاڑ وغیرہ میں کرے اور دوسرا آدمی اس کی اصلی آواز نہ سنے، لیکن گنبد وغیرہ سے جو اس کی بازگشت ہو وہ صدائے بازگشت اس کے کان میں پڑ جائے تو اس پر سجدہ تلاوت لازم نہیں آتا، کیونکہ سجدۂ تلاوت واجب ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ آیتِ سجدہ کی تلاوت کسی مکلّف انسان کی زبان سے سنیں، اور بازگشت کی آواز انسانِ مکلّف کی آواز نہیں، اس لئے سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔

۴:۔ مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر آلۂ مکبّر الصوت کی آواز بھی چونکہ اصل امام کی آواز نہیں بلکہ صدائے بازگشت کی طرح ہے، اور یہ آلہ نہ انسان کی طرح مکلّف ہے، نہ نماز میں

داخل ہے، نہ کسی عبادت یا تحریمۂ نماز کے قصد و نیت کا اس آلہ کے متعلق کوئی سوال واحتمال ہو سکتا ہے، اس لئے اس کی آواز سے نماز میں استفادہ کرنا اور نماز کی نقل و حرکت میں اس کا اتباع کرنا مفسدِ نماز ہے۔

دارالعلوم کا یہ فتویٰ سیّدی وسندی حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے پاس بھیجا گیا، تو اگرچہ نماز میں اس آلہ کے استعمال کی ممانعت کا فتویٰ آپ پہلے بھی دے چکے تھے، لیکن استعمال کی صورت میں سرے سے نماز ہی فاسد ہو جائے، یہ حکم اس فتویٰ کی موافقت میں اب دیا گیا، جس کے الفاظ بعنوان ''رأی الاحقر فی ہذا الجواب'' حسبِ ذیل ہے:۔

> اگر ثابت ہو جائے کہ اس آلہ سے عینِ صوت بلند نہیں ہو جاتی، بلکہ گونجنے اور ٹکرانے سے اس کی حکایت پہنچ جاتی ہے تو صواب منحصر فی الجواب ہے (یعنی فسادِ نماز) اور مظنون یہی ہے، اور کسی ماہرِ سائنس کی تحقیق سے یہ ظن درجۂ یقین تک پہنچ سکتا ہے، اور اگر ثابت ہو جائے کہ یہ عین صوت بلند ہو جاتی ہے تو اس صورت میں حکم وہ ہے جو احقر نے اپنے جواب میں عرض کیا ہے، (یعنی اس آلہ کو نماز میں استعمال سے بوجہ مفاسد ترک و منع کا حکم کیا جائے، لیکن اگر کوئی پڑھ لے تو نماز کے فساد کا حکم نہ ہو) اور اگر دونوں احتمال علی السواء ہوں تو پھر بھی جواب وہی ہے، جو حضرت مجیب مصیب سلمہ اللہ الرقیب نے تحریر فرمایا ہے (یعنی فسادِ نماز)، مگر توجیہ مختلف یہ ہے کہ عینِ صوت کا عدمِ بلوغ الی البعید پہلے سے متیقن ہے، اور اب اس میں شک واقع ہو گیا اور ''الیقین لا یزول بالشک'' اس لئے عدمِ بلوغ کا حکم کر کے اس صوت کو مثل صدیٰ کے حکم دیا جائے گا۔
>
> اشرف علی تھانہ بھون، ۵؍ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ۔

پھر چونکہ اس فتوے کا مرجع اصلی یہ تھا کہ آلہ کے ذریعے دور تک پہنچنے والی آواز کو

اصل امام کی آواز قرار نہ دیا جائے، بلکہ صدائے بازگشت کی طرح سمجھا جاوے، اسی تصور کی بنیاد پر آلۂ مکبّر الصوت کی اتباع کو مفسدِ نماز لکھا گیا تھا، لیکن خود یہ مسئلہ کہ یہ آواز امام کی اصلی آواز ہے یا صدائے بازگشت کی طرح اس آواز کی شبیہ ہے؟ فنی طور پر محتاجِ تحقیق تھا، اس لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت جن اداروں یا ماہرینِ فن سے اس مسئلہ کی تحقیق ہوسکتی تھی، اُن کو خطوط لکھے، تین جگہوں سے جوابات آئے، مگر ان جوابوں میں اختلاف تھا۔

ایک (۱) میں آلہ کے ذریعہ پہنچنے والی آواز کو امام ہی کی آواز بعینہ اصلی آواز قرار دینے پر جزم ویقین کے ساتھ تصریح کی گئی، دوسرے (۲) میں اس کے خلاف آواز کی نقل و حکایت ہونے کی تصریح تھی، تیسرے (۳) جواب میں تردد کا اظہار کیا گیا تھا۔

سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ نے ان جوابوں پر نظر فرمائی تو ان کا حاصل پھر یہی تھا کہ اصل مسئلہ منقح نہ ہوا بلکہ تردّد باقی رہا، لہٰذا ان تحقیقات کے بعد بھی حضرتؒ کا فتویٰ وہی رہا، جو حضرت مولانا مدنیؒ کے فتوے پر لکھا گیا تھا۔

پھر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل مذکورہ کے متعلق ایک مستقل رسالہ بنام ''المقالات المفیدہ فی الآلات الجدیدہ (۴)'' تصنیف فرمایا، اس میں بھی اس مسئلہ کا ذکر آیا تو فسادِ نماز کا حکم تحریر فرما کر آخر میں لکھا کہ:۔

---

(۱) یہ جواب شبیر علی صاحب پروفیسر محکمۂ سائنس علی گڑھ کا تھا۔

(۲) یہ جواب حیدرآباد دکن کے کسی عالم کا ہے، جو مولانا عبدالحی صاحب نے حاصل کر کے بھیجا تھا۔

(۳) یہ جواب برج نندن لال صاحب بی اے، بی ایس سی، ماسٹر سائنس الگزنڈ ہائی اسکول بھوپال کا تھا، ان تینوں جوابات کا خلاصہ مع دیگر تحقیقات جدیدہ از اعلیٰ ماہرین سائنس اس رسالہ کے آخر میں لکھ دیا گیا ہے۔۱۲ محمد شفیع

(۴) رسالہ ''المقالات المفیدہ'' حضرتؒ کی آخری تصنیف ''بوادر النوادر'' جلد دوم میں مکمل شائع ہوا ہے۔

یہ تحقیقات اپنی معلومات کے مطابق لکھی گئی ہیں، اگر کسی کو اس سے زیادہ یا اس سے خلاف تحقیق ہو وہ اپنی تحقیق پر عمل کرے، اور اگر ہم کو بھی مطلع کردے تو ماٗ جور ہوگا۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم!

کتبہ اشرف علی، تھانہ بھون، ۱۵ محرم الحرام ۱۳۶۷ھ

۱۳۴۹ھ میں دارالعلوم دیوبند کی خدمتِ فتویٰ اس ناکارہ خلائق کے سپرد کی گئی، اس وقت اس آلہ کا استعمال اور زیادہ عام ہو چکا تھا، اطرافِ ملک سے آئے دن اس کے متعلق سوالات آتے رہتے تھے، اس لئے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا جائے، چنانچہ ۱۳۵۷ھ میں احقر نے اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا جس میں دیوبند کے سابق فتویٰ اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی تائید وتصویب کو مزید تشریح وتائید کے ساتھ ضبط کرلیا گیا اور یہ رسالہ مستقل صورت میں شائع کیا گیا۔

دیوبند، سہارنپور تھانہ بھون کے علماء نے عام طور پر اس کی موافقت فرمائی لیکن میرا یہ رسالہ جب حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا (جبکہ وہ ڈابھیل ضلع سورت کے جامعہ اسلامیہ میں صدر مدرس کے فرائض انجام دے رہے تھے) آپ نے رسالہ پڑھ کر احقر کو ایک والا نامہ تحریر فرمایا، جس میں فسادِ نماز کے حکم سے اختلاف کا اظہار فرمایا، والا نامہ بلفظہٖ درج ذیل ہے:۔

مکتوب شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ از ڈابھیل

برادر مکرم! جناب مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون آنکہ رسالہ المفتی، محرم ۱۳۵۸ھ میں سے آلہ مکبّر الصوت والا مضمون میں نے پڑھا، ماشاء اللہ بہت محنت اور سلیقہ سے لکھا گیا ہے، مگر بعض اجزاء پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۱:۔ بے شک دین یا عبادت میں تعمق (۱) وغلو ممنوع ہے (یا)

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا وَ نَحْوَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِعْرَاضِ عَنِ السُّنَّةِ اَوْ تَقَالُلِهَا وَغَیْرُهُمَا.

یہی وجہ ہے کہ کبارِ علماء خصوصاً ان حضرات کے احوال میں جو عرفاً مشائخ صوفیہ سے ملقب ہیں، اسی طرح کے اکثارِ عبادات کی بے شمار نظائر پائی جاتی ہیں، جن کو یقیناً مذموم قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ وہ بحمد اللہ ان مضار سے مأمون تھے اور ان کا منشاء صحیح تھا۔

۲:۔ طہارت، نجاست کے باب میں محض شبہات واوہام یا احتمالات پر بنا کرنا یا زیادہ خوض اور تکلف سے کام لینا بیشک ناپسندہ ہے، لیکن یہ یادرکھنا چاہئے کہ محرمات دو قسم کے ہوتے ہیں، محرم بوصفہ اور محرم لکسبہ اول میں اسی طرح کا تعمق غلو میں شمار ہے، اور ثانی میں شبہات اور احتمالات سے بچنا احتیاط وتقویٰ ہے، کَمَا نَبَّهَ الْحَافِظُ ابْنُ تَیْمِیَّةَ فِیْ فَتَاوَاهُ. صحیح بخاری کی حدیث ہے: " اَلْحَرَامُ بَیِّنٌ وَّالْحَلَالُ بَیِّنٌ وَّ بَیْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ (الی قوله صلی الله علیه وسلم) وَمَنْ رَعٰی حَوْلَ حِمًی یُوْشِکُ اَنْ یُّوَاقِعَهٗ." ورنہ جو دقائق تقویٰ ائمہ اور مشائخ کبار سے منقول ہیں بے معنی توہمات قرار پائیں گے، یہ چیز کتاب، سنت اور مسائل فقہیہ کے تتبع سے صاف ظاہر ہے کہ نجاست وطہارت کے باب میں شریعت مطہرہ جو توسع اور اغماض روا رکھتی ہے، اور اس کا ربوا وغیرہ کے مسائل میں اصلاً مساغ نہیں، بہر حال اس مقدمہ میں کچھ قیود واحتراسات کی ضرورت ہے۔

(۱) نمبر: ۱ اور ۲ کے مضمون میرے رسالہ کے پہلے ایڈیشن میں تھے، موجودہ ایڈیشن میں اس کو بدل دیا گیا ہے۔ ۱۲ منہ

۳:۔ جب احادیث وفقہیات کی بناء پر یہ تسلیم کیا گیا کہ اذان، خطبہ، قراءت وغیرہ میں استماعِ مخاطبین ومقتدیین کی بناء پر رفعِ صوت مطلوب ہے، اور شریعت نے ایک حد تک اس کا اہتمام کیا ہے تو رفع صورت یا یوں کہئے کہ ابلاغِ صوت کی کسی جدید صورت کو جو فی حد ذاتہٖ مباح بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن تسلیم کرلی گئی، اباحت وجواز کی حد سے نکالنا کس اُصول پر مبنی ہوگا؟ آخر کسی امر کے متعلق شریعت کے امر کی تحدید محض اس اُصول پر تو نہیں کی جاسکتی کہ یہ چیز اُس وقت موجود نہ تھی، جیسا کہ آپ خود تسلیم کررہے ہیں، اذانِ جوق کو بدعت حسنہ کہہ کر فقہاء نے قبول کرلیا، جو آج تک رائج ہے اور فی الحقیقت یہ بنوامیہ کی بدعت نہیں، جیسا کہ شامی نے نقل کیا ہے، بلکہ فاروق اعظمؓ نے جو آخری خطبہ جمعہ کا دیا ہے اس کے متعلق صحیح میں ''فَلَمَّا قَعَدَ عَلَى الْمِنبَرِ وَ سَكَتَ الْمُؤَذِّنُونَ'' کے الفاظ ہیں، جس کو دیکھ کر شیخ ابوالحسن سندھی نے اس مسئلہ پر تنبیہ کی ہے کہ:

فِي الْعُدَّةِ مِن ابْنِ الْقَاسِمِ عَنْ مَالِكٍ اِذَا جَلَسَ الْاِمَامُ عَلَى الْمِمْبَرِ وَاَخَذَ الْمُؤَذِّنُوْن فِي الْاَذَانِ حُرِّمَ الْبَيْعُ فذكر الْمُؤَذِّنُوْن بلفظ الجماعة وَيَشْهَدُ لِهٰذَا الْحَدِيْث الزُّهْرِى مِنْ ثَعْلَبَةَ بْنِ اَبِىْ مَالِكِ القرظى اَنَّهُمْ كَانُوْا فِىْ زَمَنِ عَمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ يُصَلُّوْنَ الْجُمْعَةَ حَتّٰى يَخْرُجَ عُمَرُوَ جَلَسَ عَلَى الممبر واُذِّن المؤَذِّنُونَ. الحديث وهكذا حكاه عن ابى حنيفة واصحابه.'' (عمده ج:٦/ص:٢١١)

تکبیر کی تبلیغ کے لئے مرض الموت کے قصہ میں صدیقِ اکبرؓ کا واقعہ موجود ہے، بیشک خیال ہوسکتا ہے کہ پھر خطبہ اور قراءت صلوۃ میں یہ تبلیغ

کا عمل کیوں نہ کیا گیا، مگر ادنی تامل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہاں ایسا عمل اختیار کرنے سے دوسرے اہم مقاصد و مصالح فوت ہوتے ہیں، مثلاً: اگر کئی شخص علی وجہ الاجتماع خطبہ یا قرآن پڑھیں تو استماع و انصات للامام فوت ہو جاتا ہے اور منازعت اور تصادم اصوات کا ایسا منظر سامنے آتا ہے کہ جو صلوٰۃ و خطبہ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، اور علی وجہ التعاقب یا تو ایک ایک قراءت کی کئی کئی قراءتیں یا ایک خطبہ کے کئی کئی خطبے ہو کر تخفیف علی المصلین اور قصرِ خطبہ کی غرض نظر انداز ہو جاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی چیز نہیں "مَنْ اَمَّ مِنْكُمْ فَلْيُخَفِّفْ" اور " اِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ، اَفَتَّانٌ اَنْتَ يَا مُعَاذُ" کے ساتھ جس فرطِ غضب کا اظہار ایسے مواقع میں ہوا ہے وہ کسی اہل علم پر مخفی نہیں، آلۂ مکبر الصوت میں ان مفاسد کا کوئی احتمال نہیں بلکہ ابلاغِ صوت کا مقصد بہت پر سکون طریقہ سے حاصل ہو جاتا ہے، جیسا کہ مجالس وعظ وغیرہ میں عموماً تجربہ ہو رہا ہے، رہی یہ چیز کہ بظاہر ایک لعب کی سی صورت ہو جاتی ہے، یہ فی الحقیقت اس پر مبنی ہے کہ ہر نئی چیز ابتداء میں توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اب یہ چیز رفتہ رفتہ عام ہوتی جا رہی ہے، عام ہونے کے بعد کسی کو التفات بھی نہ رہے گا کہ یہ آواز ہم آلہ سے سن رہے ہیں۔

۴:۔ یہ تحقیق کہ آلہ سے جو صوت مسموع ہو رہی ہے وہ عین صوتِ قاری ہے یا اس کی نقل اور نقشِ ثانی ہے؟ اس کا کوئی فیصلہ ہنوز نہ ہوسکا، اس لئے اجتناب کو احوط کہہ سکتے ہیں، ناجائز نہیں کہہ سکتے، اور احوط کہنا بھی اس جزئیہ کی بناء پر کہ اقتداء بمن لم یدخل فی الصلوٰۃ لازم آتی ہے مگر مجھے اس مسئلہ میں بھی شفاء نہیں، مبلغ کی آواز سے امام کے انتقالات پر استدلال کرنا حقیقتاً مبلغ کی اقتداءِ شرعی نہیں بعض اعتبار سے توسعاً اقتداء کا اطلاق ہوتا ہے، محض اتنی سے بات سے اس پر استدلال کرنا کہ مکبر کی

نماز کا وجود و عدم عامۂ مقتدیین کی نماز کے فساد و صحت پر اثر انداز ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ غرض نہیں کہ جزئیہ فقہ میں موجود نہیں، بلاشبہ موجود ہے، مگر میں اپنے عدمِ فہم کا اظہار کر رہا ہوں، اس کا ذکر استطراداً کر دیا ہے، مقصود یہ نہیں کہ اپنے عدم فہم کو حجت قرار دوں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ میں کیا اور میرا فہم کیا، بس مقصود اتنا ہے کہ مکبّر الصوت کے حکم میں شرحِ صدر نہیں، اور اباحتِ مرجوحہ کی طرف قلب کا میلان ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

اس وقت ایک قول شیخ ابوبکر بن فورکؒ کا یاد آ گیا: ''كُلُّ مَوْضِعٍ تَرىٰ فِيْهِ اِجْتِهَادًا وَلَيْسَ عَلَيْهِ نُوْرٌ فَاِنَّهٗ بِدْعَةٌ خَفِيَّةٌ.'' بیشک یہاں بھی نور تو محسوس نہیں ہوتا، لیکن یہ اہلِ وجدانِ صحیح کا اور نورِ بصیرت رکھنے والوں کا حق ہے کہ نور کے وجود و عدم کا فیصلہ کریں، ماوشما کا منصب نہیں، آپ نے اصرار کیا تھا اس لئے چند سطور لکھی گئیں۔

شبیر احمد عثمانی، از ڈابھیل، ۲۷ صفر ۱۳۵۸ھ

احقر نے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے مولانا عثمانیؒ کی اس رائے اور اختلاف کا ذکر کیا، تو فرمایا کہ: کسی وقت جب وہ یہاں تشریف لائیں گے تو بالمواجبہ گفتگو ہو جائے گی۔ یہ واقعہ ۱۳۵۸ھ کا ہے، اس کے بعد مسلسل کچھ ایسے حالات پیش آتے رہے کہ اس مسئلہ پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے گفتگو کا موقع نہ ملا، تا آنکہ ۱۳۶۲ھ میں حضرت قدس سرہٗ کی وفات ہوگئی

۱۳۶۷ھ میں جب احقر پاکستان کراچی پہنچا، اور حضرت مولانا عثمانیؒ پہلے سے یہاں تشریف فرما تھے، اور ادھر یہاں شہر کی بڑی بڑی جماعتوں میں آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال پر بحثیں شروع ہوئیں، اور اسی اثناء میں حرمین محترمین میں تمام نمازیں آلۂ مکبّر الصوت پر ہونے لگیں، ہندوستانی اور پاکستانی حجاج وزائرین جو یہاں فسادِ نماز کا حکم سنے ہوئے تھے اُن کو سخت اُلجھن پیش آئی، اور اطرافِ پاکستان و بھارت سے سوالات کا

تانتا بندھ گیا، اُس وقت حضرت استاذ مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا کہ میں عملاً آپ کے فتویٰ کے مخالفت نہیں کرتا، اور اسی لئے آج تک نہ کسی کو اپنی رائے پر فتویٰ دیا اور نہ کبھی خود اس آلہ پر نماز پڑھی، لیکن رائے میری وہی ہے جو پہلے اپنے خط میں لکھا چکا ہوں، اب مناسب یہ ہے کہ دوبارہ اس مسئلہ پر غور کیا جائے۔

حضرت مولانا عثمانی قدس سرہٗ کے خط میں فسادِ نماز سے اختلاف کی وجہ اگرچہ اصل جزئیہ فقہیہ تھا، جس کی بناء پر فسادِ نماز کا حکم دیا گیا ہے، اور مولانا کا یہ اختلاف آواز کے عین یا غیر ہونے کی دونوں صورتوں میں تھا، لیکن فتویٰ میں چونکہ مدارِ بحث یہی رکھا گیا تھا کہ آلۂ مکبّر الصوت کی آواز کو امام کی اصلی آواز نہیں بلکہ اس کی حکایت و چربہ قرار دیا گیا ہے، اس لئے مناسب سمجھا کہ پہلے اس مسئلہ کی پوری تحقیق کر لی جائے۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے جس زمانے اور جن حالات میں اس کی تحقیق فرمائی تھی اول تو اُس وقت اس آلہ کا اتنا عموم اور شیوع نہیں ہوا تھا، بہت سے ماہرین کو بھی اس وقت تک شاید مکمل تحقیق نہ ہو، جیسا کہ بھوپال والے جواب سے واضح ہے، دوسرے وہاں ماہرین فن سے جواب حاصل کرنے کی سہولتیں بھی نہ تھیں، اور یہی وجہ ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اس معاملہ میں بعد تحقیق بھی تردد ہی کا اظہار فرمایا ہے، یہ مرکزی جگہ ہے، ہر فن کے ماہرین موجود ہیں، ان سے معلومات حاصل کرنے کی کافی سہولتیں میسر ہیں۔

احقر نے حسب الارشاد محکمۂ ریڈیو اور محکمۂ آواز کے ذمہ دار اعلیٰ ماہرین سے تحریری سوال کر کے اس کی تحقیق کی، یہاں سب نے متفقہ طور پر یہ بیان کیا کہ آلۂ مکبّر الصوت سے اصل آواز بعینہٖ دور تک پہنچتی ہے، یہ پہلی آواز کا چربہ یا بازگشت یا عکس ہرگز نہیں ہے۔

لیکن چونکہ حضرت حکیم الامتؒ کے استفسار کے جواب میں حیدرآباد کے ایک ماہر نے یہ جواب دیا تھا کہ برقی مکبّر الصوت کے ذریعہ اصل آواز دور تک نہیں پہنچتی، بلکہ اس کی

نقل و حکایت پہنچتی ہے، اور دہلی ریڈیو سے شائع شدہ ایک مضمون سے بھی کچھ ایسا ہی مفہوم ہوتا تھا، اس لئے ایک گونہ اشتباہ پھر بھی باقی رہا، جس کے ازالہ کے لئے تمام وہ جوابات جو حضرت حکیم الامتؒ نے پہلے حاصل فرمائے تھے، اور دہلی ریڈیو کا مضمون سب نقل کر کے ان ماہرین کے سامنے پیش کیا، اور مکرر ان حضرات سے سوال کیا کہ ان سب تحقیقات و بیانات کو سامنے رکھ کر مکرر غور فرمائیں، اور پھر جواب واضح دیں۔

انہوں نے ان سب جوابوں اور تحقیقات کے ملاحظہ کے بعد بھی اپنی پہلی رائے ہی کو صحیح قرار دیا، اور مکبر الصوت کی آواز کو بازگشت یا نقل و حکایت کہنے کی شدّت کے ساتھ تردید کی، ان سب قدیم و جدید تحقیقات اور مکرر سوال و جواب کا خلاصہ مع مزید تحقیقات کے جو رسالہ کی طبع ثالث کے وقت حاصل ہوئی اس رسالہ کے ضمیمہ اولیٰ میں لکھ دیئے گئے ہیں، اس کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

احقر نے حسب ایماء شیخ الاسلام حضرت مولانا عثمانیؒ، اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے ایک طرف تو فنی طور پر محکمۂ ریڈیو اور محکمۂ صوت کے اعلیٰ ماہرین سے اس کی تحقیقات شروع کیں، اور مکرّر وسہ کرر مراسلت کی، دوسری جانب علمائے اہل عصر ارباب فتویٰ سے گفتگو و مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا، خود حضرت مولانا مرحوم سے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر کئی کئی گھنٹے بحث و تحقیق کا سلسلہ جاری رہا۔

یہ سلسلہ ہنوز مکمل نہ ہوا تھا کہ علماء سلف کی یہ آخری یادگار بھی اچانک حملۂ مرض سے ۲۴ صفر ۱۳۶۹ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون! مسئلہ ہنوز تشنۂ تکمیل تھا، اس حادثہ نے اور بھی ہمت توڑ دی، ایک مدت تک پھر التواء میں پڑا رہا، اہل عصر اربابِ فتویٰ کی کچھ تحقیقات و جوابات اس عرصہ میں موصول ہوئے، اور بتقاضائے ضرورت پھر اس مسئلہ پر لکھنے کے لئے احباب کا تقاضا ہوا، اس لئے مسئلہ کی پوری تاریخ بتلانے کے بعد اس مکرر تحقیق اور چند سالہ غور و فکر اور اکابر علماء سے بحث و تمحیص کے بعد جس

نتیجہ پر احقر ناکارہ پہنچا ہے تو کلاً علی اللہ عرض کرتا ہے، اس پر بھی اُس وقت اِقدام کیا جب اکابر علماءِ اہلِ تحقیق وارباب فتویٰ سے زبانی بحث وتمحیص میں اس کی موافقت معلوم ہوئی، مثلاً:۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ

حضرت مولانا محمد حسن صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب شیخ الحدیث مدرسۂ مذکورہ۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان۔

حضرت مولانا اطہر علی صاحب جمعیۃ علماءِ اسلام مشرقی پاکستان، اور علامہ زاہد الکوثری از اکابر علماءِ مصر و مفتی اعظم فلسطین، مفتی دیارِ مصریہ و شیخ امجد زہادی قاضی عراق و ترکستان۔

اللہ تعالیٰ سے دعا والتجا ہے کہ صواب وسداد کی توفیق بخشیں، اور زلت وخطا سے حفاظت فرمائیں۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان!

نماز میں آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال پر احقر کی آخری رائے

اس مسئلہ کے دو جزء ہیں، ایک یہ کہ نماز میں آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال کیسا ہے؟ اس کا جواب اسی رسالہ میں اُوپر لکھ چکا ہوں کہ اس کے مفاسد اس کی مصلحت سے بہت زیادہ ہیں، "اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا" کا مصداق ہے، اس کے استعمال پر پانچ مفاسد شدیدہ کی تفصیل گزر چکی ہے، اس لئے نماز میں اس سے اجتناب کرنا چاہئے، اور ترک ومنع ہی کا فتویٰ دینا چاہئے۔

دوسرا جزء یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی ضرورت یا مجبوری سے اپنی رائے سے اس آلہ کی آواز پر نماز پڑھ لی (۱) تو اس کی نماز ہوگئی یا فاسد واجب الاعادہ ہے؟

(۱) آج کل حرمین میں سب حجاج وزائرین کو یہ مجبوری پیش آتی ہے۔

اس معاملہ میں کافی غور وتفتیش وتحقیق اور علماء سے مراسلت ومراجعت کے بعد رائے احقر کی یہ ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوتی، اور اعادہ لازم نہیں، اس کی وجوہ یہ ہیں:۔

۱:۔ فسادِ نماز کا حکم کرنے کی وجہ، سابقہ فتویٰ میں اس کو قرار دیا ہے کہ اس آلہ کی آواز امام کی اصلی آواز نہیں بلکہ صدائے بازگشت کی طرح اس کی مثال وحکایت یا چربہ ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی فقہی مسئلہ نہیں، بلکہ خالص سائنسِ جدید کا مسئلہ ہے، اسی کے ماہرین سے اس کا حل ہوسکتا ہے۔

پہلی مرتبہ جب سیدی سندی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے ماہرین سائنس سے اس کی تحقیق طلب فرمائی تو صرف حیدرآباد دکن کے ایک جواب میں ایسا لکھا گیا تھا کہ یہ آواز بعینہٖ متکلم کی آواز نہیں ہوتی، بلکہ اس کی شبیہ وحکایت ہے، اس کے علاوہ بھوپال کے جواب میں اظہارِ تردّد اور علی گڑھ یونیورسٹی کے جواب میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آواز امام کی اصلی آواز بعینہٖ ہے، اور اب پاکستان، کراچی، ڈھاکہ وغیرہ میں اس کی مکرر تحقیق کے وقت (۱) سب اعلیٰ ماہرین فن نے ایک ہی جواب دیا کہ یہ آواز بعینہٖ متکلم کی آواز ہے، بناء علیہ اس آواز کا اتباع امام ہی کا اتباع ہے، اس لئے فسادِ نماز کی کوئی وجہ نہیں۔

۲:۔ عام اَحکام اسلامیہ شرعیہ کے ملاحظہ سے یہ امر متقین ہے کہ جن مسائل کا تعلق فلسفیانہ تحقیق وتدقیق یا ریاضی کی باریکیوں یا اصطراب وغیرہ آلات سے ہے، شریعت مصطفویہؐ نے ان سب حقائق کی تحقیق وتدقیق سے اِغماض کر کے محض ظواہر پر اَحکام دائر فرمائے ہیں جن کو ہر خاص وعام، عالم وجاہل، شہری اور جنگلی آسانی کے ساتھ بدون استعانت آلات وحسابات معلوم کر کے خدا تعالیٰ کی طرف سے عائد شدہ فریضہ سے سبکدوش ہوسکے، رویتِ ہلال اور اختلافِ مطالع کی بحث میں منجمین اور اہلِ ریاضی کی

(۱) ان جوابات کے خلاصہ آخر رسالہ میں بعنوانِ ضمیمہ شامل کردیئے گئے ہیں، وہاں ملاحظہ فرمائے جائیں۔۱۲

تحقیقات کو سمتِ قبلہ میں اصطرلاب کے استعمال کو اسی بناء پر مسائل شرعیہ کی بنیاد نہیں بنایا گیا، بلکہ ہلال کا مدار رؤیت پر اور سمت قبلہ کا شہر کی قریبی مساجد پر، پھر محاریب صحابہؓ پر رکھ دیا گیا، حالانکہ یہ فنون اور ان کے آلات عہدِ رسالتؐ اور قرونِ مابعد میں بکثرت موجود ومروّج تھے۔

اس اُصول کی بناء پر مسئلہ زیرِ بحث میں دو نتیجے نکلتے ہیں، اول یہ کہ عبادات خالصہ میں اس قسم کے آلات کا استعمال اصولاً پسندیدہ نہیں، جیسا کہ اس کی تفصیل اسی رسالہ کے شروع میں آچکی ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی نے ان آلات کو مسائل مذکورہ میں استعمال کرلیا، تو اصل عمل کی صحت وعدم صحت کا مدار بھی ان فنی تدقیقات پر نہیں بلکہ ظاہر حال ہی پر رہے گا، مثلاً: اگر کسی شخص نے اصطرلاب وغیرہ کے ذریعہ سمت قبلہ قائم کرلی، تو شرعاً اس کی صحت وعدم صحت کا معیار فنِ اصطرلاب کی باریکیاں نہ ہوں گی، بلکہ وہی عام مساجدِ بلدہ کی موافقت وعدم موافقت پر مدار ہوگا۔

مذکور اصول کے مطابق آلۂ مکبّر الصوت کے ذریعہ سنائی دینے والی آواز کو ظاہر و متعارفِ عوام کے موافق متکلم کی اصلی آواز ہی کہا جائے گا، گو فنی تدقیقات بالفرض یہی ثابت کریں کہ وہ اصل آواز نہیں بلکہ اس کا عکس ہے، کیونکہ اس صورت میں اصل آواز اور اس آلہ کی آواز کا فرق اس قدر دقیق ہوگا کہ وہ عوام کو تو کیا خود ماہرین سائنس کو بھی واضح نہ ہوا، اسی لئے ان میں اختلاف رہا تو ایسی تدقیقات فلسفیہ جن کا ادراک ماہرین فن بھی مشکل سے کرسکیں، احکام شرعیہ کا مدار نہیں ہوسکتی، بلکہ ان اَحکام میں حسب ظاہر اس کو اصل متکلم ہی کی آواز قرار دیا جائے گا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

مسئلہ: مکبّر الصوت کو مشہور جزئیات فقہیہ پر قیاس کرنا درست نہیں

۳:۔ دوسری وجہ جو مطبوعہ رسالہ میں لکھی گئی ہے، یہ ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت کی آواز کو متکلم کی اصلی آواز نہ قرار دینے کی صورت میں فسادِ نماز کا فتویٰ، اس کو بعض جزئیاتِ فقہیہ پر قیاس کرنے کی وجہ سے ہوسکتا ہے، مثلاً: کوئی شخص خارجِ نماز امام کو لقمہ دے اور امام لقمہ لے لے، یا کوئی شخص نماز میں قرآن مجید کو دیکھ کر تلاوت کرے تو فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس کو تلقن من الخارج قرار دے کر اس کی اور تمام مقتدیوں کی نماز کو فاسد قرار دیا ہے، آلہ مکبّر الصوت میں بھی جبکہ اس کی آواز متکلم کی اصلی آواز نہ ہو یہ تلقن من الخارج پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں بھی نماز فاسد ہونا چاہئے۔

لیکن یہ قیاس صحیح نہیں، کیونکہ قیاس کرنے کے لئے دونوں میں مساوات شرط ہے، اور نظر غائر کے بعد دونوں مسئلوں میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے، اس لئے ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، وجہ فرق یہ ہے کہ مسئلہ مصرحۂ فقہاء میں آواز دینے والا یا لقمہ دینے والا ایک انسان مکلّف خود مختار ہے، جو داخلِ نماز اور شریکِ جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، پھر داخل ہوئے بغیر تکبیریں پکار رہا ہے۔

اور مسئلہ مکبّر الصوت میں آواز دور تک پہنچانے والا ایک آلہ بے جان بے حس و بے شعور ہے، نہ وہ دخول فی الصلوٰۃ کی صلاحیت رکھتا ہے، نہ اس کا مکلف ہے، منطقی اصطلاح میں عدم ملکہ اور عدم بسیط کا فرق ان دونوں میں واضح ہے، جس کا اثر مسئلہ پر یہ ہوسکتا ہے کہ انسان جو خود مختار اور مکلّف ہے اس کا فعل اسی کی طرف منسوب ہے، بخلاف ایک آلۂ بے حس و بے شعور کے کہ اس کا فعل اس کی طرف منسوب نہیں ہوتا، بلکہ اس کے محرک کی طرف منسوب ہوتا ہے، گولی چلانے یا تیر و تلوار مارنے سے کوئی شخص ہلاک یا زخمی ہو جائے تو شرعاً اور عرفاً چلانے والے کا فعل اور اسی کا جرم سمجھا جاتا ہے، گولی یا بندوق یا تیر و تلوار کی طرف کسی

کا دھیان بھی نہیں جاتا، فقہاء کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ جس کام میں کوئی فاعلِ مختار واسطہ بن کر مباشر عمل ہو تو فعل اس واسطہ کی طرف منسوب ہو جاتا ہے، اور جہاں کوئی واسطہ غیر ذی شعور غیر مختار ہو تو فعل اصل محرک اور فاعل ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے، واسطہ کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔

بناءً علیہ اگر ایک انسانِ مکلّف و مختار خارج نماز کی آواز کے اتباع کو فقہاء نے مفسد نماز قرار دیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک آلہ بے حس و شعور کی آواز کا بھی یہی حکم ہو، کیونکہ وہ واسطہ محض ہے، اس کا فعل دراصل محرک آلہ کا فعل اور اسی کی طرف منسوب ہے، اس کی نظر فقہی کے اعتبار سے بھی آلۂ مکبّر الصوت سے نکلی ہوئی آواز امام ہی کی آواز قرار دی جائے گی، کیونکہ محرک اس کا وہی ہے، اگرچہ فنی طور پر یہ اس کی بعینہٖ آواز نہ ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کہ اس کی آواز پر نقل و حرکت فسادِ نماز کا موجب نہیں ہوگی، ہاں "قراءت من المصحف" آلۂ مکبّر الصوت کے مسئلہ کی نظیر ہو سکتی ہے، مگر اوّل تو اس میں خود ائمہ کا اختلاف ہے اور اور جن حضرات کے نزدیک یہ مفسدِ نماز ہے اُن کے نزدیک بھی مطلقاً مفسد نہیں بلکہ جس صورت میں عملِ کثیر تعلیم و تعلم کا پایا جائے وہ مفسد ہے، آلہ مکبّر الصوت کی آواز پر نقل و حرکت میں ایسا نہیں ہے (جس کی تفصیل ضمیمہ اولیٰ میں آتی ہے)۔

ایک شبہ کا جواب

بعض علماء نے نماز میں آلۂ مکبّر الصوت سے استفادہ کو قراءت من المصحف پر قیاس کر کے تلقن من الخارج میں داخل ہونے کی بناء پر نماز کو فاسد فرمایا ہے، اُن کے الفاظ یہ ہیں:۔

> ظاہر ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت کے ذریعہ سے آوازِ امام کو سن کر اُس پر کاربند ہو جانا خارج کی دلالت و تلقین و تعلیم پر کاربند ہونا ہے، چاہے وہ آواز عین آوازِ امام ہو یا غیر، جب وہ ہماری سماعتِ علم میں اس آلے کے

ذریعہ سے آئی تو اس آلہٗ غیر شریکِ نماز کو اس آواز کی تعلیم و تلقین و دلالت میں داخل ہو گیا، اور اس آواز کی تعلیم و تلقین و دلالت کی نسبت اس آلہ کی طرف صحیح ہو گی، (الی) اور اس کی دلالت کے مطابق کاربند ہونا تلقّن من الخارج ہونے سے مفسد نماز ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مصحف یا کسی دیوار کی کتابت سے استفادہ خود اسی سے تلقّن ہے، لیکن اس پر اس آلہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا جو خود قرآن نہ پڑھتا ہے نہ دکھاتا ہے، پڑھنے والا امام ہے، اس سے آلہ متاثر ہو کر امام کی آواز پہنچا دیتا ہے، اگر کسی خارج از نماز کا مطلق تلقّن من الخارج کے تحت میں داخل ہو کر مفسد نماز قرار دیا جائے تو بلا واسطہ مکبّر الصوت جو آواز امام کی ہم تک پہنچتی ہے اس میں بھی ہوا کا واسطہ اور دخل ہے تو اس میں بھی نماز فاسد ہونی چاہیے، جس کا کوئی قائل نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً کسی واسطہ کا دخل تو مفسد نہیں ہے، بلکہ جس واسطہ کی طرف فعل کی نسبت کی جا سکے وہ مفسدِ نماز ہے، اور جہاں کوئی واسطہ، واسطۂ محض ہو جس کی طرف عرفاً و شرعاً فعل کی نسبت نہیں ہوتی اس کا دخل مفسد نہیں، کیونکہ درحقیقت وہ تلقّن من الخارج نہیں، بلکہ من الامام بواسطۃ الخارج ہے، جس کی ایک نظیر بذریعہ عینک دیکھنا ہے، ایک ضعیف البصر آدمی جو بلا عینک کے صاف نہیں دیکھتا، وہ عینک لگا کر کسی واقعہ کا مشاہدہ کرے یا اس کے ذریعہ چاند دیکھ کر رُویت کی شہادت دے تو کوئی اس کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا، اسی طرح یہ شخص بواسطۂ مکبّر الصوت کسی کی آواز سامنے سے سن رہا ہے وہ شہادت بالسماع دے سکتا ہے کہ میں نے اپنے کانوں سے اس کا یہ کلام سنا ہے، جس طرح دُوربین یا عینک دیکھنا اصل واقعہ کا دیکھنا ہے، اسی طرح مکبّر الصوت سے سننا اصل آوازِ امام کا سننا ہے، یہ درمیانی وسائط محض اور ہدر ہیں، اُن کی طرف فعل کی نسبت نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کے ذریعہ سنی ہوئی آواز کا اتباع خارج سے تلقین و تعلیم کی حد میں داخل نہیں ہو سکتا، اور فسادِ نماز کا حکم نہیں کیا جا سکتا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم !

آلۂ مکبّر الصوت کے مسئلہ کو سجدۂ تلاوت اور صوتِ صدیٰ کے مسئلہ پر قیاس کرنا درست نہیں

۴:۔ تیسری وجہ یہ کہ مکبّر الصوت کی آواز کو صدائے بازگشت پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ صدائے بازگشت کا مسئلہ جس کی تصریح فقہاء کے کلام میں موجود ہے وہ سجدۂ تلاوت کے باب میں وارد ہے کہ کسی نے آیت سجدہ اصل قاری کی زبان سے سننے کے بجائے گنبد یا کنویں کی بازگشت سے سنی، تو اس پر سجدہ تلاوت واجب نہیں، لیکن اس کی تصریح کہیں فقہاء کے کلام میں نظر سے نہیں گزری کہ اگر کسی مقتدی نے صوتِ صدا سن کر حرکاتِ انتقالیہ میں اس کا اتباع کیا تو نماز فاسد ہوجائے گی، اور سجدہ تلاوت کے مسئلہ پر اس مسئلہ کا قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ مسئلہ سجدہ میں ایک عبادت یعنی سجدہ تلاوت کا ایجاب مستقل ہے، جو حسبِ تصریح فقہاء آیتِ سجدہ کی تلاوت صحیحہ یا اس کے سننے پر موقوف ہے، اور حسبِ تصریح بدائع صوت صدیٰ کو تو تلاوت ہی نہیں کہہ سکتے اور کسی نے مجنون کی زبان سے آیت سجدہ سن لی تو وہ اگرچہ تلاوت ہے مگر تلاوت صحیحہ نہیں، کیونکہ مجنون تلاوت کی اہلیت نہیں رکھتا، اس لئے اس سے آیت سننے پر سجدہ واجب نہیں ہوتا۔ (بدائع ج:۱/ص ۱۸۶)

بخلاف اس مسئلہ کے کہ مقتدی پر امام کی اتباع اور اس کے ساتھ رکوع وسجود میں منتقل ہونا پہلے سے لازم وواجب ہے، مکبر کی آواز اس کے واجب ہونے کا سبب یا علت نہیں، بلکہ مکبّر کی آواز صرف انتقالِ امام کی خبر دینے والی ہے، اور امام کی حرکاتِ انتقالیہ پر اطلاع، جیسے عام طور پر امام کی آواز سے ہوتی ہے، اسی طرح کبھی اگلی صف کی نقل وحرکت سے، کبھی سایہ وغیرہ سے بھی ہوجاتی ہے، اور کبھی مکبّر کے بآواز بلند تکبیر کہنے سے اور کبھی آلۂ مکبّر الصوت سے بھی ہوجاتی ہے، بہرحال اتباعِ امام ہی کا ہوتا ہے، جو بسببِ اقتداء پہلے ہی سے اس کے ذمہ لازم تھا، آواز مکبّر یا مکبّر الصوت کے سننے یا نہ سننے پر اس کا مدار نہیں،

اس لئے صوتِ صدیٰ کا وجوب سجدہ میں اعتبار نہ کرنا اور چیز ہے اور اس کے ذریعہ انتقالِ امام پر استدلال کر کے نقل و حرکت کرنا دوسری چیز۔

خلاصہ یہ ہے کہ تحقیقاتِ سائنس سے قطع نظر اگر اس آواز کو امام کی اصل آواز نہ مانا جائے بلکہ مثلِ صوت صدیٰ کے قرار دیا جائے تو خود مقیس علیہ میں بھی فسادِ صلوٰۃ کا حکم نہ فقہاء کی تصریح سے ثابت ہے اور نہ اس کی وجہ فقہی ہو سکتی ہے، بلکہ اگر امام کی آواز کسی مقتدی کو بذریعہ صدیٰ پہنچ جائے اور مقتدی اس پر نقل و حرکت کرے تو اس میں بھی کوئی وجہ فساد کی نہیں معلوم ہوتی، پھر اس پر مکبّر الصوت کو قیاس کر کے مفسدِ نماز کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

۵:۔ بعض اہل عصر کے فتاویٰ میں آلہ مکبّر الصوت کے استعمال کو آیۃ کریمہ "وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَاتُخَافِتْ بِهَا" کے خلاف قرار دے کر ناجائز بتلایا گیا ہے، یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اولاً تو اس آیت میں قراءت کے ایک مسنون اور معتدل طریق کی تعلیم کی گئی ہے، اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اگر کوئی شخص نماز میں جہر مفرط یا اخفائے مفرط کرنے لگے تو اس کی نماز فاسد ہے، اس لئے ائمہ فقہاء میں سے کسی کا یہ مذہب نہیں کہ نماز میں جہر مفرط یا اخفائے مفرط مفسدِ نماز ہے، اس لئے اس آیت کی بناء پر فسادِ نماز کا حکم کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

ثانیاً اس آلہ کے لئے جہر مفرط بھی نہیں، کیونکہ اس سے جس طرح آواز بلند سے بلند نکالی جا سکتی ہے، اسی طرح معتدل آواز بھی نکالی جا سکتی ہے، اس لئے اس کے استعمال کو مدلولِ آیت کے منافی قرار دینا صحیح نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

یہ وجوہ ہیں جن کی بناء پر آلۂ مکبّر الصوت کے نماز میں استعمال سے فسادِ نماز اور اِعادہ کا حکم نہ ہونا چاہئے۔

هٰذَا مَا سَنَحَ لِیْ وَلِلّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی وَلِیُّ التَّوْفِیْقِ وَالسَّدَادِ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا

الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّ ارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ.

آخر میں یہ عرض ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اپنی ناقص تحقیق اور ناقص فہم پر اس کا مدار ہے، اگر کسی صاحب کو اس کے خلاف کوئی دوسری صورت راجح معلوم ہو وہ دوسرے علماء سے تحقیق کر کے عمل کریں۔ واللہ الموفق والمعین!

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ کراچی

۱۰ر شعبان ۱۳۷۲ھ

۲۵ر اپریل ۱۹۵۳ء

عرضِ مؤلف

زیرِ نظر رسالہ کے مباحث میں اہم مبحث یہ تھا کہ آلۂ مکبّر الصوت کا استعمال نماز میں مفسدِ نماز نہیں ہے، اس کے لئے احقر نے اس رسالہ میں پانچ وجوہ بیان کئے ہیں، لیکن اس رسالہ کی طباعت اول کے وقت مقامی ماہرینِ سائنس کی تحقیق سے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اس رسالہ کی آواز بعینہٖ متکلم کی آواز ہے، اور اس صورت میں فسادِ نماز کا احتمال ہی نہیں رہتا، اس لئے باقی وجوہ جن میں اس کی آواز کو غیر آوازِ متکلم ہونے کی صورت میں بھی فسادِ نماز نہ ہونے کے دلائل تھے، اُن پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی، لیکن رسالہ کی اشاعت کے بعد چند علماء کی طرف سے ایسی تحریرات وصول ہوئیں جن میں اعلیٰ ماہرین صوتیات کے اقوال سے اس کی آواز کا غیر آوازِ متکلم ہونا ثابت کیا گیا ہے، ساتھ ہی احقر کے اس رسالہ پر بعض تنقیدات بھی تھیں، اس لئے باقی وجوہ کی مزید توضیح کی ضرورت پیش آئی، جو بصورت ضمیمہ اولیٰ اس کے بعد درج کیا جاتا ہے، اور ماہرینِ صوتیات کی پوری تحریر ضمیمہ ثانیہ میں شامل کر دی گئی ہے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ضمیمہ اُولیٰ

رسالہ مکبّر الصوت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ وَرِضَا نَفْسِهٖ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَصَفْوَةِ رُسُلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ صَحْبِهٖ. اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَئِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَ اِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ، اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.

نماز میں آلہ مکبّر الصوت کے استعمال سے متعلق جو میرا آخری رسالہ ۱۳۷۲ھ میں کراچی سے شائع ہوا تھا، اس میں فسادِ نماز کے پچھلے فتویٰ سے رجوع کر کے یہ لکھا گیا تھا کہ اگرچہ مفاسدِ عارضہ کے سبب اس کا نماز میں استعمال مناسب نہیں، اس سے اجتناب ہی کرنا چاہئے، لیکن اگر ایسی جگہ شرکتِ جماعت کا اتفاق ہو گیا جہاں اس آلہ کی آواز پر نقل وحرکت کی جاتی ہے تو اب تحقیق یہ ہے کہ نماز کو فاسد نہ کہا جائے گا، اس جدید تحقیق کی چند وجوہ تھیں جن کو تفصیل کے ساتھ اس رسالہ میں درج کر کے اشاعت سے پہلے اکابر علمائے دیوبند سہارنپور، خیر المدارس ملتان، جامعہ اشرفیہ لاہور وغیرہ بھیج دیا تھا، ان سب اکابر علماء نے غور وفکر سے پورے رسالہ کو پڑھ کر اصل فتویٰ میں موافقت فرمائی، تب اس رسالہ کو شائع کیا گیا، اور ان حضرات کی تحریرات بلفظہا اس رسالہ کے ساتھ شائع کر دی گئی تھیں۔

ان وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فسادِ نماز کے حکم کا مدار اس پر ہے کہ اس آلہ کی آواز کو اصل متکلم کی بعینہٖ آواز نہ مانا جائے، بلکہ اس کی شبیہ ومثال یا چربہ قرار دیا جائے۔

اس آواز کا متکلم کی بعینہٖ آواز ہونا یا اس کا چربہ ہونا یہ ایک فنی مسئلہ ہے جس کا تعلق سائنس جدید سے ہے، اسی لئے پچھلے فتوے کے وقت بھی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اس فن کے جاننے والوں کی طرف رجوع کر کے تحقیق فرمائی، اور ان میں اختلاف رہا تھا، اس لئے رسالہ لکھنے کے وقت احقر نے مزید تحقیق سرکاری طریقوں پر اُن لوگوں سے حاصل کی جن کو اس کام کا ماہر سمجھا جاتا ہے، ان سب نے متفقہ طور اس کو عین آواز متکلم قرار دیا۔

اس لئے رسالہ مذکورہ میں جن چار وجوہ کی بناء پر فسادِ نماز کے حکم سے رجوع کیا گیا اُن میں سے پہلی وجہ یہ تھی کہ تحقیق جدید سے اس کا عینِ آوازِ امام ہونا ثابت ہوگیا، اس لئے فسادِ صلوٰۃ کے حکم کی بناء ہی منہدم ہوگئی۔

اس کے علاوہ احقر نے تین وجوہ اور بھی لکھی تھی کہ جن کی رُو سے اس کو آواز امام کا غیر یا چربہ اور مثال ہی تسلیم کرلیا جائے تو پھر بھی فسادِ نماز کا حکم نہیں کیا جاسکتا، یہ تینوں وجوہ رسالہ میں مفصل مذکور ہیں، اُن کو مکرر دیکھ لیا جائے، اس رسالہ کو بہت سے اکابر علماء کی خدمت میں اشاعت سے پہلے ہی بھیج کر ان کی تصدیق کے بعد اپنا اطمینان کیا، پھر اشاعت کے بعد اطرافِ پاک و ہند کے علماء وفضلاء تک پہنچایا، اُن میں سے چند حضرات نے سائنس کی اس جدید تحقیق سے اتفاق نہیں کیا، جو کراچی کے ماہرین سے حاصل کی گئی تھی، بلکہ اس کے خلاف دوسرے ماہرینِ صوتیات کے اقوال نقل کئے جن کا حاصل یہ تھا کہ مکبّر الصوت کے ذریعہ پہنچنے والی آواز بعینہٖ متکلم کی آواز نہیں، بلکہ اس میں بہت سے تصرفات و تغیرات درمیان میں ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک مفصل تحریر مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصفؔ صاحبزادہ حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ امینیہ دہلی سے بھیجی، اور ایک تحریر (۱) مولانا قاضی شمس الدین صاحب نے ہری پور ہزارہ سے روانہ فرمائی، ان دونوں کا

(۱) یہ تحریر بھی رسالہ ہذا کے ضمیمہ ثانیہ میں پوری شائع کردی گئی ہے۔ ۱۲ منہ

حاصل یہی تھا کہ اس آلہ کی آواز عین آواز متکلم نہیں ہے۔

بہر حال معاملہ پھر وہیں آ گیا کہ جدید سائنس کے ماہرین کی آراء اس بارے میں مختلف ہیں، ان دونوں تحریروں میں احقر کے رسالہ پر کچھ اور تنقیدات بھی تھیں جن میں سے بعض کا تعلق بعض جگہ ان شبہات سے تھا جو میری تحریر کے ابہام و اجمال سے پیدا ہوئے تھے، اور کہیں تسامح واختلاط سے، ان کو بغور دیکھ کر جن چیزوں کا قابلِ اصلاح وترمیم ہونا سمجھ میں آ گیا، اُن کی اصلاح کر دی گئی، اور جن چیزوں میں دوسری طرف کوئی مغالطہ معلوم ہوا اس کا جواب لکھ کر رسالہ کو طول دینا مفید نظر نہ آیا ہاں قابل غور وتحقیق ہے تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر بالفرض سائنس کی اسی تحقیق کو صحیح مان لیا جائے کہ یہ آواز اصل متکلم کی آواز نہیں تو پھر آلہ مکبّر الصوت کی آواز پر نماز میں نقل وحرکت کرنے والوں کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

اس کے متعلق احقر نے اپنے اصل رسالہ میں بھی واضح طور پر لکھ دیا تھا کہ فسادِ نماز کا حکم پھر بھی نہیں ہونا چاہئے، لیکن اس کے وجوہ ودلائل پر زیادہ زور اس لئے نہیں دیا تھا کہ اس میں نئی تحقیقات نے فسادِ صلوٰۃ کے حکم کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا، اب جبکہ دوسرے ماہرین کے اختلاف نے اس معاملے کو پھر غور طلب بنا دیا تو مناسب معلوم ہوا کہ ان دلائل کی پوری وضاحت کر دی جائے جن کی بناء پر احقر نے پچھلے رسالہ میں لکھا تھا کہ فسادِ نماز کا حکم بہر حال نہیں ہونا چاہئے، خواہ یہ آواز متکلم کی بعینہٖ آواز ہو یا اس کا غیر یعنی شبیہ ومثال۔

اس توضیح کا تعلق اس وجہ کے ساتھ جس کو اصل رسالہ کے صفحہ: ۵۴ پر نمبر: ۳ کے عنوان سے لکھا گیا ہے، جس میں بعض جزئیاتِ فقہیہ کے حوالہ سے اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے یہاں اُن جزئیات فقہیہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے، تاکہ مسئلہ کی پوری حقیقت واضح ہو جائے، واللہ الموفق!

یہ بات تو ظاہر ہے کہ یہ آلہ نہ تو عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وخلافتِ راشدہ میں موجود تھا کہ اس کا کوئی واضح حکم قرآن وسنت میں مذکور ہوتا اور نہ ائمہ مجتہدین کے دور میں

موجود تھا کہ ان کے کلام میں ہی کوئی واضح حکم اس کا مل جاتا، آج کے اہل علم اور اہل فتویٰ کے لئے صرف یہی اُصولِ کار ہوسکتا ہے کہ قرآن وسنت اور اقوالِ ائمہ میں ایسی نظیریں تلاش کریں جن سے اس آلہ کی آواز کا حکم معلوم ہوسکے۔

فقہاءِ متأخرین میں سے علامہ ابن عابدین شامیؒ نے ردالمحتار میں نیز اپنے ایک مستقل رسالہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ بڑی جماعتوں میں جہاں یہ طریقہ جاری ہے کہ امام کی تکبیرات کو کوئی مقتدی بآواز بلند پکار دیتا ہے جس کو عرف میں مکبّر یا مبلغ کہتے ہیں پچھلی صفوں کے مقتدی جو کہ امام کی آواز نہیں سنتے اس کی تکبیر پر رکوع وسجدہ وغیرہ کرتے ہیں، اس کے لئے شرط یہ ہے کہ مکبّر یا مبلغ تکبیر تحریمہ میں نیت تکبیرِ تحریمہ کی کرے، اور ساتھ ہی بلند آواز سے کہنے کا یہ مقصد بھی ہو کہ پچھلی صفوں کے لوگ باخبر ہوجائیں، اور اگر اس نے صرف دوسروں کو اطلاع دینے ہی کی نیت کی خود اپنی تکبیرِ تحریمہ کی نیت نہیں کی تو اس کی نماز نہیں ہوئی، کیونکہ تکبیر تحریمہ فرض ہے، وہ فرض نیت نہ کرنے کی وجہ سے ادا نہیں ہوا، اور جب اُس کی نماز صحیح نہ ہوئی تو یہ نماز سے خارج رہا، اب جن لوگوں نے اس کی آواز پر تکبیر تحریمہ کہی انہوں نے اس شخص کا اتباع کیا جو نماز میں داخل نہیں، لہٰذا اُن کی بھی نماز نہیں ہوئی۔

اس جگہ علامہ شامیؒ اور حمویؒ وغیرہ نے اس کی بھی تصریح کردی کہ اس مسئلہ میں نماز کو فاسد کہنے کی بنیاد اس اُصول پر رکھی گئی ہے کہ نماز کے اندر کسی ایسے شخص کا جو شریکِ نماز نہ ہو اتباع کرنا مفسدِ نماز ہے، یہ قریب ترین جزئیۂ فقہیہ ہے جو مسئلۂ زیر بحث کی بنیاد بن سکتا ہے، جس کو عمدۃ المتاخرین علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے اور جن حضرات نے آلۂ مکبّر الصوت کی آواز کے اتباع کو مفسد نماز قرار فرمایا ہے ان کا استدلال اسی جزئیہ سے ہے، اس جزئیۂ فقہیہ کی پوری تنقیح وتحقیق کرلی جائے تو مکبّر الصوت کا مسئلہ بآسانی حل ہوسکتا ہے۔

تحقیق یہ کرنا ہے کہ یہ مسئلہ اور اس کا بنیادی اُصول خود امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ مجتہدین سے صراحۃً منقول اور منصوص ہے یا اُن کے کسی اشارہ سے

متأخرین نے استخراج کیا ہے؟ اور یہ کہ اگر متأخرین کا استخراج ہے تو سب اس پر متفق ہیں یا اُن میں بھی اختلاف ہے؟ اور یہ کہ یہ استخراج ائمۂ مجتہدین کی کس نص سے متعلق ہے؟ اور وجہ استخراج کیا ہے؟ اور حضرات مجتہدین کی یہ نص ادلۂ شرعیہ میں سے کس دلیل پر مبنی ہے؟ اس مسئلہ کی تنقیح کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت پر یہ جزئیہ منطبق ہوتا ہے یا نہیں؟

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کو ایک مستقل رسالہ میں تحریر فرمایا ہے جس کا نام ہے "**تنبیہ ذوی الأفہام علیٰ احکام التبلیغ خلف الامام**" یہ رسالہ رسائل ابن عابدین مطبوعہ استنبول میں شامل ہے، اس میں علامہ موصوف نے خود تصریح فرمادی ہے کہ یہ مسئلہ خود امام اعظمؒ یا ائمہ مجتہدین سے منقول و منصوص نہیں، بلکہ متأخرین میں سے بھی صرف حمویؒ نے شیخ الشیوخ غزیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے، اُن کے الفاظ یہ ہیں:۔

وَلَمْ اَرَ مَنْ صَرَّحَ بِخُصُوْصِ مَسْئَلِتِنَا سِوىٰ مَا مَرَّ عَنِ الْحَمَوِیِّ. (رسائل ابن عابدین ص:۱۴۰)

البتہ اس مسئلہ کی بنیاد جس اُصول اور کلیہ پر رکھی گئی ہے کہ نماز کے اندر خارجِ نماز شخص کا اتباع مفسدِ نماز ہے، اس کی بہت سے مثالیں کتبِ فقہ میں مذکور و موجود ہیں، مگر ان میں سے بہت سی مثالوں میں فقہاء کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوتی، اس لئے مطلقاً اتباعِ خارج کو مفسدِ کہہ دینا صحیح نہیں، بلکہ یہ تحقیق کرنا لازمی ہے کہ اتباعِ خارج یا تلقّن من الخارج کو موجبِ فساد قرار دینا کس علت پر مبنی ہے؟ اور وہ علت کہاں پائی جاتی ہے کہاں نہیں؟ اور آلہ مکبّر الصوت کی آواز میں وہ علت موجود ہے یا نہیں؟

اس لئے ہم پہلے اُن جزئیات فقہیہ کو لیتے ہیں جن میں خارجِ نماز شخص کا اتباع لازم آتا ہے، اور اُن جزئیات پر جو کچھ فقہاء کی آراء اور احکام ہیں اُن کا ذکر کرتے ہیں، جزئیات اس کی بہت ہیں، اُن میں سے چند کا ذکر بقدرِ ضرورت کیا جاتا ہے، وہ یہ ہیں:۔

۱:۔ ایک نمازی کو کسی ایسے شخص نے جو نماز میں شریک نہیں سلام کیا، نمازی نے

ہاتھ یا سر کے اشارہ سے جواب دے دیا۔

۲:۔ایک خارجِ نماز شخص نے کسی نماز پڑھنے والے کو روپیہ دکھلا کر پوچھا کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا؟ اس نے نفی یا اثبات کا اشارہ کر کے جواب دے دیا، کبیری شرح منیہ میں حلبیؒ نے دونوں کے متعلق لکھا ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوئی۔

۳و۴:۔شرح منیہ ہی میں کتاب المتجانس کے حوالہ سے دو مثالیں اور نقل کی ہیں، ایک یہ کہ کسی خارجِ نماز شخص نے نماز پڑھنے والے سے کہا کہ آگے بڑھ جاؤ! وہ آگے بڑھ گیا، مقصد یہ ہے کہ اس کو آگے بڑھا کر امام بنادے اور خود اس کا مقتدی ہو کر جماعت کرے، (صرح بہ فی ردالمختار) اس کے ساتھ ایک اور جزئیہ ہے کوئی شخص جماعت میں شرکت کے لئے ایسے وقت پہنچا جبکہ اگلی صف بھر چکی ہے، اور پچھلی صف میں یہ اکیلا ہے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صف میں سے کسی کو کھینچ کر پیچھے لے آئے اور نمازی کو چاہئے کہ اس کے کہنے سے پیچھے آجائے، اس کو جمہور فقہاء نے جائز رکھا ہے، اصح اسی کو قرار دیا ہے کہ اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی، **کما فی باب الامامۃ من ردالمحتار عن المنح.**

(ج:۱/ص:۵۳۳)

دوسرے یہ کہ صف کے درمیان میں کوئی خلا باقی تھا اُس کو پورا کرنے کے لئے کوئی شخص اس خلا میں داخل ہو گیا، اور پاس والے نمازیوں نے دائیں بائیں ہٹ کر اُس کو جگہ دے دی، اس میں بھی اتباعِ غیر امام پایا جاتا ہے، مگر ان دونوں جزئیات کے متعلق فقہاء رحمھم اللہ کے مختلف اقوال ہیں، اور صحیح و مختار قول یہ ہے کہ مفسدِ نماز نہیں۔

اور ان تینوں جزئیات میں جن حضرات نے فسادِ نماز کا حکم نہیں کیا اس کی علت یہ قرار دی ہے کہ ان میں دراصل اتباع یا جواب اس شخص کا نہیں بلکہ امرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے، جس میں آپؐ نے یہ حکم دیا ہے کہ صفوں کے درمیانی خلاء کو پورا کرو، یا اکیلے صف کے پیچھے کھڑے نہ ہو، یا یہ کہ اگر صرف دو آدمی ہوں تو وہ بھی جماعت اس طرح

کر سکتے ہیں کہ ایک ذرا آگے کھڑا ہو جائے اور مقتدی اس کے داہنے طرف ذرا پیچھے، یہ احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو قولاً یا عملاً بتلائے گئے ہیں، جس نمازی نے کسی کے کہنے یا اشارہ کرنے سے آگے پیچھے یا دائیں بائیں ہٹنے کا عمل کیا، اس نے درحقیقت اُس شخص کا اتباع نہیں بلکہ امرِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا ہے، کما صرح بہ الطحطاوی فی شرح الدر، (ج:۱/ص:۲۴۷)

جزئیات فقہیہ مذکورہ کے متعلق فقہاء کی تصریحات کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:۔

کبیری شرح منیہ میں ہے:۔

۱: ولو ردّ المصلی السّلام بیده او برأسه و طلب منه شئی فأومیٰ برأسه أو عینیه أو حاجبیه أو قال نعم أو لا فانّ صلوته لا تفسد بذالک.

۲: وکذا لو أراه انسان دوهما و قال أجید هو؟فأومیٰ بنعم أو لا لعدم العمل الکثیر فی جمیع ذٰلک.

۳: و فی أحکام القراٰن للحوانیؒ ولا باس للمصلّی ان یجیبه برأسه، ذکره الزاهدیؒ.

۴: وذکر عن کتاب المتجانس لو قیل للمصلّی تقدّم فتقدم.

۵: او دخل فرجة الصف احد فتجانب المصلّی توسعة له فسدت صلٰوته لانه امتثل غیر أمرالله تعالیٰ فی الصلٰوة و ینبغی ان یمکث ساعة ثم یتقدم برأیه قال یعنی نفسه فالا جابة بالرأس او بالید مثله، انتهٰی.

۶ : و قد يفرق بأنها ليس فيها امتثال أمر .

(شرح منیہ مجتبائی ص:۴۲۱)

اور علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ تنبیہ میں شرح منیہ کی یہ عبارت لکھنے کے بعد لکھا ہے:

والمصرّح به ان الا جابة بالرأس لا بأس بها. (ص:۱۴۰)

اور البحر الرائق میں لکھا ہے:

لم يعرف ان احدا من اهل المذهب نقل الفساد فی رد السلام باليد. (بحر ج:۲/ص:۹)

اور درمختار نے یہ جزئیات تین جگہ لکھے ہیں، ایک باب الامامۃ میں اور دو جگہ مفسدات صلوٰۃ میں، باب الامامۃ میں یہ جزئیات نقل کر کے لکھا ہے:

۷: لكن نقل المصنف وغيره عن القنية وغيرها ما يخالفه ثم نقل تصحيح عدم الفساد فی مسئلة من جذب من الصف فتأخر ثم فرق فليحرّر ،اه.

اس پر علامہ شامیؒ اور طحطاویؒ کی تحقیقات حسب ذیل ہیں:۔

۸: قال، ط، قوله(مايخالفه) من فساد الصلوٰة به لانه امتثل امر الله علٰى لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم الذى لا ينطق عن الهوىٰ(قوله فليحرّر)حرّر الشرنبلالى فى شرح الوهبانية فانه ما ذكر الحديث الذى ذكره الشارح قال وبه يندفع ما نقل عن كتاب يسمّى المتجانس انه اذا قيل لمصل تقدّم او دخل

فرجة الصف أحد فتجانب المصلى توسعة له فسدت صلوٰته لانه امتثل أمر غيرالله فى الصلوة لانّ امتثاله انّما هو لأمر رسول الله فلا يضرّ. اه ماللشرنبلالى وما نقل عن القنية انما هو عين ماعن المتجانس، حلبى، أقول لو قيل بالتفصيل بين كونه امتثل أمر الشارع فلا تفسد و بين كونه امتثل أمر الداخل مراعاة لخاطره من غير نظر الى أمر الشارع فتفسد لكان حسناً.

(طحطاوی علی الدرج:۱/ص:۲۴۷)

۹: علامہ شامیؒ نے بھی اس جگہ مصف کا قول منح سے یہ نقل کیا ہے کہ:۔

لو جذبهٗ اٰخر فتأخر الاصح لا تفسد صلوٰته.

۱۰: اور البحر الرائق، باب الامامۃ میں بھی اس مسئلہ میں اختلاف نقل کرنے کے بعد لکھا:۔

والأصح انه لا تفسد صلوٰته. (بحرج:۱/ص:۳۷۴)

۱۱: نیز البحر الرائق، باب الامامۃ میں اس کے بعد لکھا ہے کہ صف کے درمیان کوئی خلا دیکھ کر باہر سے آنے والا جب اس میں داخل ہو تو نمازیوں کو چاہیے کہ اس کو جگہ دینے کے لئے دائیں بائیں کچھ سرک جائیں (بحر ص:۳۷۵)، اس جگہ قنیہ اور کتاب المتجانس کے دونوں جزئیات کے بارہ میں درمختار نے مصنف کی طرف سے عدم فساد کی تصحیح کرنے کے بعد کوئی فیصلہ نہیں کیا، بلکہ فلیحرر کہہ کر فقہاء کو دعوتِ فکر دے دی، اور شرنبلالی نے واضح کر دیا ہے کہ ان صورتوں میں فسادِ نماز کا حکم صحیح نہیں ہے، اور علت یہ قرار دی ہے کہ اس میں دراصل اس شخص کا اتباع نہیں جس نے مقتدی کو آگے پیچھے ہونے کا اشارہ کیا ہے، بلکہ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا ہے۔

اور طحطاویؒ نے بہت معتدل فیصلہ یہ فرمایا کہ مدار ہٹنے والے کی نیت پر ہے، اگر محض آنے والے کی خاطر آگے پیچھے یا دائیں بائیں ہٹ گیا تو نماز فاسد ہوگئی، کیونکہ اس نے نماز میں اَمرِ غیر اللہ کا اتباع کیا، اور اگر اس کی خاطر نہیں بلکہ یہ سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہی ہے کہ جب کوئی مقتدی صف کے اندر گنجائش دیکھ کر بیچ میں داخل ہونا چاہے تو کچھ سمٹ کر یا دائیں بائیں ہٹ کر اُس کو جگہ دیدو، اسی طرح اگر پچھلی صف میں صرف ایک آدمی ہے وہ اگلی صف کے کسی آدمی کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کرے تو اس میں امرالٰہی سمجھ کر ہٹا تو نماز میں کوئی فساد نہیں، اور اگر صرف آنے والے کی خاطر سے ہٹا تو بے شک نماز فاسد ہوگئی۔ اور علامہ شامیؒ نے بھی اس جگہ تقریباً وہی بات فرمائی جو طحطاویؒ نے لکھی، حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے فتویٰ نمبر: ۴۴۸ مندرجہ امداد الفتاویٰ جلد اول صفحہ: ۳۵۵ میں طحطاویؒ کے اس فیصلہ کو بہت مستحسن قرار دیا ہے، اسی طرح مفسدات الصلوٰۃ درِمختار میں جہاں ان جزئیات کا ذکر آیا تو علامہ شامیؒ نے اس پر لکھا:

و قدمنا عن الشرنبلالی عدم الفساد و تقدم الکلام علیه هناک.

تیسری جگہ مفسداتِ صلوٰۃ ہی کے آخر باب میں درِمختار نے ان جزئیات کو دُہرایا تو وہاں یہ الفاظ لکھے:

اما لو قیل تقدّمُ فتقدَّمَ او دخل فرجة الصف احد فوسع له فوراً فسدت صلوته، ذکره الحلبی و غیره خلافاً لما مر عن البحر اھ.

اس جگہ طحطاویؒ نے ان دونوں جزئیوں کے متعلق یہ الفاظ تحریر فرمائے:

(قوله خلافاً لما مر عن البحر) من عدم الفساد وهو المعتمد. (طحطاوی ج:۱/ص:۲۷۲)

ان پانچوں جزئیات میں اتنی بات قدر مشترک ہے کہ نمازی نے خارجِ نماز شخص

کے کہنے پر نقل وحرکت کی، اور محققین فقہاءؒ نے ان پانچوں صورتوں میں صحیح اور راجح اس کو قرار دیا کہ نماز فاسد نہیں ہوئی، البتہ شرح منیہ میں پہلے دو اور آخر کے تین جزئیات میں بطورِ احتمال کے ایک فرق کا ذکر کیا ہے کہ ابتدائی دونوں جزیئے جن میں نمازی نے خارج نماز شخص کی بات کا جواب سر یا ہاتھ کے اشارہ سے دیا ہے، اُن میں جواب تو ہے مگر اتباع یا امتثالِ امر نہیں ہے، اور آخری تین جزئیات میں اتباع اور امتثال امر بھی ہے، مگر حسب تصریحاتِ مذکور الصدر اس اتباع وامتثال کو بھی فقہاء نے اس بنیاد پر جائز رکھا کہ یہ اتباع درحقیقت اس شخص کا نہیں جو خارجِ نماز ہوتے ہوئے اس کام کے لئے کہہ رہا ہے بلکہ اتباع اَمرِ شارعؑ کا ہے جو تسویۂ صفوف کے بارے میں وارد ہوا ہے۔

آلۂ مکبّر الصوت

اب اِن نظائر فقہیہ کو دیکھنے اور ان کے متعلق فقہاء کی تصریحات کو جاننے کے بعد اپنے مسئلۂ زیر بحث پر نظر ڈالئے کہ اس میں علتِ فساد کیا چیز ہوسکتی ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ اس کی آواز کو اگر عینِ متکلم کی آواز قرار دیا جائے جیسا کہ کہ بہت سے ماہرینِ سائنس کا قول ہے کہ، تو فسادِ صلوٰۃ کی کوئی وجہ کسی درجہ میں بھی نہیں ہوسکتی، اور اگر اس کو دوسرے ماہرینِ سائنس کے قول کے مطابق متکلم کی آواز سے الگ غیر آواز قرار دیں تو فسادِ صلوٰۃ کی وجہ یہ کہی جاسکتی ہے کہ اس کی آواز کا اتباع غیر امام یا خارج شخص کی آواز کا اتباع ہے، لیکن خارجِ نماز شخص کے اتباع کے متعلق مذکور الصدر پانچ جزئیاتِ فقہیہ میں آپ معلوم کرچکے ہیں کہ فقہاء کے نزدیک راجح اور صحیح قول یہی ہے کہ اس اتباع میں جہاں امر غیر اللہ کا اتباع مقصود نہ ہو تو صرف اس وجہ سے کہ کسی خارج شخص کے کہنے یا اس کے اشارہ کرنے پر نقل وحرکت کی گئی اس کو مفسدِ نماز کہنا صحیح نہیں۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت کی آواز پر تکبیرِ تحریمہ یا تکبیراتِ انتقالیہ ادا کرنے میں اس کا دُور دُور بھی کوئی احتمال نہیں کہ اس آلہ کی خاطر سے اس کا اتباع کیا جارہا ہے، یہاں تو بجز اتباعِ امر اللہ کے اور کوئی احتمال ہی نہیں کہ نماز پڑھنے والا امر الٰہی کے تابع تکبیر تحریمہ اور دوسری تکبیرات امام کے ساتھ کہنا چاہتا ہے مگر اس کو امام کا حال بوجہ دور ہونے کے معلوم نہیں، آلۂ مکبر الصوت کی آواز نے اس کو یہ خبر دی کہ اب امام نے تکبیر تحریمہ کہی ہے، اب رکوع میں گیا ہے، اب سجدہ میں جارہا ہے، اس کی آواز کے ذریعہ نمازی باخبر ہو کر امرِ الٰہیٰ کی اطاعت بجالاتا ہے، تو اس میں کوئی وجہ فسادِ نماز کی نہیں ہوسکتی، امر الٰہی اس کے متعلق ''وَارْکَعُوْا مَعَ الرَّاکِعِیْنَ'' ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِیُؤْتَمَّ بِهٖ فَاِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا. الحدیث (بخاری و مسلم)

امام اسی لئے تو بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، تو جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو، جب وہ سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو۔

حلبیؒ نے شرح منیہ میں اور طحطاویؒ اور شامیؒ نے شرح درِمختار میں یہ بات واضح کردی ہے کہ مطلقاً کسی خارجِ شخص کا اتباع مفسدِ نماز نہیں ہوسکتا، جب تک اس میں اَمرِ غیر اللہ کا اتباع مقصود نہ ہو، آلۂ مکبر الصوت کی آواز پر نقل وحرکت میں حکمِ آلہ کے اتباع کا احتمال ہی نہیں، اس سے واضح ہوگیا کہ ان سب فقہاء کے اقوال کے مطابق آلۂ مکبّر الصوت کی آواز پر نقل وحرکت کرنے میں فسادِ نماز کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

خود علامہ شامیؒ نے اپنے رسالہ ''تنبیہ'' میں، جو خاص اسی مسئلہ مکبّر یا مبلغ کے لئے لکھا ہے، اگرچہ خارج نماز کی آواز پر تکبیر تحریمہ کہنے کو حمویؒ کے حوالہ سے مفسدِ نماز لکھا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اسی رسالہ میں یہ بھی لکھ دیا:

و نقل عن ذٰلک الکتاب ان الاجابة بالرأس لا بأس بها ولم أر من صرح بخصوص مسئلتنا سوی مامر عن الحموی وهذا الفرع اشبه بها من غيره لان الاجابة فيهما بالفعل.

(ترجمہ) یعنی شارح منیہ نے اسی کتاب المتجانس سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سر یا ہاتھ سے کسی بات کا جواب دینا بھی کسی کے کہنے سے آگے پیچھے ہو جانے کی طرح ہے، لہٰذا یہ بھی مفسدِ نماز ہونا چاہئے، لیکن شارح منیہ نے المتجانس کا یہ کلام نقل کر کے خود اس کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ فرمایا کہ ان دونوں میں یہ فرق کیا جا سکتا ہے کہ سر یا ہاتھ سے اشارہ کرنے کی صورت میں دوسرے کا حکم ماننا یا اتباع کرنا محقق نہیں۔

پھر علامہ شامیؒ نے شارحِ منیہ کے اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ حضراتِ فقہاء کی تصریحات اسی پر شاہد ہیں کہ سَر یا ہاتھ کے اشارہ سے جواب دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور مسئلۂ زیرِ بحث یعنی مکبر خارجِ نماز کی آواز پر نقل وحرکت کو مفسدِ نماز قرار دینے کا قول میں نے سوائے حمویؒ کے اور کسی سے منقول نہیں دیکھا، اور مکبّرِ خارجِ نماز کا مسئلہ سَر یا ہاتھ کے اشارہ کے مسئلہ کے ساتھ بہت اشبہ اور ملتا جلتا ہے کیونکہ اس میں بھی زبان سے کسی بات کا جواب نہیں بلکہ صرف عمل سے ہے۔

علامہ شامیؒ کی تحریر مذکور سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ مکبّرِ خارجِ نماز کی تکبیر پر نقل وحرکت کرنے سے فسادِ نماز کا حکم صریح طور پر ائمہ مجتہدینؒ سے منقول نہیں اور فقہاءِ متاخرینؒ میں سے بھی جزئیہ کے طور پر صرف علامہ حمویؒ نے لکھا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ جو کچھ علامہ حمویؒ نے لکھا ہے وہ بھی از روئے دلیل ایسی قطعیت نہیں رکھتا کہ اس میں دوسری رائے کی گنجائش نہ ہو، بلکہ اس مسئلہ کو اشارہ بالید و بالرأس کے

ساتھ اشبہ فرمایا ہے، جس میں جوازِ نماز کا حکم واضح اور راجح ہے، اور یہ سب بحث دوسری صورت میں ہے، جبکہ مکبّر کوئی ذی روح متحرک بالارادہ ہے، جس کی حرکت شرعاً وعقلاً اسی کی طرف منسوب ہوتی ہے، اور جہاں مکبّر کوئی آلہ بے جان ہے جس کی حرکت شرعاً وعقلاً اسی محرک کا عمل سمجھی جاتی ہے، تو معاملہ اور بھی اہون ہو جاتا ہے کہ اُس کی آواز پر نقل وحرکت کرنے کو مفسدِ صلوٰۃ نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہاں آلہ کے اتباع واقتداء کا کوئی محرک نہیں، بلکہ محرکِ آلہ امام ہی کی اتباع واقتداء ہے۔

یہ پانچ جزئیات فقہیہ تو ایسے ہیں جن میں نمازی نے کسی انسان خارج نماز کا جواب دیا، اس کے کہنے کا اتباع کیا، اور فقہاء نے اس کو مفسدِ نماز نہیں قرار دیا۔ ایک چھٹا جزئیہ اس سلسلہ کا نماز میں قرآن کو دیکھ کر تلاوت کرنا ہے کہ کوئی شخص نماز میں تلاوت اس طرح کرے کہ قرآن مجید کو سامنے کھول کر رکھ لے یا ہاتھ میں لے اور اس کو دیکھ کر پڑھے، یا محراب پر قرآن کریم کی کوئی سورت لکھی ہو، اس کو دیکھ کر پڑھے، اس میں بھی خارجِ نماز سے استفادہ اور اس کا اتباع ہے، اور یہ جزئیہ مسئلہ زیر بحث آلۂ مکبّر الصوت کے ساتھ زیادہ اشبہ ہے، کیونکہ اس میں بھی استفادہ کسی ذی رُوح متحرک بالارادہ سے نہیں بلکہ مصحف سے ہے، اس کے متعلق فقہاء کی تصریحات یہ ہیں: ائمۂ اربعہ میں سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو مفسدِ نماز فرماتے ہیں، اور دلیل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے کہ:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے منع فرمایا کہ ہم لوگوں کی امامت اس طرح کریں کہ قرآن میں دیکھ کر تلاوت کریں۔

یہ حدیث مغنی ابن قدامہ میں بحوالہ کتاب المصاحف ابوبکر بن داؤد مذکور ہے، اور امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور ائمہ حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ تو اس کے قائل ہیں کہ اس عمل سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ امام یوسفؒ اور امام محمدؒ اس کو اس

بناء پر مکروہ فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ یہود و نصاریٰ اہلِ کتاب کا ہے، اُن کے ساتھ تشبہ کرنا مکروہ ہے، اور ان حضرات کا ستدلال اُس حدیث سے ہے جس کو امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں اور دوسرے ائمہ حدیث نے اپنی اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خادم حضرت ذکوان رضی اللہ عنہ تراویح رمضان میں اُن کی امامت کرتے تھے اور قرآن مجید کو مصحف سے پڑھا کرتے تھے''۔

نیز عینی شرح بخاری میں نقل کیا ہے کہ ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نماز پڑھتے تو ان کا ایک غلام قرآن شریف لے کر اُن کے پیچھے کھڑا ہو جاتا، جب وہ کسی آیت میں بھولتے یا تردّد کرتے تو وہ قرآن کریم کھول کر آگے کر دیتا تھا، اور حضرت انسؓ اس طرح اس سے مدد لے کر تلاوت کو درست فرما لیتے''۔ (عمدۃ القاری ج:۵/ص:۲۲۵)

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے نماز میں اس طرح تلاوت کرنے کو مفسدِ نماز قرار دیا ہے، فقہاء حنفیہ نے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کو دو وجہ بیان کی ہیں:

اول یہ کہ ایسا کرنے میں عمل کثیر ہوگا کہ قرآن شریف کو ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوگا، پھر اُس کے ورق اُلٹے گا، تو یہ ایک ایسا عمل ہوگا جس کو دیکھنے والا قطعاً یہی سمجھے گا کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھ رہا، اور یہی صحیح تعریف ہے عمل کثیر مفسدِ صلوٰۃ کی۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں خارج سے تعلیم و تعلّم اور تلقّن پایا جاتا ہے، اور یہ خود ایک عمل کثیر ہے، پہلی وجہ کی بناء پر تو اگر کوئی ایسا کرے کہ قرآن شریف کھول کر سامنے رکھ لے اور اوراق نہ بدلے، یا محراب پر لکھا ہوا دیکھ کر پڑھ لے تو نماز فاسد نہیں ہوگی، مگر دوسری وجہ پر مطلقاً فاسد ہو جائے گی، اور مبسوطؔ، زیلعیؔ وغیرہ میں اسی دوسری وجہ کو ترجیح دی ہے۔

لیکن حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی فسادِ نماز کا حکم صرف اس صورت میں ہے کہ جبکہ قرآن اس کو یاد نہ ہو، صرف دیکھ دیکھ کر ہی پڑھتا ہو، اور اگر

قرآن کریم یاد ہے مگر محض امداد کے لئے قرآن مجید کھول کر سامنے رکھ لیا ہو کہ ضرورت پڑے تو اس پر نظر کرنے سے آیت یاد آ جائے گی، یہ صورت باجماع مفسد نماز نہیں، فقہاء محدثین کی تصریحات اس بارے میں حسب ذیل ہیں:۔

شمس الائمہ سرخسیؒ کی مبسوط میں ہے:

و اذا قرأ في صلوته من المصحف فسدت صلوته عند ابي حنيفةؒ، وعند ابي يوسف ومحمد صلوته تامة ويكره و قال الشافعي لا يكره لحديث ذكوانؓ انه كان يؤمها في رمضان وكان يقرء من المصحف ولا نه ليس الا حمل المصحف بيده والنظر فيه ولو حمل شيئاً اٰخر لم تفسد صلوٰته الا انهما كرها ذلك لانه تشبّه باهل الكتاب ولا بي حنيفةؒ طريقان احدهما ان حمل المصحف و تقليب الاوراق والنظر فيه والتفكر فيه عمل كثير وهو مفسد للصلوٰة كالرمي بالقوس وعلى هذا الطريق يقول اذا كان المصحف موضوعاً بين يديه او قرأ بما هو مكتوبٌ على المحراب لم تفسد صلوته والاصح ان يقول انة تلقّن من المصحف فكانّه تعلّم من معلّم و ذلك مفسد لصلوٰته. (مبسوط ج:۱/ص:۲۰۱)

اور البحر الرائق میں اس مسئلہ کی تفصیل لکھنے کے بعد فرمایا کہ صاحبینؒ کے نزدیک جو اس کو تشبہ باہل الکتاب کی وجہ سے مکروہ قرار دیا ہے وہ بھی عام نہیں بلکہ:

انما التشبّه الحرام باهل الكتاب فيما كان مذموماً

وفيما يقصد به التشبّه كذا ذكره قاضى خان فى شرح جامع الصغير ، فعلىٰ هذا لو لم يقصد التشبّه لا يكره عندهما. (بحر ج:۲/ص:۱۱)۔

اور زیلعیؒ نے شرح کنز میں مبسوط کی مذکورہ تفصیل لکھنے کے بعد لکھا ہے:۔

ولو كان يحفظ القرآن و قرأه من مكتوب من غير حمل المصحف قالوا لا تفسد صلوٰته لعدم الا مرين، تبيين.
(زیلعی ج:۱/ص:۳۹۸)

اسی طرح حلبیؒ نے شرح منیہ میں یہ سب تفصیل نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

هذا اذا لم يكن حافظا لما قرأهٗ فان كان حافظاً له لا تفسد بالاجماع. (کبیری ص:۴۲۳)

اور البحر الرائق میں ہے:

و قال الرازیؒ قول ابى حنيفةؒ محمول علىٰ من لم يحفظ القرآن ولا يمكنه أن يقرأ الا من المصحف فامّا الحافظ فلا تفسد صلوٰته فى قولهم جميعا، و تبعة علىٰ ذلک السرخسى فى جامع الصغير على ما فى النهاية، وابو نصر الصفار علىٰ ما فى الذخيرة...... بان هٰذه القرأة مضافة الىٰ حفظه لا الىٰ تلقّنه من المصحف، وجزم به فى فتح القدير والنهاية والتبيين، وهو أوجه كما لا يخفى. اه

منتقی باجی شرح مؤطا میں حدیثِ ذکوان نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

قال مالک لا بأس ان یؤم نظراً من لا یحفظه.

(منتقی ج:۱/ص:۲۱۰)

اور ابن قدامہ حنبلیؒ نے مغنی میں لکھا ہے:

قال الموفق قال احمد لا بأس ان یصلی بالناس القیام وهو ینظر فی المصحف اھ.

مغنی ابن قدامہ میں اس جگہ صحابہ وتابعین کے مختلف اقوال جواز وفساد کے بارے میں نقل فرمائے ہیں۔

اس جزئیہ فقہیہ کے متعلق ائمہ مجتہدین اور صحابہ وتابعین میں اختلاف اور ہر ایک کے دلائل سامنے آ گئے ہیں، جن حضرات نے فسادِ نماز کا حکم کیا اُن کی علّت بھی واضح ہوگئی کہ خارجِ نماز سے تعلیم وتلقن کو علت فسادِ نماز کی قرار دی ہے، یا یہ کہ قرآن مجید میں دیکھ کر پڑھنا اس سے سیکھنے کے حکم میں یہ تعلم وتلقن من الخارج ایک عمل کثیر ہے، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان حضرات نے تلقن اور تذکر میں فرق کیا ہے، تلقن یعنی تعلم کو عمل کثیر قرار دے کر مفسد قرار دیا ہے، اور تذکر یعنی دوسرے کی بات سن کر کوئی چیز یاد آ جانا اس کو عمل کثیر سے خارج اور غیر مفسد قرار دیا، تذکر میں تفصیل ہے کما فی الشامیۃ ص:۵۸۲۔

اس فرق کی مزید توضیح کے لئے ایک اور جزئیہ فقہیہ ملاحظہ ہو جس کو در مختار نے باب صلوٰۃ المریض میں قنیہ سے نقل کیا ہے، وہ یہ ہے:

(لو اشتبه علی المریض اعداد الرکعات والسجدات لنعاس یلحقه لا یلزمه الاداء) ولو اداها بتلقین غیره ینبغی ان یجزیه، کذا فی القنیة و قال الشامیؒ تحته، قد یقال انه تعلیم و تعلّم وهو مفسد کما اذا قرأ من

المصحف او علّمه انسان القراء ة وهو فی الصلٰوة، ط،
قلت و قد يقال انه ليس بتعليم و تعلم بل هو تذكير
اعلام فهو، كاعلام المبلغ بانتقالات الامام فتمل. اه.
(ردالمحتار ج:۱/ص:۷۱۳)

آلۂ مکبّر الصوت

اب اپنے مسئلہ آلۂ مکبّر الصوت پر اس نظر فقہی سے غور کیا جائے تو یہاں تعلیم کا تو کوئی سوال ہی نہیں، کیونکہ آلۂ مکبّر الصوت سے کوئی چیز سیکھی نہیں جاتی، بلکہ جو مقتدی پہلے سے اس فکر میں ہیں کہ امام کی آواز سنیں تو امرِ الٰہی کے مطابق اس کا اتباع کریں، اُن کو اس آلے کے ذریعہ یہ علم ہو جاتا ہے کہ اب امام نے تکبیر کہی، اُسی وقت وہ امام کا اتباع کرنے کی نیت سے تکبیر کہہ لیتے ہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو تذکیر کہا جاسکتا ہے، آلۂ مکبّر الصوت سے تو کسی بھولی ہوئی چیز کا یاد آنا بھی نہیں بلکہ جس آواز کے وہ انتظار میں تھے اس کے صادر ہونے کی اطلاع ہے، اس لئے اس کو عمل کثیر میں داخل کرنے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں ہوسکتی، اور کلام الناس سے اس کی کوئی مناسبت نہیں۔

حدیثِ صحیح اور عملِ صحابہ کرامؓ سے ایک نظیر

یہاں تک اس مسئلہ کے متناسب فقہاء کے نظائر اور جزئیات میں گفتگو تھی، اب خود عہدِ رسالتؐ کی ایک نظیر کو سمجھئے، صحیح بخاری ''باب ماجاء فی القبلہ'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ مسجد قباء میں لوگ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک آنے والا آیا، اور اس نے بیان کیا کہ آج کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ قرآن نازل ہوا اور آپؐ کو اس کا حکم دے دیا گیا کہ نماز میں (بجائے بیت المقدس کے) کعبہ کی طرف رُخ کریں،'' فاستقبلوها وكانت وجوههم الى الشام

فاستداروا الی الکعبة'' (ترجمہ) انہوں نے کعبہ کا استقبال کرلیا جبکہ اُن کا رُخ اس وقت شام یعنی بیت المقدس کی طرف تھا، (مگر یہ خبر سن کر) وہ کعبہ کی طرف پھر گئے۔''

یہ روایت بخاری و مسلم میں متعدد مواقع میں منقول ہے، اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ عینیؒ نے شرح بخاری میں فرمایا ''وفیہ جواز تعلیم من لیس فی الصلوٰة من ھو فیھا۔'' یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو کوئی نماز میں نہیں ہے وہ نماز پڑھنے والے کو تعلیم دے سکتا ہے۔'' (عمدة القاری ج:۴/ص:۱۴۸)

اور عمدة القاری ج:۱/ص:۲۴۲، میں اسی حدیث کے ذیل میں فرمایا:

> و فیہ استماع المصلی لکلام من لیس فی الصلوٰة فلا یضرّ صلوٰته (الی قوله) هٰکذا استنبطه الطحاوی منه.
>
> اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کوئی نماز پڑھنے والا کسی ایسے شخص کا جو نماز میں داخل نہیں کلام سن سکتا ہے، اور وہ اس کی نماز کے لئے مضر نہیں، یہ حکم اس حدیث سے امام طحاویؒ نے بھی اس طرح مستنبط کیا ہے۔

اسی طرح حافظ ابنِ حجرؒ نے شرح بخاری جلد اول میں صفحہ:۴۰۳ پر اسی حدیث کے ذیل میں علامہ عینیؒ کے مذکورہ دونوں مسئلوں کو حدیث مذکور سے استنباط فرمایا ہے، مگر بعد میں تحریر فرمایا کہ اس معاملہ میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہو جبکہ نماز میں عملِ کثیر اور کلام الناس جائز تھا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ عملِ کثیر اور کلام کی ممانعت کے بعد ہی ہو، مگر مصلحتِ اصلاح نماز کے لئے اس کو جائز رکھا گیا ہو۔

وجہ ان دونوں احتمالوں کی یہ ہے کہ کلام اور عملِ کثیر کی نماز میں ممانعت بھی ہجرت کے دوسرے سال میں ہوئی، اور تحویلِ قبلہ بھی ہجرت کے سولہ یا سترہ مہینے بعد دوسرے ہی سال میں واقع ہوئی ہے۔ لیکن فقہاءِ حنفیہ کے مذکورہ سابق ارشادات سے اس کی ایک تطبیق اور بھی سمجھی جاسکتی ہے، وہ یہ کہ تحویلِ قبلہ کے معاملہ میں بھی درحقیقت تعلیم و تعلم یا غیر کا اتباع

نہ تھا، بلکہ صحابہ کرامؓ کو قرآنی ارشادات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے پہلے ہی معلوم تھا کہ کہ قبلہ کا حکم بدلنے والا ہے، جب کسی آنے والے نے استقبالِ کعبہ کی خبر دی تو ان کو معلوم ہو گیا کہ اب تحویل قبلہ کا حکم ہو گیا، اس لئے ان کا کعبہ کی طرف پھر جانا اَمرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع تھا، اَمرِ غیر کا نہیں، اور جہتِ شام سے جہتِ کعبہ کی طرف مڑنے کا جو عمل کثیر ہوا وہ چونکہ اصلاح نماز کے لئے تھا اس کو معاف سمجھا گیا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُن کو اُس نماز کے اعادہ کا حکم نہیں فرمایا۔

آلۂ مکبّر الصوت

آلۂ مکبّر الصوت کی آواز پر نقل وحرکت کا معاملہ ظاہر ہے کہ اس واقعۂ تحویلِ قبلہ کی نسبت بہت ہی اَہون ہے، اور علامہ عینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ اور امام طحاویؒ نے اس واقعہ سے اس اَمر کا استنباط کیا ہے کہ نماز کو خارجِ نماز شخص سے کسی قسم کا ستفادہ کرنا جائز ہے موجبِ فساد نہیں۔

خلاصۂ کلام

یہ سات جزئیاتِ فقہیہ جو اس وقت ذکر کی گئی ہیں آلۂ مکبّر الصوت کی آواز پر نقل وحرکت کے لئے نظیریں اور مثالیں بن سکتی ہیں، ان تمام میں مدارِ بحث یہ ہے کہ ان میں:

(۱) خارج سے تعلیم وتعلّم یا تلقین وتلقّن پایا جاتا ہے (۲) یا کسی خارج شخص کی بات کا جواب ہے۔ (۳) یا اَمرِ غیر اللہ کا نماز میں اتباع ہے، اور اس جگہ اتباع سے مراد یہ ہے کہ خارج کے کلام سے متاثر ہو کر نمازی کوئی کام کرے، اصطلاحی اتباع یا اقتداء مراد نہیں: کما صرح به الشامی فی رسالته "التنبیه" اور یہ تینوں چیزیں مفسدِ صلوٰۃ ہیں۔

پھر جب اس پر غور کیا جائے کہ ان تین چیزوں کو مفسدِ نماز کس بناء پر قرار دیا تو خود فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ بناءِ فسادِ دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ہے، یا

عملِ کثیر، یا کلام الناس، اوران دونوں کا مفسد ہونا آیتِ قرآنی:

''قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِیْن'' اوراس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے:

ان هـذه الصلوٰة لا يصلح فيها شئى من كلام الناس انما هى التسبيح والتكبير و قراء ة القرأن. (رواه مسلم)

یعنی یہ نماز، اس میں لوگوں کی کوئی بات چیت درست نہیں، وہ تو صرف تسبیح وتکبیراورقرأتِ قرآن ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خارج سے استمداد یا استفادہ مطلقاً مفسدِ نماز نہیں جب تک کہ وہ عملِ کثیر یا کلام الناس کی حد میں داخل نہ ہو، اور مذکورالصدر جزئیات میں جن صورتوں کو فسادِ نماز کا سبب نہیں مانا گیا وہ اسی پر مبنی ہیں کہ ان میں اگرچہ بظاہر تعلیم وتعلم یا اتباعِ امر غیر پایا جاتا ہے مگر وہ اس درجہ میں نہیں کہ جس کو عملِ کثیر موجب فسادِ صلوٰۃ قرار دیا جائے یا عام کلام الناس کی طرح سوال وجواب یا تعلیم وتعلّم کی حیثیت دی جائے۔

فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی ان تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد مسئلہ زیر بحث یعنی آلۂ مکبر الصوت کی آواز پر نماز میں نقل وحرکت پر غور کیا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آواز پر نماز میں نقل وحرکت عملِ کثیر میں تو کسی طرح داخل کیا ہی نہیں جا سکتا، کیونکہ کسی کے کہنے سے یہاں کوئی عمل کیا ہی نہیں گیا، بلکہ باتباع امام رکوع وسجود جس کا پہلے سے یہ مأمور تھا وہ ہی بجا لایا ہے، اسی طرح کلام الناس میں داخل کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، کہا جا سکتا ہے کہ تو صرف یہ کہ اس اس میں رکوع وسجود کا وقت اور محل متعین کرنے میں اتباعِ امر غیراللہ فی الصلوٰۃ پایا جاتا ہے، لیکن مذکورہ بالا جزئیات اور فقہاء کی تصریحات میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں درحقیقت اتباع امرِ غیر نہیں، بلکہ امرِ الٰہی: ''وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ'' اورامرِ رسولؐ: ''فَاِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا'' کی تعمیل ہے، آلۂ مکبر الصوت کی آواز کا اس میں صرف اتنا دخل ہے کہ دور کے مقتدیوں کو اس کے

ذریعہ اطلاع ہوگی کہ اب امام رکوع میں گیا، اب رکوع سے اُٹھا، اب سجدہ میں گیا، اس اطلاع پر اَمرِ شرعی کی تعمیل کرلینا ان صورتوں سے بہت اَہون ہے جن میں فقہاء رحمہم اللہ نے نماز کو جائز قرار دیا ہے، کہ ہاتھ یا سر سے سلام کا جواب یا درہم کے کھرے کھوٹے ہونے کا جواب ،یا صف میں پیچھے آنے والے کے کہنے سے پیچھے ہٹ جانا ،یا کسی حافظ کا قرآن کو سامنے رکھ کر بھولنے کے وقت اس سے مدد لینا وغیرہ، اس لئے آلۂ مکبّر الصوت کی آواز کو متکلم کی آواز کا غیر قرار دینے کی صورت میں بھی فسادِ نماز کے حکم کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

حاصل یہ ہے کہ یہ مسئلہ نہ کتاب وسنت میں منصوص ہے، نہ ائمہ مجتہدین کی طرف سے اس میں کوئی تصریح ہے، فقہاءِ متاخرین میں سے بعض حضرات نے لکھا ہے، اور جن دلائل پر اُن کی بنیاد رکھی ہے وہ دوسری جزئیات فقہیہ سے متصادم ہونے کی بناء پر محلِ بحث و نظر ہے، اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ انسانِ مکلّف کے عمل سے متعلق ہے، مکبّر الصوت کے آلۂ بے جان کی اس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، جس کی تفصیل اصل رسالہ میں مذکور ہے، بایں وجوہ حکم فسادِ صلوٰۃ سے اجتناب ضروری ہے، خصوصاً اس ابتلاءِ عام کے زمانے میں کہ حرمین محترمین میں اطراف عالم سے جمع ہونے والے حجاج کی سب نمازیں اس آلہ پر ہورہی ہیں، اس کو روکنا اختیار میں نہیں، اب دو ہی صورتیں ہیں یا سب حجاج کی نمازوں کو فاسد کہا جائے، یا پھر اُن کو یہ کہا جائے کہ مساجد حرمین کی جماعت سے محروم رہیں، اس کے علاوہ پوری دنیا میں اس کا رواج عام مساجد میں ہوچکا ہے، اس حالت میں فسادِ نماز کے حکم کا صرف اتنا ہی اثر ہوسکتا ہے کہ آدھی دنیا کے مسلمانوں کی نمازوں کا فاسد اور ان کو فاسق قرار دیا جائے، ظاہر ہے کہ ایسے ابتلاءِ عام کے وقت اُصولِ فتویٰ کا مقتضا یہی ہے کہ ائمہ وفقہاء کے کلام میں رُخصت وسہولت کے پہلو تلاش کئے جائیں، اور جواز کے پہلو میں من وجہ کوئی ضعف بھی محسوس کیا جائے تو اس کو نظر انداز کرکے فسادِ نماز کے حکم سے گریز کیا جائے، یہاں تو فقہاء رحمہم اللہ کی مذکورہ تصریحات سے اور صحابہ کرامؓ کے تحویلِ قبلہ والے عمل سے قوی پہلو یہی ہے کہ فسادِ نماز کا حکم نہیں ہونا چاہئے۔

تنبیہ:۔ ا۔ اس مسئلہ میں ابتلاءِ عام کی رعایت سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہونا چاہئے کہ آج کل تو سود، قمار، رشوت، شراب، بے حیائی، داڑھی منڈانا، تصویر وغیرہ سب ہی گناہوں میں ابتلاءِ عام ہورہا ہے تو ان میں بھی سہولت و رُخصت ہونی چاہئے، وجہ ظاہر ہے کہ یہ تمام گناہ وہ ہیں جن کی حُرمت اور اُن پر وعیدیں قرآن وسنت میں منصوص اور فقہائے امت کے نزدیک مجمع علیہ ہیں، یہاں اوّل تو حکم کی بنیاد ابتلاءِ عام پر نہیں بلکہ فقہی جزئیات پر ہے، ثانیاً اس کے خلاف کوئی حکم نہ منصوصِ کتاب وسنت ہے، نہ ائمہ مجتہدین سے منقول ہے، اس لئے اُس پر محرماتِ قطعیہ کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

۲:۔ یہ تمام تحقیق وتنقیح جو فقہی روایات سے اس جگہ کی گئی یا اصل رسالہ میں لکھی، اس کا مقصد نماز میں آلۂ مکبّر الصوت کے استعمال کی حوصلہ افزائی یا استحسان ہرگز نہیں، بلکہ صرف اتنا ہے کہ فسادِ صلوٰۃ کے حکم سے اجتناب کیا جائے، باقی اس میں شبہ نہیں کہ نماز میں اس کے استعمال پر بہت سے مفاسد مرتب ہوتے ہیں، اور ضرورت کوئی داعی نہیں بلکہ اسلام کا سادہ اور مسنون طریقہ مبلغ یا مکبّر کے ذریعہ آواز کو دور تک پہنچانے کا کھلا ہوا اور بے غبار ہے۔

اس کے بعض مفاسد تو احقر نے اپنے اصل رسالہ میں لکھے ہیں اور اس پر مزید اور جدید اضافہ اس تحریر سے ہوا، جو مولانا مفتی شمس الدین صاحب بے موضع درویش ہری پور ہزارہ سے بھیجی، جس میں گوجرانوالہ کا واقعہ تحریر فرمایا کہ دو مسجدیں قریب قریب ہیں، ایک میں امام اور خطیب موجود ہے، دوسری مسجد والوں نے اپنی مسجد کے لئے جداگانہ امام وخطیب رکھنے کے بجائے بذریعہ تار مکبّر الصوت اپنی مسجد کو دوسری مسجد سے متصل کر کے اسی مسجد کے امام کے خطبہ اور نماز کی اقتداء دوسری مسجد میں شروع کردی، یا مکہ مکرمہ سوقِ مسعی کا چشم دید واقعہ یہ ذکر فرمایا کہ کچھ لوگ سوقِ مسعی میں اپنی اپنی دکانوں پر رہتے ہوئے بغری اتصالِ صفوف کے بذریعہ مکبّر الصوت امامِ حرم کی اقتداء کرنے اور نماز ادا کرلیتے ہیں، جس

کے فاسد ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا، اس طرح کے بہت سے مفاسد ہیں جو پیش آرہے ہیں اور آگے بڑھنے کا خطرہ ہے، اس لئے نماز میں اس آلہ کے استعمال سے اجتناب ہی کرنا چاہئے، خصوصاً جبکہ علماء کی ایک جماعت اس پر نماز پڑھنے کو مفسدِ صلوٰۃ قرار دیتی ہے تو خروج عن الخلاف کا مقتضا بھی یہی ہے کہ نماز میں اس سے پرہیز کیا جائے۔

واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم! اللّٰھم ھذا الجھد وعلیک التکلان، ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ.

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲؍شعبان ۱۳۸۱ھ

ضمیمۂ ثانیہ

آلۂ مکبّر الصوت کے متعلق ماہرین سائنس کی تحقیقات پہلی مرتبہ

از حکیم الامۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

یہ تحقیقات تفصیل کے ساتھ ''امداد الفتاویٰ'' اور احقر کے پہلے رسائل میں شائع ہو چکی ہے، اس لئے اُن کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

جناب شبیر علی صاحب پروفیسر سائنس علی گڑھ یونیورسٹی

نے تحریر فرمایا کہ لاؤڈ اسپیکر کے ڈائل پر سے جو آواز بلند ہو کر دور جاتی ہے وہ بجنسہٖ آوازِ متکلم یا خطیب ہوتی ہے، جو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ قوی ہو جاتی ہے، آواز دراصل ہوا میں لہروں کے پیدا ہونے کا نام ہے، جو زبان کی حرکت سے پیدا ہوتی ہیں، اور کان کے پردے پر جا کر اسی قسم کی کیفیت پیدا کرتی ہیں، کان کے پردے تک پہنچنے سے پیشتر اگر وہ لہریں ضعیف ہو چکی ہیں (جس کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں، مثلاً: بادِ مخالف یا شور و غل وغیرہ) اور پھر اُن کو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ قوی کر دیا گیا ہے، تاکہ وہ زیادہ دُور تک جا سکیں، تو ایسی صورت میں لاؤڈ اسپیکر کے بعد جو آواز نکل رہی ہے وہ فی الحقیقت اصلی ہی آواز ہے۔

آواز ڈائل پر جا کر ختم نہیں ہو جاتی، لاؤڈ اسپیکر ضعیف لہروں میں ایک قسم کی نئی جان ڈال دیتا ہے، اور یہ فعل اُن لہروں کے معدوم ہو جانے سے پیشتر ہوتا ہے، یعنی وہ لہریں متکلم کے منہ سے نکلی ہوئی بجنسہٖ اپنی اصلی حالت پر قائم ہوتی ہیں۔

ماسٹرِ سائنس الگزنڈر ہائی اسکول بھوپال

نے اپنی مفصل تحریر میں اس مسئلہ میں تردّد کا اظہار کیا

حیدر آباد دکن سے مولوی عبدالحی صاحب

نے کسی ماہرِ سائنس سے معلوم کر کے لکھا ہے کہ آواز کے متعلق علمائے سائنس کی یہ رائے ہے کہ جس جسم کے آواز سے نکلتی ہے وہ ایک خاص قسم کی ارتعاشی حرکت کرتا ہے، یہ ارتعاش حرکتِ مادہ ہوا میں بجنسہٖ منتقل ہوتی ہے، اور عام طور پر بالآخر ہوا میں منتقل ہو کر سننے والے کے کان تک پہنچتی ہے۔

مکبّر الصوت مختلف قسم کے ہیں غیر برقی نوعیت کے مکبّر الصوت میں بولنے والا بات کرتا ہے تو آواز کی موجیں براہِ راست منعکس ہو کر سننے والے تک منتقل ہوتی ہیں، بلندی آواز کی وجہ اس خاص صورت میں یہ ہے کہ موجوں کی توانائی ہوا کے وسیع رقبوں میں پھیل کر منتشر نہیں ہونے پاتی، بلکہ ایک خاص سمت میں موجوں (۱) کو ہدایت ہونے سے آواز تقریباً اپنی کامل ابتدائی توانائی کے ساتھ سامع تک پہنچ جاتی ہے، اس آواز کو بلا شبہ بولنے والے ہی کی آواز سمجھ سکتے ہیں، اس مکبّر الصوت سے آواز کا انتقال بہت دور تک نہیں ہوسکتا، اگر مکبّر الصوت برقی نوعیت کا ہے جیسا کہ معمولی لاسلکی ٹیلی فون کے ساتھ استعمال کرنے کا آلہ ہوتا ہے، تو اس کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے، یہاں آواز کے پیدا کرنے والے جسم کی ارتعاشی حرکت اپنی نوعیت بدل کر ایک دوسری قسم کی ارتعاشی صورت اختیار کر لیتی ہے، گویا کہ آواز کی نقل برقی رووں یا برقی موجوں میں تیار کر لی جاتی ہے، اور سننے والے کے لئے آلۂ سماعت میں داخل ہو کر بالآخر آواز کے مادّی ارتعاش کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے، جو کہ آواز پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے، اس طرح سننے والا نقل در نقل یا بالواسطہ طریقہ سے آواز سن پاتا ہے، ایسے لاؤڈ اسپیکروں کی آواز ابتدائی آواز کی محض نقل یا حکایت ہی سمجھی جاسکتی ہے۔ فقط۔

۳ / صفر ۱۳۴۷ھ

(۱) یعنی آواز کی لہروں کو ایک خاص آلہ کے ذریعہ کسی خاص سمت میں جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔

مکرّر تحقیق از ماہرینِ سائنس

منجانب بندہ محمد شفیع دیوبندی مقیم کراچی

سوال از ماہرینِ سائنس

نماز میں آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کی آواز پر تکبیرِ تحریمہ اور رکوع وسجدہ وغیرہ میں منتقل ہونا، پھر سلام دے کر نماز ختم کرنا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ اس مسئلہ کا مدار اس تحقیق پر ہے کہ آلہ مکبّر الصوت کے ذریعہ جو آواز دُور تک پہنچتی ہے، وہ بعینہٖ امام کی آواز ہے یا اس کی صورت یہ ہے کہ امام کی آواز سے پیدا شدہ تموج، کہ یہ آلہ اپنے اندر جذب اور محفوظ کر کے اس کو ریڈیائی طاقت سے دور پہنچا دیتا ہے، اور سنی ہوئی آواز امام کی آواز کا عکس ہوتی ہے (مثل آوازِ بازگشت) مگر چونکہ آلہ کا اس آواز کو اپنے اندر لینا اور باہر پھینکنا برقی سرعت کے ساتھ بیک وقت ہوتا ہے، اس لئے باوجود مغائرت کے ایک ہی آوازِ مسلسل معلوم ہوتی ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پہلے بھی چند ماہرین سے کی گئی تھی، لیکن اُن کے جواب مختلف آنے کی بناء پر مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی، برائے کرم اس کے متعلق اپنی رائے اور تحقیق سے مطلع فرمایئے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

جواب از کمیونیکیشن اینڈ ایلوئیلیشن ڈیپارٹمنٹ کراچی

ا:۔ جو آواز آلۂ مکبّر الصوت کے ذریعہ دُور تک پہنچتی ہے وہ بعینہٖ بولنے والے کی آواز ہوتی ہے، اور کسی صورت سے کسی قسم کا عکس نہیں ہوتی۔

۲:۔ جب کوئی شخص بولتا ہے تو اس کی آواز سننے والے تک ہوا کے ذریعہ پہنچتی ہے،

لیکن جب وہ شخص آلہ مکبّر الصوت کے ذریعہ بولتا ہے تو اس کی آواز بجائے ہوا کے بجلی کی لہروں کے ذریعہ اور اسی کی رفتار سے سننے والے تک پہنچتی ہے۔

۳:۔ یہ ہرگز صحیح نہیں کہ آلہ مکبّر الصوت آواز کو گراموفون کی طرح محفوظ کر کے برقی سرعت کے ساتھ آگے پہنچاتا ہے، فقط .... مسعود رفیع بی ایس سی

ڈپٹی ڈائریکٹر آف کمیونیکیشن اینڈ ایلویلیشن ڈپارٹمنٹ، کراچی

جواب از محکمۂ ریڈیو پاکستان

جب ہم کہیں بولتے ہیں تو جو الفاظ دوسرا شخص ہم سے سنتا ہے وہ کہنے والے اور سننے والے کے درمیان کی ہوا میں تموّج کے ذریعہ اُس تک پہنچتے ہیں، اسی تموّج کو فنی اصطلاح میں آواز کی لہریں کہا جاتا ہے، یہ لہریں واسطہ (ہوا) کے دباؤ اور پھیلاؤ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتیں، اُن کا مقابلہ پانی کے تالاب میں پتھر پھینک کر لہریں پیدا کرنے سے کیا جاسکتا ہے، بولنے والے کی آواز کی پیدا کی ہوئی لہریں مائیکروفون سے ٹکراتی ہیں اور مائیکروفون میں آواز کی لہروں کو برقی لہروں میں بدلنے کا ایک آلہ ہوتا ہے (ایمپلیفائر) یعنی اضافہ کرنے والے آلات کی مدد سے اُن برقی لہروں کی شدت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

بات یہ ہے کہ بولنے والے کی پیدا کردہ آواز کی معمولی شدت دور کے سننے والوں تک پہنچے یا نہ پہنچے، مگر یہ برقی لہریں اس مقصد کو پورا کرسکتی ہیں، کیونکہ اس صورت میں آواز کے پاٹ کو حسب منشاء بڑھایا جاسکتا ہے، یہ اضافہ کردہ برقی قوت لاؤڈ اسپیکر کو چلاتی ہے، لاؤڈ اسپیکر میں برقی لہروں کو آواز کی لہروں میں تبدیل کرنے کا ایک آلہ ہوتا ہے، چنانچہ واضح ہوگیا ہوگا کہ اس سلسلہ میں کسی منزل پر بھی بولنے والے کی آواز جذب و محفوظ نہیں ہوئی، بالفاظِ دیگر بولنے والا جس لمحہ کوئی لفظ ادا کرتا ہے اسی لمحہ برقی آلات اس کی آواز کے زور کو بڑھا دیتے ہیں، تا کہ اسے زیادہ لوگ سن سکیں۔

بارِ سوم سوال از ماہرینِ سائنس

منجانب: احقر محمد شفیع

مکرّر تحقیق کے وقت ماہرینِ سائنس کے سامنے وہ تحقیق اور جواب نہ رکھے گئے تھے جن میں اختلاف واشتباہ کی وجہ سے تحقیق مکرّر کی نوبت آئی، اس لئے تیسری مرتبہ یہ تمام جوابات اور تحریراتِ سابقہ نقل کر کے اُن کے پاس بھیجی گئی، اور سابقہ تحقیقات میں جن الفاظ سے متکلم کی آواز میں کسی قسم کی تبدیلی کا اشتباہ پایا جاتا تھا اُن پر سرخ نشان لگا کر خصوصیت سے اُن پر توجہ کر کے جواب دینے کے لئے عرض کیا گیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال نمبرا:۔ بعض مسائلِ شرعیہ کی تحقیق کے لئے یہ معلوم کرنا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ جو آواز دُور تک پہنچتی ہے یہ بعینہٖ بولنے والے کی آواز ہوتی ہے یا اس کا عکس و شبیہ ہوتی ہے؟ جیسے آوازِ بازگشت میں ہوتا ہے، یا جیسے گراموفون کی آواز ہے۔ سوال کا منشاء یہ ہے کہ آواز جو ہوا میں پیدا شدہ لہروں یا تموج کا نام ہے، لاؤڈ اسپیکر کسی منزل میں اُن کو بدل کر اُن کے مشابہ نئی لہریں پیدا کر دیتا ہے یا انہی لہروں میں کوئی جدید برقی قوت پیدا کر دیتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ لہریں منتشر ہونے سے پہلے دُور تک پہنچ جاتی ہیں، برائے کرم اس مسئلہ میں اپنی تحقیق سے استفادہ کا موقع دیا جائے۔

۲:۔ اس مسئلہ کی تحقیق پہلے بھی ماہرینِ سائنس جدید سے کی گئی تھی، اُن کے

جوابات میں کچھ اختلاف اور اشتباہ رہا، اس لئے وہ تحریریں بھی جناب کے ملاحظہ کے لئے منسلک ہیں، ان میں سے جواب (۱) نمبر او۴ تو اس مسئلہ میں صریح ہیں کہ بذریعہ لاؤڈ اسپیکر جو آواز دور تک سنائی دیتی ہے وہ بعینہٖ متکلم کی آواز ہے، اصلی آواز میں کوئی تبدیلی نہیں، تبدیلی صرف آواز کے مادّہ اور مرکب میں ہوئی کہ آواز کی لہریں جس ہوا پر سوار تھیں اب وہ ہوا برقی رَو میں منتقل ہوگئی، غرض بذریعہ آلہ سنائی دینے والی آواز کا عکس یا شبیہ نہیں بلکہ بعینہٖ متکلم کی آواز ہے۔

اور نمبر:۳ اس کے بالکل خلاف ہے یہ رائے لکھتا ہے کہ وہ اصلی آواز کا عکس ہے۔

اور نمبر۲: اس مسئلہ میں تردّد کا اظہار کرتا ہے۔

اور نمبر۵: اور نمبر۶: کی تفصیلات میں کسی کسی جگہ تبدیلی کا ذکر ہے، جس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ اصلی آواز میں تبدیلی ہوکر اس کے مشابہ دوسری آواز سنائی دیتی ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں جہاں تبدیلی کا ذکر ہے اس سے آواز کے مرکب یعنی ہوا میں تبدیلی اور اس کا برقی رَو میں منتقل ہونا مراد ہو۔

جناب سے استدعا ہے کہ کچھ وقتِ عزیز صرف فرما کر منسلکہ تحریرات پر نظر ڈال لی جائے، بالخصوص وہ مقامات جن پر سرخ نشان کر دیا گیا ہے، اُن کو ملاحظہ فرما کر اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں کہ ان مختلف آراء میں سے صحیح کیا ہے؟ اور نمبر۵: و نمبر۶: میں جن تبدیلیوں کا ذکر ہے اس سے کس قسم کی تبدیلی مراد ہے، اصلی آواز کی تبدیلی یا محض اس کے مرکب اور مادّہ میں تبدیلی؟ جزاکم اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء والسلام

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ممبر مجلس تعلیماتِ اسلامیہ دستوریہ پاکستان

---

(۱) یہ تحقیقات جس ترتیب سے شائع شدہ آپ کے سامنے ہیں، یہ نمبر اسی ترتیب کے ہیں۔ ۱۲ منہ

جواب از سول ایلوئیلیشن ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مندرجہ ذیل سطور سپردِ قلم ہیں:۔

نمبر:ا و ۴ رائیں درست ہیں۔

نمبر:۲ جب تحریر میں لائی گئی تھی تو بقول برج نندلال صاحب اس مسئلہ کے متعلق پوری تفصیلات معلوم نہیں تھیں، اس لئے اُن کی رائے فیصلہ کن نہیں سمجھی جا سکتی۔

نمبر:۳ درست نہیں۔

نمبر:۶ کا اطلاق زیرِ بحث مسئلہ پر نہیں ہوتا، کیونکہ صرف مائیکروفون، ایمپلیفائر اور لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے ریڈیائی لہریں وجود میں نہیں آتیں، اور اس لئے چھوٹی فریکوئنسی والی لہروں کے بڑی فریکوئنسی والی لہروں پر سوار ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

نمبر۵: جس میں تبدیلی کا ذکر ہے اس سے کسی دوسری مشابہ آواز کا وجود میں آنا مقصود نہیں، بلکہ آواز کی لہروں کا برقی لہروں میں اور پھر برقی رَو کا آواز کی لہروں میں تبدیلی ہونا مراد ہے، جس سے آواز کی اصلیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، موجودہ سائنس کے مطابق لاؤڈ اسپیکر سے نکلنے والی آواز بالکل وہی آواز ہے جو مائیکروفون سے ہوئی ہے، ایمپلیفائر میں طاقت حاصل کرنے کے بعد لاؤڈ اسپیکر تک پہنچی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اب پہلے کی نسبت کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے اور بہت دُور تک سنائی دیتی ہے۔

الراقم محمد الطاف علی ایم ایس سی، ایم ایس سی ای (امریکہ)

سینئر کمیونیکیشن آفیسر سول ایلوئیلیشن ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف پاکستان

انگریزی رسالہ ''دی اسٹوری آف دی آرٹی فیشل وائس''

کا اُردو ترجمہ

مصنوعی آواز کی کہانی

(شائع کردہ تعلیمی ادارہ ہری پور ہزارہ)

تعارف

از جناب علامہ ابوالخیری صاحب ایم، اے، ایم، او، ایل، ایس، ای، وی، ایچ، پی ریٹائرڈ
ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ہری پور ہزارہ

میں نے اس معلوماتی رسالہ کو، جو مصنوعی آواز سے متعلق چند پاکستانی اور غیر ملکی بلند پایہ ماہرین فن کی آراء کا مجموعہ ہے، پڑھا ہے، ان آراء کو جناب مولانا حکیم احمد حسن صاحب قریشی ساکن بھوئی گاڑ، ضلع اٹک نے اُن نوجوانانِ پاکستان، شائقین تحقیق کے مطالعہ کے لئے ترتیب دیا ہے، جو مصنوعی آواز کے بارہ میں زیادہ موثق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس مجموعہ میں عمدہ مفید علم کو ایسی شکل میں اِکٹھا کیا گیا ہے جو ایسا اندازِ بیان رکھتا ہے جو کہ تشریحی اور سیدھے سادے الفاظ میں نفسِ مضمون کو واضح کرتا ہے۔

قارئینِ رسالہ سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اس رسالہ کے مطالعہ کے بعد مصنوعی آواز کے اُصولوں کو اَحسن طریق پر سمجھ سکیں گے، اور یہ رسالہ انہیں مزید مطالعہ اور تحقیق و تجسس کا شوق بخشے گا۔ (دستخط)

ابوالخیری صاحب ایم، اے، ایم، او، ایل، ایس، ای، وی، ایچ، پی ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر

مصنوعی آواز کی کہانی

از جناب خان محمد رفیق احمد خانصاب، بی، ایس، سی، (گولڈ میڈلسٹ، علی گڑھ) سابق پروفیسر انجینئرنگ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سی اینڈ جی، فائنل گریڈ، لندن، اے، ایم، آئی، ای، پاکستان، ایم، پی، اے، ایس، اسپیشل ٹرینڈ ان ٹیلی کمیونیکیشن، میونخ جرمنی، ڈی، ای، ایس، درجہ اوّل پرنسپل ٹیلی کمیونیکیشن، اسٹاف کالج ہری پور ہزارہ۔

انسان صدیوں سے مصنوعی آواز کی سعی میں رہا ہے، لیکن اسے صدائے بازگشت کے سوا کامیابی نہ ہوسکی، آلاتِ موسیقی کے زیر و بم سے غزل، وزن اور لہجہ کا اندازہ تو ہوسکا، مگر آواز کی ہو بہو تخلیق نہ ہوسکی، بجلی کی ایجاد سے اس کی تیز رفتاری کا پتہ چلا کہ یہ ایک سیکنڈ میں ۱۷۶۰۰۰ میل جاسکتی ہے، یعنی پوری زمین کے اِردگرد سات چکر فی سیکنڈ لگاسکتی ہے، تو اس کے دیگر قواعد کے علاوہ سائنسدانوں نے اس کے ذریعہ تار بھیجنے کا طریقہ ایجاد کیا، مگر اس میں بھی حروف کے اشارے بھیجے جاتے تھے، جنہیں صحیح ترتیب سے جوڑنے کے بعد ہی مطلب نکلتا، تار کے ساتھ ساتھ جھنڈی اور شیشہ کے اشارات بھی مستعمل رہے، مگر اصل آواز کی طرح مصنوعی ساخت بہر حال اس وقت تک نہ حاصل ہوسکی، جب تک ٹیلی فون اور گراموفون نہ ایجاد ہوئے، اس کے بعد لاسلکی، وائرلیس کی ایجاد ہوئی، لیکن اس میں بھی الفاظ مقررہ علامات سے ہی بھیجے جاتے رہے، آخر کار جدید ریڈیو، ٹرانسمیٹر اور ریسیور ایجاد ہوئے، دوسری طرف متحرک فلمی تصاویر میں پہلے خاموش فلمیں بنیں، جن کے مطالب پردۂ سینما کے کنارے پر حروف کی شکل میں دکھائے جاتے تھے، اور اُن کو پڑھ کر سامعین فلم کے مطالب سمجھتے تھے، پھر ٹاکیز فلمیں جاری ہوئیں، اور ان میں ایکٹنگ اور ریکارڈنگ میں اس

طرح تطبیق دی گئی کہ کردار اور آواز بالکل متحد ہو گئے، اور اب تو فلم پر ہی اس طرح کی صدا بندی کی گئی ہے کہ جب فلم چلتی ہے تو روشنی پڑنے کی وجہ سے خود بخود فلم کے ساتھ ساتھ آواز بھی نکلتی چلی جاتی ہے، جدید ترین ایجاد ٹیپ ریکارڈ کی ہے، جس میں پلاسٹک کی ایک ٹیپ پر مشین صدا بندی کرتی ہے، اور جب جی چاہے بعد میں سنا جاسکتا ہے، علاوہ ازیں اب تو ریڈیو، ٹیلی فون بھی ایجاد ہو چکے ہیں۔

ٹیلی فون کی آواز

آواز تھوڑی ہی دُور فضا میں جانے کے بعد ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے، اور اس کی رفتار بھی سات سو پچاس میل فی گھنٹہ ہے، ان مسائل کے باوجود سائنسدان آواز کو دور دراز تک بھیجنے اور سننے کی سعی میں لگے رہے، بالآخر انہوں نے کان کے پردے کے اُصول پر ایک مصنوعی جھلی ایجاد کی اور اُسے مائیکروفون میں لگایا، مائیکروفون کی اس معدنی جھلی یا پتی میں کان کے پردے کی طرح آواز پڑنے پر ارتعاش ہوتا ہے، چنانچہ اس پتی اور بجلی کے ذریعہ ٹیلی فون میں مصنوعی آواز پیدا کی جاتی ہے، ادھر ٹیلی فون کے ریسیور میں بھی ایک مقناطیسی جز کے اوپر ایک معدنی گول پتی رکھی رہتی ہے، مقناطیس کے گرد تار میں مائیکروفون سے چلی ہوئی بجلی آتی ہے اور مقناطیسی اثر سے اس پتی میں ارتعاش پیدا کرتی ہے، ریسیور میں کرنٹ کی مقدار اور رفتار تحریک فریکوئنسی (Ferguncy) مائیکروفون میں پڑی ہوئی آواز کی مطابقت کرتی ہے، جس طرح کسی آواز سے ہوا میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے، اس طرح ریسیور کی پتی میں ارتعاش کے مطابق ہوا میں لرزہ پیدا ہوتا ہے، ہوا کا یہ لرزہ کانوں میں پہنچ کر اُسی قسم کی ہو بہو آواز کا احساس دلاتا ہے جس طرح مائیکروفون کے سامنے کی آواز ہوتی ہے، مائیکروفون میں جب کوئی بولتا ہے تو اس کی پتی میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے، یہ پتی بولنے اور سننے والے کے درمیان برقی سلسلے کا ایک جز ہوتی ہے، اور اس کے ارتعاش ہی کے مطابق کرنٹ کی مقدار اور فریکوئنسی میں تبدیلی ہوتی ہے، کرنٹ کی یہ لحہ بہ لحہ تبدیلیاں

تار سے ہوتی ہوئی ریسیور تک پہنچ کر بولی ہوئی آواز کی دوبارہ تخلیق کرتی ہیں، اس طرح مائیکروفون، ریسیور اور بجلی کے ذریعہ ایک بار نکلی ہوئی آواز کی مصنوعی تخلیق ہوتی ہے۔

بولنے والے کی آواز لاؤڈ اسپیکر تک

خطابِ عامہ (پبلک ایڈریس) میں مکبّر الصوت سے آواز آنے کے لئے کم و بیش وہی حالات کارفرما ہوتے ہیں جو ایک شخص سے دوسرے تک ٹیلی فون پر بات کرنے میں ہوتے ہیں، خطیب اور سامعین کے درمیان تین خاص برقی آلات ہوتے ہیں، مائیکروفون، اسپیچ ایمپلیفائر اور لاؤڈ اسپیکر۔ بنیادی مائیکروفون ایک خاص معدنی کوئلہ (کاربن) سے بنے ہوئے ایک گول بلاک کی شکل کا ہوتا ہے، اس کے اندر کٹے ہوئے دائرے ہوتے ہیں، جس میں کوئلہ کے باریک دانے (کاربن گرے نول) بھرے رہتے ہیں، یہ ذرّات اُوپر سے کاربن کی ایک گول پتی (ڈایافرام) سے دَبے رہتے ہیں، مائیکروفون سے بجلی کے دو تار نکلتے ہیں، ایک اس گول پتی سے لگا ہوتا ہے، دوسرا کاربن بلاک سے، کاربن کے ذرّات میں کرنٹ کو گزرنے میں ایک مقررہ رکاوٹ (رزسٹنس) ہوتی ہے، جب آواز مائیکروفون کی پتی پر پڑتی ہے تو اس میں ارتعاش ہوتا ہے، دَبنے سے ذرّاتِ کاربن بھی دبتے ہیں اور کرنٹ کو گزرنے میں رُکاوٹ کم ہو جاتی ہے، جس سے اس کی مقدار بڑھ جاتی ہے، ارتعاش ہی میں رکاوٹ بھی اسی قدر بڑھ جاتی ہے، اور نتیجتاً اس کی مقدار کم ہو جاتی ہے، اس طرح کاربن کی پتی حرکت کرتی ہے، اور اسی مطابقت سے کرنٹ کی مقدار کم و بیش ہوتی رہتی ہے، ہر آواز کے لئے مختلف کمی بیشی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مائیکروفون کے سامنے آئی ہوئی آواز کی فریکوئنسی کی مطابقت سے اس کی برقی تاروں میں ہر لمحہ بدلتی ہوئی مقدار کا کرنٹ پیدا ہوتا ہے، اس قسم کا مائیکروفون اگرچہ عام ٹیلی فون کے لئے مناسب ہے، لیکن خطابِ عامہ کے لئے زیادہ موزوں نہیں ہے، اس واسطے کہ انسانی آواز کی فریکوئنسی کی وسیع حدود میں یہ پوری مطابقت سے کام نہیں کرتا، وہ مائیکروفون جو خطاب عامہ کے کام

آتے ہیں اس بنیادی مائیکروفون میں کچھ ردّ و بدل اور مزید اصلاح کے بعد بنائے جاتے ہیں۔

مائیکروفون میں پیدا شدہ کمزور کرنٹ براہِ راست لاؤڈ اسپیکر سے آواز پیدا کرنے کے لئے ناکافی ہوتا ہے، آواز کافی بلند کرنے کے لئے مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر کے درمیان ایک تیسرا برقی آلہ ہوتا ہے، جسے ایمپلیفائر کہتے ہیں، ایمپلیفائر مائیکروفون کے کرنٹ کو کئی گنا بڑھا کر لاؤڈ اسپیکر کو دیتا ہے، یہ برقی آلہ والوز رسٹر، کنڈنسر اور ٹرانسفارمر وغیرہ سے مرتب ہوتا ہے، اور بجلی یا بیٹری کے کرنٹ سے کام لیتا ہے، کرنٹ کی طاقت کس قدر بڑھے گی یہ ایمپلیفائر کے ڈیزائن اور اس کے اجزاء کی خوبی پر منحصر ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز مختصر حدود تک پہنچانی ہے یا وسیع حدود تک، اس کے لئے ایمپلیفائر سے حاصل شدہ برقی طاقت تاروں کے ذریعہ ایک یا چند لاؤڈ اسپیکروں میں دی جاتی ہے، خود لاؤڈ اسپیکر دیکھنے میں گول اور گاؤدم ہوتا ہے، پتلے مگر سخت کاغذ کا ایک دائرہ نما تختہ کناروں پر ایک لوہے کے ڈھانچہ سے چمٹا ہوتا ہے، اور مرکز پر ایک تار کوائل کے کنارے سے لگا ہوتا ہے، ایمپلیفائر سے حاصل شدہ کرنٹ کوائل کے دونوں سروں تک تاروں کے ذریعہ لایا جاتا ہے، کوائل میں کرنٹ کی تبدیلیاں اسکی مقناطیسی خصوصیات میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے، جس سے کوئی کوائل خود بھی اپنی جگہ سے آگے پیچھے جنبش کرنے لگتا ہے اور کاغذ کا یہ خول جس سے کوائل بڑا ہوتا ہے وہ بھی اسی مطابقت سے حرکت کرتا ہے، اور کاغذ کی اسی حرکت سے اس کی اردگرد کی ہوا میں اسی مطابقت سے حرکت ہوتی ہے، اور اس کانوں میں بولنے والے کی آواز کی طرح ایک آواز کا احساس ہوتا ہے۔

مختصراً یوں سمجھئے کہ بولنے والے کی آواز سے مائیکروفون میں ارتعاش ہوکر برقی لہریں پیدا ہوتی ہیں، اور ان لہروں کی طاقت کو ایمپلیفائر کے ذریعہ بڑھایا جاتا ہے، اور یہ بڑھی ہوئی طاقت لاؤڈ اسپیکر کے سخت کاغذ کو متحرک کرتی ہے، جس سے اردگرد کی ہوا میں تحریک ہوتی ہے، اور اس سے کانوں میں آدمی کی بولی ہوئی آواز کی سی آواز کا احساس ہوتا ہے۔

ایک مثال

مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے بجلی سے بجنے والی ایک گھنٹی کی مثال کو پیش نظر رکھئے، اس گھنٹی کا بٹن دروازہ کے باہر ہوتا ہے اور گھنٹی گھر کے اندر ہوتی ہے، اب جس وقت بھی بٹن کو باہر سے دبایا جائے گا گھنٹی گھر کے اندر بجے گی، اور جس تناسب سے بٹن دبایا جاتا رہے گا گھنٹی اسی تناسب سے بجتی اور خاموش ہوتی رہے گی۔

اب یہ سمجھنا کہ گھنٹی کو اُنگلی کے دباؤ نے براہِ راست بجایا غلط ہے، یہ کام تو بجلی کے تاروں، سوئچ کی پتیوں اور گھنٹی کے اندر کے پُرزوں کے عمل کا نتیجہ ہے، انگلی کا دباؤ تو بٹن پر لگ کر ختم ہوگیا، آگے بجلی اور گھنٹی کے اندر کے مقناطیسی پُرزوں کی سب کارستانی ہے کہ گھنٹی بجتی ہے، ایسے ہی بولنے والے کی آواز سے مائیکروفون کے ڈایافرام (معدنی پتی) پر تھرتھراہٹ آکر آواز تو یہاں ختم ہوگئی، آگے سب کام بجلی کے تاروں، بجلی کے کرنٹ اور مائیکروفون اور ایمپلیفائر اور لاؤڈ اسپیکر کے پُرزوں کا ہے، جن سے دوبارہ از سرِ نو (اصلی آواز کی طرح) ہو بہو آواز پیدا ہوتی ہے۔

صدائے بازگشت اور لاؤڈ اسپیکر کی آواز میں فرق

آواز بڑھتے ہوئے دائرہ نما لہروں کی طرح فضا میں آگے بڑھتی ہے، کانوں کو اس کا پہلا احساس اس وقت ہوتا ہے جب یہ لہریں کانوں کے پردوں پر براہِ راست پڑتی ہیں، آواز سے پیدا شدہ ہوا کی کچھ لہریں سننے والے سے گزر کر آگے بڑھتی رہتی ہیں، اگر ان بڑھتی ہوئی لہروں کی راہ میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے تو یہ اس سے ٹکرا کر واپس ہوتی ہے، واپس ہوتی ہوئی لہریں بھی دوبارہ سننے والے کے کانوں تک پہنچ کر آواز کا احساس دلاتی ہیں، لیکن پہلی سنی ہوئی آواز کے کچھ دیر بعد، اس واپس آئی ہوئی آواز کو صدائے بازگشت کہتے ہیں، صدائے بازگشت اور اصل آواز میں براہِ راست تعلق ہے، اور اُن کی رفتار بھی

ایک ہے۔

لیکن لاؤڈ اسپیکر کی آواز اصل آواز نہیں ہوتی، بلکہ اسی مطابقت کی ایک جدید تخلیق ہوتی ہے، یہ تخلیق مائیکروفون سے بدلتی ہوئی بجلی کی لہروں اور لاؤڈ اسپیکر کے برقی اثرات سے حاصل ہوتی ہے، بجلی کی لہروں سے بننے والی آواز کی رفتار اصل آواز سے کئی گناہ زیادہ ہوتی ہے، چنانچہ لاؤڈ اسپیکر مائیکروفون سے بہت دور بھی رکھا ہو تب بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بولنے والے اور لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں ساتھ ساتھ نکل رہی ہیں، حالانکہ خود اصل آواز کو اتنی ہی دور جانا ہو تو کافی وقت درکار ہوگا، اگر مائیکروفون، لاؤڈ اسپیکر یا ایمپلیفائر کے کچھ اجزاء بگڑ جائیں یا بجلی فیل ہو جائے تو اس مصنوعی آواز کا مکمل بلیک آوٹ ہو جاتا ہے۔ فقط۔

مکبّر الصوت کی آواز، نمبر ۱

از رائے مسٹر ایل کینوٹ، ایم، پی، ٹی، اے، پی، ایم، جی ٹیلکم آسٹریلیا
کولمبو پلان ایکسپرٹ ٹیلی کمیونیکیشن اسٹاف کالج ہری پور ہزارہ

سوال: جب کوئی آدمی مائیکروفون میں بولتا ہے اور اس کی آواز مکبّر الصوت سے از سرِ نو پیدا ہوتی ہے تو کیا لاؤڈ اسپیکر سے نکلنے والی آواز آدمی کی حقیقی آواز مانی جا سکتی ہے؟

جواب: میری رائے میں مکبّر الصوت سے نکلنے والی آواز بولنے والے آدمی کی حقیقی آواز تسلیم نہیں کی جا سکتی، حقیقی آواز کی صوتی لہریں مائیکروفون کے ڈایا فرام پر پڑتی ہیں، جسے ایمپلیفائر لاؤڈ اسپیکر سسٹم ایسے طریقہ پر کنٹرول کرتا ہے کہ حقیقی آواز کی قابلِ شاخت نقل پیدا ہو جاتی ہے، (ری پروڈکشن) از سرِ نو پیدا کرنا کہ اس لفظ میں ہی جو ایسے سامان پر بالعموم بولا جاتا ہے یہ حقیقت مضمر ہے کہ یہ آلہ آواز کو از سرِ نو پیدا کر رہا ہے نہ کہ یہ حقیقی آواز ہے، ایک چالاک نقال یا بہروپیہ اس طرح کی مصنوعی آواز کے تماشے دکھا سکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کی نقل آواز منقول عنہ شخصیت کی واضح طور پر حقیقی آواز نہیں تسلیم کی

جاسکتی۔

سوال: کیا اس طرح کی آواز کا جسے مکبّر الصوت از سرِ نو پیدا کرنا ہے حقیقی آواز ہونے کے معیار پر صدائے بازگشت سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب: میری رائے میں ان دونوں کا آپس میں مقابلہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ لاوڈ اسپیکر سے نکلنے والی آواز کے مقابلہ میں صدائے بازگشت اصلی آواز کی بہت بہترین نقل ہے، ایک اچھی صدائے بازگشت کے بارے میں پھر بھی یہ ثبوت مہیا ہوسکتا ہے کہ وہ عملاً اصلی آواز کی جملہ خصوصیات کی حامل ہے، اور فنی طور پر یوں محسوب ہوسکتی ہے کہ وہ سوائے سمت کی تبدیلی کے باقی حیثیات سے اصلی آواز ہے، مگر بہترین ایمپلیفائر لاوڈ اسپکیر سسٹم کی پیداوار میں قطع نظر ازیں کہ وہ مصنوعی پیداوار ہے، اصلی آواز کی بعض خصوصیات بھی بدستور معدوم ہوتی ہیں۔

مکبّر الصوت کی آواز، نمبر۲

از مسٹر سی، ڈبلو، سی، رچرڈس ایسکوائر، بی، ایس، سی، انجینئرنگ انگلینڈ اے، ایم، سی، ای، اے، ایم، آئی، ای، ای کولمبو پلان، ایکسپرٹ ایڈوائزر حکومت پاکستان، ٹیلی کمیونیکیشن، اسٹاف کالج ہری پور ہزارہ۔

سوال: جب کوئی شخص مائیکروفون میں بولتا ہے اور اس کی آواز مکبّر الصوت پر ظاہر ہوتی ہے تو کیا یہ مکبّر الصوت سے نکلنے والی آواز بولنے والے کی حقیقی آواز مانی جاسکتی ہے یا ایک مصنوعی آواز ہوتی ہے؟

جواب: یہ میری سمجھی ہوئی پختہ رائے ہے کہ مکبّر الصوت سے نکلنے والی آواز یہ نہیں مانی جاسکتی کہ آدمی کے کلام کی اصلی آواز ہے، جو آواز مکبّر الصوت سے سنی جاتی ہے وہ بولنے والے کی آواز کی محض ایک نقل ہے، اور یہ نقل بھی بالکل مصنوعی ہے، یہ آواز ایک آلہ

سے نکلتی ہے جسے الیکٹرونک میکینیکل ٹرانسدیوسر کہتے ہیں، اور اس سے ہوا میں ایک تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے جس سے کانوں میں آواز کا احساس ہوتا ہے، اس کا اس آواز سے جو آدمی کے منہ سے نکلتی ہے کوئی بلاواسطہ تعلق نہیں ہے، مزید برآں یہ نقل اس حد تک غیر کامل ہوگی جتنا اس آواز کو از سرِ نو پیدا کرنے والے آلے کے مختلف پُرزے غیر کامل ہوں گے۔

یہ مسئلہ زیادہ صفائی سے یوں حل کیا جاسکتا ہے کہ ایک آدمی کو ایک ہوا بند کمرے میں مائیکروفون پر بات کرتا ہوا غور کیا جائے (جس میں نہ ہوا باہر سے اندر جاسکے، نہ اندر سے باہر آسکے) کمرے کے باہر مکبّر الصوت پر اس کی آواز تو سنی جاسکتی ہے، مگر یہ جسمانی طور غیر ممکن ہے کہ اس آدمی کے اصل کلام کی ذرا سی بھی اصلی آواز باہر سنی جاسکے، چنانچہ سخت قانونی زاویہ نظر سے بھی بلا کسی جھجک کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مکبّر الصوت سے نکلنے والی آواز آدمی کے بول کی آواز نہیں۔

سوال: جب ایک آدمی کنویں یا گنبد والی عمارت میں بولتا ہے تو اس کی آواز صدائے بازگشت کی حیثیت سے واپس ہوتی ہے، تو آیا یہ صدائے بازگشت مکبّر الصوت کی آواز سے کچھ مختلف ہے؟

جواب: کنویں یا گنبد والی عمارت کی صدائے بازگشت آدمی کی اصلی آواز کی لہروں سے واپس آنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے، بالفاظِ دیگر صدائے بازگشت کو آدمی کی اصلی آواز سے نکلا ہوا سمجھا جاسکتا ہے، کیونکہ آواز ایک حائل شدہ حد سے واپس آکر سننے والے کے کانوں میں پہنچتی ہے، اس طرح دراصل صدائے بازگشت اور آدمی کی اصلی آواز میں بلاواسطہ کا تعلق ہے، مگر مکبّر الصوت کی آواز اور آدمی کی اصلی آواز کا آپس میں کوئی بلاواسطہ کا تعلق نہیں، اس طرح صدائے بازگشت کا آدمی کی اصلی آواز سے پورا تعلق ہے، مگر مکبّر الصوت کی آواز کا آدمی کی اصلی آواز سے تعلق بالکل صفر ہے۔

مصنوعی آواز، نمبر ۳

ازرائے مسٹرار، ایچ ہمنس اسکوائرڈ ڈائریکٹر آف انجینئرنگ مانچسٹر نمبر ۱۳: انگلینڈ گرانا ٹیلی ویژن سیٹ ورکس لمیٹڈ۔

میری فنی معلومات کی رُو سے یہ پختہ رائے ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت سے پیدا ہونے والی آواز جس کو عام پبلک جلسوں میں استعمال میں لایا جائے حقیقی آواز کے مترادف قرار نہیں دیا جاسکتا، جیسا کہ انسان کی حقیقی آواز میں پیدا ہوتی ہو، یہ ایک گونج ہے، اس سے زیادہ نہیں، اور حقیقی آواز نہیں، اور مثل کسی تصویر کی نقل کے ہے حقیقی تصویر نہیں۔

ایک ٹیلی فون سے دوسرے ٹیلی فون تک بات کس طرح پہنچتی ہے؟

ازرائے مسٹر شانز من، ٹیلی کمیونیکیشن والیکٹرک انجینئر از ایس اینڈ ایچ جرمنی جنرل منیجر ٹیلی فون فیکٹری، ہری پور ہزارہ (۸/جولائی ۱۹۶۰ء)

ٹیلی فون ایکسچینج کی وساطت سے ٹیلی فون پر بات کرنے والے ایک شخص کا دوسرے شخص سے رابطہ قائم ہوجانے کے بعد حسبِ طریقہ بات چیت ہوتی ہے:۔

بولنے والے آدمی کی آواز ہوا میں ارتعاش پیدا کرتی ہے، یہ ارتعاش ٹیلی فون کے مائیکروفون کی معدنی پتی (ڈایافرام) سے ٹکراتی ہیں، اس پتی میں ارتعاش کی لہروں اور اصل آواز کی فریکوئنسی کے مطابق حرکت ہوتی ہے، پتی کے نیچے خاص قسم کے معدنی کوئلہ کے ذرّات (کاربن گرینول) ہوتے ہیں، اور ان میں باہم دباؤ اسی مطابقت سے کم وبیش ہوتا ہے، وباؤ کی تبدیلی سے کرنٹ میں رکاوٹ (رزسٹنس) بھی کم وبیش ہوتی ہے، اور یہ حرکت اصل آواز کی فریکوئنسی کے مطابق ہوتی ہے، چنانچہ معدنی ذرّات میں سے گزرتی ہوئی کرنٹ کی مقدار میں اس رُکاوٹ میں تبدیلیوں کے مطابق کمی بیشی ہوتی ہے۔

بدلتی ہوئی مقدار کا یہ کرنٹ تاروں کے ذریعہ دوسرا آدمی کے ٹیلی فون تک پہنچتا ہے

اور وہاں پر اصلی آواز کی تجدید مندرجہ ذیل طریقہ پر ہوتی ہے:

کرنٹ دوسرے ٹیلی فون کے ایک مقناطیسی جزء میں سے گزرتا ہے، اور اس کے اوپر رکھی ہوئی معدنی کوئلہ کی پتی (ڈایافرام) میں ارتعاش پیدا کرتا ہے، پتی کے ارتعاش کے مطابق اِردگرد کی ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں، آواز کو دُور دراز تک پہنچانے کے لئے کیریئر سسٹم رائج کئے گئے ہیں، جس کے ذریعہ صرف دو ہی تاروں کی لائن پر بیک وقت ایک سے زیادہ آدمی بات کرسکتے ہیں، لاسلکی کے ذریعہ بھی برقی و مقناطیسی لہروں کی مدد سے آواز دُور دراز تک پہنچائی جاسکتی ہے۔

ٹیلی فون ہی کے اُصولوں کا اطلاق مکبّر الصوت پر ہوتا ہے، مگر یہاں بہتر خواص کے یعنی کوئلہ کے ذرّات والے کے بجائے کنڈنسر یا کرسٹل مائیکروفون استعمال کئے جاتے ہیں، آگے بھیجنے سے اُن سے پیدا شدہ کرنٹ کی طاقت ایک خاص برقی آلہ سے بڑھ جاتی ہے، اسی طرح ٹیلی فون نیز مکبّر الصوت میں اصل آواز کی مصنوعی طور پر دوبارہ تخلیق ہوتی ہے۔

اکابر علمائے اُمت کی رائیں

از دارالعلوم دیوبند

حامداً و مصلیاً آلۂ مکبّرِ الصوت کو نمازوں میں استعمال کرنے کے بارے میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی مفصل و مدلل تحریر دارالعلوم میں موصول ہوئی، جو کہ دارالعلوم کے علماء واساتذہ کی ایک مجلس میں پڑھ کر سنائی گئی، مجیب لبیب نے اس آلہ کے نماز میں استعمال کے بارے میں بنظرِ فقہی جو تحقیق کی ہے، اور احتیاط کے دقیق پہلوؤں کی رعایت رکھ کر مسئلہ کا جو تصفیہ کیا ہے وہ باعتبار اُصول و جزئیاتِ فقہیہ صحیح اور درست ہے، موجودہ حالات و واقعات

اور علماءِ عصر کے اقوال ومباحث، نیز سائنسدانوں کی آراء وتحقیقات کی روشنی میں یہ ایک معتدل اور متوسط فیصلہ ہے کہ نمازوں میں اس آلہ کے استعمال سے (ان مفاسد کی بناء پر جن کو اس تحریر میں نہایت وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے) احتراز کیا جائے کہ اس کا استعمال کراہت سے خالی نہیں ہے، لیکن اگر کسی اتفاقی یا مجبورکن صورت میں ایسی جگہ نمازوں میں شرکت کی نوبت آجائے جہاں نمازوں میں اس آلہ کا استعمال ہو رہا ہو، تو پھر ان اُصول وقواعدِ فقہیہ کی رُو سے (جن کی تفصیل خوبی کے ساتھ تحریر ہذا میں کی گئی ہے) نماز کے فساد کا حکم نہ کیا جائے گا، اور اس کے اعادہ کی ضرورت نہ ہوگی، جب تک کوئی اَمر موجبِ فساد واعادہ متحقق نہ ہو۔ فللہ درّ المجیب وجزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ السید مہدی حسن غفرلہٗ مفتی دار العلوم دیو بند

الجواب صحیح: ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ محمد طیب غفرلہٗ مدیر دار العلوم دیو بند

احقر سید مبارک علی، نائب مدیر دار العلوم دیو بند..... جواب درست ہے، محمد ابراہیم غفرلہٗ

.....

لاؤڈ اسپیکر کا استعمال موجودہ زمانہ میں اہم مسائل میں سے ہو گیا ہے، اور اس کے متعلق علماءِ زمانہ کی مختلف آراء شائع ہوتی رہتی ہیں، اور چونکہ اس کا زیادہ تعلق نماز سے ہے، اس لئے یہ اختلاف مسلمانوں کے لئے زیادہ موجبِ تشویش ہے، جناب محترم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس کے متعلق مفصل اور مفید رسالہ لکھا ہے، میں نے اس کو من اَولہٖ الیٰ آخرہٖ سنا اور مجیب لبیب کو صمیم قلب سے دُعائیں دیں، خدا کرے کہ مصنف علامہ کے اور رسائل کی طرح یہ رسالہ بھی خواص وعوام دونوں کے لئے مفید اور عند اللہ مقبول ہو، آمین

محمد اعزاز علی امروہوی

الجواب صحیح ہے: بندہ سیّد حسن عفی عنہٗ مدرس دار العلوم دیو بند۔

باسمہٖ تعالیٰ! مخدومنا العلام مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ کا رسالہ بابت

آلہ مکبّر الصوت من اوّلہ آخرہ سنا، اور حضرت مفتی اعظم دار العلوم کے تصویب کے الفاظ بھی دیکھے، یہ احقر بھی حضراتِ اکابر کی رائے سے اتفاق کرتا ہے، فقط

فخر الحسن، مدرّس دار العلوم دیوبند

۷۸۶

للّٰہ در المجیب، اصاب فیما اجاب و اجاد فیما افاد للخواص و العوام. کتبہ احقر الانام

سید احمد علی سعید، نائب مفتی دار العلوم دیوبند

از مدرسہ مظاہرِ علوم سہارنپور

مکرمی محترمی! دام مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

۱: آپ کا رسالہ تمام اکابرِ مدرسہ نے شروع سے اخیر تک پورا سنا، اہلِ سائنس اور دیگر علماء کی آراء بھی سامنے آئیں، اس ''لاؤڈ اسپیکر'' پر نماز کا فساد اس پر موقوف ہے کہ یہ متکلم کی عین آواز نہیں ہے، اگر اس فن کے اکثر قابلِ اعتماد ماہرین کی یہ رائے ہے کہ یہ عین آواز ہے تو نماز اس پر ہو جائے گی، مگر اس کا استعمال نماز میں اُن عوارض کی وجہ سے جن کو آپ نے مفصل بیان فرمایا ہے، ناجائز ہی رہے گا۔

۲: آپ نے لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو متکلم کی آواز نہ مانتے ہوئے جو جوازِ نماز کی بحث فرمائی ہے اس کے دلائل و نظائر ہماری نظر میں مخدوش ہیں، ان سے اطمینان نہیں ہوا، یہ بحث تفصیل کی محتاج ہے، اور آپ کے قاصد کا اس وقت تقاضا شدید ہے، اس لئے اس کی تفصیلات پھر کسی وقت عرض کی جا سکتی ہیں، پہلے بھی احقر کچھ عرض کر چکا ہے۔

۳: چونکہ علماء کی ایک جماعت کی یہ تحقیق ہے کہ اس آلہ پر نماز جائز ہے، مگر ابھی تک یہ مسئلہ اتفاقی نہیں ہے، ایسی صورت میں قطعی طور پر نماز کے فساد کا حکم تو نہیں دیا جائے گا، مگر نماز اہم عبادات سے ہے، اور اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، مَلِک العلماء بدائع میں لکھتے ہیں:

ان الصلوٰة اذا ترددت بین الجواز والفساد کان الحکم بالفساد اَولٰی وان کان للجواز وجوہ وللفساد وجہ واحد لان الوجوب کان ثابتا بالقین فلا یسقط بالشک.

اس لئے حتی الوسع اس پر نماز ادا نہ کی جائے، فقط واللہ اعلم!

سعید احمد غفرلہٗ مفتی مظاہر علوم سہارنپور

عبد اللطیف ناظم مدرسہ مظاہر العلوم زکریا کاندھلوی

و یتفرّع علٰی عبارة مَلِک العماء ان اعادة الصلوٰة اَولٰی. محمد اسعد اللہ

مدارسِ ملتان شہر

خیر المدارس وقاسم العلوم

۷۸۶

ہم خدامِ مدرسہ ''خیر المدارس'' نے اس رسالہ کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کیا، حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ العالی نے نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کرنے کے متعلق جو رائے قائم فرمائی وہ بالکل صحیح اور مسلکِ اعتدال کے موافق ہے، یعنی نماز میں اس آلہ کے استعمال کو بوجہ مفاسدِ عدیدہ منع کا فتویٰ دیا ہے، اور یہ مفاسد ایسے

ہیں جن کی واقعیت میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے، ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اکثر و بیشتر اس آلہ کے استعمال پر زیادہ اصرار کیا کرتے ہیں، وہ ذرا سی سہولت اور ظاہری و سطحی نفع کے مقابلہ میں ان تمام مفاسد کو بھول جاتے ہیں جو اس آلہ کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں، اور جن کو حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ نے تفصیل سے اس رسالہ میں ذکر فرمایا ہے۔

اس لئے ہمیں اس رائے میں پورا اتفاق ہے کہ نماز میں اس آلہ کے استعمال سے لوگوں کو منع کیا جائے تا کہ نماز کی وہ سادہ اور مسنون وضع قائم رہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اس وقت تک چلی آ رہی ہے، اور امام کی تکبیرات انتقالیہ کا اِبلاغ اسی طرح مکبّرین کے ذریعہ سے ہوتا رہے جس طرح خیر القرون سے اس وقت تک ہوتا چلا آ رہا ہے۔

لیکن بایں ہمہ حضرت مفتی صاحب نے دوسرا پہلو جو ذکر فرمایا کہ اگر کسی جگہ لوگوں نے اس آلہ کا نماز میں استعمال کر دیا تو آیا ان تمام آدمیوں کی نماز باطل و فاسد اور واجب الاعادہ ہوگی یا نہیں؟ مسئلہ کی اس جانب پر بھی آپ نے جو رائے قائم فرمائی ہے کہ اس نماز کو فاسد نہیں کہا جائے گا، اس سے بھی ہمیں اتفاق ہے، اور اس پر جو دلائلِ فقہیہ اور شواہد ماہرینِ سائنس کے پیش فرمائے ہیں اُن کی واقعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ان دلائل کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے حضرات کی نماز فساد سے تو بچ جائے گی، لیکن نماز کی وہ وضع اور ہیئتِ مسنونہ جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے قائم نہ رہ سکنے کی وجہ سے ثواب اور برکاتِ صلوٰۃ میں از حد کمی اور نقصان واقع ہو جائے گا۔ فقط واللہ اعلم!

بندہ محمد عبداللہ غفرلہٗ، خادم دار الافتاء خیر المدارس ملتان۔

خیر محمد عفا اللہ عنہ	محمد ابراہیم عفی عنہ
مہتمم مدرسہ خیر المدارس	مدرس مدرسہ عربی خیر المدارس
محمد شریف کشمیری عفا اللہ عنہ	جمال الدین المردانی غفرلہٗ
مدرس خیر المدارس	مدرس خیر المدارس

محمد عبد القادر قاسمی غفرلہٗ ملتان
عبد الشکور غفرلہٗ
احقر علی محمد عفی عنہ
مدرس قاسم العلوم ملتان

محمد حسین عفی عنہ
مدرس مدرسہ خیر المدارس
محمد شفیع غفرلہٗ
مہتمم مدرسہ قاسم العلوم ملتان

از حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

الجواب واللہ الموفق للصواب

احقر نے اس تمام تر تفصیل کو دیکھا، بعض جگہ سے تحریر پڑھی نہیں گئی، مگر مفہوم واضح تھا، بہر حال میرے نزدیک اس تحقیق کے بعد آلۂ مکبّر الصوت میں امام کی آواز بعینہٖ آتی ہے کوئی دوسری آواز یا عکس وغیرہ نہیں، اب عدمِ جواز استعمال فی الصلوٰۃ کی کوئی وجہ نہیں، یہ ارشاد بھی اُصول فقہ کے موافق ہے کہ اگر یہ آواز امام کی آواز نہ ہو بلکہ آلہ کی ہو تو چونکہ وہ فاعل مختار نہیں، اس لئے نسبتِ فعل اس کی طرف نہ ہوگی، بلکہ اصل محرک کی طرف ہوگی اور وہ امام ہے۔

رہا یہ شبہ کہ اس میں غلو ہے اس لئے مدفوع ہے کہ غلو وہ ہے جس میں حد سے تجاوز ہو، اور جبکہ امام کی آواز سامعین کو نہ پہنچتی ہو تو ان کو آواز پہنچا دینا غلو نہیں، بلکہ تحصیل مقصود ہے، بالخصوص جبکہ تحصیلِ مقصود بآسانی ہو دشواری سے نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت سے آواز کا بلند ہونا اور دور تک پہنچانا بناءِ محراب و بناءِ گنبد سے زیادہ آسان ہے، اور بناءِ محراب و بناءِ گنبد بلا نکیر مدتِ مدیدہ سے رائج ہے، اور اس سے بھی رفع صوت امام مقصود ہے، کما صرّح به الشّامی فی مسئلة استحباب قيام الامام فی المحراب، و الله اعلم بالصّواب!

نوٹ: مگر نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال دو شرطوں سے جائز ہے، ایک یہ کہ لاؤڈ اسپیکر اعلیٰ قسم کا ہو کہ امام کو اس کی طرف منہ کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ توجہ الی غیر اللہ

مقصدِ صلوٰۃ کے منافی ہے، دوسرے مکبّرین کا انتظام مکمل ہوتا کہ مائیکروفون فیل ہو جائے تو نماز میں گڑبڑ نہ ہو۔

ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ
۱۵ محرم ۱۳۶۹

از دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو آلہ یار سندھ

ناچیز نے اس رسالہ کو لفظ بہ لفظ پڑھا، اب تک اس مسئلہ میں ناچیز کی رائے شدید سخت تھی، اس رسالہ کے دیکھنے اور پڑھنے کے بعد سے اب بالکل اس تحریر سے متفق ہوں، فقط

اشفاق الرحمٰن
مفتی دار العلوم ٹنڈو آلہ یار سندھ
۱۰ رمضان المبارک ۱۳۷۲ھ

مکتوب بقیۃ السلف حضرۃ العلامۃ الشیخ محمد زاہد الکوثری المصریؒ

استفتاء از حقر محمد شفیع

ما قولكم رحمكم الله فى الألة الجديدة مكبّر الصوت لاؤد اسپيكر، هل يجوز استعماله فى خطبة الجمعة والصلوٰة لاستماع القراءة والتكبيرات الانتقالية وهل يسوغ للمقتدى اتباع صوته فى الانتقالات؟ وانما نشاء السؤال لوجوه:

۱: قد اختلف اقوال المتنورين الماهرين بأمثال هذه الألات فى هذا الصوت الذى يصل الى البعيد هل هو عين صوت الامام ام عكسه و بشئى اٰخر مثل الصدى و على الثانى يفوت من شرائط التبليغ كون المبلّغ مصلّياً مقتداً بالامام فكان كمن يبلّغ تكبيرات الامام وهو خارج الصلوٰة و

فی مثله حکم الفقهاء بفساد الصلوٰة کما هو ظاهر المتون والفتاویٰ فی التلقّن من الخارج، صرح به فی العناية و فتح القدير.

۲: الصوت الواصل الی البعید باعانة هٰذه الاٰلة صوت الاٰلة ام غیره من التدقیقات الریاضیة والفلسفیة التی لا یکاد یعرفه الاّ المهرة فی هٰذا الفن، فهل علٰی مثله مدار الاحکام الشرعیة؟ بعد تسلیم الغیریّة فی الصّوتین فی اصل الحقیقة ام یهدر هٰذا الفرق الدقیق کما هو مبنیٰ عامة الاحکام الشرعیة فی امثال هٰذه الامور من سِمة القبلة و رؤیة الهلال وغیره حیث لم یلتفتوا الٰی اقوال المنجمین اصحاب الاصطراب فی تخریج هٰذه الاشیاء بل حکم جمهور الفقهاء علٰی ماهو ظاهر یعرفه کل احد من غیر تجشم الاٰلات ومن غیر نظر الی التدقیقات الریاضیة عملاً بقوله له علیه الصلوٰة والسلام : نحن امّة امیّة لا نکتب ولا نحسب انما الشهر هٰکذا هٰکذا، و قوله صلی الله علیه وسلم : صوموا لرؤیتهٖ وافطروا لرؤیتهٖ.

۳: وبعد تسلیم الغیریة و تسلیم ان یکون مدارالحکم علٰی هٰذا التدقیق الریاضی هل یفترق حکم رجل مکلف یبلّغ التکبیرات وهو خارج من الصلوٰة لم یقتد بالامام وحکم هذهٖ الاٰلة فإن عدم دخول الانسان المکلف فی الصلوة من عدم الملکة وعدم دخول هٰذه الاٰلة عدم بسیط فهل یفترقان فی الحکم فانّ الفعل ینسب الی الواسطة اذا کان مکلفاً ممیزاً واما اذا کان واسطة الفعل شیئا غیر ذی شعور فلا ینسب الفعل الی الواسطة بل الٰی اصل المحرّک کما یری فیمن قتل رجلا بسیف اورمح او بندوق فان القاتل لا یعدّ الا الانسان المحرّک لهٰذه الوسائط فلا یعد

المبلّغ الا الامام فی مسئلتنا.

۴: وربما یختلج فی الصدور انّ استعمال هٰذه الاٰلة فی الصلوٰة لاستماع القراءة والیکبیرات من الغلو فی العبادة الذی لم یکلف الله تعالیٰ به عباده رفقا بهم عن تجشم هٰذه التکلفات التی لا تکاد تحصل فی عامة البلاد والقریٰ فهل هٰذا من الغلو المذموم ام من بذل الجهد المستطاع فی المطلوبات الشرعیة؟

۵: و قد یظن ان استعمال امثال هٰذه الاٰلات فی العبادات یضاهی بالتلهی والتلعّب فهل هٰذا الظنّ فی محلّهٖ؟

۶: ومن قائل یقول ان استعماله یخالف قوله تعالیٰ: " لا تجهر بصلٰوتک ولا تخافت بها وابتغ بین ذٰلک سبیلا. " فهل لهٗ وجه؟ والصلوٰة والسلام علیٰ سیّد الانبیاء والهٖ وصحبهٖ.

العبد الضعیف محمد شفیع الدیوبندی
۲۳/ ذی الحجة ۱۳۶۸ھ

ترجمہ: اللہ آپ پر رحمت نازل فرمائے، آلۂ جدیدہ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، خطبۂ جمعہ اور نمازوں میں قرأت اور تکبیراتِ انتقالیہ سننے کے لئے، کیا اس کا استعمال جائز ہے اور کیا مقتدی اس کی آواز کی اتباع کرتے ہوئے انتقالات کر سکتا ہے؟

یہ سوالات متعدد وجوہ سے پیدا ہوئے:

۱: اس قسم کے جدید آلات کے ماہرین کا اس میں اختلاف ہے کہ آلۂ مکبّر الصوت کے ذریعہ جو آواز دور تک پہنچتی ہے وہ بعینہٖ امام کی آواز ہے یا اس کا عکس ہے؟ اور آواز

بازگشت کی طرح کوئی دوسری چیز ہے، مؤخر الذکر صورت میں تبلیغ کے شرائط میں سے یہ شرط فوت ہوجاتی ہے کہ مبلغ ایسا شخص ہونا چاہئے جو امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہو، اس صورت میں مکبّر الصوت کی مثال اس شخص جیسی ہوگی جو خارجِ صلوٰۃ رہ کر امام کی تکبیرات مقتدیوں تک پہنچا رہا ہو، اور اس قسم کی صورت میں فقہاء فسادِ صلوٰۃ کا حکم فرماتے ہیں، جیسا کہ متون اور فتاویٰ سے ظاہر ہے، عنایہ اور فتح القدیر میں اس کی تصریح ہے۔

۲: مکبّر الصوت کے ذریعہ جو آواز دُور تک پہنچ رہی ہے وہ بعینہٖ امام کی آواز ہے یا نہیں؟ یہ فلسفہ کی ان تدقیقات میں سے ہے جو تقریباً ماہرینِ فن ہی جان سکتے ہیں، لہٰذا امام اور مکبّر الصوت کی آواز میں غیریت تسلیم کر لینے کے بعد کیا اس جیسی چیز کو اَحکام شرعیہ کا مدار قرار دیا جاسکتا ہے یا اس باریک فرق کو نظر انداز کردیا جائیگا، جیسا کہ اس قسم کے مسائل میں عام طور سے اَحکامِ شرعیہ کا مبنیٰ ہے، جیسے سمتِ قبلہ اور رؤیت ہلال وغیرہ کو جمہور فقہاء نے ان اشیاء کی تخریج میں منجّمین اور اصحاب اصطراب کے اقوال کی طرف التفات کرنے کے بجائے ظاہر کے موافق حکم فرمایا ہے کہ آلات کے تتبع اور ریاضی جزرَسی کی طرف التفات کئے بغیر ہر شخص اُسے پہچان لے، فقہاء نے اس سلسلہ میں نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کے اس قول پر عمل فرمایا ہے کہ: ''ہم ناخواندہ امت ہیں، نہ ہم لکھتے ہیں اور نہ حساب کرتے ......الخ''، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ: ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔''

۳: اگر غیریت کو تسلیم کرلیا جائے اور یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ریاضی موشگافی پر حکم کا مدار ہوگا تو کیا ایسے مکلّف شخص کے حکم میں جو خارجِ صلوٰۃ رہ کر امام کی اقتداء نہ کرتے ہوئے امام کی تکبیرات پہنچا رہا ہو، اور اس آلہ کے حکم میں فرق ہوگا، اس لئے کہ مکلّف انسان کا نماز میں داخل ہونا تو عدمِ ملکہ کی قسم سے ہے، اور اس آلہ کا عدمِ دخول عدم بسیط ہے تو کیا ان دونوں کے حکم میں کوئی تفریق ہوگی، جبکہ فقہاء کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ واسطۂ فعل اگر کوئی غیر شعور چیز ہو تو فعل واسطہ کی طرف منسوب نہیں ہوتا، بلکہ اصل محرک کی طرف

منسوب ہوتا ہے، جیسے کوئی شخص تلوار، نیزے یا بندوق سے کسی شخص کو قتل کر دے تو ان وسائط کے اصل محرک ہی کو قاتل کہا جائے گا، لہٰذا مسئلہ زیرِ بحث میں مبلغ دراصل امام ہی ہوگا۔

۴: بسا اوقات دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قرأت اور تکبیرات سننے کے لئے نماز میں اس کا استعمال غلو فی العبادات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بنظر سہولت اس کا مکلّف نہیں فرمایا تا کہ انہیں اس قسم کے تکلفات کی زحمت نہ ہو، جو عام طور سے ہر شہر اور ہر قصبہ میں میسر نہیں آسکتے، کیا اُسے غلوِ مذموم کہیں گے یا اُن چیزوں میں جو شرعاً مطلوب ہیں حسبِ استطاعت کوشش کرنا کہاں جائے گا؟

۵: کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ اس قسم کے آلات کا نماز میں استعمال کرنا لہو ولعب کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، کیا یہ گمان برمحل ہے؟

۶: بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مخالف ہے کہ: ''نہ اپنی نماز زیادہ زور سے پڑھو اور نہ زیادہ آہستہ، درمیانی راستہ اختیار کرو'' کیا یہ فرمان خداوندی اُن کی دلیل بن سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ سید الانبیاء اور آپ کے آل واصحاب پر صلوٰۃ وسلام نازل فرمائے۔

عبد ضعیف محمد شفیع دیوبندی

۲۳/ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

الجواب من العلامۃ الشیخ محمد زاہد الکوثری المصری رحمۃ اللہ علیہ (۱)

(۱) علامہ موصوف اس قرن کے مسلّم ومعروف مشائخ میں سے ایک متبحر عالم تھے، آپ کی تصانیف آپ کے تبحرِ علمی اور رزانتِ علمی پر شاہد ہیں، آپ مصر کے حنفی المذہب متبع سنت بزرگ تھے، افسوس ہے کہ اس تحریر کے کچھ عرصہ بعد یہ یادگارِ سلف بھی دنیا سے رُخصت ہوئی، غفر اللہ ونور ضریحہ، وانا للہ وانا الیہ راجعون! ۱۲ محمد شفیع

و اما الاستفتاء فانت بن ججدة الفتوىٰ و قد طالت ممارستكم حتى اصبحت فقيه النفس بالمعنى الصحيح وملاحظاتكم المرقعة فى غاية الوجاهة فمهما كان رفع النداء و نداوة الصوت مطلوبين فى الأثار فالمكبّر يحقق كمال رفع الصوت المحقق للتبليغ الكامل فلا يبقى هناك محظور فى استعمال المكبّر كماهو نتيجة ملاحظاتك التمهيدية فالاعتراف بالنتيجة بعد تسليم المقدمتين، الصغرىٰ والكبرىٰ ضرورى الا انى لا اتقدم بتوقع فتوىٰ وارى ان يكون هذا اجتراء ازاء بداعتكم الفقهية .

فادعو الله عز وجل ان يوفقنى وایاكم لما فيه رضاه ويطول بقائكم فى خير و عافية.

محمد زاهد الكوثرى
بشارع العبّاسيّة بالقاهرة
رقم ١٠٤ ،محرام الحرام ١٣٦٩ھ

ترجمہ: (خط کے تمہیدی مضمون کے بعد تحریر فرمایا ہے) لیکن (آلہ مکبّر الصوت کے استعمال کے متعلق) استفتاء، تو آپ خود فتوے کے ماہر اور محقق ہیں، آپ کا تجربہ اس میں طویل ہے، یہاں تک کہ آپ صحیح معنی میں فقیہ النفس ہیں، آپ کی تحریرات ایک خاص شان رکھتی ہیں، پھر جبکہ آواز کا بلند کرنا اور دُور تک پہنچانا ازروئے روایت مطلوب ہے تو آلہ مکبّر الصوت اس مطلوب کو حاصل کر دیتا ہے، اس لئے یہاں کوئی مانعِ شرعی مکبّر الصوت کے استعمال میں نہیں ہے، جیسا کہ آپ کی تمہیدی عبارات کا نتیجہ بھی یہی ہے، کیونکہ قیاس کے دو مقدمے صغریٰ اور کبریٰ تسلیم کر لینے کے بعد نتیجہ کا اعتراف کرنا ایک بدیہی امر ہے، مگر میں فتویٰ لکھنے کی ہمت نہیں کرتا کیونکہ آپ کی مہارت کے مقابلہ میں ایک جرأت ہوگی۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اور آپ کو اُن کاموں کی توفیق دے جو اس کے نزدیک پسندیدہ ہیں، اور آپ کی حیات کو خیر و عافیت کے ساتھ دراز فرمائے۔

محمد زاہد الکوثری/ شارع عباسیہ، قاہرہ نمبر:۱۰۴
محرم الحرام ۱۳۶۹ھ

مکتوب گرامی شیخ العرب والعجم (۱)

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ

در تحقیق استعمال آلۂ مکبّر الصوت در نماز

محترم المقام زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ!

والا نامہ مؤرخہ ۲۵ رمحرم باعثِ سرفرازی ہوا، میں عدیم الفرصتی کی بناء پر جواب میں قاصر رہا، معاف فرمائیں۔

میرا خیال آلۂ مکبّر الصوت کے متعلق یہ تھا جو آپ کو معلوم ہے، جس کا مبنیٰ یہی تھا کہ جو آواز اس آلہ سے پیدا ہوتی ہے، وہ دوسری آواز ہے، پڑھنے والے اور خود بولنے والے کی نہیں ہے، اور چونکہ خود عبادت میں مشغول نہیں ہے اس لئے وہ اُس مبلغ کی طرح ہے جس نے عبادت میں اشتغال نہیں رکھا ہے محض تبلیغ کو انجام دیتا ہے، اس لیے حسبِ تصریحات فقہاء کرام مفسدِ صلوٰۃ ہوگا، مگر بعد میں دفتر جمعیۃ میں اس کے متعلق اجتماع کیا گیا اور کئی گھنٹہ بحث وتمحیص کے بعد قرار پایا کہ ماہرینِ فن آلۂ مکبّر الصوت سے تحقیق کی جائے کہ یہ آواز وہی ہے جس کو متکلم بولتا ہے اور آلہ اسی آواز کو قوی اور منتشر کر دیتا ہے جس طرح عینک نورِ عین کو دُوربین یا خوردبین بناتی ہے یا کوئی جدید آواز پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ ماہرینِ فن سے ہندوستان اور یورپ میں تحقیق کی گئی اور معلوم ہوا کہ آواز وہی ہے آلہ کی وجہ سے اُس میں صرف وسعت اور قوت پیدا ہوتی ہے، اسی بناء پر اور اس بناء پر کہ حجاز میں بار بار لکھنے اور تار وغیرہ دینے پر کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور تمام حجاج اور زوّار اور اہلِ حرمین کی نمازوں کے فساد کا فتویٰ نہایت خطرناک امر ہے، نیز کوئی قطعی مبنیٰ موجود نہیں ہے، اہلِ علم بھی سب متفق نہیں ہیں، اختیار کرنا کہ عدم جواز کے فتویٰ سے رجوع کیا جائے۔

(۱) بنام مولانا مفتی قاری عبدالشکور صاحب ترمذی مدظلہم

دعوت صالحہ سے اس نابکار کو فراموش نہ فرمائیں، جناب مولانا عبدالکریم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کی خبر آپ کے والا نامہ سے معلوم ہوئی، رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ، آمین! مکبّر الصوت کے بعد میرا اجاز جانا نہیں ہوا، واقفینِ پُرسانِ حال سے سلام مسنون عرض کردیں، والسلام!

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۵؍ربیع الاول ۱۳۷۲ھ

☆☆☆

فونوگراف وغیرہ کے متعلق شرعی اَحکام

رفع الخلاف عن حکم فو گراف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ و کفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی ولا سیّما علٰی سیّدنا محمد المجتبٰی و من بھدیہٖ اھتدٰی

مسلمانوں کی ہر حرکت وسکون اور عادت وعبادت چونکہ ایک مذہبی قانون کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے جب کوئی نئی ایجاد اُن کے سامنے آتی ہے تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس کی طرف ہاتھ اور قدم بڑھانے سے پہلے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کے تمام مضار ومنافع پر نظر ڈالیں، اور اس کے بعد اس کے استعمال یا عدمِ استعمال کا فیصلہ کریں۔

گراموفون امریکہ میں ایجاد ہوا اور پھر اسلامی دنیا میں پھیلا تو اس نے بھی فقہی فتاویٰ میں چند سوالات کا اضافہ کر دیا، جن کے جوابات علماء نے لکھے اور بعض طبع بھی ہوئے

حال میں میرے مخدوم ابن مخدوم جناب حافظ محمد یعقوب صاحب نبیسہ قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ نے احقر کو اس موضوع پر ایک مفصل تحریر لکھنے کا امر فرمایا، مجھے باوجودیکہ اپنی علمی کم مائیگی پیشِ نظر تھی، لیکن اپنے مخدوم کے ارشاد کی تعمیل کو باعثِ سعادت سمجھ کر یہ جہد المُقل ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں وباللّٰہ التوفیق!

گراموفون کے متعلق فقہی سوالات اور ان کے جوابات تحریر کرنے سے پہلے چند مفید معلومات عرض کئے جاتے ہیں، جو علاوہ دلچسپی کے اصل مسئلہ کی تحقیق میں بھی کچھ نہ کچھ بصیرت پیدا کرنے والے ہیں۔

فونوگراف کب ایجاد ہوا اور کس نے ایجاد کیا؟

فونوگراف ایک یونانی لفظ ہے، جس کے معنی "کاتبِ صوت" ہوتے ہیں، دورِ حاضر میں اس آلہ کا موجد امریکہ کے مشہور فاضل اڈیسوؔن کو بتلایا جاتا ہے، جو کان کی قوتِ سماعت اور اس کے ذریعہ سے ادارک اصوات پر غور کرتے کرتے اس عجیب وغریب نتیجہ پر پہنچا ہے۔ (دائرۃ المعارف للعلامۃ فرید الوجدی)

لیکن قدیم تاریخ میں یونانی فلسفہ کے علمبردار فلاطوؔن الٰہی کے حالات میں بھی ہم ایک ایسے آلہ کا ذکر پاتے ہیں جو گراموفون کی طرح تمام انسانی آوازں کا عکس اُتارتا تھا، اگرچہ یہ تفصیل معلوم نہیں ہوسکی کہ افلاطون نے اس آلہ کو کس اُصول پر ایجاد کیا، اور کس چیز سے ترتیب دیا، اور یہ کہ فاضل اڈیسوؔن نے اسی کی نقل اُتار کر ایجاد کا سہرا اپنے سَر کرلیا یا مستقل طور پر ایجاد کرتے ہوئے توارُدِ خاطر ہوگیا؟

بہرحال تاریخِ قدیمہ پتہ دیتی ہے کہ اس آلہ کا پہلا موجد افلاطون ہے، اور یہ کہ اس زمانہ کے سلاطین وامراء کو گراموفون کی طرح لہو ولعب میں نہیں بلکہ سلطنت وسیاست کی بڑی بڑی مہمات میں استعمال کرتے اور نہایت مفید نتائج حاصل کرتے تھے، وہ جس گفتگو اور جن مقالات کو زیادہ اہم سمجھتے تھے، اس کے ضبط کرنے میں کتابت کی جگہ اس آلہ سے کام لے کر ہر قسم کی تحریف اور جعل سازی وغیرہ کے خطروں سے مأمون ہوجاتے تھے۔

آج عدالتوں میں مدعی اور مدعا علیہ اور ان کے گواہوں کے بیانات اور اُن پر جرح اور بحث، پھر عدالت کے فیصلوں کے لئے نہایت اہتمام سے مسلیں بنتی ہیں، اور سیکڑوں ورق سیاہ کئے جاتے ہیں، اور ایک مستقل عملہ اس کام کے لئے رکھنا پڑتا ہے، اس پر بھی یہ مسلیں جعل سازی اور تحریف وتغیر سے ہرگز مأمون نہیں ہوتیں۔

اُس زمانہ کے سلاطین اور حکام یہ کام بھی اکثر اسی آلہ سے لیتے تھے، جس کے

ذریعہ عدالتِ ماتحت کی تمام کاروائی عدالتِ عالیہ کے سامنے ایسی صاف واضح ہوتی تھی کہ گویا وہ خود اس مقدمہ کی سماعت میں شریک تھی، اور نہ کسی کا کوئی لفظ بدلا جا سکتا تھا اور نہ کسی کو اس سے انکار کرنے کی مجال باقی رہتی تھی۔

(ازاحة الوهم للعلامة محمد نجيت المصري رئيس المجلس العلمي بمحكمة مصر الكبرىٰ الشرعية۔ص:۱۲)

دوسری بات اس جگہ قابل غور یہ ہے کہ:-

فونو گراف میں حاملِ صوت ہوا بھری ہوتی ہے یا وہ از خود کلمات قطع کرتا ہے؟

اس کے متعلق عام طور سے یہ مشہور ہے کہ ریکارڈ میں حاملِ صوت ہوا بھری ہوئی ہوتی ہے، اور وہی بطور آواز بازگشت مکرر سنائی دیتی ہے، لیکن اس آلہ کی اصل حقیقت اور اس کے اُصولِ ایجاد پر نظر کرنے کے بعد یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ دَورِ حاضر کے انسائیکلو پیڈیا اور دائرۃ المعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آلہ کی بنیاد ایک خاص قسم کی نلکی پر قائم کی گئی ہے، اور اس کے مقابل ایک پن لگائی جاتی ہے، جب آواز کی متحرک اور متکیف ہوا نلکی کے راستہ سے اس پردہ پر پہنچتی ہے تو اس کو اُسی قدر دباتی اور کھولتی ہے جس قدر ہر حرف کے لئے مناسب ہے، یعنی جس طرح انسانی مخارجِ الفاظ کی بست وکشاد سے حروف اور کلمات پیدا ہوتے ہیں، مثلاً میم کے ادا کرنے کے لئے دونوں ہونٹ بالکل بند کرنے پڑتے ہیں، اور واؤ کے لئے کچھ بند کرنے ہوتے ہیں، اسی طرح یہ آواز کی ہوا بعض دوسرے آلات کی امداد سے اس پردہ کو ٹھیک اسی قدر دباتی ہے جس سے حروف کا صحیح مخرج پیدا ہو جائے، اور اس پردہ کے دَبنے سے وہ پن جو اس کیساتھ رکھی گئی ہے قطعۂ تو تیا پر اُسی قدر دبتی ہے، اور اس میں تمام کلمات کی صورتیں منقش ومطبوع ہو جاتی ہیں، پھر اس طبع شدہ

قطعۂ توتیا کے ذریعہ اس نلکی اور پردہ وغیرہ کی امداد سے دوبارہ ویسی ہی آواز جب چاہیں پیدا کی جاسکتی ہے، یہ موقع اس ایجاد کی مفصل کیفیت اوراس کے آلات ترکیب کو باستیعاب بیان کرنے کا نہیں، اور نہ ہماری غرض اس سے متعلق ہے، ہمیں صرف یہ دکھلانا تھا کہ فونوگراف کی آواز صدائے بازگشت کی طرح نہیں، بلکہ جس طرح انسانی زبان اور منہ کی حرکت سے ہوا میں اہتزاز وتموّج پیدا ہوکر کلمات بنتے اور مسموع ہوتے ہیں اسی نظریئے پر فونوگراف کی بنیاد ہے، اس میں بھی حروف وکلمات کو اسی ترکیب سے پیدا کیا جاتا ہے، اور اس لئے اس آلہ کا نام بھی "فونوغراف الناطق" رکھا جاتا ہے۔

تمہیدی اُمور میں سب سے زیادہ اہم اورضروری چیز اس کی تحقیق کرنا ہے کہ:

فونوگراف آلاتِ طرف ومزامیر سے ہے یا نہیں

یہ بحث کسی قدر غور طلب ہے، اس لئے اس میں دو پہلو ہیں، اور دونوں کے لئے کچھ کچھ قرائن وشواہد موجود ہیں، اور مسئلہ کی بعض جزئیات کا فیصلہ اسی تحقیق پر موقوف ہے، کیونکہ اگر اس کو آلاتِ معازف ومزامیر میں داخل سمجھا جائے تو آوازِ مباح کا سننا سنانا بھی اس کے ذریعہ سے مطلقاً ناجائز ہوجاتا ہے، جیسے دوتار، ستار اور ہارمونیم پر کسی مباح نظم یا نعتیہ اشعار کا گانا بھی اسی طرح ناجائز ہے جیسے عام غزلوں اور فحش کلام کا۔

اور اگر یہ ثابت ہو کہ یہ آلہ اپنی اصل سے محض آلہ حاکیۂ صوت ہے، جیسے ٹیلی فون وغیرہ، اور لہو ولہب اور گانے بجانے میں اس کا استعمال اتفاقی طور پر ہوگیا تو مسئلہ کے حکم میں یہ تفصیل کرنی پڑے گی کہ اس کی جس پلیٹ میں کوئی ناجائز مثل عورتوں کے گانے یا معازف ومزامیر اور طبل وسارنگی وغیرہ کی آوازیں ہوں وہ تو اپنی اصل کی طرح ناجائز وحرام ہیں، اور جس پلیٹ میں کوئی مباح آواز ہو اس کو اگر بقصدِ لہو ولہب سنتا ہے تو مکروہ ہے، اور اگر کسی غرضِ صحیح سے سنتا ہے اور لہو ولہب مقصود نہیں تو جائز بلا کراہت ہے۔

بہر حال آوازِ مباح کو اس آلہ کے ذریعہ سے سننے کا جواز یا عدمِ جواز اس تحقیق پر موقوف ہے کہ یہ آلہ من جملہ آلاتِ معازف ومزامیر، دوتار، ستار اور طبل وسارنگی وغیرہ کے ہے یا اصل سے محض حکایتِ صوت کے لئے ایجاد ہوا ہے، اور پھر اتفاقی طور پر شوقین مزاجوں نے اس سے طرب اور لہو ولعب کا کام لے لیا، چونکہ اس بحث میں دونوں پہلوؤں کے کچھ کچھ قرائن موجود ہیں اس لئے جانبین کے قرائن پیش کرنے کے بعد جانبِ راجح کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔

آلاتِ طرب ومزامیر میں سے ہونے کے وجوہ

۱: عام طور پر اس کا استعمال محض لہو ولعب اور گانے بجانے میں اور اسی طرح کیا جاتا ہے جیسے دوسرے آلاتِ معازف ومزامیر کا، اور اربابِ سماع جو حظ دوسرے مزامیر سے حاصل کرتے ہیں بعینہٖ وہی حظ اس سے حاصل ہوتا ہے، اس لئے یہ آلہ بھی مزامیر میں داخل ہونا چاہئے۔

۲: اور اگر عام مزامیر اور گراموفون میں فرق کیا جائے کہ اس میں دوسری آوازوں کی نقل کی جاتی ہے خود اس کی آواز مقصود نہیں ہوتی، بخلاف جملہ مزامیر کے کہ وہ خود مقصود ہوتے ہیں، تو اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے آلاتِ طرب میں بھی آوازوں کی نقل اُتاری جاتی ہے، اور اسی وجہ سے ہندی مثل مشہور ہے "تانت باجی راگ پایا" یعنی دوتار کی تانت بجتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا گیت گانا ہے، بالخصوص ہارمونیم میں تو آواز کی صاف نقل ہوتی ہے، گو بالکل فونوگراف کی طرح صاف نہ ہو۔

الغرض جملہ مزامیر اور فونوگراف میں اس کے سوا کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا کہ مزامیر میں نئی آواز پیدا کی جاتی ہے اور فونوگراف میں کسی پہلی آواز کی نقل ہوتی ہے، اور یہ بعینہٖ ایسا فرق ہے جیسے قدیم طرز کی مصوری اور فوٹوگراف میں ہے، کیونکہ قدیم طرز کے مصور اپنی طرف سے حسبِ دلخواہ ایک صورت بناتے ہیں اور فوٹوگراف ایک محکی عنہ (واقع) کا تابع

ہوتا ہے اور اس کے عکس کو جو غیر قائم تھا مسالہ کے ذریعہ سے قائم بنا دیتا ہے، لیکن اس فرق کی وجہ سے جواز و عدم جواز میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا بلکہ فوٹو کی تصویر کو بھی عام تصویروں کی طرح شرعاً ناجائز قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب تک عکس تھا جیسے آئینہ اور پانی میں ہوتا ہے اس وقت تک جائز تھا، اور جب مسالہ کے ذریعہ اس کو پائیدار بنایا گیا تو یہی تصویر ہے، اور اس طرح پائیدار بنانا تصویر کشی ہے۔

اسی طرح یہاں ایک جائز کلام جب تک اپنی اصلی صورت میں تھا جائز تھا، اور جب اسی کلام کا عکس اس آلۂ طرب میں اُتارا گیا تو یہی ایک تغنی وتلعب ہے، اور ناجائز ہے، غرض آواز کا ہو بہو ہونے یا کسی آواز کی بعینہٖ نقل ہونے سے آلۂ طرب کے جواز و عدمِ جوازِ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

فونوگراف کے دراصل محض آلۂ حاکیہ ہونے کے وجوہ

۱: اسی تحریر کی ابتداء میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ اس آلہ کا پہلا موجد افلاطونؔ ہے، اور نہ وہ لہو ولعب کا شوقین تھا، اور نہ اس غرض کے لئے اس نے ایجاد کیا، اور نہ اُس زمانہ کے لوگوں نے اسے لغو مشغلہ میں استعمال کیا، بلکہ اس سے بڑے بڑے اہم کام لئے، جس سے ثابت ہوا کہ یہ آلہ دراصل مزامیر میں سے نہیں، اور اس کی اصل وضع لہو ولعب اور گانے بجانے کے لئے نہیں ہوئی۔

۲: اس آلہ کا دوبارہ جنم (جیسا کہ آپ معلوم کر چکے) امریکہ کے مشہور فاضل ایڈیسونؔ کے ہاتھوں ہوا، جہاں تک تحقیق سے معلوم ہوا اس جدید ایجاد کا اصل مقصد بھی محض لہو ولعب نہ تھا، بلکہ ایک کام کی چیز ایجاد کرنا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ اڈیسونؔ کی قسمت میں وہ خوش نصیب لوگ نہ تھے، جو اس کو اچھے مصرف میں استعمال کرتے اور افلاطونؔ کی طرح اس کے لئے ایک بہترین یادگار بنا دیتے۔

۳: جو چیز اصل سے جائز ہو اور کسی مفسدہ پر مبنی نہ ہو، اگر لوگ عام طور پر اسے

لہو ولعب اور ناجائز کاموں میں استعمال کرنے لگیں تو اس سے اُس کو معازف و مزامیر میں شمار نہیں کیا جاسکتا، دیکھئے! اگر کسی وقت ٹیلی فون کے ذریعہ عام لوگ گانا مع مزامیر سننے سنانے لگیں تو ٹیلی فون کو مزامیر میں داخل نہ سمجھا جائے گا، اور آج بھی بہت آدمی گھڑا بجا کر اس پر گاتے ہیں، مگر اس وجہ سے گھڑے کو کسی نے مزامیر میں شمار نہیں کیا، اسی طرح بعض آدمی محض تالیاں بجا کر گاتے ہیں، مگر اس کی وجہ سے انسان کے ہاتھوں کو مزامیر نہیں کہا جاسکتا، اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات میں تالی بجانے کی شرعاً اجازت ہی نہیں بلکہ امر تک فرمایا گیا ہے، نماز کے سامنے سے اگر کوئی شخص گزرتا ہو تو متنبہ کرنے کے لئے مرد کو "سبحان اللہ" کہنا اور عورت کو ہاتھ پر ہاتھ مارنا مستحب ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کسی چیز کو اتفاقی طور پر لہو ولعب یا گانے بجانے میں استعمال کر لینے سے اس کا مزامیر میں داخل ہونا لازم نہیں آتا، اس لئے اگر گراموفون کو بھی اگر عام لوگ طرب وتغنی میں استعمال کریں تو وہ اس سے مزامیر میں شمار نہ ہوگا (جبکہ اس کی اصل وضع اس کے لئے نہیں)۔

۴: فونوگراف اور دوسرے مزامیر کا فرق اس پر مبنی نہیں ہے کہ اس میں حکایتِ صوت ہے، اور دوسرے مزامیر میں صوتِ جدید پیدا کی جاتی ہے، بلکہ یہ فرق وجوہ ماسبق پر مبنی ہے، جن کی مزید تحقیق عنقریب پیش کی جائے گی، کیونکہ صوتِ جدید ہونے یا کسی آواز کی نقل اُتارنے کو مزامیر ہونے یا نہ ہونے میں کوئی دخل نہیں، اور فونوگراف کو فوٹوگراف پر قیاس کرنا صحیح نہیں، کیونکہ آواز کی نقل اُتارنا شرعاً ممنوع نہیں، اور صورتِ جاندار کی نقل اُتارنا شرعاً جائز ہے۔

۵: اوّل تو عرف میں باجہ نام رکھ دینا کسی چیز کی حقیقت نہیں بدلتا، دوسرے اس کے عرف عام ہونے میں بھی کلام ہے، تیسرے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عام طور پر لہو ولعب میں استعمال کرنے کی وجہ سے بحث کا فیصلہ غور طلب ہو جاتا ہے، لیکن حضرت حکیم الامت مجدد

الملت سیدی وسندی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی دامت برکاتہم نے مسئلہ زیرِ بحث کا جو فیصلہ احقر کے ایک عریضہ کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے وہی احق بالقبول ہے، جس کو بغرضِ تحصیلِ برکت حضرت کی اصل عبارت میں نقل کیا جاتا ہے، وہی ہذہ:

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ یعنی اس آلہ کا مزامیر میں سے ہونا غیر مسلم ہے، اس لئے کہ ملاہی (مزامیر) محرم وہ ہیں جہاں خود اُن ملاہی کی صورت (آواز) بخصوصہ مقصود ہو، گو ان میں کوئی خاص لہجہ بھی منضم کرلیا جاوے، جیسا ہارمونیم میں ایسا انضمام ہوجاتا ہے، اور گراموفون میں خود اس آلہ کی صوت بخصوصہ مقصود نہیں، بلکہ مقصود اصل صوتِ محکی عنہ ہے، جس کا اس آلہ کے ذریعہ سے محفوظ کر کے اعادہ کیا جاتا ہے، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر گراموفون میں جو صوت (آواز) بند کر کے پیدا کی جاتی ہے، اگر اصل محکی عنہ (یعنی جس کی آواز ہے) پر قدرت ہوجاوے تو پھر اس آلہ کی طرف اس وقت التفات بھی نہ کیا جاوے، بخلاف ہارمونیم وغیرہ کے کہ ایسے وقت بھی اس سے قطع نظر نہیں کی جاتی، اور اس کا راز یہ ہے کہ گراموفون کی خصوصیت نے اس صوت (آواز) میں حظ (لذت) نہیں بڑھایا، لہٰذا اصل کے ہوتے ہوئے اس کا قصد نہیں کیا جاتا، اور ہارمونیم کی خصوصیت کو حظِ خاص میں دخل ہے جو سادہ استماع میں مفقود ہے، اس لئے اصل کے ہوتے ہوئے بھی اس کا قصد کیا جاتا ہے، اس سے صاف ثابت ہوگیا کہ یہ اُن ملاہی میں سے نہیں جن کی صوت بخصوصہا مقصود ہوتی ہے، اور حرمت ایسے ہی ملاہی کیساتھ مخصوص ہے، کماذکر۔

گراموفون کے شرعی احکام (۱)

فقہی طور پر اس آلہ کے متعلق سوالاتِ ذیل پیش آتے ہیں، جن کا جواب نمروار عرض کیا جائے گا:۔

۱: گراموفون میں عام راگ و مزامیر اور عورتوں کا گانا وغیرہ سننا شرعاً کیسا ہے؟

۲: کوئی مباح نظم یا نثر اس آلہ کے ذریعہ سے تفریحاً سننا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

۳: کسی ضروری اور مفید کلام کو اس آلہ کے ذریعہ سے ضبط کر لینا اور پھر سنانا جائز ہے یا نہیں؟

۴: گراموفون میں قرآن مجید سننا اور سنانا جائز ہے یا نیں؟

۵: اس میں جو قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اس کے وہی احکام ہیں جو عام تلاوتِ قرآن کے ہیں یا کچھ اور؟

۶: اس میں اگر کوئی آیتِ سجدہ تلاوت کر دی جائے تو سننے والے پر سجدہ لازم ہوگا یا نہیں؟

۷: اس کی جس پلیٹ (ریکارڈ) میں قرآن مجید کی کوئی سورۃ محفوظ ہو اس کو بلا وضو چھونا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

۱: جس آواز کا سننا اصل سے حرام ہے، اس کا گراموفون میں سننا بھی قطعاً بلا اختلاف حرام ہے، مثلاً: عورتوں کا گانا اگرچہ بلا مزامیر ہو، اور مردوں کا گانا مع مزامیر اور

(۱) یہ سب اَحکامِ گراموفون کے ہیں، لیکن ٹیپ ریکارڈ کے اَحکام بعض مسائل میں مختلف ہیں، اس لئے اس کی مستقل بحث صفحہ؟؟؟ پر آرہی ہے۔ ۱۲ محمد رفیع عثمانی غفرلہٗ

ناچ رنگ وغیرہ کی نقل، اسی طرح کسی مسلمان کی غیبت یا اس پر بہتان یا کوئی جھوٹی بات جس طرح اصل سے سننا سنانا حرام ہے، اسی طرح اس آلہ میں بھی اتفاقاً اجماعاً حرام ہے۔ کما لا یخفٰی .

۲: جو کلام اصل سے مباح (جائز) ہے، اس کے اس آلہ میں نقل اُتارنا اور اس سے سننا سنانا بھی فی نفسہٖ (خارجی عوارض سے قطع نظر کرتے ہوئے) مباح ہے، کیونکہ آپ تمہیدی مقدمات میں مفصل معلوم کر چکے ہیں کہ گراموفون اپنی ذات سے آلاتِ طرب ومزامیر اور ملاہی محرمہ میں داخل نہیں، اس لئے کوئی مباح کلامِ فقط اس آلہ کی وجہ سے بغیر کسی عارضی کراہت یا ممانعت کے ناجائز نہ ہوگا، البتہ جبکہ بلاضرورت محض تفریحاً سنا جاتا ہے، تو یہ ایک قسم کا لہو ولعب ہے، جو اگر چہ لہو حرام نہ سہی مگر اسلام نے اس قسم کے لہو سے اجتناب کی تعلیم دی ہے، جو انسان کے لئے مفید نہ ہو، حدیث میں ہے:

مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ

انسان کے پکے مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ بے فائدہ کاموں سے باز رہے۔

الغرض جائز کلام کے اس آلہ میں سننے سنانے کا اصلی حکم (خارجی عوارض سے قطع نظر کرتے ہوئے) یہ ہے کہ جائز ہے، مگر خلاف اَولیٰ ہے۔

لیکن چونکہ آج کل عموماً اس آلہ کا استعمال ناجائز اور حرام ولہو ولعب اور گانے بجانے میں ہونے لگا ہے، اور یہ جائز صورت بھی ناجائز کے ساتھ مشابہ ہونے کے وجہ سے جائز اور ناجائز اور حلال وحرام کو التباس میں ڈال کر بہت سے مفاسد کو مستلزم ہو جائے گی، جیسا کہ حالاتِ عامہ کا تجربہ اس پر شاہد ہے۔

اس لئے سدِ ذرائع کے طور پر یہ صورت بھی ناجائز قرار دی جائے گی، جیسا کہ فقہاء نے شربت کے برتنوں کو دسترخوان پر شراب کے برتنوں کی طرح رکھنا محض اسی صوری

مشابہت کی وجہ سے (سدِ ذرائع کے طور پر) ممنوع قرار دیا ہے، لیکن یہ ممانعت چونکہ عارضی ہے، اس لئے اگر کسی وقت یا کسی خاص جگہ میں یہ عارضی وجہ ممانعت موجود نہ ہو مثلاً: کسی زمانہ میں اس کا استعمال لہو ولعب میں نہ رہے، یا کسی ملک یا کسی خاص شہر میں ایسا ہو جائے تو وہاں اپنے اصلی حکم پر جائز سمجھا جائے گا۔

۳: کوئی ضروری اور مفید کلام جو شرعاً ناجائز نہ ہو اور اس کا بعینہ لب ولہجہ کے ساتھ نقل کرنا مقصود ہو، اس آلہ کے ذریعہ سے اس کا محفوظ کر لینا اور پھر اعادہ کرنا جائز ہے، جیسے افلاطونؔ کے زمانہ کے حالات میں آپ بذیلِ تمہید معلوم کر چکے ہیں کہ اس زمانہ کے حکام تمام عدالتی کاروائی کی مسلوں کے بجائے اس آلہ سے کام لے کر ہر قسم کی تحریف وجعل سازی کے خطرات سے مأمون ہو جاتے تھے، اور اس میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ بہت سے کلام وہ ہیں جو محض لب ولہجہ کے ذرا سے تغیر سے بالکل اُلٹ جاتے ہیں، اس آلہ کے ذریعہ سے چونکہ لب ولہجہ بھی محفوظ ہو جاتا ہے، اسلئے اس میں اس کی گنجائش نہیں رہتی کہ کوئی شخص اسی طرح اپنی بات کو بدل دے، مثلاً ایک لفظ ہے ”کیا بات ہے“ یہ لفظ جب بلا ضغطۂ زبان بولا جائے تو استفہام واستفسار کا ایک جملہ ہے، اور جب اسی لفظ کو ذرا ضغط اور تفخیم کے ساتھ بولیں تو یہی ایک چیز کی بڑائی اور عظمت شان کا بیان ہو جائے گا، عرف میں کہا جاتا ہے، سبحان اللہ کیا بات ہے“ اور اسی لفظ کو جب کسی قدر ضغطہ زبان کے ساتھ بلا تفخیم و تعظیم بولا جائے تو تو یہی جملہ تحقیر وتوہین کا جملہ ہو جاتا ہے، کہتے ہیں کہ ”یہ بات کیا ہے“ دیکھئے! یہ ایک ہی کلام ہے جو تعظیم کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور توہین کے لئے بھی، اور استفہام بھی بن سکتا ہے اور اس کا امتیاز محض لہجہ کلام پر موقوف ہے، جس کو کاغذات میں نقل کرنا دشوار ہے، اور اس قسم کے تغیرات سے بھی وہ تقریر مأمون ہو سکتی ہے جو اس آلہ میں محفوظ ہو۔

الغرض اگر کوئی ضروری اور مفید مضمون اس آلہ کی پلیٹ میں محفوظ ہو جو بغیر اس آلہ کے ہمیں دستیاب نہیں ہو سکتا، اس قسم کے مضامین کو سننا جائز ہے مگر مناسب ہے کہ مجمع عام

میں مجلس آرائی کے ساتھ اس طرح نہ سنے جس طرح عام اہل تغنی وتلہی سنتے ہیں، بلکہ خلوت میں سنے تاکہ ان کی مشابہت لازم نہ آئے۔

۴: قرآن مجید کو گراموفون میں بھرنا اور سننا سنانا سب ناجائز ہے۔

اوّل تو اسلئے کہ عام مباح کلام کو بھی بلاضرورت اس میں سننا جائز نہیں، جیسا کہ جواب نمبر ۲: کے تحت میں مفصل گزر چکا ہے، تو قرآن مجید کو اس میں سننا بدرجہ اولی ناجائز ہوگا، کیونکہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کو گراموفون میں سننے کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے وہ صورتِ مذکورہ نمبر ۳: کے تحت میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتا۔

دوسرے اس لئے کہ اگرچہ گراموفون مزامیر اور ملاہی محرمہ میں داخل نہیں، لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ بے ضرورت کوئی کلام اس میں بھرنا اور سننا ایک قسم کا لہو ولعب ہے، اور اگر لہو ولعب مقصود نہ ہو تب بھی تشبہ ہے لہو ولعب کے ساتھ، اور لہو ولعب اگر دوسرے مباح کلام میں کسی وقت جائز بھی سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ کسی وقت اور کسی حال میں جائز نہیں ہوسکتا، کیونکہ تلاوتِ قرآن مجید عبادت ہے، اور عبادت کو ذریعۂ لہو ولعب بنانا سخت حرام ہے۔

نیز یہ ایک قسم کی توہین ہے کلام الٰہی کی کہ لہو ولعب کے موقع پر لہو ولعب کی صورت سے اس کی تلاوت کی جائے، یہ تو قرآن مجید اور کلامِ الٰہی ہے، فقہاء نے تو مطلقاً سبحان اللہ یا الحمد للہ وغیرہ الفاظ کو بھی ایسے موقع پر کہنے کا ناجائز لکھا ہے جہاں مقصود تسبیح وتحمید نہ ہو بلکہ کوئی دوسرا کام مقصود ہو، جیسے سوداگر کسی کو فروخت کرنے کے وقت خریدار سے کہتے ہیں: ''سبحان اللہ کیا اچھی چیز ہے'' چونکہ سبحان اللہ محض اپنی چیز کی رونق بڑھانے کے لئے بے محل بولا گیا ہے اسلئے ناجائز ہے، اسی طرح بچوں کو سلانے کے وقت جو اکثر عورتیں ''اللہ اللہ'' کرتی ہیں فقہاء نے اس کو اسی لئے ناجائز فرمایا ہے کہ یہ ذکر اللہ بے محل ہے۔

ان جزئیات پر نظر کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض یہ لہو ولعب بھی نہ ہو

تب بھی قرآن مجید کا اس آلہ میں سننا جائز نہ ہوگا، کیونکہ بے محل و بے موقع ہے، اور اگر ذرا انصاف سے حالات کا معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج کل عموماً قرآن مجید کا ریکارڈ بھی محض تفریح طبع کے لئے ایسا ہی رکھا جاتا ہے جیسے مختلف قسم کے گیت اور مختلف گانے والی فواحش کی آوازیں رکھی جاتی ہیں، کس قدر غیرت کا مقام ہے کہ قرآن مجید کی پلیٹ بھی رنڈیوں کے گانے کے ساتھ ہم پلہ کر کے رکھی جائے! اور جہاں ابھی ابھی گوہر خان اور ننھی جان کی مجلسِ رقص وسرود گرم تھی وہیں اب محض ذائقہ بدلنے کے لئے قاری صاحب کی اعوذ باللہ شروع کر دی جائے، گراموفون کے مسئلہ سے علیحدہ ہو کر اگر اصل واقع میں بھی ایسا کیا جاتا ہے مجلس رقص وسرود میں مختلف رنڈیوں اور قوالوں کے ذیل میں قاری صاحب کو بھی موقع دے کر ''نوازا'' جاتا تو کسی مسلمان کی غیرت وحمیت تقاضا کرتی کہ وہ اس طرح قرآن مجید سنے اور سنائے؟ اور کیا یہ قرآن مجید کی صاف توہین نہ تھی؟ نعوذ باللہ منہ!

تعجب ہے کہ علامہ شیخ محمد نجیت مصری ازہری کو یہ کھلی ہوئی قباحت اور قرآن مجید کو ذریعۂ لہو ولعب بنانا سمجھ میں نہیں آتا، اور محض اتنی بات سے کہ یہ آلہ اصل سے مزامیر میں داخل نہیں، قرآن مجید تک اس میں پڑھنے کو جائز کر دیتے ہیں، اور اس پر نظر نہیں فرماتے کہ اوّل تو آج کل گراموفون کو استعمال کرنے والے ننانوے فیصد وہی لوگ ہیں جو اس سے محض مزامیر اور رقص وسرود کا کام لیتے ہیں، اور اگر بالفرض کوئی خدا کا بندہ ایسا نہ ہو اور اس کا قصد محض قرآن مجید ہی سننا ہو تو اوّل تو ظاہر حال اس کی تکذیب کرتا ہے، کیونکہ قرآن ہی سننا مقصود تھا تو قرآن سنانے والے ہر جگہ، ہر گاؤں اور ہر شہر میں خدا کے فضل سے بکثرت موجود ہیں، اُن سے کیوں نہ سن لیا جائے؟ رہا یہ کہ کسی خاص قاری کی آواز سننا مقصود ہو تو یہ شرعاً مطلوب نہیں۔

دوسرے اس سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو اس کے عمومی استعمال سے تشبہ لہو ولعب کے ساتھ یقیناً پیدا ہوتا ہے، اسلئے بھی قابلِ مذمت ممانعت ہے، جیسا کہ فقہاء نے شربت یا

چائے کے برتنوں کو دستر خوان پر شراب کے برتنوں کی طرح رکھنے کو ناجائز فرمایا ہے۔

لطیفہ: اور عجیب بات ہے کہ اس آلہ کے موجد عیسائیوں نے بھی شاید اس کا احساس کیا کہ کلامِ الٰہی کو اس کے ذریعے سے سننا اور سنانا ایک قسم کا لہو ولعب ہے، اسی لئے آج تک نہیں سنا گیا کہ کسی عیسائی نے انجیل کی کوئی سورۃ یا کسی یہودی نے توارۃ کی کچھ آیتیں اس میں بند کی ہوں، یہ ہمارے آزاد خیال مسلمانوں ہی کا طرۂ امتیاز ہے کہ انہیں اس کی پرواہ نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا فونوگراف میں سننا سنانا چند گناہوں پر مشتمل ہے اوّل تو مطلقاً لہو ولعب، دوسرے قرآن مجید کو ذریعۂ لہو ولعب بنانا جو سخت ترین حرام ہے، تیسرے لہو ولعب کی مجلسوں میں فواحش کے گانے بجانے کے ذیل میں تفریح طبع کے لئے اس کا تلاوت کرنا بغیر گراموفون کے بھی ناجائز ہے، اور گراموفون میں بدرجۂ اولیٰ حرام ہے

۵: تمہیدی مقدمات میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ یہ آلہ بھی کلمات وحروف کی اسی طرح قطع کرتا ہے جس طرح انسانی زبان، اس لئے اگر گراموفون میں جو آواز سنائی دیتی ہے وہ قرآن ہی کے احکام رکھتی ہے، مثلاً: اس آواز کو بُرا کہنا یا اس کا استہزاد کرنا یا اس کے قرآن ہونے سے انکار کرنا وغیرہ اسی طرح جائز نہیں جس طرح خارج میں تلاوتِ قرآن کے ساتھ جائز نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ قرآن مجید کو اس میں بند کرنا اور پھر اس طرح سننا سنانا گناہ ہے، اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی (جنبی) غسل کی حاجت والا آدمی قرآن مجید پڑھنے لگے، یا کوئی شخص ...... معاذ اللہ ...... بیت الخلاء میں قرآن مجید پڑھنے لگے، تو اس شخص کا یہ فعل تو سخت گناہ اور حرام ہے، مگر جو آواز اس کی زبان سے نکل رہی ہے اس کے قرآن ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۶: گراموفون میں اگر کوئی آیتِ سجدہ پڑھی جائے تو اس سے سجدہ واجب نہیں ہوتا، کیونکہ فقہاء رحمہم اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ سامع پر وجوب سجدہ کے لئے یہ شرط ہے کہ پڑھنے

والے میں خود بھی وجوب سجدہ کی اہلیت وصلاحیت ہو، گو بالفعل اس کے ذمہ واجب ہو یا نہ ہو، اسی وجہ سے سونے والے آدمی یا مجنون مطبق کی زبان سے اگر آیتِ سجدہ نکل جائے یا کسی جانور طوطے وغیرہ کو آیتِ سجدہ سکھادی جائے تو ان سب صورتوں میں سے اس کے سننے والے پر سجدہ واجب نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں اہلیت وجوب سجدہ کی نہیں ہے، بخلاف حیض ونفاس والی عورت کے کہ اگر وہ آیتِ سجدہ پڑھ دیں تو گو اُس کے ذمہ سجدہ واجب نہ ہوگا مگر ان میں اہلیت وجوب موجود ہونے کی وجہ سے سننے والوں پر سجدہ واجب ہو جائے گا، جیسا کہ شامی ودرمختار کی عبارات ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔

ذکر شیخ الاسلام انه لایحب بالسماع من مجنون او نائم او طیر لان السبب سماع تلاوة صحیحة و صحتها بالتمییز و لم یوجد......الخ. (شامی استنبولی، ج:۱/ص:۲۷۰)

اور درمختار میں تصریح ہے کہ آوازِ بازگشت سے یا کسی جانور سے اگر آیت سجدہ کسی نے سن لی تو اس پر سجدہ واجب نہیں، کیونکہ جس کی آواز سنی ہے وہ خود وجوب سجدہ کی اہلیت نہیں رکھتا، درمختار میں ہے:

لا تجب بسماعه من الصّدی و الطیر. (درمختار)

سجدۂ تلاوت آواز بازگشت سے نیز کسی جانور سے سننے سے واجب نہیں ہوتا۔

اب ظاہر ہے ہے کہ گراموفون بھی وجوب سجدہ کی اہلیت نہیں رکھتا، اس لئے اس کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کے ذریعہ اگر آیتِ سجدہ سن لی تو سجدہ واجب نہ ہوگا۔

۷: گراموفون کے جس ریکارڈ (پلیٹ) میں قرآن مجید کی کوئی آیت محفوظ ہو اس کو بلاوضو چھونا جائز ہے، کیونکہ وہ قرآن مجید کے حکم میں نہیں، اور نہ آیات وکلمات اس میں اس طرح لکھے ہوئے ہیں جس طرح عام طور پر لکھا جاتا ہے، اور اس کے اندر قطعۂ توتیا پر جو

کچھ حروف کے مخارج کندہ ہوتے ہیں ان کی وجہ سے ریکارڈ کو قرآن کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المتاب فی کل باب،
والحمد للہ اولہ وآخرہ وظاہرہ و باطنہ، بعزتہ و جلالہ
تتم الصالحات!

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
مدرس دار العلوم دیوبند
ربیع الاول ۱۳۴۷ھ

☆☆☆

تصدیقاتِ اکابر علماء

تصویب از سیّدی حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم

بعد الحمد والصلوٰۃ ! میں مؤلف رسالہ ہذا کا ممنون ہوں کہ انہوں نے رسالہ مجھ کو اظہارِ رائے کی غرض سے دیا، دیکھنے سے خود مجھ کو بعض فوائدِ زائدہ حاصل ہوئے، یہ تو اظہار شکر ہے، اب اظہار رائے کرتا ہوں کہ ماشاء اللہ اس مبحث میں کافی شافی ہے، اور تحقیقات میں وافی اور شبہات کے لئے نافی ہے، حسبِ استدعاءِ مؤلف سلمہٗ کو ''رَفْعُ الْخِلَافِ عَنْ حُکْمِ فُوْنُوْغِرَافِ'' سے ملقب کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس کو مقبول ونافع فرمادے، اور مؤلف سلمہٗ کو اس کے امثال کے لئے موفق فرمادے۔

کتبہ اشرف علی، مقیم تھانہ بھون۔

۲۱ ربیع الاثانی ۱۳۴۷ھ

....

حمد وصلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے رسالۂ جدیدہ کا مطالعہ موجب تنشیط خاطر وتطریبِ قلب ہوا، تحقیقاتِ عجیبہ اور قواعدِ شرعیہ کی تحریر کے بعد اشارۂ اکابر کو مشعل راہ بنا کر فیصلہ صحیحہ فرمایا ہے، دعا ہے مؤلف ممدوح کی دیگر مؤلفات کی طرح اس کو بھی قبول عام منجانب اللہ عطا ہو۔

کتبہ الفقیر اصغر حسین عفا اللہ عنہ

كَشْفُ السَّجاف عن وَجْهِ فوتو غِرافِ

فوٹو کے متعلق شرعی اَحکامِ

صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''میری اُمّت میں کچھ لوگ شراب کا نام بدل کر اُس کو پئیں گے، اور برسرِ مجلس راگ باجے اور گانے بجانے کا مشغلہ کریں گے، حق تعالیٰ اُن کو زمین میں دھنسا دیں گے، اور اُن میں سے بعض کو بندر اور خنزیر بنادیں گے۔''

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مضمون شراب کے متعلق ارشاد فرمایا ہے، آج اُمّت نے اس کو صرف شراب ہی نہیں بلکہ اکثر دوسرے محرمات میں بھی استعمال کر رکھا ہے، شریعت میں جس نام سے کسی چیز کو حرام کیا گیا ہے اس پر نئی معاشرت کا رنگ و روغن چڑھا کر اور نام بدل کر بے خطر اس کا استعمال کیا جاتا ہے، اور اپنے نزدیک سمجھتے ہیں کہ اس حیلہ سے وہ خدائی گرفت سے بچ گئے، اور حقیقت یہ ہے کہ: ۔

کارہا باخلق آری جملہ راست ۔۔۔ باخدا تزویر و حیلہ کے رواست

اگر ان کو چشم بصیرت نصیب ہو تو وہ مشاہدہ کرلیں کہ درحقیقت اس حیلہ نے ان کو ایک گناہ کے بجائے دو گناہوں کا مجرم بنادیا، ایک تو خود گناہ کا ارتکاب، اور دوسرا اس پر کسی قسم کی ندامت کا نہ ہونا اور تلافی و تدارک سے غافل رہنا۔

شراب کا نام الکحل یا اسپرٹ رکھ کر جائز کرلیا گیا، تو تصویر کشی کا لقب فوٹو گرافی رکھ کر حلال کرلیا گیا، پرانے مزامیر و معازف کو چھوڑ کر اس کی جگہ گراموفون نے لے لی اور اس

نام کی بدولت وہ بھی حرمت سے نکل گیا، سود کا نام منافع اور رشوت کا لقب حق الخدمت کر کے علانیہ اس کا لین دین جاری ہوگیا، والی اللہ المشتکیٰ و لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم! اس وقت ہمارے زیرِ بحث ''فوٹو اور فوٹو گرافی'' کا مسئلہ ہے، یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے کہ شریعت نے تصویر کشی کو حرامِ قطعی اور اس کے استعمال کو ناجائز قرار دیا تھا، دورِ حاضر کے روشن خیال مسلمانوں نے اس پر ایک نیا روغن چڑھایا، پرانے طرز کی تصاویر کو چھوڑ کر اس کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا اور نیا نام رکھ لیا، اور حرمت و ممانعت کے فتووں سے بے خطر ہو کر بیٹھ گئے اور اس بارہ میں اُن لوگوں کا زیادہ شکوہ نہ تھا جنہوں نے صرف جدید تعلیم میں آنکھ کھولی اور جدید نصاب ہی میں علمی پرورش پائی، بقول اکبر مرحوم:

انہوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں؟
پلے کالج کے چکر میں، مرے صاحب کے دفتر میں!

افسوس اور شکایت اُن بعض حضرات سے ہے جو کتاب وسنت سے بھی محض ناواقف نہیں، بلکہ بعض اوقات اپنی ہمدانی کے خیال میں وہ ائمہ اجتہاد اور سلفِ صالح پر بھی حرف گیری کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں، تصویر کشی کا نام فوٹو گرافی رکھ کر انہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا، ''تصویر اور فوٹو میں فرق'' پر اُن کی قوت استدلال کا خاکہ یہ ہے:

پہلی دلیل: جس کو سب سے بڑی دلیل کہا گیا فوٹو کے جواز پر یہ پیش کی گئی ہے: ''اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فوٹو عبادت کے کام نہیں آتے''، لیکن مجھے اول تو اسی میں کلام ہے کہ ''فوٹو عبادت کے کام نہیں آتے'' کیونکہ ہندوستان کے رہنے والے جانتے ہیں کہ آج بھی ہندوستان میں ایک فرقہ موجود ہے جو اپنے پیر کے فوٹو کو پوجتا ہے، اس کے علاوہ تصویر کا مبادیٔ شرک وبت پرستی میں سے ہونا اسی پر موقوف نہیں کہ اس کی اس وقت بھی عبادت ہوتی، بلکہ وہ تصویر بھی مبادیٔ شرک میں سے ہے جو اگرچہ اس وقت پوجی نہیں جاتی مگر آئندہ اس کی پرستش کا احتمالِ قریب موجود ہو، ورنہ عیسیٰ اور مریم علیہما السلام اور

دوسرے انبیاء علیہم السلام کی وہ تصویر بھی جو شروع میں محض اُن کی یاد تازہ کرنے اور اپنے لئے ایک نمونہ باقی رکھنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ مبادیٔ شرک میں سے نہ رہیں گی، کیونکہ اُس وقت اُن کی عبادت کا خیال بھی نہ تھا، مگر ایک زمانے کے بعد وہی تصویریں ذریعۂ بت پرستی بن گئیں، اور اگر تسلیم ہی کرلیا جائے کہ ''فوٹو عبادت کے کام میں نہیں آتے اور نہ آسکتے ہیں'' تو زیادہ سے زیادہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ فوٹو کی تصویر مبادیٔ شرک میں سے (جو حرمتِ تصویر کے اسباب میں سے ایک سبب ہے) نہیں، مگر جب کسی چیز کی حرمت چند اسباب پر مبنی ہو تو ان میں سے کسی ایک سبب کا منعدم ہوجانا اس چیز کو حلال نہیں کردیتا، مثلاً: ایک مجرم پر چند جرم عائد کئے گئے ہوں، چوری، ڈاکا زنی، قتل عمد، توہین عدالت وغیرہ وغیرہ۔ اگر صفائی کے گواہ اس کو قتل عمد سے بری ثابت کردیں تو فقط اتنی بات سے وہ بالکل آزاد نہیں کردیا جاتا، بلکہ دسرے جرموں کی سزائیں اُس پر قائم کی جاتی ہیں، تصویر کا استعمال بھی جیسا کہ میرے رسالہ ''تصویر'' میں مذکور ہے، بہت سے جرموں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے، مبادیٔ شرک میں سے ہونا، مشابہت کفار کا لازم ہونا، ملائکہ رحمت کو آنے سے روک دینا وغیرہ۔

اب اگر فرض کرلیا جائے کہ فوٹو کی تصویر میں حرمت کا ایک سبب ''مبادیٔ شرک میں سے ہونا'' موجود نہیں تو اس سے کہاں لازم آیا کہ یہ تصویر بالکل حرمت سے آزاد ہوجائے، کیا استعمالِ تصویر کے دوسرے اسباب جو فوٹو کی تصویر میں قطعاً موجود ہیں، مثلاً: مشابہتِ کفار اور ملائکہ رحمت کا بغض اس کی ممانعت کے لئے پھر بھی کافی نہیں، ہاں! اس تقریر پر زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ عذاب میں اتنی تخفیف ہوجائے کہ اس کو وہ عذاب نہ دیا جائے جو عبادت کی تصاویر رکھنے والے کو دیا جائے گا۔

اور اُس وقت کہا جاسکتا ہے کہ فوٹو گرافی کا وہی حکم ہونا چاہئے جو تصویر کشی کا ہے، یعنی ذی رُوح کا فوٹو لینا مطلقاً حرام ہونا چاہئے، اور غیر ذی رُوح میں سے اُن چیزوں کا جن کی عبادت کی جاتی ہے جیسا کہ رسالہ تصویر میں مذکور ہے، اسی طرح فوٹو کے استعمال کا

وہی حکم ہوگا جو استعمالِ تصاویر کا ہے، اور جس کو انشاء اللہ عنقریب تفصیل کے ساتھ عرض کیا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب!

دوسری دلیل: یہ پیش کی جاتی ہے کہ فوٹو گرافی درحقیقت عکاسی ہے، جس طرح آئینہ، پانی اور دوسری شفاف چیزوں پر صورت کا عکس اُتر آتا ہے، اور اس کو کوئی گناہ نہیں سمجھتا، اسی طرح فوٹو کے شیشہ پر مقابل کا عکس اُتر آتا ہے، اور فرق صرف یہ ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس پائیدار نہیں رہتا اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کرلیا جاتا ہے، ورنہ فوٹو گرافر اعضاء کی تخلیق وتکوین نہیں کرتا۔

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات نے فوٹو کی تصویر کو آئینہ، پانی وغیرہ کے عکس پر قیاس کیا ہے، یعنی جس طرح آئینہ کے عکس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ایسے ہی فوٹو کی تصویر بھی ایک عکس ہے، پھر اس کو کیوں حرام کیا جائے؟

لیکن اگر ذرا تأمل سے کام لیا جائے تو واضح ہوجائے گا کہ یہ قیاس اُصولِ قیاس کے قطعاً خلاف ہے، اور ایک عالم کی شان اس سے بہت اعلیٰ ہونی چاہئے کہ وہ ایسی ظاہر الفرق چیزوں میں فرق نہ کرے اور ایک دوسرے کا حکم نافذ کردے، فوٹو کی تصویر اور آئینہ وغیرہ کے عکس میں چند نمایاں فرق ہیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

۱: سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ جس کو خود یہ حضرات بھی تسلیم کرتے ہوئے ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں: ''فرق صرف یہ ہے کہ آئینہ وغیرہ کا عکس قائم اور پائیدار نہیں رہتا، اور فوٹو کا عکس مسالہ لگا کر قائم کرلیا جاتا ہے۔''

مگر وہ اس فرق کو قلیل سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہی فرق تصویر اور عکس میں مابہ الامتیاز ہے، عکس کو جس وقت تک مسالہ لگا کر پائیدار نہ کرلیا جائے اس وقت تک وہ عکس ہے، اور جب اس کو مسالہ کے ذریعہ پائیدار قائم کرلیا جائے وہی عکس، عکس کی حدود سے نکل کر تصویر بن جاتا ہے، کیونکہ عکس صاحبِ عکس کا ایک عرض ہے، جو اس سے علیحدہ نہیں

ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ آئینہ و پانی وغیرہ میں جب تک کہ ذی عکس اُن کے مقابل رہتا ہے اُس وقت تک عکس باقی رہتا ہے، اور جب وہ اُن کے محاذات سے ہٹ جائے تو عکس بھی اس کے ساتھ چل دیتا ہے، دھوپ میں آدمی کھڑا ہوتا ہے اور اس کا عکس زمین پر پڑتا ہے، مگر اس کا وجود آدمی کے تابع ہوتا ہے، جس طرف یہ چلتا ہے عکس بھی اس کے ساتھ چلتا ہے، زمین کے کسی خاص حصہ پر اس کا قائم اور پائیدار ہونا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی مسالہ یا نقش اور رنگ کے ذریعہ سے اس کی تصویر نہ کھینچ لی جائے۔

حاصل یہ ہے کہ عکس جب تک کہ مسالہ وغیرہ کے ذریعہ سے پائیدار نہ کرلیا جائے اس وقت تک وہ عکس ہے، اور جب اُس کو کسی طریقہ سے قائم و پائیدار کرلیا جائے تو وہی تصویر بن جاتا ہے۔

اور عکس جب تک عکس ہے نہ شرعاً اس کی کوئی حرمت ہے اور نہ کسی قسم کی کراہت، خواہ وہ آئینہ، پانی یا کسی اور شفاف چیز پر ہو یا فوٹو کے شیشہ پر، اور جب وہ اپنی حد سے گزر کر تصویر کی صورت اختیار کرے گا خواہ وہ مسالہ کے ذریعہ سے ہو یا خطوط و نقوش کے، ذریعہ سے، اور خواہ یہ فوٹو کے شیشہ پر ہو یا آئینہ وغیرہ شفاف چیزوں پر، اس کے سارے اَحکام وہی ہوں گے جو تصویر کے متعلق ہیں۔

غرض مسالہ لگا کر پائیدار کرنے سے پہلے پہلے صورت کا عکس فوٹو کے شیشہ پر بھی ایسا ہی حلال اور جائز ہے جیسے آئینہ، پانی وغیرہ میں اور مسالہ لگا کر آئینہ وغیرہ شفاف چیزوں پر بھی عکس کا پائیدار کرلینا ایسا ہی حرام و ناجائز ہے جیسا کہ فوٹو کے آئینہ پر۔

آج اگر کوئی مسالہ ایسا ایجاد کیا جائے کہ جب اس کو آئینہ پر لگایا جائے تو اس کے مقابل صورت اس میں قائم ہو جائے یا کوئی شخص اسی صورت کو قلم وغیرہ سے آئینہ پر نقش کردے تو یقیناً آئینہ کی صورت کا وہی حکم ہوگا جو تمام تصاویر کا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

ان حضرات نے فرمایا کہ: ''فوٹو گرافر اعضاء کی تخلیق وتکوین نہیں کرتا'' لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ اعضاء کی تخلیق وتکوین کے کیا معنی ہیں؟

کیا صرف یہی تصویر کے ایک ایک عضو کو بغیر کی آلہ اور واسطہ کے اپنے ہاتھ سے بنایا جائے؟ یا کسی آلہ کے ذریعہ سے بنانا بھی تخلیق وتکوین میں داخل ہے؟ اگر تخلیق اسی کا نام ہے کہ کوئی آلہ درمیان میں نہ ہو تو وہ شخص بھی اعضاء تخلیق نہیں کرتا جو کسی مشین کے ذریعہ سے لوہے، تانبے یا کسی اور دھات کے مجسمے یا بت بناتا ہے، اسی طرح وہ شخص بھی تخلیق اعضاء کا مجرم نہیں ہوسکتا جو سانچے میں مورتیاں اور مجسمات ڈھالتا ہے، بلکہ اس شخص پر بھی یہ جرم عائد نہیں ہوسکتا جو قلم سے تصویر بناتا ہے، کیونکہ وہ بھی بلا واسطہ تخلیق اعضاء نہیں کرتا، قلم درمیان میں حائل ہے۔

اور اس وقت اس قاعدہ کی بناء پر فقط فوٹو گرافی جائز نہیں ہوتی، بلکہ بہت سے بتوں اور مجسمات بلکہ تمام تصویروں کا بنانا بھی حلال طیب ہو جاتا ہے جس کی قباحت محتاجِ بیان نہیں۔

اور اگر کسی واسطہ کے ذریعہ سے تصویر بنانا بھی تخلیقِ اعضاء کے حکم میں داخل ہے تو جس طرح مشینوں اور سانچوں میں مجسمات ڈھالنا، قلم سے تصویر بنانا تخلیق اعضاء ہے ایسے ہی مسالہ کے ذریعہ سے فوٹو کے عکس کو پائیدار کرنا بھی تخلیق ہے، اور جب مشینوں، سانچوں میں مجسمات ڈھالنا، قلم سے تصویر بنانا حرام ہیں تو فوٹو کے عکس کو مسالہ لگا کر پائیدار کرنا کیوں حرام نہ ہو؟

اور اگر تسلیم ہی کر لیا جائے کہ فوٹو گرافر اعضاء کی تخلیق وتکوین نہیں کرتا تو زیادہ سے زیادہ اس سے یہ ثابت ہوگا کہ فوٹو گرافی میں تشبہ بالخلق (جو تصویر کشی کی حرمت کے اسباب

میں سے ایک سبب ہے) لازم نہیں آتا، لیکن رسالہ التصویر میں واضح کیا جا چکا ہے کہ تصویر کشی کی حرمت فقط اسی ایک سبب پر مبنی نہیں بلکہ اس کے دو سبب اور بھی ہیں، یعنی تصویر کا مبادیٔ شرک میں سے ہونا، اور مشابہتِ کفار کا لازم آنا، اور یہ دونوں سبب حرمت فوٹو گرافی میں بے شبہ موجود ہیں، اور میں عرض کر چکا ہوں کہ جب تک اسبابِ حرمت میں سے ایک سبب بھی کسی تصویر میں موجود ہوگا اس وقت تک یہ تصویر جائز نہیں ہوسکتی، اس لئے تخلیق تکوین نہ کرنے پر بھی فوٹو گرافی جائز نہ ہونی چاہئے۔

اس کے بعد اپنے مقصود (فوٹو کی تصویر اور آئینہ کے عکس میں فرق) کو بیان کرتا ہوں، ایک فرق تو وہی تھا جس کو خود ان حضرات نے بھی تسلیم کیا ہے۔

۲: دوسرا فرق آئینہ وغیرہ کے عکس اور فوٹو کی تصویر میں یہ بھی ہے کہ آئینہ کے عکس میں مشابہت کفار لازم نہیں آتی، اور فوٹو میں لازم آتی ہے، پانی وغیرہ میں چہرہ کا دیکھنا کفار کا خاص شعار نہیں، بلکہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے بھی ثابت ہے، اور فوٹو کا دیواروں وغیرہ میں لگانا رومن کیتھولک اور دیگر تصاویر پرست فرقِ کفار کے طرزِ عمل کے مشابہ ہے۔

۳: ایک فرق یہ بھی ہے کہ عرف میں آئینہ وغیرہ کے عکس کو کوئی تصویر نہیں کہتا اور فوٹو کو تصویر کہا جاتا ہے، جیسا کہ عنقریب میں اس کی شہادت پیش کروں گا، اس لئے فوٹو کے احکام تصویر کے احکام ہونے چاہئیں نہ کہ عکس آئینہ کے۔

یہ تین نمایاں فرق ہیں جو فوٹو کی تصویر کو آئینہ وغیرہ کے عکس سے ممتاز کر دیتے ہیں، اس لئے فوٹو کی تصویر کو آئینہ کے عکس پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق ہوگا، جو شرعاً وعقلاً مردود ہے۔

تیسری دلیل: ان حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ:

''موجودہ دنیائے اسلام کے تمام روشن خیال علماء (بشرطیکہ روشن خیالی

منصبِ افتاء کے خلاف نہ ہو) رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ فوٹوگرافی مصوری نہیں ہے، اور نہ فوٹو پر تصویر کا اطلاق ہوسکتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ مصر و مراکش، ایران وقسطنطنیہ کے تمام اکابر اربابِ عمائم ہم کو کاغذی پیراہنوں میں ہندوستان میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

مگر کیا تعجب کے قابل نہیں کہ وہ ''روشن خیال'' عالم، جو ائمہ مجتہدین اور سلفِ صالحین کی تقلید سے بے نیاز ہو (اپنی خواہش کے موافق دیکھ کر) معاصرین کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے، اور وہ آزاد قلم جس کو مقتدمین اسلام کا اتباع ایک ''تاریک پہلو'' نظر آتا ہو، اور جو جمہور فقہاء ومحدثین کے (جن میں بہت سے صحابہ بھی داخل ہیں) کلام کی تغلیط کرتے ہوئے بھی نہ رُکتا ہو، وہی قلم ہے جو اسوقت اپنے تھوڑے معاصرین کے فتووں سے مسلمانوں کے لئے ایک حرام کو حلال کرنا چاہتا ہے، اور کیا افسوس کے قابل نہیں کہ جب اپنے خیال کے موافق نہ ہوتو حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کی بھی شنوائی نہ ہو؟ اور جب موافق ہوتو چند معاصرین کے فتوے قابلِ استدلال بن جائیں، خصوصاً جبکہ ہزار ہا علماء کے فتوے اُن کے خلاف بھی موجود ہوں، بقول اکبرؔ

دل کو بھا جائے تو اکبر کی خرافات اچھی!

پھر معلوم نہیں کہ ''روشن خیالی'' اور ''تاریک خیالی'' کا معیار ان حضرات کے نزدیک کیا ہے؟ جس کی وجہ سے اُن ہزاروں علمائے ہندوستان وغیر ہندوستان کو ''روشن خیالی'' میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی، جن کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ احکامِ شرعیہ میں جسارت ودلیری سے کام لے کر دین کو اپنی خواہشات کا تابع نہیں بناتے، اور مقتدمین اسلام کو اپنے سے زیادہ اعلم بالقرآن والحدیث سمجھ کر اُن کی رائے کو اپنی رائے سے مقدّم جانتے ہیں۔

اور اگر فی الواقع وہ اسی جرم کی سزا میں ''روشن خیالی'' سے محروم ہیں تو یہ محرومی اُن

کے لئے باعث فخر ہے، انہیں ایسی ''روشن خیالی'' کی ضرورت نہیں، اُن کی ''تاریک خیالی'' پر ایسی ہزاروں روشنیاں قربان کی جاسکتی ہیں: ؎

خدا گواہ کہ جرمِ ما ہمیں عشق است گناہ گبر و مسلماں بجرم ما بخشد

اس کے بعد مجھے اس میں بھی کلام ہے کہ جن علماء کو ان کی اصطلاح میں ''روشن خیال'' کہا جاتا ہے وہ بھی سب کے سب اس مسئلہ میں آپ کے ہم نوا ہوکر فوٹو اور فوٹو گرافری کو حلال سمجھتے ہوں، بلکہ اب تو وہ اصطلاحی روشن خیال حضرات بھی جو ایک عرصۂ دراز تک فوٹو کو نہ فقط جائز سمجھتے رہے بلکہ بذریعۂ عمل مسلمانوں کو اس کی تعلیم دیتے رہے ہیں، جب اُن کو اپنی عاقبت پیش نظر ہوتی ہے تو وہ اپنے خیالات سے تائب ہوکر (جیسا کہ ایک مسلمان کا فرض ہے) صاف صاف حق کا اعتراف کر لیتے ہیں، ہم نہایت مسرت کے ساتھ جناب ابوالکلام آزاد کو مرحبا کہتے ہیں (اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ کہ سید صاحب (۱) ندوی اور ان کے ہم خیال علماء بھی اس میں اُن کی تقلید کریں) جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ نے ایک مدتِ مدید تک اپنے اخبار ''الہلال'' کو با تصویر شائع کرنے کے بعد اب اپنے خیال سے رجوع کر لیا ہے، چنانچہ جب آپ کے بعض معتقدین نے آپ کا تذکرہ لکھا اور درخواست کی کہ آپ کا فوٹو بھی درجِ تذکرہ کیا جائے تو آپ نے صاف انکار کر دیا، اور اُن کے خط کے جواب میں یہ الفاظ لکھے:۔

> تصویر کا کھنچوانا، رکھنا، شائع کرنا سب ناجائز ہے، یہ میری سخت غلطی تھی کہ تصویر کھنچوائی، اور الہلال کو باتصویر نکالا تھا، میں اب اس غلطی سے تائب ہو چکا ہوں، میری پچھلی لغزشوں کو چھپانا چاہئے نہ کہ ازسرِ نو اُن کی تشہیر کرنی چاہئے۔

(۱) حضرت مولانا سیّد سلیمان صاحب ندویؒ مراد ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مولانا موصوف نے اپنی وفات سے پہلے اپنے اس فتویٰ میں رجوع کا اعلان فرمایا تھا، نور اللہ مرقدہٗ ۔۱۲ محمد شفیع

آپ سے فوٹو کھنچوانے کی درخواست کی گئی تھی جس کے جواب میں انہوں نے فوٹو کو تصویر میں داخل سمجھ کر (جیسا کہ وہ واقع میں داخل ہے) لکھا کہ: ''تصویر کھنچوانا، شائع کرنا، رکھنا سب ناجائز ہے'' جس سے اُس دلیل کی بھی حقیقت کھل گئی جس کو مولانا سید سلیمان صاحب نے روشن خیال علماء سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

فوٹوگرافی مصوری نہیں اور نہ فوٹو پر تصویر کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

جناب مولانا ابوالکلام تو آپ کی اصطلاح میں ''تاریک خیال'' نہیں، یہ تو انہی حضرات میں سے ہیں جن کے فوٹو کو آپ حضرات کے نزدیک فوٹو کے جواز کا فتوی کہا جاتا ہے۔

خداوندِ عالم مولانا کو جزائے خیر عطا فرمائے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کی توفیق دے، آمین!

میری اتنی گزارش سے انشاء اللہ تعالیٰ واضح ہوگیا کہ جن وجوہ کی بناء پر فوٹو اور فوٹوگرافی کو حلال اور جائز سمجھا جاسکتا تھا اُن میں سے ایک بھی قابلِ استدلال نہیں، اور اس ضعیف بنیاد پر ایک حرام صریح کو حلال کردینا اتنی بڑی جسارت اور دلیری ہے کہ کسی خدا ترس مسلمان سے ممکن نہیں، بلکہ بلاشبہ اسی مضمون کی نظیر ہے جو بحوالۂ حدیث اُوپر ذکر ہوچکا ہے کہ اس امت کے کچھ لوگ نام بدل کر شراب پئیں گے، بلاشبہ یہ بھی اسی طرح تصویر کا نام بدل کر اس کو حلال کرنا ہے، حق تعالیٰ مسلمانوں کو اس بلائے عظیم سے بچائے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ!

تنبیہ: ۱......حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک مضمون تصویر کے جواز پر معارف اعظم گڑھ سے شائع کیا تھا، اس کے جواب میں احقر کا رسالہ التصویر شائع ہوا، زیر نظر رسالہ فوٹو سے متعلق بھی دراصل اسی رسالہ التصویر کا جزء تھا، یہاں ''آلات جدیدہ'' کی مناسبت سے صرف اس رسالہ کو لیا گیا ہے، اس میں جابجا رسالہ التصویر کے حوالے ہیں،

اس سے مراد وہی مستقل کتاب ہے جو بنام التصویر شائع ہوئی تھی۔

۲: یہ قصہ اب سے تقریباً چالیس سال قبل کا ہے، اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی تحقیق پر نظر ثانی فرما کر اس سابق فتوے سے رجوع اور جمہور مسلمانوں سے اتفاق کا اعلان فرما کر علمائے حق کی سنت کو زندہ فرما دیا، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو بالخصوص علماء کو آپ کے اُسوہ کی توفیق عطا فرمائے!

کتبہ احقر محمد شفیع غفرلہ

تصحیح العلم فی تقبیح الفلم

فلم کے شرعی اَحکام

از افاضاتِ حضرت مجدد الملّت حکیم الامۃ

فقیہ العصر مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر بائسکوپ کے پردہ پر خلفائے اسلام، شاہانِ اسلام اور رہنمایانِ اسلام کی تصویریں متحرک، بولتی گاتی اور ناچتی دکھائی جائیں اور خواتین اسلام کو بائسکوب کے ذریعہ سے پبلک میں بے پردہ پیش کیا جائے تو کیا شریعتِ اسلامیہ اس فعل کو جائز قرار دیتی ہے یا شریعتِ اسلامیہ کے نزدیک یہ فعل ناجائز ہے؟ اور کیا حکم دیتی ہے شریعتِ اسلامیہ اُن حضرات کے بارہ میں جو اس فعل کے جواز کی حمایت میں پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کو متحرک تصاویر اور بولتی تصاویر کی طرف رغبت دلاتے ہیں؟ بینوا توجروا!

الجواب۔ شریعتِ اسلامیہ میں جاندار کی تصویر بنانا مطلقاً معصیت ہے خواہ کسی کی تصویر ہو، اور خواہ مجسمہ ہو یا غیر مجسمہ۔

فی جمع الفوائد من السنة عن عائشة قدم صلی اللہ

علیہ وسلم من سفر و قد سترت بقرام علیٰ سھوہ لی فیہ تصاویر فنزعہ و قال : اشد الناس عذابا یوم القیامۃ الذین یتضاھون بخلق اللہ.

اور کسی مسلمان کی تصویر بنانا اور زیادہ معصیت ہے کہ اس میں ایسے شخص کو آلۂ معصیت بنانا ہے جو اس کو اعتقاداً قبیح جانتا ہے، اور اسی اصول پر حق تعالیٰ کی قسم معصیت پر کھانے پر خاص تشنیع فرمائی گئی ہے۔

فی تفسیر الجلالین: وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُمْ ای نصبا لھا بان تکثروا الحلف بہ اَنْ لَّا تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ. فی الکمالین: نصباً ای علما للایمان . فی القاموس: النصب بضمتین کل ما جعل علما ای لا تجعلوا اللہ معرضا لا یمانکم.

اگر چہ اُس تصویر کی طرف کوئی امر مکروہ بھی منسوب نہ کیا گیا ہو محض تفریح و تلذذ ہی کے لئے ہو، کیونکہ محرماتِ شرعیہ سے تلذذ بالنظر بھی حرام ہے۔

فی الدرّ المختار کتاب الاشربہ وحرم الانتفاع بھا (ای بالخمر) ولو بسقی دواب او لطین او نظر للتلھی.

اور اگر اس کی طرف کسی نقص یا عیب کو بھی منسوب کیا جائے تو اُس میں ایک دوسری معصیت یعنی غیبت بھی منضم ہوگی، کیونکہ غیبت صرف کلام ہی میں منحصر نہیں، نقوش قلم یعنی کتابت سے بھی ہوتی ہے اسی طرح اُس عیب کی ہیئت بنانے سے بھی ہوتی ہے بلکہ یہ سب سے اشد ہے۔

فی احیاء العلوم: بیان ان الغیبۃ لا تقتصر علی اللسان.

اعلم ان الذكر باللسان انما حرم لان فيه تفهيم الغير نقصان اخيك و تعريضه بما يكرهه فالتعريض به كالصريح والفعل فيه كالقول والاشارة والايماء والغمز والهمز والكتابة والحركة وكل ما يفهم المقصود فهو داخل في الغيبة وهو حرام فمن ذٰلك قول عائشةؓ دخلت علينا امرأة فلما ولّت أومأت بيدي انها قصيره فقال السلام عليه : اغتبتيها. (ابن ابي الدنيا وابن مردوية من رواية حسان ابن مخارق وحسان ، و ثقه ابن حبان و باقيهم ثقات، كذا في تخريج العراقي باختلاف يسير في بعض الالفاظ) ومن ذٰلك المحاكات كان يمشي متعارجاً او كما يمشي فهو غيبة بل هو اشد في الغيبة لانه اعظم في التصوير والتفهيم، ولما رأى صلى الله عليه وسلم عائشة حاكت امرأة قال ما يسرني اني حاكيت انسانا ولي كذا و كذا(تقدم في الآفة الحادية عشر عن ابي داؤد والترمذي وصححه كذا في تخريج العراقي) وكذالك الغيبة بالكتابة فان القلم احد اللسانين وذكر المصنف شخصا معينا و تهجين كلامه في الكتاب غيبة ....الخ

اسی طرح اُس منسوب الیہ کی تصویر کی کوئی خاص ہیئت بنانا بھی ایسا ہی ہے جیسے خود اُس کی طرف اُس وصف کو منسوب کرنا مثلاً: مخدرات کی تصاویر کو بے پردہ ظاہر کرانا۔

في صحيح البخاري غزوه الفتح،عن ابن عباس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما قدم الىٰ ان يدخل

البيت وفيه الالهة فامر بها فأخرجت فاخرج صورة ابراهيم واسماعيل في ايديهما من الأزلام فقال النبي صلى الله عليه وسلم : قاتلهم الله لقد علموا ما استقسما بها قط، ثم دخل البيت ، الحديث .

اگر چہ وہ نقص یا عیب واقع میں بھی اُس میں ہوتب بھی اُس کی غیبت باقسامہا حرام ہے، اور اگر واقع کے خلاف ہو تو غیبت سے بڑھ کر وہ بہتان ہے۔

عن ابی هريرة قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : اتدرون ما الغيبة؟ قالوا: الله و رسوله اعلم ! قال: ذكر احدكم اخاه بما يكره! فقال رجل: ارأيت ان كان في اخي ما اقول؟ قال: ان كان فيه ما تقول فقد اغتبته وان لم يكن فيه ما تقول فقد بهتّه.

(جمع الفوائد عن ابی داؤد والترمذی)

اور جس کی طرف کوئی نقص یا عیب منسوب کیا گیا ہے اگر علاوہ مسلمان ہونے کے اس میں اور کوئی وجہ بھی احترام کی ہو جیسے سلاطینِ اسلام میں ان کی اہانت اور زیادہ موجبِ انتقام ہے۔لحدیث: ''من اهان سلطان الله في الارض اهانه الله۔(ترندی)'' اور جس کی تنقیص یا اہانت مذموم ہے اس کی طرف جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ منسوب ہیں ان کا بھی وہی حکم ہے جیسے اُن کی بیبیاں وغیرہا، چنانچہ کفارِ عرب حضرات صحابہؓ کی بیبیوں کے نام اپنے اشعار میں عشق بازی کے عنوان سے ذکر کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُس کو ایذاءِ قبیح میں شمار فرمایا:

في الجلالين : وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ من اليهود والنصارى وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (من العرب) اَذًى كَثِيْرًا من السب والتشبيب بنسائكم.

اور زوجیت یا قرابت کی نسبت تو بڑی چیز ہے، استعمال کی نسبت بھی حرمتِ تنقیص

کے لئے کافی ہے، جیسے کسی کے استعمالی کپڑے میں عیب نکالنا۔

فی احیاء العلوم: بیان معنی الغیبة وما فی ثوبه فکقوالک انه واسع الکم طویل الذیل وسخ الثیاب.

اور اگر وہ تصویر کسی مشتہاۃ کی ہو تو نظر بد کی معصیت کا اُس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور تصویر کی پوری حکایت ہے، اجنبیہ کے تو کپڑے کو بھی بدنفسی سے دیکھنا حرام ہے۔

فی ردالمحتار باب الحظر والاباحة مفاده ان رؤیة الثوب بحیث یصف حجم العضو ممنوعة ولو کثیفا لا تری البشرة منه وفیه فی بحث النظر الی الاجنبیة من المرأة والماء بخلاف النظر لانه انما منع منه حیثیة الفتنة والشهوة وذٰلک موجود ههنا وفیه فی احکام ستر العورة انّ النظر الٰی ملاء ة الاجنبیة بشهوة حرام.

بالخصوص اگر غیر مسلموں کو خواتین مسلمات کی تصاویر کی طرف بدنفسی (بدنیتی) کے ساتھ نظر کرنے کا موقع دیا جائے، کیونکہ بدنفسی سے نظر کرنا شریعت میں ایک گونہ بدکاری ہے بنص الحدیث، اور ایسی بدکاری کہ مرد غیر مسلم ہو اور عورت مسلم، بلکہ ایسے موقع پر نکاح بھی اس درجہ امرِ شدید ہے کہ اس کے احکام علماء مجتہدین کے لئے محلِ بحث ہوگئے ہیں، اور جس کو مسلمان کے مرتد بنانے کے اور اسلام اور قرآن میں طعن کرنے کے اور حربیوں سے سازش کرنے کے برابر قرار دیا گیا ہے، نمونہ کے طور پر اُس کے متعلق ایک روایت نقل کی جاتی ہے:

فی الدرالمختار فصل الجزیة، قلت: ومذهب الشافعیة ما فی المنهاج وشرحه لابن حجر ولوزنی بمسلمة او اصابها بنکاح اودلّ اهل الحرب علیٰ عورة المسلمین او فتن مسلماً عن دینه او طعن فی الاسلام او القرآن...الخ

اور ان سب سے بڑھ کر شناعت میں وہ صورت ہے جس میں مقتدایانِ دین کی اہانت ہو کہ درحقیقت وہ اہانت اسلام کی ہے جس کا تحمل کسی طرح طبعاً اور شرعاً ممکن نہیں۔

فی جمع الفوائد عن ابی امامة رفعه، ثلثة لا يستخف بهم الا منافق، ذوالشيبة فی الاسلام و ذو العلم و امام مقسط، و فيه عن الترمذی عن عبدالله بن مغفل مرفوعاً اللّٰه اللّٰه فی اصحابی من اٰذاهم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی الله ومن اٰذ ی الله فيوشک ان يأخذه.

اور جب ایسی فلموں کے قبائح معلوم ہو گئے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ بقدر اپنی قدرت کے گو وہ قدرت حکومت سے استعانت ہی کے طور پر ہو اُن کے انسداد میں کوشش کریں، اور تماشا دیکھنے والوں کو ان قبائح پر مطلع کر کے شرکت سے روکیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ سب عقابِ خداوندی میں گرفتار ہوں۔

ابو داؤد مرفوعاً، ما من قوم يعمل فيهم بالمعاصی ثم يقدرون علی ان يغيرو اثم لا يغيرون الا يوشک ان يعمهم بعقاب. (مشکوٰة)

اور جب ساکتین کے لئے یہ وعید ہے تو ترغیب دینے والے کس درجہ کی وعید کے مستحق ہوں گے؟

روی ابوداؤد عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: اذا عملت الخطيئة فی الارض من شهدها فكرهها كان كمن غاب عنها ومن غاب فرضيها كان كمن شهدها (ای باشرها وشارک اهلها). اشرف علی

۱۸ / شعبان ۱۳۵۰ھ ہجری نبوی

روزہ میں انجکشن کا شرعی حکم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آج کل جو انجکشن کے ذریعہ دوا بدن میں پہنچائی جاتی ہے، یہ مفسدِ صوم ہے یا نہیں؟ ادلۂ شرعیہ سے جواب عنایت فرمایا جائے۔

الجواب: ڈاکٹروں سے تحقیق کرنے اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انجکشن کے ذریعہ دوا جوفِ عروق میں پہنچائی جاتی ہے، اور خون کے ساتھ شریانوں یا وریدوں میں اس کا سریان ہوتا ہے، جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں براہِ راست دوا نہیں پہنچتی، اور فسادِ صوم کے لئے مُفطر کا جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں منفذِ اصلی کے ذریعہ پہنچنا ضروری ہے، کسی عضو کے جوف میں یا عروق (شریانوں اور وریدوں) کے جوف میں پہنچنا مفسدِ صوم نہیں، لہٰذا انجکشن کے ذریعہ جو دوا بدن میں پہنچائی جاتی ہے مفسد صوم نہیں، فقہاء کی عبارتیں دو طرح پر تقریباً بلکہ حقیقتاً اس دعویٰ کی تصریح کرتی ہیں کہ، اول تو یہ کہ فقہاء نے زخم پر دوا ڈالنے کو مطلقاً مفسد نہیں فرمایا، بلکہ جائفہ یا آمہ کی قید لگائی ہے، کیونکہ انہیں دو قسم کے زخموں سے دوا براہِ راست جوفِ دماغ یا جوفِ بدن کے اندر پہنچتی ہے ورنہ جوفِ عروق کے اندر تو دوسری قسم کے زخموں سے بھی دوا پہنچ جاتی ہے۔ دوسرے بہت سی جزئیاتِ فقہیہ مسلمات فقہاء میں ایسی ہیں جن میں دوا وغیرہ مطلقاً جوفِ بدن تو پہنچ گئی، لیکن چونکہ جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں منفذِ اصلی سے نہیں پہنچی، اس لئے اس کو مفطر و مفسدِ صوم نہیں قرار دیا، جیسے مرد

کی پیشاب گاہ کے اندر دوا یا تیل وغیرہ چڑھانے سے باتفاق ائمہ ثلاثہ روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ کما صرح به الشامي حيث قال:

وافاد انه لو القى فى قصبة الذكر لا يفسد اتفاقاً ولا شك فى ذٰلك. (شامي ج:۲ ص:۱۰۳) ومثله فى الخلاصة. (ج:۱ ص:۲۵۳) نقلا عن ابى بكر البلخي.

اگر دوا مثانہ تک پہنچ جائے تب بھی امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مفسدِ صوم نہیں، اور حضرت امام ابو یوسفؒ جو مثانہ میں پہنچ جانے پر مفسد قرار دیتے ہیں وہ بھی اس بناء پر کہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ مثانہ اور معدہ کے درمیان منفذ ہے جس سے دوا معدہ میں پہنچ جاتی ہے ورنہ نفسِ مثانہ میں پہنچنے کو وہ بھی مفسد نہیں فرماتے، اسی لئے صاحب ہدایہ نے اس اختلاف کے متعلق فرمایا ہے:

فكانّه وقع عند ابى يوسف ان بينه و بين الجوف منفذا ولهٰذا يخرج منه البول ووقع عند ابى حنيفة ان المثانة بينهما حائل والبول يترشح منه وهٰذا ليس من باب الفقة. انتهٰى.

ابن ہمامؒ اس کی شرح فرماتے ہیں:

يفيد انّه لا خلاف لو اتفقوا علٰى تشريح هٰذا العضو فان قول ابى يوسف بالافساد انما هو علٰى بناء قيام المنفذ بين المثانة والجوف (الى قوله) قال فى شرح الكنز و بعضهم جعل المثانة نفسها جوفاً عند ابى يوسف وحكى بعضهم الخلاف مادام فى قصبة الذكر وليس

بشئی .انتھٰی.

اسی طرح اگر کان میں پانی ڈالے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا، کما صرح فی الدرالمختار والخلاصۃ، حالانکہ کان بھی ایک جوف ہے، اسی طرح اگر کوئی انگور وغیرہ کو ایک تاگے میں باندھ کر نگل جائے اور پھر کھینچ لے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا، کما قال فی الخلاصۃ:

وعلٰی ھٰذا لو ابتلع عنباً مربوطاً بخیط ثم اخرجه لا یفسد صومه. (خلاصه ج: ۱ ص: ۲۶۰)

و مثله فی العالمگیریة مبطوعة الهند ص: ۲۰۲ ولفظه: ومن ابتلع لحما مربوطاً علٰی خیط ثم انتزعه من ساعته لا یفسد وان ترکه فسد، کذا فی البدائع.

اگر مطلق جوفِ بدن میں کسی شئے کا پہنچنا مفسد ہوتا تو خود پیشاب گاہ بھی ایک جوف ہے اور مثانہ تو بدرجۂ اولیٰ جوف ہے، کان اور حلق بھی جوف ہیں، ان میں پہنچنا بلا خلاف مفسدِ صوم ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً جوفِ بدن میں مفطر چیزوں کا پہنچنا مفطرِ صوم نہیں، بلکہ خاص جوفِ دماغ اور جوفِ بطن مراد ہیں، بلکہ جوفِ دماغ بھی اس میں اصل نہیں وہ بھی اسی وجہ سے لیا گیا ہے کہ جوفِ دماغ میں پہنچنے کے بعد بذریعۂ منفذ جوفِ معدہ میں پہنچ جانا عادۃً اکثریہ ہے، جیسا کہ صاحب بحر کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے:

قال فی البحر والتحقیق ان بین جوف الرأس وجوف المعدة منفذاً اصلیًا فما وصل الیٰ جوف الرأس وصل الٰی جوف البطن من الشامی. (ج: ۲/ ص: ۱۶)

اس عبارت میں اس مقصد کی بالکل وضاحت ہوگئی کہ جوف سے مراد صرف جوفِ بطن ہے، اور جوفِ دماغ سے چونکہ جوفِ بطن میں پہنچنا لازمی ہے، اس لئے اس میں پہنچنے کو

بھی تبعاً لجوف المعدہ مفسد قرار دیا ہے۔

اسی طرح حقنہ وغیرہ کو تبعاً لجوف المعدہ مفسد کہا گیا ہے، فتاویٰ قاضی خان میں ہے

اما الحقنة والوجور فلانه وصل الى الجوف ما فيه صلاح البدن و فى القطور والسعوط لانه وصل الى الرأس ما فيه صلاح البدن.

اس عبارت سے بھی یہی معلوم ہوا کہ جس جوف میں پہنچنا مفسدِ صوم ہے وہ جوفِ معدہ اور جوفِ دماغ ہے، مطلقاً جوف مراد نہیں، اور خلاصۃ الفتاویٰ کی عبارت اس مضمون کے لئے بالکل نصِ صریح ہے، وھی ھٰذہ۔

وما وصل الى جوف الرأس والبطن من الاذن والانف والدبر فهو مفطر بالاجماع و فيه القضاء وهى مسائل الاقطار فى الاذن والسعوط والوجور والحقنة وكذا من الجائفة والآمّة عند ابى حنيفة.

اسی طرح عالمگیری کے الفاظ بھی اس کے قریب ہیں:

و فى دواء الجائفة والآمّة اكثر مشائخ علىٰ ان العبرة للوصول الى الجوف والدماغ.

(عالمگيرية مطبوعة الهند ج: ۱/ص: ۲۰۲)

اور بدائع کی عبارت ان سب سے زیادہ اس مضمون کے لئے اصرح واوضح ہے وھی ھٰذہ:۔

وما وصل الى الجوف او الدماغ من المخارق الاصلية كالأنف والاذن والدبر بأن استعط او احتقن او اقطر

فی اذنه فوصل الی الجوف او الی الدماغ فسد صومه، وأما إذا وصل الی الدماغ لانه له منفذاً الٰی الجوف فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجوف الٰی قوله وأما إذ وصل الی الجوف او الی الدماغ من غير المخارق الاصلية بانّ داوی الجائفة والأمة فان داواها بدواء يابس لا يفسد لانه لم يصل الی الجوف ولا الی الدماغ ولو علم انه وصل يفسد فی قول ابی حنيفة.

(بدائع ج:۲،ص:۹۳)

اوّل یہ کہ کسی چیز کا بدن کے کسی حصہ کے اندر داخل ہو جانا مطلقاً روزہ کو فاسد نہیں کرتا، بلکہ اس کے لئے دو شرطیں ہیں، اوّل یہ کہ وہ چیز جوفِ معدہ میں یا دماغ میں پہنچ جائے، دوسرے یہ کہ یہ پہنچنا بھی مخارقِ اصلیہ یعنی منفذِ اصلی کے راستہ سے ہو، اگر کوئی چیز مخارقِ اصلیہ کے علاوہ کسی دوسرے کیمیاوی طریق سے جوفِ معدہ یا دماغ میں پہنچا دی جائے تو وہ بھی مفسدِ صوم نہیں، انجکشن کے ذریعہ بلا شبہ دوا یا اس کا اثر پورے بدن کے ہر حصہ میں پہنچ جاتا ہے، مگر یہ پہنچنا منفذِ اصلی کے راستہ سے نہیں، بلکہ عروق (رگوں) کے راستہ سے ہے، یہ راستہ منفذِ اصلی نہیں، اسی لئے گرمی کے موسم میں کوئی شخص اگر ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا ہے تو پیاس کم ہو جاتی ہے، کیونکہ پانی کے اجزاء مسامات کے راستہ سے اندر جاتے ہیں، مگر اس کو کسی نے مفسدِ صوم نہیں قرار دیا، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ گلوکوز وغیرہ کے انجکشن ایسے ہیں کہ ان کے ذریعہ بدن کو غذا جیسی قوت پہنچ جاتی ہے، اس لئے اس کا حکم غذا کا سا ہونا چاہئے؟ جواب واضح ہے کہ قوت پہنچانا مطلقاً مفسد نہیں، جیسے ٹھنڈک پہنچانا مفسد نہیں، بلکہ منفذِ اصلی کے راستہ سے کسی چیز کا جوفِ معدہ یا دماغ میں پہنچنا مفسد ہے، وہ انجکشن میں نہیں پایا جاتا اگرچہ قوت اُس سے پہنچ جائے۔

انجکشن کی ایک واضح نظیر

یہ ظاہر ہے کہ انجکشن کا طریقہ نہ عہدِ رسالتؐ میں موجود تھا، نہ ائمۂ مجتہدینؒ کے زمانہ میں، اس لئے اس کا کوئی صریح حکم تو نہ کسی حدیث میں مل سکتا ہے نہ ائمۂ دین کے کلام میں، البتہ فقہی اُصول وقواعد اور نظائر پر قیاس کر کے ہی اس کا حکم شرعی معلوم کیا جاسکتا ہے، سو اس کی واضح مثال یہ ہے کہ اگر کسی کو بچھو یا سانپ کاٹ لے تو یہ مشاہدہ ہے کہ زہر بدن کے اندر جاتا ہے، سانپ کا زہر تو اکثر دماغ ہی پر اثر انداز ہوتا ہے، اور بعض جانوروں کے کاٹنے سے بدن پھول جاتا ہے جس سے زہر کا بدن کے اندر جانا یقینی ہو جاتا ہے، مگر دنیا کے کسی فقیہ وعالم نے اس کو مفسدِ صوم نہیں قرار دیا، یہ انجکشن کی ایک واضح مثال ہے، بلکہ سنا گیا ہے کہ انجکشن کی ایجاد ہی اس طرح ہوئی ہے کہ زہریلے جانوروں کے کاٹنے کا تجربہ کرتے کرتے اس نتیجہ پر پہنچا گیا ہے کہ دوا کا فوری اثر اس طرح بدن میں پہنچایا جاسکتا ہے، سانپ، بچھو اور دوسرے زہریلے جانوروں کے کاٹنے کو دنیا میں کسی نے مفسدِ صوم قرار نہیں دیا، اس کی وجہ وہی ہو سکتی ہے جو بدائع کے حوالہ سے ابھی گزری ہے کہ یہ زہر اگرچہ بدن کے سب حصوں میں پہنچ گیا مگر مخارقِ اصلیہ یعنی منفذِ اصلی کے راستہ سے نہیں پہنچا، اس لئے مفسدِ صوم نہیں (۱) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

کتبہ الاحقر محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۱ر ربیع الاول ۱۳۵۰ھ

---

(۱) لیکن جو انجکشن پیٹ میں لگایا جائے جیسے کتے کے کاٹنے پر آج کل لگایا جاتا ہے تو اس کے ذریعہ اگر دوا براہِ راست معدہ میں پہنچائی جاتی ہے تو اس انجکشن سے روزہ ٹوٹ جائے گا، اور اگر براہِ راست معدہ میں نہیں پہنچتی تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، ڈاکٹروں سے تحقیق کر لی جائے، افادنا بہ شیخنا المفتی محمد شفیع، واللہ اعلم! محمد رفیع عثمانی استاذ دارالعلوم کراچی

تصدیقاتِ اکابر

الجواب صحیح

وھو رایی منذ برھة من الزمان

اشرف علی (از تھانہ بھون)

۱۵ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ

الجواب صحیح

حسین احمد غفرلہٗ

صدر مدرس دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح

بندہ اصغر حسین عفا اللہ عنہٗ

مدرّس دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح

محمد اعزاز علی غفرلہٗ

مدرّس دار العلوم دیوبند

ریڈیو پر تلاوت قرآن سے متعلقہ اَحکامِ شرعیہ

❁❁❁

یہ رسالہ اب سے اکیس سال پہلے ۱۳۶۱ھ میں جبکہ احقر دار العلوم دیو بند میں خدمتِ فتویٰ پر ماٴ مور تھا، ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی وَمَنْ بَھَدْیِہٖ اِھْتَدٰی!

ریڈیو عصرِ حاضر کی ایک ایسی ایجاد ہے جس کو اگر صحیح استعمال کیا جائے تو پوری دنیا کے لئے بڑی نعمت ہے، اور علمی، عملی، اخلاقی تربیت کے لئے بہترین ذریعہ ہے، لیکن افسوس ہے کہ جن ہاتھوں میں اس کا نظام ہے انہوں نے اس کو مفید خلق بنانے کے بجائے خالص تجارتی اغراض پر مقبول عوام بنانے کو ترجیح دی، اور اسی لئے ہر اچھے بُرے مذاق کی تسکین کو اس میں ضروری سمجھ کر اس میں رقص وسرود اور فلمی گیت تک داخل کر دیئے، دیندار مسلمانوں کی ترغیب کے لئے اس میں تلاوتِ قرآن اور مختلف مضامین پر تقریریں وغیرہ بھی شامل کر دیں۔ اسلئے فقہی طور پر یہاں چند سوال پیدا ہوگئے، جو اکثر اطراف سے آتے رہتے ہیں، مناسب معلوم ہوا کہ ان سوالات کا جواب کسی قدر تفصیل سے اس رسالہ میں لکھ دیا جائے۔ واللہ الموفّق والمعین!

سوالات

۱: ریڈیو پر تلاوتِ قرآن جائز ہے یا نہیں؟

۲: ریڈیو کے ذریعہ تلاوت قرآن سننا جائز ہے یا نہیں؟ اور جائز ہے تو کیا اس کے لئے بھی وہی آداب وشرائط ہیں جو بالمواجہ کسی قاری سے سننے کے وقت لازم ہوتے ہیں؟

۳: اگر ریڈیو پر کسی قاری نے آیتِ سجدہ پڑھی تو کیا سننے والوں پر سجدۂ تلاوت لازم ہے یا نہیں؟

۴: ریڈیو پر درسِ قرآن یا تقریر سے پہلے ''السلام علیکم'' کہنا کیسا ہے؟ اور سننے

والوں پر اس کا جواب دینا واجب ہے یا نہیں؟

ان سوالات کے جوابات علی الترتیب حسبِ ذیل ہیں:۔

الجواب

۱: پہلے اُصولی طور پر یہ (۱) جان لینا ضروری ہے کہ جو آلات خاص طور پر لہو وطرب کے لئے وضع کئے گئے ہیں، جیسے طبلہ، سارنگی، دوتار، ہارمونیم وغیرہ ان پر قرآنی آیات کی آواز بنانا بے ادبی اور گستاخی ہے، اس لئے بالکل ناجائز ہے، اور جو آلات اصل سے تو لہو وطرب کے لئے وضع نہیں ہوئے، مگر ان کا عام استعمال لہو وطرب اور گانے بجانے میں ہوتا ہے جس کی بناء پر وہ آلات لہو وطرب ہی کے آلات سمجھے جاتے ہیں، اُن کا بھی حکم یہی ہے، جیسے فونوگراف وغیرہ، البتہ جو آلات ایسے ہیں کہ نہ اُن کی وضع لہو وطرب کے لئے ہے، نہ اُن کو عموماً الاتِ لہو وطرب سمجھا جاتا ہے ایسے آلات پر قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور اس کا سننا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ آدابِ تلاوت کی پوری رعایت کی جائے۔ مثلاً: جس مجلس میں تلاوت کی جارہی ہے وہ مجلس لہو وطرب کی مجلس نہ ہو، قاری ادب واحترام کے ساتھ ثواب سمجھ کر قرأت کرے، اور آلہ مکبّر الصوت، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ مشین وغیرہ آلات بظاہر اسی قسم میں داخل ہیں، اگرچہ ریڈیو کے استعمال کرنے والوں کی بدمذاقی نے زیادہ تر گانے بجانے اور لغو چیزوں میں لگا رکھا ہے، اسی وجہ سے بعض علماء نے اس پر تلاوت قرآن کو درست نہیں سمجھا، لیکن دوسرے مفید کام مثلاً: دنیا کی خبریں اور تلاوت یا تفسیر قرآن اور دوسرے مفید مضامین کی بھی اس میں خاص اہمیت پائی جاتی ہے۔

اس لئے یہ صحیح ہے کہ اس کو آلاتِ لہو وطرب کے حکم میں داخل نہیں کیا جاسکتا اور ریڈیو کی جس مجلس میں تلاوت ہوتی ہے وہ مجلس بھی لہو ولعب اور لغو چیزوں سے الگ ہوتی

(۱) یہ خلاصہ ہے اس تحقیق کا جو سیّدی حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہٗ نے اپنے رسالہ ’’القالات المفیدہ فی حکم الاصوات الجدیدۃ‘‘ میں تحریر فرمائی ہے۔۱۲ محمد شفیع

ہے، اس لئے اس پر تلاوت قرآن فی نفسہ جائز ہے، ہاں! تلاوتِ قرآن ریڈیو پر ہو اس سے علیحدہ کسی صورت میں بہر حال محض تلاوت پر معاوضہ لینا حرام ہے، اور معاوضہ لے کر پڑھنا بھی ناجائز اور اس کا سننا بھی درست نہیں، علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس مسئلہ کو اپنے رسالہ ''شفاء العلیل''، میں پوری تفصیل کے ساتھ مع دلائل لکھ دیا ہے۔

یہاں معاوضہ کے جواز کی صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

۱: اوّل یہ کہ تلاوتِ کے ساتھ اس کا ترجمہ اور تفسیر بھی ہو تو پھر وہ تلاوت مجردہ نہ رہے گی، تعلیم کی حیثیت اختیار کر لے گی، اس کا معاوضہ لینا جائز ہوگا۔

۲: دوسرے یہ کہ ریڈیو کی ملازمت اختیار کرے، وہاں جانے آنے اور وقت کی پابندی وغیرہ کی تنخواہ لے اور تلاوت کو ثواب سمجھ کر کیا کرے۔

تنبیہِ ضروری

ریڈیو پر تلاوتِ قرآن کے معاملہ میں ایک اور چیز بھی قابلِ نظر ہے، وہ یہ کہ اگرچہ تلاوت کرنے والا جس مجلس میں تلاوت کر رہا ہے، وہاں کوئی چیز احترامِ قرآن کے خلاف نہ ہو، مگر جہاں جہاں ریڈیو کی آواز سنی جاتی ہے اُن میں بکثرت ایسے مواضع ہوتے ہیں جن میں شور و شغب اور مختلف قسم کے کاروبار ہوتے رہتے ہیں، جیسے عام ہوٹلوں اور بازاروں میں ہر طرح کی خرافات ہوتی رہتی ہیں، اس میں ریڈیو سے قرآن کی تلاوت بھی ہوتی رہتی ہے، بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو قرآن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی مجالس میں قرآن سنانا بے ادبی اور ناجائز ہے، جیسا کہ عالمگیری کتاب الکراہتہ میں ہے:

ومن حرمة القرآن ان لا یقرأ فی الاسواق و فی مواضع اللغوا کذا فی القنیة (و فیه قبل ذٰلک) وقد یأثم (ای بالذکر والتلاوة) اذا فعله فی مجلس الفسق وهو یعلمه

لما فیہ من الاستھزاء والمخالفة لموجبه.

(عالمگیری طبع مصرج:۵/ص:۳۲۷)

یعنی قرآن کے احترام میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کو بازاروں اور لغو مجلسوں میں نہ پڑھا جائے، اور پڑھنے والا گنہگار ہوگا، اگر اس نے کسی فسق وگناہ کی مجلس میں اس کو پڑھا، بشرطیکہ اس کا مجلسِ فسق ہونا اس کو معلوم ہو، کیونکہ ایسا کرنا درحقیقت قرآن کا استہزاء کرنا اور قرآن کے منشاء کے خلاف کرنا ہے۔

اور شیخ الاسلام محی الدین نوویؒ نے اپنے رسالہ ''التبیان فی آداب حملۃ القرآن'' میں تحریر فرمایا ہے:۔

و مما یعتنی به ویتأکد الامر به احترام القرآن من امور قد یتساهل فیها بعض القارئین الغافلین المجتمعین ضمن ذٰلک اجتناب الضحک واللغط والحدث فی خلال القراءة الا کلاماً ما یضطر الیه و من ذلک العبث بالید او غیرها، ومن ذٰلک النظر الی ما یلهی ویبدد الذهن. (ص:۱۸)

یعنی من جملہ اُن چیزوں کے جن سے قرآن کا احترام ضروری ہے، اور بہت سے غافل قاری اس میں تساہل کرتے ہیں، ایک یہ ہے کہ مجلسِ تلاوت میں ہنسی، ٹھٹھے اور فضول باتوں سے اجتناب کیا جائے، اور تلاوت کے درمیان بلا ضرورتِ شدیدہ کلام کرنے سے، نیز ہاتھوں یا دوسری چیزوں سے کھیلنے سے پرہیز کیا جائے، اور ایسی چیزوں پر نظر ڈالنے سے بچا جائے جن کی وجہ سے ذہن منتشر ہو اور توجہ قرآن کی طرف نہ رہے۔

تصریحاتِ مذکورہ بالا سے معلوم ہوا کہ لہو ولعب کی مجالس میں اور ایسے مواقع میں جہاں لوگ قرآن سننے کی طرف متوجہ نہ ہوں تلاوتِ قرآن کرنا گناہ اور ناجائز ہے، اور جبکہ ریڈیو کا اکثر ایسے مواقع میں استعمال کیا جانا معلوم ہے۔ ریڈیو پر تلاوت قرآن کرنے والا بھی ایک حیثیت سے اس گناہ کا شریک ہوجاتا ہے۔

لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو قرآن کو قرآن ہی کی حیثیت سے سنتی اور اس سے فائدہ اُٹھاتی ہے، اور اس کو خاص اہمیت دیتی ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ریڈیو کا ادارہ کبھی اس کو اپنے پروگرام میں شامل نہ کرتا، اس لئے تلاوت کرنے والے کے پیش نظر وہی حضرات ہوسکتے ہیں جو آداب کی رعایت کرتے ہیں، اس لئے اُصول وقواعد پر نظر کرنے کے بعد صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ بے جا اور غلط استعمال کرنے کی ذمہ داری خود استعمال کرنے والوں پر ہے، تلاوت کرنے والے کو اس کا ذمہ دار نہیں کہا جاسکتا۔

ریڈیو سے تلاوتِ قرآن سننا

۲: دوسرا سوال ریڈیو کی تلاوتِ قرآن سننے سے متعلق ہے، اس کا جواب ظاہر ہے کہ جس چیز کا پڑھنا جائز ہے اس کا سننا بھی جائز ہے، البتہ جیسے قاری پر لازم ہے کہ مجلسِ قرأت میں آدابِ قرآن کی پوری پابندی کرے، اسی طرح سننے والوں پر لازم ہے کہ ایسی مجلس میں ریڈیو نہ کھولیں جس میں عام لوگ لہو لعب یا شور وشغب یا اپنے کاروبار میں مشغول ہوں اور قرآن سننے کی طرف توجہ نہ ہوں، ورنہ گنہگار ہوں گے، جب ریڈیو سے قرآن سننا ہی مقصود ہو تو ادب کے ساتھ بیٹھ کر سنیں، اور ان تمام آداب کی رعایت کریں جو تلاوتِ قرآن کی مجلس کے لئے لازم ہیں، ایسا نہ کریں کہ ریڈیو کھول کر اپنے کاروبار میں لگ جائیں اور چلتے پھرتے اس کی آواز کان میں پڑتی رہے، کیونکہ یہ ادب کے خلاف ہے۔

ریڈیو پر آیت سجدہ کی تلاوت

۳: تیسرا سوال اس کا ہے کہ اگر قاری نے ریڈیو پر کوئی آیت سجدہ پڑھی تو سننے والوں پر سجدہ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ آلہ حال میں ایجاد ہوا ہے، اس کا حکم صریح الفاظ میں کتب فقہ یا نصوصِ کتاب وسنت میں نہیں ہوسکتا، قواعد واُصول اور امثال ونظائر ہی سے اس کا حکم دریافت کیا جاسکتا ہے، فقہاء کے کلام میں اس کی ایک نظیر یہ مذکور ہے کہ صوتِ صدیٰ یعنی آواز بازگشت جو کسی گنبد یا کنویں وغیرہ میں سنی جاتی ہے، یہ آواز چونکہ خود متکلم کی اصلی آواز نہیں بلکہ اس کا عکس ہے، جو ایک غیر جاندار، غیر ذی شعور چیز کے ذریعہ انسان تک پہنچا ہے، اس لئے فقہاء نے اس کو تلاوتِ قرار نہیں دیا، اور وجوبِ سجدہ کے لئے تلاوتِ صحیحہ شرط ہے، اسلئے بازگشت کے ذریعہ آیتِ سجدہ سننے والوں پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔

فقہ کی نہایت مستند اور معروف کتاب ''بدائع الصنائع'' میں میں ملک العلماء نے پہلے تو یہ مسئلہ لکھا کہ وجوبِ سجدہ کے لئے اہلیتِ نماز شرط ہے، اس کی بناء پر حکم لکھا کہ کافر، بچہ، مجنون اور حیض ونفاس والی عورت پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، خواہ وہ خود پڑھیں یا کسی دوسرے سے سنیں، کیونکہ ان میں وجوب نماز کی اہلیت نہیں ہے، البتہ بے وضو مسلمان یا جنبی (یعنی جس پر غسل واجب ہو) یہ لوگ اگر آیتِ سجدۂ کی تلاوت کرلیں یا کسی سے سن لیں تو ان پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا، وضو یا غسل کرنے کے بعد ادا کرلیں، کیونکہ ان میں وجوبِ نماز کی اہلیت بالفعل موجود ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ: اگر کوئی کافر بچہ یا حیض ونفاس والی عورت آیتِ سجدۂ پڑھے تو اگر چہ خود ان پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، مگر سننے والے بالغ مسلمانوں پر ان سے سن کر بھی سجدہ واجب ہوجائے گا، کیونکہ تلاوت اُن کی صحیح ہے، وجہ یہ ہے کہ سجدہ تلاوت تو صرف الفاظ سجدہ سننے سے واجب ہوجاتا ہے جو پوری آیت نہیں ہے، اور ایک آیت سے کم

کی تلاوت حیض ونفاس والی عورت کے لئے جائز ہے، اور کافر اور بچہ کی تلاوت کا جائز ہونا ظاہری ہے، اس لئے ان سب کی تلاوت کو تلاوتِ صحیحہ قرار دیا جائے گا، اور وجوبِ سجدہ کے لئے تلاوتِ صحیحہ ہونا ہی شرط ہے، لہٰذا سننے والوں پر سجدۂ تلاوت لازم ہوگا۔

اس کے بعد دو چیزوں کا حکم اس سے مختلف یہ بیان فرمایا کہ: اُن میں سجدہ تلاوت سننے والوں پر واجب نہیں ہے۔ اوّل کسی طوطے یا آوازِ بازگشت کے ذریعہ آیتِ سجدہ سننا کہ اس کو تلاوت ہی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ تلاوت کا تعلق قصد وشعور سے ہے، اور طوطا یا جس گنبد وغیرہ سے بازگشت کی آواز آئی ہو وہ نہ ذی شعور ہیں، نہ تلاوت کا قصد وہاں پایا جاتا ہے۔ دوسرے مجنون کہ اگرچہ اُس کی فی نفسہٖ اہلیت کی بناء پر تلاوت تو مانی جائے گی، مگر چونکہ وہ اپنی اہلیت اور تمیز کھو چکا ہے اس لئے تلاوت صحیحہ نہ ہوگی، بہرصورت ان سے آیتِ سجدہ سننے والوں پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوگا، بدائع کے آخری الفاظ یہ ہیں:

بخلاف السماع من الببغاء والصدیٰ فان ذلک لیس بتلاوۃ وکذا اذا سمع من المجنون لان ذٰلک لیس بتلاوۃ صحیحۃ لعدم اھلیتہ لانعدام التمییز.

(بدائع ج:۱/ص:۱۸٦)

بخلاف اس کے کہ آیت سجدہ کسی طوطے سے یا آوازِ بازگشت سے سنی جائے، کیونکہ یہ تلاوت ہی نہیں، اسی طرح اگر کسی مجنون کی زبان سے آیتِ سجدہ سنی ہو تو اگرچہ اس کو تلاوت کہیں گے، لیکن تلاوتِ صحیحہ نہیں، کیونکہ عدمِ تمیز کی وجہ سے اس کی اہلیت فوت ہو چکی ہے۔

فقہاء کی مذکورہ بالا تصریحات سننے کے بعد مسئلہ زیرِ بحث پر غور کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ریڈیو یا آلہ مکبّر الصوت کی آواز کو بھی اگر مصنوعی آواز مثل صوتِ صدیٰ کے قرار دیا جائے تو اس کے ذریعہ آیتِ سجدہ سننے والوں پر سجدۂ تلاوت واجب نہ ہو، اور اگر اس کو

متکلم کی اصلی آواز قرار دیا جائے تو سجدۂ تلاوت واجب ہو۔

اب یہ بات کہ یہ آواز اصلی ہے یا مصنوعی؟ اس معاملہ میں سائنسِ جدید کے ماہرین کے اقوال خود مختلف ہیں، بعض اس کو اصلی آواز قرار دیتے ہیں اور بعض مصنوعی کہتے ہیں، جس کی مکمل تفصیل احقر کے رسالہ ''مکبّر الصوت'' میں مذکور ہے، اس لئے سجدۂ تلاوت کے باب میں احتیاط اسی میں ہے کہ سجدہ کو واجب قرار دیا جائے، اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تفصیل مطلوب ہو تو رسالہ مکبّر الصوت میں دیکھ لیا جائے۔

ریڈیو پر درسِ قرآن سے پہلے سلام کرنے اور جواب دینے کا حکم

۴: چوتھا سوال اس سے متعلق ہے کہ ریڈیو پر درسِ قرآن یا کوئی وعظ و تقریر نشر کرنے سے پہلے ''السلام علیکم'' کہنا کیسا ہے؟ اور اس کا جواب دینا سننے والوں پر واجب ہے یا نہیں؟

اس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ درسِ قرآن یا خطبہ یا وعظ کے شروع میں مخاطبین کو سلام کرنا سنت سے ثابت نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے تمام خطبات میں کہیں مذکور نہیں کہ خطبہ یا وعظ سے پہلے لوگوں کو سلام کرتے ہوں، اسی طرح تمام علمائے اُمت کا درسِ قرآن و حدیث وغیرہ میں یہ معمول نہیں رہا، کہ درس سے پہلے لوگوں کو سلام کریں، اس لئے ریڈیو پر درس سے پہلے سلام کرنا سنتِ سلف کے خلاف ہے، خصوصاً اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابلِ ترک ہے کہ حکمِ شرعی کے مطابق سلام سننے والوں پر اس کا جواب دینا واجب ہو جاتا ہے، اور یہ واجب ادا جب ہو سکتا ہے جب جواب دینے والوں کا جواب سلام کرنے والا سنے، یہاں اس کا امکان نہیں، اس لئے ایسے مواقع پر سلام کرنا ہی عبث ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ کسی نے ''السلام علیکم'' ریڈیو پر کہہ دیا تو سننے والوں پر جواب

دینا واجب ہے یا نہیں؟ تو مقتضا قواعد کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس واجب کی ادائیگی اس طرح کہ سلام کرنے والے کو اس کا جواب معلوم ہو جائے، سننے والوں کی قدرت میں نہیں، اسلئے وجوب جواب تو ساقط ہو جانا چاہئے، البتہ احتیاطاً جوابِ سلام دے دیں تو بہتر ہے، کیونکہ یہ ایک کلمۂ دعا کا ہے، اور دعا غائبانہ بھی ہو سکتی ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

خادم دار الافتاء دار العلوم دیو بند

شوال ۱۳۶۱ھ

مفتی دیارِ مصر شیخ عبد المجید آفندی سلیم نے ریڈیو پر تلاوتِ قرآن کے جائز ہونے کا فتویٰ اس شرط کے ساتھ دیا کہ آدابِ قراءت محفوظ رہیں، مثلاً: جس مجلس میں پڑھا جائے وہاں لوگ خاموش ہو کر سنیں، اور قراءت بھی کسی ایسی مجلس میں نہ ہو جو لہو ولعب یا فسق وفجور کی مجلس ہو۔

شیخ کمال الدین ادہمی مصری نے اپنی کتاب "تجیب المسلمین بکلام رب العالمین" میں یہ فتویٰ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مفتی مصر نے جن شرائط کے ساتھ ریڈیو پر تلاوتِ قرآن کو جائز قرار دیا ہے وہ شرائط عام طور پر مفقود ہیں، اس لئے فتویٰ جواز کے خلاف واقع ہے۔

کیونکہ عام طور پر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ ریڈیو قہوہ خانوں، ہوٹلوں، تفریح گاہوں میں لگے ہوئے ہیں، لوگ اپنے لہو ولعب، شور وشغب، کاروبار بلکہ فسق وفجور میں لگے ہوتے ہیں اور قرآن کی یہ آواز وہاں سنائی جاتی ہے، جس میں بلاشبہ قرآن کی بے ادبی ہے۔

اور یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ادارۂ ریڈیو کے ذمہ داروں کی نظر میں اصل مقصود تو وہ چیزیں ہیں جو عوام کی تفریحِ طبع کا کام دیں، ثانوی درجہ میں قراءت یا کوئی دوسرا مفید مضمون اس میں لگا لیا جاتا ہے، اس لئے ریڈیو پر تلاوتِ قرآن کرنے والا بھی اس گناہ کا شریک ہے جو لہو ولعب کی مجلس میں سننے سنانے والے کر رہے ہیں، خصوصاً اگر قراءت کرنے والی کوئی عورت ہے تو یہ گناہ دُوگنا ہو جاتا ہے، کیونکہ عورت کی آواز بھی ستر میں داخل ہے۔

شیخ کمال ادہمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اسی رائے کا مندرجہ ذیل نظم میں بھی اظہار کیا ہے:

مَـالِـیْ وَمَـا لِـلـرَّادِیُوْ وَشِـرَائِـہٖ وَسِـمَـاعِ مَـاقَـدْ جَاءَ فِـیْ آلَاتِـہٖ

مجھے ریڈیو خریدنے اور اس کے آلات سے جو کچھ سنا جاتا ہے اس کے سننے سے کوئی واسطہ نہیں۔

وَاللّٰـہِ لَـوْ اَعْـطَـوْہُ بِـالْمَجَّانِ لِی وَتَـکَـفَّـلُـوْا بِـجَـمِـیْعِ مَصْرُوْفَاتِـہٖ

خدا کی قسم! اگر لوگ مجھے ریڈیو مفت دیں اور اس کے تمام مصارف بھی اپنے ذمہ رکھیں۔

مَـا کُـنْـتُ اَقْـبَـلُـہٗ وَلَا اَرْغَـبُ بِـہٖ فَـالشَّـرُّ کُلَّ الشَّرِّ فِیْ طَبَّـاتِـہٖ

تو میں اُس وقت بھی اس کو قبول نہ کروں اور نہ اس کی طرف رغبت کروں کیونکہ اس کے اندر ساری خرابیاں موجود ہیں۔

صَـرَفٌ لِـمَـالٍ لَیْـسَ فَـائِـدَۃٌ بِـہٖ وَضِـیَـاعُ مَـاقَـدْ عَزَّ مِنْ اَوْقَـاتِـہٖ

بے فائدہ مال خرچ کرنا اور اوقاتِ عزیز کو ضائع کرنا

وَسِـمَـاعُ اغـنیۃ یُھَیِّجُ سَـمْـعُھَـا شَھْوَاتِ خَالِی الْفِکْرِ مِنْ شَھْوَاتِہٖ

اور ایسے گیت اور غزل سننا جس سے ایک خالی الذہن آدمی کی شہوات میں ہیجان پیدا ہو جائے۔

اَمَّا سِوٰی ھٰذَا مِنَ الْقُرْاٰنِ وال اٰدَابُ فِیْـہِ فَـلَیْـسَ مِـنْ غَـایَـاتِـہٖ

اور اس کے علاوہ قرآن یا اخلاقی مضامین جو اس میں ہوتے ہیں وہ اصلی مقصود نہیں۔

بَـلْ اِنَّـمَـا جَـرَّتْـہُ قَـافِـیَـۃً لَـہٗ وَسِوَاھُمَا الْمَقْصُوْدُ مِنْـہُ بِذَاتِـہٖ

بلکہ بطور قافیہ اُن کو لگا دیا ہے اور اصل مقصود دوسری ہی چیزیں ہیں۔

وَلَـکَـمْ اَرَادُوْا لِـطَـیِّـہٖ فَتَـخَـوَّفُـوْا شَـعْـبًـا یَـدِیْـنُ اللّٰـہَ فِـیْ اٰیَـاتِـہٖ

بہت مرتبہ ریڈیو کے ادارہ نے یہ بھی ارادہ کیا کہ تلاوتِ قرآن کو اس میں سے نکال دیں مگر دیندار لوگوں کے خوف سے یہ کام نہیں کیا۔

فَـرَأَوْا مُـحَـارَاۃً لَّـہٗ اِبْـقَـائَـہٗ لٰـکِـنَّـھُـمْ نَـقَـصُـوْہُ مِنْ سَـاعَـاتِـہٖ

اس لئے دینداروں کے ساتھ مدارات کی خاطر اس کو جاری رکھا، مگر اوقات تلاوت کم کردیئے۔

اَلرَّادِیُوْ شَیْءٌ عَظِیْمٌ نَافِعٌ لِلْخَلْقِ لَوْ رَاعُوْا جَمِیْلَ صِفَاتِہٖ

ریڈیو فی نفسہٖ مخلوق کے لئے بہت عمدہ نافع چیز ہے، کاش کہ اس کے فوائد کی رعایت کی جاتی۔

ہم جو ریڈیو کی مخالفت کرتے ہیں اس کا سبب یہ خرافات ہیں جن میں ہم اس کو اس کے ذمہ داروں نے لگا رکھا ہے، ورنہ یہ تو ایک بہترین نافع اور مفید ایجاد ہے، جس سے دین و دنیا کے ہزاروں فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں، آج بھی اگر اس کا استعمال عمومی طور پر صحیح اور جائز کاموں میں ہونے لگے تو پھر مخالفت کی کوئی وجہ نہیں۔ (تحبیب المسلمین، طبع مصر ص:۱۱۸)

شیخ الازہر مصر کا فتویٰ

قاہرہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''نور الاسلام'' کی چوتھی جلد ص:۳۵۸ میں بھی اس مسئلہ کے متعلق ایک سوال اور شیخ الازہر کی طرف سے جواب حسبِ ذیل شائع ہوا ہے:

سوال: ریڈیو پر قرآن پڑھنا کیسا ہے؟ جبکہ عموماً اس کو لہو ولعب کی مجلسوں اور نامناسب مقامات میں سنا جاتا ہے۔

الجواب

انّ الذی یسمع من الکلام بواسطۃ الردیو ھو کلام المتکلم وصوت القاری ولیس صدیٰ کلمات کالذی یمسع فی الجبال والصحاری وغیرھما وعلٰی ھذا یکون المسموع من الرادیو قرانا حقیقۃ فمتی کان القاری جالسًا فی محل غیر ممتھن وکان فی قراء تہ مراعیا ما

تجب مراعاته مستوفيا شروط القراءة وليس في قراءته خلل كانت قراءته جائزة ومثاب عليه اما اذا لم يستوف الشروط كأن جلس في محل ممتهن او أخل بشروط القراءة او قصد من قراءته اللهو اللعب فلا تجوز ولايضر القاري متى كان مستوفيًا الشروط مراعيا لاحكام التجويد وكان على الوصف الذى قدّمنا ان يسمع صوته في محل لا تجوز القراءة فيه وعلى السامع ان يستمع واذا وجد من يشوش نهاه من التشويش . انتهٰى.

(ترجمہ) ’’جو کلام ریڈیو کے ذریعہ سنا جاتا ہے وہ متکلم کا اصلی کلام اور قاری کی اصلی آواز ہے، وہ آواز بازگشت نہیں جو پہاڑوں اور جنگلوں وغیرہ میں سنی جاتی ہے، اس بناء پر جو قرآن ریڈیو سے سنا جائے وہ حقیقتاً قرآن ہی ہے، تو جب قاری ایسی جگہ میں بیٹھا ہو جس میں قرآن کی بے ادبی نہیں اور اپنی قرأت میں تمام آدابِ تلاوت کی رعایت رکھی ہو، اور اسکی قرأت میں بھی کوئی خلل نہ ہو تو اس کی قرأت جائز ہے، اور جو کچھ اس سے سنا جاتا ہے وہ قرآن ہی ہے، اس کا سننا جائز بلکہ باعثِ ثواب ہے، ہاں! اگر شرائطِ تلاوت کو پورا نہیں کیا گیا، مثلاً: کسی ایسی جگہ بیٹھ کر تلاوت کی جس میں تلاوت کرنا قرآن کی بے ادبی سمجھی جائے یا تلاوت کو محض تفریح اور مشغلہ کے طور پر کرے تو جائز نہیں، اور جب قاری نے آدابِ تلاوت پورے کر کے تلاوت کی ہو تو یہ بات اس کے لئے مضر نہیں کہ اس کی آواز کسی ایسی جگہ سنی جائے جہاں تلاوت کرنا جائز نہیں، (جیسے بازار اور لہو ولعب کے مواقع) بلکہ سننے والوں پر لازم ہے کہ وہ ریڈیو کو اسی وقت استعمال کریں جبکہ تلاوت سننا ہی مقصد ہو، اور اگر کوئی اس مجلس میں ذہن کو منتشر کرنے والی بات کرے تو اس کو منع کرنا چاہئے۔‘‘

احقر نے بھی شروع رسالہ میں عرض کیا ہے کہ بمقتضائے قواعد ریڈیو سننے والوں کی غلطی اور گناہ کا ذمہ دار قاری نہیں ہے، بلکہ جو اُس کو غلط مواقع میں استعمال کرتے ہیں وہ اس کے ذمہ دار ہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم! بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہوائی رُؤیتِ ہلال کی شرعی حیثیت

اور آلاتِ جدیدہ کی خبروں کا درجہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ

کراچی میں ہلالِ رمضان پر بعض لوگوں نے ہوائی جہاز میں پرواز کر کے (چاند) دیکھنے کا اہتمام کیا، اور اس رُؤیت کی بناء پر کراچی میں روزہ کا اعلان ہوا، اس پر اطراف پاکستان اور ہندوستان وغیرہ سے مختلف قسم کے سوالات آئے، اور اہل علم نے اس پر اشکالات کا اظہار کیا، اس لئے مناسب ہوا کہ رُؤیتِ ہلال کی شرعی حیثیت کو واضح کر دیا جائے۔

اسلام ایک دینِ فطرت اور عالمگیر مذہب ہے، اس کے اَحکام عالم، جاہل، خواندہ، ناخواندہ، مرد، عورت پر یکساں حاوی ہیں، اس کے احکام جس طرح حکماء وفلاسفر اور علماءِ محققین، امراء وسلاطین کے لئے ہیں اسی طرح وہ جنگلوں اور پہاڑی درّوں میں رہنے والے وحشی انسانوں کے لئے بھی، اور ایسے لوگوں اور خطوں کے لئے بھی ہیں جن میں نہ جدید آلات میسر ہیں، نہ وہ ان کا استعمال کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف عباداتِ اسلامیہ میں اس کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ کم از کم عبادت اور عبادت گاہوں میں یکسانیت ہو، امیر و غریب کا امتیاز نہ ہو، ہر کلمہ گو مسلمان ایک ہی انداز سے عبادت کر سکے، عبادت کے وقت: ''ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز'' کا منظر نظر آئے، حج میں لباسِ احرام کی یکسانیت، منیٰ، مزدلفہ، عرفات میں بلا امتیاز ایک ہی میدان میں قیام، نماز کی صفوف کی یکسانیت وغیرہ کھلے ہوئے شواہد ہیں، اس لئے اسلام میں تمام عبادات اور تمام اَوامر ونواہی کی بنیاد ایسی سادگی پر رکھی گئی ہے جو ہر زمانے، ہر ملک، ہر خطہ میں ہر مسلمان کو یکساں

حاصل ہو، یہ نہ ہو کہ مالدار جدید آلات کے ذریعہ اپنی عبادت کو بہتر بناسکیں۔ اور غریب عبادت میں بھی دیکھتے رہ جائیں، اس لئے اسلامی عبادات نہ فلسفہ قدیم کی رہین منت تھیں، نہ آج سائنسِ جدید اوراس کے مخترعہ آلاتِ جدیدہ کی محتاج ہیں، نہ اس کے ادا کرنے میں کسی محقق، فلسفی یا ماہر ریاضیات ونجوم کی ضرورت ہے، سمتِ قبلہ کا استخراج فنِ ریاضی کا اور ہلال کے ذریعہ مہینہ کا شروع اور ختم، فلکیات کا فنی مسئلہ تھا، مگر نبی اُمّی فداہ وامی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس دھندے میں ڈالنے کے بجائے ان دونوں کے لئے یہ ہدایات دیں کہ فنی باریکیوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں، سرسری اور نظری طور پر اُن کا تعین کرلینا کافی ہے، رُویت ہلال کے متعلق ارشاد ہے:۔

صُومُوا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهٖ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا ثَلٰثِيْنَ.

چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور چاند دیکھ کر افطار کرو (اگر اَبر وغیرہ کی وجہ سے) اشتباہ ہوجائے تو مہینہ تیس دن کا قرار دو۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ ریاضی کی تدقیقات اور ہیئت ونجوم کے حسابات میں جائے بغیر ہر شہر کے آدمی سادہ طور پر اپنی اپنی جگہ چاند دیکھنے کی کوشش کریں، چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرکے مہینہ ختم کرلیں، چاند دیکھنے کے لئے اہتمام بھی صرف اتنا کہ کسی ایسی جگہ جہاں مطلعِ قمر میں کوئی چیز حائل نہ ہو، کھڑے ہوکر دیکھ لیں، اس سے زیادہ اہتمام کو بھی پسند نہیں فرمایا۔

عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں مانا کہ ہوائی جہاز نہ تھے، مگر مدینہ میں سلع پہاڑ سامنے کھڑا ہے اس کے اُوپر کچھ آبادی بھی ہے، جبل اُحد بھی ساتھ لگا ہوا ہے، مکہ معظمہ تو سب طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے، صفا اور مروہ کی پہاڑیاں اور جبلِ ابی قیس بالکل شہر سے لگے ہوئے ہیں، لیکن عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں پھر خلافت راشدہ اور قرون

خیر میں کہیں نظر سے نہیں گزرا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ نے اتنا اہتمام فرمایا ہو کہ لوگوں کو ان پہاڑوں کے کسی اونچے مقام پر چڑھ کر چاند دیکھنے کے لئے بھیجا ہو، اسی طرح عہدِ مبارک میں اگر ہوائی جہاز اور ریڈیو، ٹیلی فون نہ تھے تو تیز رفتار سانڈنیاں موجود تھیں، جو ایک رات دن میں دور تک کی خبریں بلکہ شہادتیں لاسکتی تھیں، مگر حکیم الحکماء صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی پسند نہ کیا کہ سانڈنی سوار دوڑا کر مکہ سے مدینہ یا رابغ وغیرہ کی خبریں بہم پہنچائیں، شام اور مصر فتح ہونے کے بعد کوئی مشکل نہ تھی کہ وہاں کی شہادتیں ہر وقت سانڈنی سواروں کے ذریعہ مدینہ طیبہ میں جمع کرلی جائیں، مگر کہیں نظر سے نہیں گزرا کہ حضرات صحابہؓ نے اس کا اہتمام فرمایا ہو، اُن کا یہ طرزِ عمل اس کی کھلی علامت ہے کہ ان معاملات میں زیادہ اہتمام اور کاوش ان حضرات کو پسند نہ تھی، یہ احتمال اُن خیار الخلائق کے بارے میں نہیں ہوسکتا کہ پسندیدہ اور افضل ہونے کے باوجود سستی سے اُس پر عمل نہ کیا ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی اس عملی تعلیم کا حاصل یہی تھا کہ ہر شہر والے سادگی کے ساتھ اپنی اپنی جگہ چاند دیکھنے کی کوشش کریں، نظر نہ آئے تو مہینہ تیس دن کا سمجھیں، اتفاقی طور پر کسی دوسرے مقام کی شہادت آجائے تو اس کو قبول کریں، نہ آئے تو خواہ مخواہ خبریں اور شہادتیں بہم پہنچانے کی فکر میں نہ پڑیں۔

عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ اور قرونِ خیر کے اس تعامل کی بناء پر ہمارے نزدیک کسی طرح مستحسن اور پسندیدہ نہیں کہ ہوائی جہازوں میں اُڑ کر چاند دیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ ؎ ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ۔

تنبیہ: لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اتفاقی طور پر کوئی ہوائی جہاز کا مسافر چاند دیکھ لے اور آکر شہادت دے تو اس کی شہادت قبول نہ کی جائے، کیونکہ اس کی شہادت کو ردّ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ نیچے کی ہوا میں گرد وغبار اور بخارات کی وجہ سے مستبعد نہیں کہ چاند نظر نہ آئے اور بلند جگہ پر ہوا صاف ہونے کی وجہ سے نظر آجائے۔ کما قال الشامی:

و قد یری الھلال من اعلی الاماکن ما لایری من الاسفل

فلا یکون تفردہ بالرؤیۃ خلاف الظاھر. (ج:۲ ص:۱۲۷)

شرط یہ ہے کہ ہوائی جہاز پرواز اتنی اونچی نہ ہو جہاں تک زمین والوں کی نظریں پہنچ نہ سکیں، کیونکہ شرعاً رُویت وہی معتبر ہے کہ زمین پر رہنے والے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ سکیں، اس لئے اگر بیس تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر کے کوئی شخص چاند دیکھ آئے تو اس بستی کے لئے وہ رُویت معتبر نہیں جس سے عام انسان باوجود مطلع صاف ہونے کے اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

تمام شہروں میں رمضان یا عید ایک ہی دن کرنے کا کوئی شرعی اجر نہیں

تمام شہروں میں ایک ہی دن رمضان یا عید منانا نہ مسلمانوں پر لازم ہے، نہ اس کے اہتمام میں پڑنا کوئی اسلامی خدمت یا شرعی اجر ہے اور نہ عادۃً ایسا ہوسکتا ہے، کیونکہ مغربی اور مشرقی ممالک میں مسافتِ طویلہ کے بعد اختلافِ مطالع کا وجود یقینی اور اس کا اعتبار جمہور کے نزدیک ثابت ہے، اس لئے عہدِ صحابہ میں رمضان وعید، مدینہ میں کسی روز، مکہ میں کسی روز، شام میں کسی دن، عراق ومصر میں کسی دن ہوتی تھی، ان سب شہروں میں ایک ہی دن رمضان یا عید منانے کا جو اہتمام اس زمانہ میں ممکن تھا حضرات صحابہؓ و تابعینؒ نے اس کا بھی اہتمام نہیں فرمایا۔

حضرت کریبؓ کا واقعہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ:

> وہ مدینہ سے شام حضرت معاویہؓ کے پاس گئے تھے، وہاں رمضان کا چاند جمعہ کی شب میں دیکھا اور سب نے جمعہ کا پہلا روزہ رکھا، کریبؓ جب واپس مدینہ تشریف لائے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اُن سے دریافت کیا کہ: آپ نے رمضان کا چاند کس روز دیکھا تھا؟ انہوں نے عرض کیا کہ: جمعہ کی شب میں! فرمایا کہ: آپ نے خود دیکھا؟ عرض کیا کہ: ہاں میں نے بھی دیکھا اور حضرت معاویہؓ اور سب مسلمانوں نے بھی دیکھا

اور سب نے جمعہ کا روزہ رکھا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا: لیکن ہم نے (یعنی اہلِ مدینہ) تو شنبہ کی رات میں چاند دیکھا ہے، اس لئے ہم تو اُس وقت تک روزہ رکھیں گے جب تک یہاں چاند نظر نہ آئے یا تیس دن پورے ہو جائیں۔ حضرت کریبؓ نے عرض کیا: کیا آپ کے لئے حضرت معاویہؓ اور سب مسلمانوں کی رؤیت کافی نہیں؟ تو فرمایا کہ: ہمیں رسولِ خدا نے ایسا ہی حکم دیا ہے! (مسلم شریف ج:۱/ص:۳۴۸)

حضرت ابن عباسؓ کا یہ فیصلہ خواہ اس بناء پر ہو کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار کر کے ملکِ شام کی رُؤیت کو اہل مدینہ کے لئے کافی نہیں سمجھا، یا اس بناء پر کہ شہادت دینے والے تنہا حضرت کریبؓ تھے، اور ایک آدمی کی شہادت عید کرنے کے لئے کافی نہ سمجھی گئی۔ بہر حال اس واقعہ سے اتنا ضرور ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ اس فکر میں نہ رہتے تھے کہ سب جگہ عید یا رمضان ایک ہی دن میں کیا جائے، اور اس کے لئے شہادتیں بہم پہنچانے کی فکر کریں، ورنہ کیا مشکل تھا کہ پورے ماہِ رمضان میں مدینہ کے لئے شام کی باقاعدہ شہادت حاصل کر لی جاتی۔

مسئلہ رُؤیت ہلال کے متعلق پوری تحقیق اور مسائل معلوم کرنا ہوں تو احقر کے رسالہ ''رُؤیتِ ہلال'' کا مطالعہ کیا جائے، یہاں اس کا صرف اتنا حصہ نقل کیا جاتا ہے جو آلات جدیدہ سے متعلق ہے۔

ہلال کے معاملہ میں آلات جدیدہ کی خبروں کا درجہ

مسئلہ ہلال کے تمام ضروری پہلوؤں کی وضاحت کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آلاتِ جدیدہ، ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن، لاسلکی، وائرلیس، ٹیلی گرام وغیرہ کے ذریعہ آنے والی خبروں کا درجہ اور مقام شرعی حیثیت سے کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

۱: ہلال رمضان کے علاوہ عید، بقر عید یا کسی دوسرے مہینہ کے لئے ثبوتِ ہلال

باقاعدہ شہادت کے بغیر نہیں ہوسکتا، اور شہادت کے لئے شاہد کا حاضر ہونا لازمی ہے، غائبانہ خبروں کے ذریعہ شہادت ادا نہیں ہوسکتی، خواہ وہ قدیم طرز کے آلاتِ خبر رسانی خط وغیرہ ہوں یا جدید طرز کے ریڈیو، ٹیلی فون وغیرہ۔

۲: البتہ جس شہر میں باقاعدہ قاضی یا ہلال کمیٹی نے کسی شہادت پر اطمینان کر کے عید وغیرہ کا اعلان کر دیا ہو، اس اعلان کو اگر ریڈیو پر نشر کیا جائے تو جس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے اُس شہر اور اس کے مضافات و دیہات کے لوگوں کو اس ریڈیو کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ چاند کے متعلق مختلف خبریں نشر نہ کرے۔ صرف وہ فیصلہ نشر کرے جو اس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے اس کو دیا ہے، اور اس کے نشر کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا وہ الفاظ بعینہٖ نشر کئے جائیں، جس ریڈیو میں ایسی احتیاط کی پابندی نہ ہو اس کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا کسی کے لئے درست نہیں۔

اور جس طرح ایک شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ اس شہر اور اس کے مضافات کے لئے واجب العمل ہے، اسی طرح اگر کوئی قاضی یا مسلم مجسٹریٹ یا ہلال کمیٹی پورے ضلع یا صوبہ یا پورے ملک کے لئے ہو تو اس کا فیصلہ اپنے اپنے حدودِ ولایت میں واجب العمل ہوگا، اس لئے جو فیصلہ پاکستان میں صدر مملکت کی طرف سے ریڈیو پر نشر کیا جائے اور اس میں مذکور الصدر احتیاط سے کام لیا گیا ہو، وہ پورے ملک کے لئے نافذ العمل ہوسکتا ہے، بشرطیکہ کوئی علاقہ ایسا نہ ہو جہاں اختلاف مطالع کا اعتبار کرنا مذکورہ تحقیق کے مطابق ضروری ہو۔

۳: اسی طرح استفاضۂ خبر جس کی تعریف اور تحقیق رسالہ ''رویت ہلال'' میں مذکور ہے، اس میں بھی ان آلاتِ جدیدہ کی خبروں کا اعتبار کیا جائے گا، اگر ملک کے مختلف حصوں اور سمتوں سے دس بیس ریڈیو اور ٹیلی فون، ٹیلی ویژن یا خط وغیرہ کے ذریعہ چاند

دیکھنے والوں کی طرف سے اطمینان بخش خبریں آ جائیں تو ان پر اطمینان کیا جاسکتا ہے، شرط یہ ہے کہ خبر دینے والے کی شناخت پوری ہو جائے اور وہ یہ بیان کریں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے، یا یہ کہ ہمارے سامنے فلاں شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی کے سامنے شہادت پیش ہوئی۔ اس نے شہادت کا اعتبار کر کے چاند ہونے کا فیصلہ کر دیا (شامی ج:۲ص:۱۵۱)۔ محض ایسی مبہم خبر کہ فلاں جگہ چاند دیکھا گیا ہے، استفاضۂ خبر کے لئے کافی نہیں۔

۴: رمضان کے چاند میں چونکہ شہادت یا استفاضۂ خبر دونوں شرط نہیں ہیں، ایک ثقہ مسلمان کی خبر بھی کافی ہے، اس لئے خط اور آلاتِ جدیدہ کی خبروں پر اس شرط کے ساتھ عمل کرنا درست ہے کہ خبر دینے والے کا خط یا آواز پہنچانی جائے اور وہ بچشم خود چاند دیکھنا بیان کرے، اور جس کے سامنے یہ خبر بیان کی جارہی ہے وہ اس کو پہنچاتا ہو، اور اس کی شہادت کو قابلِ اعتماد سمجھتا ہو۔

ٹیلی گرام اور وائرلیس سے آئی ہوئی خبروں میں چونکہ خبر دینے والے کی شناخت نہیں ہوسکتی اس لئے محض ایسی خبروں سے ہلال ثابت نہیں ہوگا، البتہ ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، ریڈیو پر آواز کی شناخت ہو جاتی ہے اور یہ پہنچانا جاسکتا ہے تو جب یہ معلوم ہو کہ خبر دینے والا کوئی ثقہ مسلمان عاقل و بالغ اور بینا ہے اور خود اپنے چاند دیکھنے کی خبر دے رہا ہے، رمضان کا اعلان کرایا جاسکتا ہے، اور خبر دینے والے پر مکمل اعتماد نہ ہو تو رمضان کا اعلان کرانا بھی درست نہیں، اور ثبوتِ رمضان کے لئے حکمِ حاکم یا فیصلۂ قاضی بھی شرط نہیں، عام آدمی جب کسی معتمد ثقہ مسلمان عاقل، بالغ، بینا سے یہ خبر سنیں کہ اس نے چاند دیکھا ہے تو اُن پر روزہ رکھنا لازم ہو جاتا ہے، خواہ کوئی قاضی یا عالم یا ہلال کمیٹی فیصلہ دے یا نہ دے۔ (عالمگیری ج:۱/ص:۱۲۷)

بندہ ناکارہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

ووقفہٗ لما یحبّ ویرضیٰ....../۱۶/ذیقعدہ ۱۳۸۰ھ

التِّبْيَان لِحكم التداوى بدم الانسان

مریض کے بدن میں انسانی خون کا استعمال اور اُس سے متعلق مسائل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج کل بہت کمزور مریضوں کے علاج کا ایک نیا طریقہ یہ نکلا ہے کہ کسی انسان کے بدن کا خون بذریعہ انجکشن نکال کر محفوظ کرلیا جاتا ہے، پھر یہ خون بذریعہ انجکشن مریض کے بدن میں چڑھایا جاتا ہے، جس سے جاں بلب مریض کو فوری قوّت پہنچ جاتی ہے، اس کے متعلق مختلف قسم کے سوالات بکثرت آتے رہتے ہیں، مناسب معلوم ہوا کہ ان میں سے اہم سوالات کے جوابات یہاں لکھ دیئے جائیں۔

سوال: کیا کسی انسان کا خون بضرورتِ مرض دوسرے انسان کے بدن میں پہنچانا جائز ہے؟

الجواب: اصل حکم تو یہ ہے کہ خون نجاست غلیظہ ہے، اور نجات کا استعمال خارج بدن میں بھی حرام ہے، داخل بدن میں بدرجۂ اولیٰ ہے، کما صرّح فی الدرلمختار و ردالمحتار من فصل الانجاس ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ کرامؓ نے ناپاک چربی کشتیوں اور چمڑوں وغیرہ میں استعمال کرنے کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: حرام ہے۔ (صحیح بخاری)

اس کے علاوہ انسانی خون انسان کا جزء ہے، اور اجزاء کا استعمال کرنا مطلقاً حرام

ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الانتفاع باجزاء الآدمی لم یجز قیل للنجاسة وقیل للکراهة وهو الصحیح، کذا فی جواهر الاخلاطی.

یعنی آدمی کے کسی جزء کا استعمال جائز نہیں اور اس کی وجہ اور علت میں دو قول ہیں، بعض نے فرمایا کہ: ناپاک ہونے کی وجہ سے، اور بعض نے فرمایا کہ: انسان کی شرافت اور تکریم کی وجہ سے۔ پہلی وجہ کی بناء پر انسانی اجزاء میں سے صرف وہی چیز حرام ہوگی جو نجس ہو، جیسے خون بدن کا کٹا ہوا ٹکڑا یا کھال وغیرہ اور دوسری وجہ کا اثر یہ ہوگا کہ جو چیزیں نجس نہیں مثلاً: ناخن بال وغیرہ اُن کا استعمال بھی جائز نہیں ہوگا، اور عالمگیری میں یہ دونوں وجہ ذکر کر کے دوسری ہی وجہ کو صحیح قرار دیا ہے، اور عام فقہاء نے اس کو اختیار کیا ہے، اسی لئے انسان کے بالوں سے کوئی چیز بنا کر استعمال کرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے، خصوصاً انسان کے بدن کا کوئی حصہ، اس کے بارہ میں تو عالمگیری نے فتاویٰ قاضی خان سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک سے مر رہا ہو اور کوئی مردار چیز بھی نہیں ملتی، جس کو کھا کر جان بچا لے، ایسی حالت میں اگر اس کو کوئی شخص یہ کہے کہ تو میرا ہاتھ یا بدن کا کوئی اور ٹکڑا کاٹ کر کھا لے میں تجھے اجازت دیتا ہوں تو نہ اس شخص کے لئے ایسا کرنا جائز ہے اور نہ اس شخص کے لئے یہ جائز ہے کہ اپنے بدن کا گوشت دوسرے کو کھلائے، عبارت عالمگیری کی یہ ہے:

مضطر لم یجد میتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع یدی کُلُها، او قال: اقطع منّی قطعة و کلها، لا یسعه ان یفعل ذالک ولا یصح امره به.

(عالمگیری باب:۱۱ ج:۵، ص:۳۴۷، طبع مصر)

یہ جزئیہ فقہیہ بالکل مسئلہ زیر بحث کی نظیر ہے کہ ایک انسان کی جان بچانے کے لئے کوئی انسان اپنے بدن کا خون اپنی مرضی سے دینا چاہتا ہے مگر اس مذکورہ تصریح کے مطابق

انسانی جزء ہونے کی وجہ سے یہ جائز نہیں۔

یہ حکم تو اصل مسئلہ کا ہے، لیکن علاج و دوا کے لئے بعض فقہاء نے خاص اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت دی ہے، درمختار، شامی وغیرہ میں اسی پر فتویٰ دیا گیا ہے، شرط یہ ہے کہ کسی مسلمان ڈاکٹر یا طبیب کی تجویز سے یہ معلوم ہو کہ اس حرام چیز کے سوا کوئی دوسرا علاج ممکن نہیں، اور اس کے استعمال سے بغالب ظن تندرستی کی اُمید ہے۔ (شامی آخر باب المیاہ قبل فصل البیر)

اس فتوے پر بھی عالمگیری کی مذکورہ تصریح سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ انسانی خون کو دوسری حرام چیزوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، لیکن عالمگیری کی مذکورہ تصریح میں ایک ایسے عضوِ انسانی کا ذکر ہے جس کے قطع کرنے سے اُس انسان کو نہایت سخت تکلیف پہنچے گی، جس سے بعض اوقات اس کی جان کا بھی خطرہ ہوسکتا ہے، اور خون لینے کا جو طریقہ رائج ہے اس سے انسان کو کوئی ایسی تکلیف لاحق نہیں ہوتی، معمولی کمزوری ہوتی ہے جو چند روز کے علاج سے دفع ہو جاتی ہے، اس فرق کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ بطور علاج و دوا ایسے حالات میں جبکہ کسی مسلمان ڈاکٹر یا طبیب کے کہنے کے مطابق اور کوئی دوا کارگر نہ ہو اور خون دینے سے جان بچنے کی قوی اُمید ہو تو صرف ایسے حالات میں خون دے کر علاج کیا جاسکتا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

سوال ۲: اگر بیوی کا خون شوہر کے جسم میں یا شوہر کا بیوی کے جسم میں داخل کیا جائے تو اس سے نکاح پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب: اس کا صریح حکم ظاہر ہے کہ فقہاء کے کلام میں نہیں مل سکتا، کیونکہ یہ طریقۂ علاج ان کے زمانہ میں رائج نہیں تھا، لیکن ایک نظیر سے اس کا حکم سمجھا جاسکتا ہے کہ، وہ یہ کہ بچہ کو کسی عورت کا دودھ پلانے سے یہ بچہ مثل اپنے بچہ کے اس عورت کے لئے ہو جاتا ہے، اور یہ رضاعی ماں بیٹے کہلاتے ہیں، جس کی وجہ یہی ہے کہ دودھ جب اُس کے بدن

کا جزء بنا تو یہ اُس بچہ کی ماں ہوگئی، لیکن باتفاق فقہاء یہ حرمت رضاعت صرف اُس زمانہ کے ساتھ محدود ہے جبکہ بچہ کوئی دوسری غذا کھانے کے قابل نہ ہو، یعنی زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال کی عمر تک، اس کے بعد اگر کوئی عورت اس کو اپنا دودھ پلادے تو اُس سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ اب اس کی غذا اور نشو ونما کا مدار اس دودھ پر نہیں رہا۔

اسی طرح جب میاں بیوی میں سے ایک کا خون دوسرے کے بدن میں ایسے وقت پہنچایا گیا ہے جبکہ اس کے بدن کا نشو ونما اس خون پر موقوف نہیں بلکہ وقتی طور پر سہارا دینے کے لئے دیا گیا ہے، تو اس خون کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے کے لئے جزئیت کا رشتہ قائم نہیں ہوگا، اس لئے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، احتیاطاً دوسرے علماء سے بھی دریافت کرلیا جائے تو بہتر ہے۔

خون کے ذریعہ علاج کرنا مذکور الصدر وجوہ کی بناء پر اگر جائز بھی کہا جائے تب بھی اس میں اور بہت سے مفاسد ہیں (۱)، کیونکہ انسانی اجزاء دوسرے بدن میں منتقل ہوکر اس کے اخلاق وعادات کا اثر ساتھ لائیں گے، کسی کافر یا فاسد الاخلاق کا خون دیا تو تو اس کے آثار منتقل ہونا ظاہر ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس سے احتیاط ہی کی جائے اور اگر دینا ہی ناگزیر ہو تو اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس خون کے ذریعہ بُرے اخلاق اس طرف منتقل ہونے کی صورت نہ پیدا ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
دار العلوم کراچی
۷؍ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ

---

(۱) اب ایک مفسدہ اس میں یہ بھی پیش آنے لگا ہے کہ بے رحم کمپاؤنڈر اور نرسیں ناواقف اور سیدھے سادے مریضوں کو یہ کہہ کر کہ انجکشن لگانا ہے، ان کا خون نکال لیتے ہیں پھر اس کو فروخت کردیتے ہیں۔۱۲ محمد رفیع عثمانی، دار العلوم کراچی

خیر الکلام فی حوض الحمام

پانی کی جدید ٹینکیاں اور ان کی طہارت ونجاست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال: آج کل عام شہروں میں گھروں کے اندر غسل خانوں وغیرہ میں پانی پہنچانے کے لئے پائپ سسٹم کا رواج ہے، جسکا طریقۂ عمل یہ ہے کہ سرکاری پانی کا پائپ ہر مکان میں پہنچا دیا جاتا ہے، مکان والا اس پانی کو جمع کرنے کے لئے ایک حوض زمین دوز بناتا ہے جو گھر میں پانی کا خزانہ ہوتا ہے، پھر ہینڈ پمپ وغیرہ کے ذریعہ سے اس کا پانی عمارت کی سب سے اونچی سطح پر رکھی ہوئی ٹنکی پر پہنچا دیا جاتا ہے، پھر ٹنکی سے پائپ کے ذریعہ یہ پانی مکان کے مختلف حصوں اور غسل خانوں میں پہنچایا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایسی حوض یا ٹنکی میں جو عموماً دَہ دردَہ سے بہت کم ہوتی ہے، کوئی ناپاکی گر جائے تو اس کا پانی ناپاک ہو جائے گا یا نہیں؟ اور ناپاک ہو جائے تو اس کو پاک کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ کیا اُن کو عام برتنوں کی طرح ایک مرتبہ یا تین مرتبہ پانی ڈال کر دھویا جائے؟ یا کوئی دوسری آسان صورت بھی اس کے پاک کرنے کی ہے۔ بینوا توجروا

الجواب: اگر نیچے کے حوض یا اُوپر کی ٹنکی میں نجاست ایسی حالت میں گری ہے کہ اس کا پانی دونوں طرف سے جاری ہے، مثلاً: سرکاری پانی حوض میں آرہا ہے اور حوض کا پانی بذریعہ پائپ اُوپر چڑھایا جارہا ہے، اور دوسری طرف پائپ کے ذریعہ غسل خانہ وغیرہ میں پانی نکالا جارہا ہے، تو اکثر فقہاء کرامؒ کے نزدیک یہ حوض یا ٹنکی اُس وقت بحکم آبِ

جاری ہونے کی وجہ سے ناپاک ہی نہ ہوگی (۱)، (کما فی سیأتی فی الروایة الاولیٰ من شرح المنیة)

اور اگر حوض یا ٹنکی کا پانی دونوں طرف سے جاری نہ ہو، دونوں طرف یا کسی ایک طرف سے بند ہو تو اکثر فقہاء کے نزدیک یہ حوض اور ٹنکی ناپاک ہوجائے گی، پھر ناپاک ہونے کے بعد اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو نجاست گری ہے اگر وہ کوئی ذی جرم ہے یعنی محسوس جسامت رکھتی ہے تو پہلے اس نجاست کو ٹنکی میں سے نکال دیا جائے پھر اس کو دونوں طرف سے جاری کر دیا جائے، یعنی جس حوض یا ٹنکی میں نجاست گری ہے اس کے ایک طرف سے پانی داخل کیا جائے اور دوسری طرف سے نکالا جائے، تو دوسری طرف سے پانی نکلتے ہی یہ حوض اور ٹنکی اور ان کے پائپ سب پاک ہوجائیں گے، یہ ضروری نہیں کہ کوئی خاص مقدار پانی کی نکل جانے کے بعد پاک قرار دیا جائے، البتہ بعض فقہاء کے نزدیک تین مرتبہ اور بعض کے ہاں ایک مرتبہ حوض یا ٹنکی کا پانی بھر نکال دینا ضروری ہے،

(کما سیأتی فی الروایة الثانیة من شرح المنیة)

اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ ایک طرف سے پاک پانی داخل کر کے دوسری طرف سے اتنا پانی نکال دیا جائے جتنا کہ وقوعِ نجاست کے وقت اس حوض یا ٹنکی میں موجود ہے، اُس کے بعد حوض یا ٹنکی اور اس کے پائپ کو پاک سمجھا جائے، اور اگر تھوڑا سا پانی نکل جانے کے بعد بھی استعمال کرلیا جائے، تو قول مختار کے موافق گنجائش ہے۔

---

(۱) لیکن ناپاک نہ ہونے کا یہ حکم اس وقت ہے جبکہ پانی میں نجاست کا رنگ، بو یا ذائقہ ظاہر نہ ہو، اگر ان میں سے کوئی چیز پانی میں ظاہر ہوگئی تو جتنے پانی میں یہ ظاہر ہوگی اتنا ہی پانی ناپاک ہوجائے گا، اسی طرح اگر یہ نجاست پانی جاری ہونے کی حالت میں گری ہے اور پانی کسی ایک طرف سے بند ہونے کے بعد بھی جو پانی میں پڑی رہی تو پھر بھی پانی ناپاک ہوجائے گا۔۱۲

عباراتِ فقہاء مسائل مذکورہ کے متعلق حسب ذیل ہیں

۱: فی شرح المنية عن فتاویٰ قاضی خان، فان ادخل يده فی الحوض و عليها نجاسة ان كان الماء ساكنا لا يدخل فيه شئی من انبوبه ولا يغترف انسان بالقصعة يتنجس ماء الحوض وان كان الناس يغترفون من الحوض بقصاعهم ولا يدخل من الانبوب ماء او علی العكس اختلفوا فيه واكثرهم علیٰ انه يتنجس ماء الحوض و ان كان الناس يغترفون بقصاعهم ويدخل فيه من الانبوب اختلفوا فيه واكثرهم علیٰ انه يتنجس، انتهیٰ . فهٰذا هو الذی ينبغی ان يعتمد عليه.
(شرح منیہ ص: ۹۹)

۲: قال فی شرح المنية فان دخل الماء من جانب حوض صغير قد تنجس ماء ه فخرج من جانب قال ابو بكر بن سعد الاعمش لا يطهر مالم يخرج مثل ما كان فيه ثلٰث مرات فيكون ذٰلک غسلاله کالقصعة حيث تغسل اذا تنجست ثلاث مرات و قال غيره لا يطهر مالم يخرج مثل ما كان فيه مرة واحدة، و قال ابو جعفر الهندوانی يطهر بمجرد الدخول من جانب والخروج من جانب وان لم يخرج مثل ما كان فيه وهو ای قول الهندوانی اختار صدر الشهيد حسام الدين لانه حينئذ

یصیر جاریاً والجاری لا ینجس مالم یتغیر بالنجاسة والکلام فی غیر متغیّر انتھٰی. (شرح منیه ص: ۹۹)

تنبیہ: اس جگہ علامہ شامیؒ کی بعض روایات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ چھوٹے حوض یا ٹنکی کو پاک کرنے کا جو طریقہ بتلایا گیا ہے کہ اس کے پانی کو دوسری طرف سے جاری کر دیا جائے، اس میں جاری کرنے کی معتبر صورت یہ ہے کہ حوض یا ٹنکی کو بھر کر اُس کے کناروں سے پانی بہا دیا جائے، اور اگر تلی میں سوراخ کر کے پائپ لگا کر نکالا جائے تو وہ جاری پانی کے حکم میں نہیں ہوگا۔

حیث قال ثم ان کلامهم ظاهره ان الخروج من اعلاه فلو کان یخرج من ثقب فی اسفل الحوض لا یعدّ جاریاً لان العبرة لوجه الماء بدلیل اعتبارهم فی الحوض الطول والعرض الا العمق (الی قوله) ولم أر المسئلة صریحا نعم رأیت فی شرح سیدی عبدالغنی فی مسئلة خزانة الحمام اخبر ابو یوسف برؤیة فارة فیها، قال فیه اشارة الٰی ان ماء الخزانة اذا کان یدخل من اعلاها ویخرج من الانبوب فی اسفلها فلیس بجاز انتھٰی و فی شرح المنیة یطهر الحوض بمجرد ما یدخل الماء من الانبوب و یفیض من الحوض هو المختار لعدم تیقن بقاء النجاسة فیه و صیرورته جاریاً اهـ وظاهر التعلیل الاکتفاء بالخروج من الاسفل لکنه خلاف قوله یفیض فقال وراجع . انتھٰی. (ردالمحتار ج:۱، ص:۱۳۸)

لیکن اوّل تو خود علامہ شامیؒ نے اس مسئلہ کو شک و تردّد کے ساتھ لکھا اور پھر شرحِ

منیہ کی عبارت سے اس پر استدلال بھی کیا کہ اُوپر سے بہنے اور نیچے سے نکلنے کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اگر چہ اس استدلال پر ایک شبہ بھی ظاہر کر دیا، تاہم اتنا تو معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ ائمہ کی طرف سے منصوص نہیں، متأخرین کا استنباط ہے اور اس میں بھی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل اس مسئلہ کی اس پر ہے کہ حوضوں کے بڑے چھوٹے ہونے میں اُن کے طول و عرض کا اعتبار ہے، عمق کا اعتبار نہیں، جیسا کہ درمختار میں تصریح ہے کہ اگر کوئی حوض اوپر سے بڑا یعنی دَہ دردَہ ہو اور عمق میں اس کا رقبہ اس سے کم ہو تو اس کو حوض ہی سمجھا جائے گا، جو بحکمِ آبِ جاری ہوتا ہے۔

و لفظ الدر المختار:

ولو اعلاه عشر واسفله اقل جاز حتّٰی یبلغ الاقل ولو بعکسه فوقع فیه نجس لم یجز حتّٰی یبلغ العشر ولو جمد ماء ہ فثقب ان الماء منفصلاً عن الجمد جاز لانه کالمستقف وان متصلا لا. (شامی ج:۱، ص:۱۷۹)

اور علت اس مسئلہ کی وہ ہے جو علامہ شامیؒ نے اسی عبارت درمختار سے کچھ پہلے لکھی ہے، ”لان الاستعمال من السطح لامن العمق“ یعنی استعمال کرنے والا پانی کو حوض کے سطحِ اعلیٰ سے لے کر استعمال کرتا ہے، جب وہ دَہ دردَہ سے کم ہو اور اس میں نجاست گر جائے تو پانی کو ناپاک سمجھا جائے گا، اگر چہ یہ حوض عمق کی جانب سے وسیع ہو، اور دَہ دردَہ سے بھی زائد ہو، اور اسی پر اس مسئلہ کی تفریع ہے کہ بڑے حوض کی سطح پر برف جما ہوا ہو اس کو توڑ کر کچھ حصہ پانی کا کھول لیا جائے، اگر یہ برف پانی سے متصل ہو اور اس پانی میں نجاست گر جائے تو چونکہ پانی لینے کی جگہ آبِ قلیل ہے، اس لئے اُس کو ناپاک کہا جائے گا، یہی وجہ ہے کہ جو کنویں سطح کے اعتبار سے دَہ دردَہ سے کم ہیں اُن کو وقوعِ نجاست سے نجس کہا جاتا ہے، حالانکہ گہرائی کا اعتبار کیا جائے تو بہت سے کنوؤں کا پانی اتنا گہرا ہوتا ہے

کہ اگر اس کو معمولی حوض کی طرح پھیلا دیا جائے تو وہ دَہ دردَہ سے بھی زیادہ ہو جائے۔

جن حضرات نے پانی کے جریان کا حوض کی تلی کی جانب سے اعتبار نہیں کیا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد اسی مسئلہ پر ہے کہ ماءِ کثیر میں اعتبار اوپر کے طول وعرض کا ہے عمق کا نہیں، تو عمق کی طرف سے جاری ہونے کا بھی اعتبار نہ ہونا چاہئے، لیکن جبکہ علامہ شامیؒ وغیرہ کے بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عمق کا اعتبار نہ کرنا اس وجہ سے ہے کہ پانی کا استعمال عمق کی طرف سے نہیں ہوتا تو اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان حضرات کے زمانہ کے حوض حمام پر آج کل کی گھریلو حوضوں اور ٹنکیوں کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان میں پانی کا استعمال حوض یا ٹنکی کے کناروں سے یا اُوپر کی سطح سے مروّج ہی نہیں، بلکہ عرفی طور پر اُن کا پانی تلی میں لگے ہوئے پائپ ہی کے ذریعہ استعمال ہوتا ہے، اس لئے ان حوضوں اور ٹنکیوں میں اگر تلی کی جانب پانی بذریعۂ جاری کر دیا جائے تو وہ بحکمِ آبِ جاری ہو جائے گا۔

هٰذا ما سنح لی واللّٰه سبحانه و تعالیٰ اعلم!

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

خادم دارالافتاء دارالعلوم کراچی

۲۳ محرم ۱۳۸۰ھ

آلاتِ جدیدہ سے متعلق چند فتاویٰ

(از امداد الفتاویٰ)

حضرت حکیم الامت مجدد الملت سیّدی مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے امداد الفتاویٰ میں ایک حصۂ خاص کو حوادث الفتاویٰ کے عنوان سے جمع فرمایا ہے، جس میں جدید پیش آنے والے مسائل کا جواب ہے، اس حصۂ میں بہت سے مسائل آلاتِ جدیدہ کے متعلق ہیں، مناسب معلوم ہوا کہ ان کو بھی اس کتاب کا جزو بنا دیا جائے، وھی ھذہ۔

تحقیقِ حکمِ مسمریزم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین وناصرین شرع متین اس مسئلہ میں کہ علومِ روحانی مثلاً: علمِ مسمریزم، علمِ تصوّر، علمِ مقناطیسی وغیرہ کی بابت شرع شریف میں کیا حکم ہے؟ جائز ہیں یا ناجائز؟ اگر جائز ہیں تو جزوی یا کلی، دلائل حوالہ حدیث شریف یا آیت مع خلاصہ تفسیر وتشریح کے تحریر فرمائیں۔

جواب: یہ عمل روحانی نہیں ہیں، نہ عملاً نہ اثراً بلکہ دونوں طرح سے اعمالِ نفسانی ہیں، اور چونکہ قائدہ شرعیہ ہے کہ فعلِ مباح بھی اگر متضمن مفاسد کو ہو وہ غیر مباح ہو جاتا ہے، اور یہ اعمال متضمن مفاسدِ کثیرہ اعتقادیہ وعملیہ کو ہیں، جیسا تجربہ کار پر مخفی نہیں، اس لئے بناء بر قاعدہ مذکورہ اُن سے ممانعت کی جائے گی، اگر مفاسد کی تفصیل پر مطلع ہونا ہو تو زبانی سوال پر ظاہر کئے جاسکتے ہیں۔ ۱۷ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ

زمین سے پانی دینے والے نل (ٹیوب ویل) میں نجاست گر جائے تو پاک کرنے کا طریقہ

سوال: آج کل جو یہ آہنی نل جو کنویں کا کام دیتے ہیں، ایجاد ہوئے ہیں، اگر ان کے اندر کوئی شخص پیشاب وغیرہ ڈال دے تو آیا یہ ناپاک ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ اور پہلی شق پر ان کے پاک کرنے کی کیا صورت ہے؟

الجواب: فی الدر المختار ینزح کل مائها الذی کان فیها وقت الوقوع بعد اخراجه الا اذا تعذر الٰی قوله و ان تعذر نزح کلها فیقدر ما فیها وقت ابتداء النزح قاله الحلبی. (۲۱۸ تا ۲۲۰)

اس روایت سے ثابت ہوا کہ نجاست کا وقوع ہونا کنویں میں اُس کو نجس کر دیتا ہے، سو اس میں جب نجاست گرے گی ناپاک ہو جاوے گا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وقوعِ نجاست کے وقت جس قدر پانی ہو اُس قدر نکال دینے سے وہ پاک ہو جاتا ہے، پس اس بناء پر نل کے اندر جس قدر پانی ہے اُس کے نکال دینے سے وہ پاک ہو جائے گا، اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ نل کے نیچے زمین میں سے پانی کی آمد ہوتی ہے تو کیا وہ ناپاک نہ ہوگا، بات یہ ہے کہ وہ پانی ایسا ہے جیسا متعارف کنوؤں میں بھی علاوہ بھرے ہوئے پانی کے اُبلنے والا پانی ہوتا ہے، مگر چونکہ وہ فی البئر نہیں ہے اس کا اعتبار نہیں، اسی طرح جو پانی بالفعل اس آہنی کنویں کے اندر نہ ہو مگر بطور آمد کے کے نیچے سے بذریعۂ مسامات ارض کے اس کے اندر آ جاتا ہو وہ معتبر نہیں، البتہ اگر تجربہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ اس نل کی جڑ میں پانی مجتمع رہتا ہے تو اس کو نجس کہیں گے، اور تخمینہ سے جب اس قدر نکل جاوے کنواں پاک ہو جاوے گا۔

اور عبارتِ مذکورہ سے ایک اور بات ثابت ہوئی کہ اگر اس آہنی کنویں میں ایسی نجس

چیز گر جائے جو نکل نہ سکے تو اس کا نکالنا معاف ہے، پھر اس میں دو صورتیں ہیں، یا تو وہ ذی نجاست ہے، جیسے ناپاک لکڑی یا ناپاک کپڑا، یا عینِ نجاست ہے، جیسے مردار کی بوٹی، صورتِ اُولیٰ بلا انتظار معاف ہے، صرف پانی نکالنے سے پاک ہو جائے گا، اور صورتِ ثانیہ میں اتنی مدت تک انتظار کریں کہ گمان غالب ہو کہ وہ مٹی ہو گیا ہو، پھر پانی نکال دیں۔

فی الدر المختار بعد قوله إلا اذا تعذر كخشبة او خرقة متنجسةٍ فی ردالمحتار و اشار بقوله متنجسة الٰی انه لا بد من اخراج عين النجاسة ميتة و خنزير اهـ ج قلت فلو تعذر ايضاً ففی القهستانی عن الجواهر لو وقع عصفور فيها فعجزوا عن اخراجه فما دام فيها فنجسة فتترک مدة يعلم انه استحال وصار رخاة و قيل مدة ستة اشهر اهـ. (ج: ۱/ص: ۲۱۹)

جانور کو ذبح کرنے کا جدید طریقہ

سوال: (از انگلستان، از اخبار مدینہ بجنور یکم فروری ۱۹۱۷ء)

خیال یہ پیدا ہوا رہا ہے کہ جانور کو ذبح کے وقت بہت ہی کم تکلیف پہنچے، اور ذبح کا کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے جس میں یہ امر حاصل ہو جائے، اس غرض کے لئے ایک رائل سوسائٹی بنائی گئی ہے، اور ذبح ہونے والے جانوروں کو تکلیف سے بچانے کے لئے ایک آلہ ایجاد کیا گیا ہے، جس سے جانور کو بیہوش کر دیا جائے اور بے حسی کی حالت میں اس کو ذبح کیا جائے، اگر کوئی مسلمان اس حالت کے بعد جانور کو اپنے طریق پر ذبیحہ کرے تو کیا ایسا جانور ذبح سمجھا جائے گا؟ جانور کے بے حس کئے جانے سے جانور مر نہیں جاتا،

اس کی نبض برابر قائم رہتی ہے، اگر جانور مر جائے تو دل کی حرکت بند ہو جانے سے نبض بند ہو جائے گی، اور خون کا حصہ جسم میں رہ جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوتا، لہٰذا اسی حالتِ بیہوشی میں ذبح کرنے والا شاہ رگ کو کاٹ کر خون خارج کر سکتا ہے، ایسے جانور بھی ذبح ہوئے ہیں جو بذریعہ آلہ کئی منٹ تک بیہوش پڑے رہنے کے بعد ذبح کئے گئے اور کافی خون نکلا۔

بہر حال استفتاء کی صورت یہ ہے کہ آیا اگر کوئی جانور ذبح کرنے سے پہلے بیہوش کر لیا جائے، یعنی اس کو درد کا احساس نہ رہے، اور اس کے بعد ذبح کیا جائے ایسی صورت میں کہ اُس کے دل کی حرکت بھی قائم رہے اور نبض بھی اس کی چلتی رہے، اور ذبح بھی اسلامی طریق پر کیا جائے، تو کیا ایسا جانور ذبیحہ سمجھا جائے گا؟ ممکن ہے کہ عنقریب یہاں (یعنی انگلستان) کا یہ قانون ہو جائے کہ کوئی جانور ذبح نہ ہو جب تک اس کو آلۂ مذکور سے بیہوش نہ کیا جائے، اس امر کی ابھی پوری اطلاع نہیں کہ وہ آلہ کس قسم کا ہے، اور اس کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے؟ آیا اس سے جانور کے کسی حصہ پر ضرب لگائی جاتی ہے یا کسی منشّی چیز سے اُسے بیہوش کیا جاتا ہے؟

الجواب: یہاں دو مقام پر کلام ہے، ایک یہ کہ ایسی حالت میں ذبح کرنے سے جانور حلال ہوگا یا نہیں؟ سو چونکہ یہ فعل کسی شرطِ حلّت کے منافی نہیں، اور حیات پورے طور پر باقی ہے اس لئے جواب یہ ہے کہ جانور حلال ہو جائے گا۔

فی الدر المختار :

ذبح شاة مريضة فتحركت او خرج الدم حلّت والا لا ان لم تدر حياته عند الذبح وان علم حياته حلّت مطلقا وان لم تتحرک ولم يخرج الدم وهٰذا يتأتى فى منخنقة و متردية و نطيحة والتى بقر الذئب بطنها فذكوة هٰذه الاشياء تحلل وان كانت حياتها خفيفة وعليه الفتوىٰ

لقوله تعالٰی "الا ما ذكيتم" من غير فصل، في ردالمحتار قوله فتحركت: اى بغير نحو مد رجل و فتح كما يخرج من الحى الٰى قوله عند الامام وهو ظاهر الرواية قوله و عليه الفتوىٰ خلافا لهما. (ج:۱ ص:۳۰۱)

دوسرا کلام ہے کہ خود یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟ سو اس میں تفصیل یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس آلہ سے آیا اُس جانور کے کسی حصہ پر ضرب لگائی جاتی ہے یا کسی نشہ آور چیز سے اس کو بیہوش کیا جاتا ہے، جیسا کہ سائل نے اس میں تردّد ظاہر کیا ہے، اور غالب طریق ثانی ہے، سو اگر ایسا ہے تو یہ فعل حرام ہے۔ اما الطريق الاوّل فلما في الدر المختار مكروهات الذبح:

والنخع بلوغ السكين النخاع و هو عرق ابيض في جوف عظم الرقبة وكره كل تعذيب بلا فائدة مثل قطع الرأس والسلخ قبل ان تبرد اى تسكن من اضطراب، في ردالمحتار و قيل النخع ان يمد رأسه حتى يظهر مذبحه و قيل ان يكسر عنقه قبل ان يسكن عن الاضطراب فان الكل مكروه لما فيه من تعذيب حيوان بلا فائدة. (هدايه ج:۵/ ص:۲۸۸، ۲۸۹)

واما الطريق الثاني فلما في الدر المختار:

وحرم الانتفاع بها ولو بسقى دواب. (ج:۵،ص:۴۴۴)

اور اگر یہ دونوں طریقے نہیں بلکہ مباح طریق سے اس جانور کے حاسہ کو معطل کر دیا جاتا ہے تو وہ بھی دو وجہ سے ناجائز ہے، اوّل اس وجہ سے کہ قبل بیہوش ہونے کے اس کے

حواس سالم تھے، اور بعد بیہوش ہونے کے حواس کا بطلان یقینی نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ اس آلہ سے حرکت باطل ہو جاتی ہو، مگر حواس باقی ہو، اور بطلانِ حرکت بطلانِ حس کو مستلزم نہیں، ممکن ہے کہ اس آلہ کا اثر صرف جوارح معطل کر دینے میں ایسا ہو جیسا کسی شخص کے ہاتھ پاؤں زور سے پکڑ کر اس کا گلا گھوٹ دیا جائے تو اس کو حرکت نہ ہوگی، مگر احسان ہوگا، پس پہلے سے ذی حس ہونا یقینی اور اب زوالِ حس میں شک ہو گیا، اور عقلی و شرعی قاعدہ ہے کہ ''الیقین لایزول بالشک''۔ پس بقاءِ حس کی صورت میں یہ آلہ زیادتِ تعذیب کا سبب ہوگا، اس لئے ناجائز ہے، اور خود حیوان متکلم نہیں جو اپنا حال بیان کر سکے، اور انسان پر امتحان کرنے سے دھوکا نہ کھایا جائے، کیونکہ انسان اور بہائم کے بہت سے خواص باہم متفاوت ہوتے ہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ ایسا کرنے والا اس طریق کو طریقِ مشروع سے جس میں بیہوش نہیں کیا جاتا، یقیناً زیادہ مستحسن سمجھ کر طریقِ مشروع کو ناقص و مرجوح سمجھے گا، اور مخترع کو منصوص پر ترجیح دینا قریب بکفر ہے۔ ان دو وجہ سے خود یہ طریقہ بدعت سیۂ و تحریف فی الدین ہونے کے سبب خلاف شرع ہے، پس ایسا قانون بنانا خلافِ مذہب اسلام ہے، واضعان و حاکمانِ قوانین کو اطلاع دے کر درخواست کی جائے کہ اہلِ اسلام کے لئے ایسا قانون مقرر نہ کریں جیسا کہ معاہدہ ہے۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ

ہوائی جہاز میں مسافتِ قصر کی تحقیق

سوال: ہوائی جہاز میں اگر کوئی سفر کرے تو کتنی مسافت میں نماز کا قصر کرنا چاہئے؟

الجواب: جس وقت احکامِ شرعیہ سفر کے متعلق موضوع ہوئے ہیں اُس وقت سفر فی البر والبحر والجبل واقع تھا، فی الہوا نہ تھا، اور اَحکامِ تابع واقعات ہی کے ہوتے ہیں، اس لئے شریعت میں نصاً یہ مسکوت عنہ ہے، لیکن شریعت میں اس کی ایک نظیر وارد ہے، پس اس پر قیاس کر کے اس میں حکم دیا جائیگا، اور چونکہ قیاس مظہر ہے نہ مثبت، اس لئے اس حکم کو بھی حکم

وارد فی الشرع کہا جائے گا، وہ نظیر یہ ہے کہ حج میں جو مواقیت متعدد ہیں ان میں اہل نجد کے لئے قرن مقرر فرمایا گیا ہے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کوفہ و بصرہ فتح ہوا تو اُن لوگوں نے عرض کیا کہ: قرن ہماری راہ سے ہٹا ہوا ہے، اور وہاں جانے میں مشقت ہے! تو آپ نے فرمایا کہ: اس کے محاذی مقام کو دیکھ لو! چنانچہ ذات عرق مقرر ہوا۔ (رواہ بخاری)

اور گو اس باب میں احادیث مرفوعہ بھی ہیں، مگر اوّل تو وہ متکلم فیہا ہیں، دوسرے اس اجتہاد کے وقت حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع نہ تھی، تو اتنا تو ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ نے اس میں اجتہاد سے کام لیا، چنانچہ اسی جوازِ اجتہاد کی بناء پر ہمارے فقہاء نے فرمایا ہے کہ:

ومن کان فی بحر او بر لا یمرّ الا بواحد من المواقیت المذکورۃ فعلیہ ان یحرم اذا حاذی اخرھا و یعرف بالاجتہاد فان لم یکن بحیث یحاذی فعلٰی مرحلتین من مکۃ. (فتح القدیر)

پس اسی طرح یہاں اس مسافت ہوائی کے محاذی کو دیکھیں گے کہ بحر ہے یا برّ یا جبل، اور اس محاذی کی مسافتِ قصر کو دیکھیں گے، اور اسی کا اعتبار اس مسافتِ ہوائی میں کرکے اس کے موافق حکم دیں گے، احتیاطاً اس میں دوسرے علماء سے بھی رجوع کرلیا جائے۔ ۱۷ر ذیقعدہ ۱۳۳۵ھ

ٹیلی فون کے واسطہ سے رُؤیت ہلال کی شہادت

سوال نمبر۱: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر رُؤیت ہلال عید کی خبر کسی معتبر شخص سے بذریعہ ٹیلی فون معلوم ہو تو عندالشرع وہ معتبر سمجھی جائے گی یا نہیں؟

نمبر۲: اگر رمضان المبارک کے چاند کی خبر مذکورۂ بالا طریقہ سے معلوم ہو تو معتبر

مانی جائے گی یا نہیں؟

الجواب عن السوالین: گوان دونوں ہلالوں کی شہادت میں بعض احکام میں اختلاف یعنی تفاوت بھی ہے، لیکن یہ شرط مشترک ہے کہ شاہد عدل یا مستور بمعنی غیر معلوم الوصف ہو، اور یہاں وہ خود غیر معلوم الذات ہے، باقی آواز، اوّل تو ٹیلی فون میں صاف پہچانی نہیں جاتی، دوسرے اگر پہچانی بھی جاوے تب بھی آوازوں میں تشابہ ہوا کرتا ہے، اور جو شرط ہے محتجب کی تعیین کی (کہ اس کے تکلم کے وقت دو معتبر شخص اُس کو دیکھ رہے ہوں اور وہ اس کو دیکھ کر کہیں کہ یہ متکلم فلاں شخص ہے، اور یہ محتاج الی التعیین اُس وقت اُن دونوں کو دیکھ رہا ہو) یہ یہاں ممکن نہیں، لہٰذا یہ شہادت ٹیلی فون کے واسطے سے رمضان [1] یا فطر میں معتبر نہیں۔ فی الدر المختار (جلد: ۲)

للصوم مع علة كغيم و غبار خبر عدل او مستور علىٰ ما صححه البزازى علىٰ خلاف ظاهر الرواية لا فاسق اتفاقا...............الخ.

سوال: ایک شہر کے مفتی یا دیندار عالم کے نزدیک رُؤیتِ ہلال کا ثبوت بموجب شرع شریف کے ہوا اور وہ اُس رُؤیت کے ثبوت کی خبر دوسرے شہر کے مفتی یا دیندار عالم کو بذریعہ آلہ ٹیلی فون کے کرے کہ جس میں خبر دہندہ و مخبر الیہ ایک دوسرے کی آواز کو اچھی طرح سنتے اور پہچانتے ہیں، اور تکلم کے وقت غیر کا واسطہ بھی نہیں ہوتا، اور مخبر الیہ کو اس خبر کی تصدیق میں کسی طرح کا شک وشبہ بھی نہیں رہتا تو، اس خبر پر عمل کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور صورتِ مسئولہ میں اور دوسرے قابلِ اعتبار ٹیلی فون کی ضرورت باقی رہی یا نہیں؟

الجواب۔ ایک کلام تو خود طریقِ موجب میں ہے، سو اس کا سوال مقصود نہیں،

---

(۱) فيه لا يلزم لثبوت رمضان الشهادة الشرعية بل يكفى خبر عدل والخبر على التلفون معتبر اذا المتكلم وهو ثقه، فليتفكر. ۱۲ محمد شفيع

دوسرا کلام ٹیلی فون کے واسطہ میں ہے اور یہی مقصود بسوال ہے، سواس کا جواب ظاہر ہے کہ جن اَحکام میں حجاب مانعِ قبول ہے، اس میں غیر معتبر ہے، اور جن میں حجاب مانع نہیں اس میں اگر قرائنِ قویہ سے تکلم کی تعیین ہو جائے تو معتبر ہے۔ ۱۶ر محرم ۱۳۴۸ھ

عورت کے لئے بحالتِ روزہ ربڑ کا حلقہ داخل بدن میں استعمال کرنا

سوال: ایک ضروری مسئلہ اس وقت پیش آیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک عورت بوجہ امراض رحمی کے سخت بیمار ہے، اور ضعف و ناتوائی بھی زیادہ ہے، حکیمی علاج بوجہ نہ ملنے ہوشیار دائی کے چھوڑ کر ڈاکٹری شروع کیا گیا، ڈاکٹری علاج میں جو مس ہوشیار ہے، اس کا علاج ہو رہا ہے، مس کہتی ہے کہ بوجہ کجئی رحم یہ شکایات ہیں، سو رحم میں داخلاً اگر ربڑ کا حلقہ ماہ دو ماہ تک بذریعۂ عمل بالید چڑھا رہے تو آرام ہو جائے گا، اس پر اپنا تجربہ بتلاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ رمضان شریف آ گئے، اس حلقہ کے موجود ہوتے ہوئے جو کہ داخلِ اعضائے اندرونی ہے روزہ میں تو کچھ خرابی نہ واقع ہوگی، اور اگر خرابی روزہ کی وجہ سے تا رمضان اس علاج کو موقوف رکھا جاتا ہے تو مرض کی اور زیادتی ہو جاتی ہے، آیا اس حالت میں روزہ ترک کر کے علاج مذکور کرانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: خود روزہ کی حالت میں یہ چھلا چڑھانا مفسدِ صوم ہے، لیکن اگر غیر حالتِ صوم میں چڑھایا ہوا حالتِ صوم میں داخل بدن باقی رہے تو اس سے روزہ میں کوئی خلل نہیں آتا۔ ۲۷ر شعبان المعظم ۱۳۳۶ھ

کسی شخص کو ملازم کہہ کر اپنے ساتھ بے ٹکٹ لے جانا

سوال: ایک شخص کے پاس جو ریلوے کا ملازم ہے دو آدمیوں کا پاس ملا ہوا ہے، کیا ہر شخص جس کو وہ لے جانا چاہے جا سکتا ہے؟ شرعاً کوئی جرم تو نہیں ہے؟ جبکہ وہ یہ کہہ دے گا کہ یہ میرا آدمی ہے، خواہ اس کا آدمی ہو یا نہ ہو، افسر ریلوے اس کو نہیں پکڑ سکتا، نہ کوئی

جرم ہے، شبہ اس وجہ سے ہے کہ جب اس کا خاص آدمی نہیں ہے محض دوست یا رشتہ دار ہے تو شاید شرعاً اس آدمی کو جانا جائز نہ ہو۔

الجواب: واقعی جائز نہیں۔

مصنوعی آنکھ لگوانا جائز ہے

سوال: زید نے بوجہ شدّتِ اضطراب مقلۂ عین نکلوایا، اب مصنوعی مقلہ اس کے مقام پر رکھوانا چاہتا ہے، کیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ سونے کی ناک، بنوا لینے کی اجازت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دی تھی مقلہ کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے یا نہ؟ عمرو کہتا ہے ناک کے عوض میں (جس کی اجازت آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی) قوّتِ شامہ نہیں ہوتی، اور مقلہ میں قوّتِ باصرہ ہوتی ہے، پس مقلہ کو اس پر قیاس مع الفارق ہے، اور مقلہ بنانا تسویر بنانے کے حکم میں ہے، پس ناجائز ہے، کیا عمرو کا قول صحیح تو نہیں ہے؟

الجواب۔ مُبیح کا فتویٰ صحیح ہے، اور محرِّم سے سوال کیا جاوے کہ کیا مقلہ پر حیوانِ ذی رُوح صادق آتا ہے؟ نیز مقلہ میں جو بصارت حیوانی ہوتی ہے آیا صانعِ مقلہ کی وضع کی ہوئی ہے؟ یا جو بصارت مودعہ مخی فی الدماغ ہے، یہ مقلہ محض اس کا طریق ومحل ہے، اوّل باطل ہے اور ثانی پر آنکھ بنانا یعنی قدح بھی ناجائز ہوگا، واللازم باطل فکذا الملزوم، واللہ اعلم! نیز جو علّتِ وعید تصویر کی آئی ہے کہ ’’فقال احیوا ما خلقتم‘‘، اس پر نظر کر کے جس عضو میں مصوّر حیات پیدا کر سکے اس پر وعید نہ ہونا چاہئے، اور انف میں ہونا چاہئے۔

قریب ۱۳۳۷ھ

نوٹ کے ذریعہ زکوٰۃ کی ادائیگی

سوال ۱: زکوٰۃ میں نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اسی طرح دوسری رقوم واجب التملیک مثل فدیہ صوم وصلوٰۃ وغیرہ۔

الجواب ۱: چونکہ وہ مال نہیں محض سندِ مال ہے، اس لئے نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، اور یہی حکم ہے دوسری رقوم واجب التملیک کا بلکہ ان صورتوں سے زکوٰۃ وغیرہ ادا ہو جاتی ہے:

(الف) یا تو خود مسکین کو نقد دے، یا کوئی چیز از قسم مال اتنی قیمت کی دے، کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ غیر جنس سے بھی ادا ہو جاتی ہے، اور

(ب) یا مسکین کو نوٹ دیا، اور اس مسکین نے اس کو نقد (۱) یا کسی جنسی کے بدلے فروخت کر کے اس نقد یا جنس پر قبضہ کر لیا، اب قبضہ کے وقت زکوٰۃ وغیرہ ادا ہو گئی، اور اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوئیں، مثلاً: اس مسکین کے پاس سے وہ نوٹ ضائع ہو گیا یا اس نے اپنے قرض (۲) میں کسی کو دے دیا، ان صورتوں میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔ ۵/صفر ۱۳۳۷ھ

سوال ۲: اگر کسی مسکین کو زکوٰۃ وغیرہ میں نوٹ دے دیا اور اس نے اس کا نقد یا جنس لے کر قبضہ کر لیا، مگر نوٹ لینے والے نے اس نوٹ پر بٹہ لیا، مثلاً: فی روپیہ ایک پیسہ، اور اسی طرح اگر کسی مدرسہ میں دیا اور مہتمم نے اس کو نقد کر کے کسی مستحق طالب علم کو دیا اور نقد کرنے کے وقت اسی طرح بٹہ لگا تو آیا زکوٰۃ میں پورا روپیہ ادا ہوا یا پیسہ کم روپیہ؟ اور اگر اپنے روبرو ایسا نہ ہوا مگر معلوم ہے کہ جہاں نوٹ بھیجا ہے وہاں ایسا ہوا ہوگا، تو احتیاط کی بات کیا ہے؟

الجواب ۲: اس صورت میں پیسہ کم روپیہ ادا ہوگا، ایک پیسہ مثلاً اس شخص کو اور بھی زکوٰۃ میں کسی مسکین کو دے دینا چاہئے، اسی طرح جب قرائن سے اپنے غیبت سے بٹہ لگنا معلوم تب بھی فی روپیہ مثلاً ایک پیسہ اور بھی مسکین کو دیدے۔ ۵/صفر ۱۳۳۷ھ

---

(۱) یعنی سونا چاندی یا ریزگاری۔۱۲ محمد رفیع عثمانی، دار العلوم کراچی

(۲) جس کو قرض میں دیا تھا اگر اس نے اس کے بدلے نقد یا جنس پر قبضہ کر لیا تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، زکوٰۃ بالکل ادا نہ ہونے کا حکم صرف اسی صورت میں ہوگا کہ وہ نوٹ ضائع ہو جائے۔۱۲ محمد شفیع۔

وُجوب زکوٰۃ بر نوٹ

سوال: آج کل نوٹوں کا اس شدّت سے رواج ہوگیا ہے کہ بعض مرتبہ مہینوں بھی روپیہ کی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی، تنخواہ وغیرہ میں نوٹ ہی ملتے ہیں اور وہی صرف میں آتے ہیں۔

۱: بنئے فی نوٹ ایک پیسہ لے کر ریز گاری دیتے ہیں، یہ بٹہ جائز ہے یا نہیں؟ بصورتِ اثبات کیا ہے اس کے لئے بھی کسی شرعی حیلہ کی ضرورت ہے؟ جیسا کہ روپیہ کی صورت میں کیا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ ایک پیسہ شامل کر کے دے دیا جائے،

۲: اگر کسی کے پاس بقدرِ نصاب کے نوٹ جمع ہو جائیں تو حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ نوٹوں پر واجب ہوگی یا نہیں؟ شبہ کا منشاء یہ ہے کہ نوٹ حقیقتاً چاندی یا سونا نہیں، اگر یہ کہا جائے کہ اجراءِ نوٹوں میں گورنمنٹ مقروض ہے اور قرض میں زکوٰۃ واجب ہے تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ گورنمنٹ قرضدار بے شک ہے، لیکن گورنمنٹ نے نہ اس کا وعدہ کیا ہے، نہ اُس کے ذمہ ہے کہ ایک روپے کے نوٹ کے عوض میں روپیہ دے، بلکہ اگر وہ چونسٹھ پیسے یا ۱۶ اکنی یا ۸ دونی جو چاندی کی نہیں ہوتیں دیدے تو لینے والا انکار نہیں کرسکتا، اسی طرح بڑی رقم کے نوٹوں کے معاوضہ میں گورنمنٹ چھوٹی رقم کے نوٹ دے سکتی ہے، اور چھوٹی رقم کے نوٹوں میں وہی پیسہ یا اکن یا دونی والی صورت پیش آسکتی ہے، تو ایسی صورت میں اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی شخص ایک لاکھ پیسوں کا مقروض ہو یا پچاس ہزار کانسی کی اکنی یا دونی کا مقروض ہو تو کیا ایسی صورت میں قرض خواہ کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہوگی؟

۳: قیاساً علی ذٰلک یہ جو اسّی ہزار ٹکہ کا مہر بندھا ہے، ان میں وقتِ ادائیگی مہر، زوجہ کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا فرق ہوا؟ اُمید ہے کہ جواب سے عزت بخشی جائے، دلیل کی ضرورت نہیں صرف جناب کی تحقیق مطلوب ہے۔

الجواب: اوّل ایک مقدمہ سمجھ لینا چاہئے، وہ یہ کہ حقیقت نوٹ کی کیا ہے؟ سو حقیقت نوٹ کی یہ ہے کہ جس وقت اوّل میں روپیہ دے کر گورنمنٹ سے نوٹ لیا تھا، گورنمنٹ اس روپیہ کی مقروض ہوگئی، اور نوٹ اس قرضہ کی سند ہے، پس اصل حق مالک کا وہ روپیہ ہے، اور آئندہ کسی کو نوٹ دینا اپنے اسی قرضہ کا بذمہ گورنمنٹ حوالہ کر دینا ہے، اس سے سب سوالوں کا جواب ہوگیا، چنانچہ تصریحاً بھی لکھا جاتا ہے۔

۱: یہ بٹہ دینا وراسی طرح سے لینا جائز نہیں کیونکہ حوالہ میں کمی بیشی جائز نہیں، اور اس حیلہ کا محل حوالہ نہیں بلکہ بیع یداً بید تقاضلاً ہے، جو یہاں نہیں۔

۲: زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ اس کا اصل حق ہے، اور یہ مثال اس لئے غلط ہے کہ اس میں اصل حق مالِ زکوٰۃ نہیں عروض ہے، اور دوسری جنس سے ادا ہو جانے سے جو اشتباہ ہوگیا ہے سو وہ قرضہ کا غیر جنس سے بتراضی طرفین ادا کر دینا صحیح ہے۔

۳: اور اسی تقریر بالا سے ٹکوں کے مہر میں اور نوٹ کے بدل میں فرق ظاہر ہوگیا کہ مہر میں اصل سے ہی واجب ٹکے ہیں، اور یہاں ایسا نہیں جیسا مذکور ہوا۔

نوٹ در حقیقت قرض کی ایک سند ہے

سوال: گزارش ہے اینکہ حسن العزیز کے جزءِ مجالس الحکمۃ (اربعین مصطفائی) کی مجلس سیم ۳۰ میں دیکھنے سے نوٹ کا سندِ مال ہونا معلوم ہوا، جس سے ایک شبہ ہوتا ہے جو تحریر خدمت کرتا ہوں، اُمید ہے کہ جوابِ باصواب سے مطلع فرمائیں گے، اور وہ یہ کہ مثلاً: کسی شخص نے دوسرے شخص سے ایک سو روپیہ نقد قرضہ لئے، اور اس کو ادا کرتے وقت سو روپے کا ایک نوٹ دیا، اب وہ نوٹ اس روپیہ لینے والے شخص کے پاس جل جائے اور کسی صورت سے ہلاک ہوگیا، تو اب وہ شخص مدیون اس ادائے قرض سے بَری ہوگیا یا کہ اُس کے ذمہ اور سو روپے ادا کرنا ہوگا، بظاہر سرکاری قانون کے مطابق تو وہ روپے ادا ہوگئے، کیونکہ سرکار نے نوٹ کو نفسِ مال قرار دیا ہے، بناء بریں اکثر واقعات سے مشاہدہ کیا گیا ہے

کہ نوٹ جل گئے، اور باوجود اُن کے نمبر موجود ہونے کے سرکار سے اُن جلے ہوئے نوٹوں کے روپے وصول نہ ہو سکے، کیونکہ سرکار کے نزدیک اس نفسِ نوٹ کا بتلانا ضروری ہے، خواہ وہ جلے یا پھٹے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں۔

الجواب: جب جلے ہوئے دکھلانے سے روپیہ مل جاتا ہے اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سرکار بھی نوٹ کو سندِ مال سمجھتی ہے، اگر مال ہوتا تو اگر کوئی کپڑا خریدے اور وہ جل جائے تو اس کو جلا ہوا دکھلا کر کیا کوئی شخص روپیہ لے سکتا ہے۔ ۱۳۳۸ھ

سوال، ضمیمہ سوال بالا: اور موافق قانونِ شریعت بوجہ نوٹ کو نفسِ مال یا حکمِ مال کے (کیونکہ وہ سندِ مال ہے) نہ قرار دیئے جانے کے وہ قرض لئے ہوئے سو روپے ادا نہیں ہوئے، جیسے کہ نفسِ نوٹ سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، اب اس امر میں تردّد ہے کہ ضائع شدہ نوٹ (جو قرض میں دیئے گئے) کے سو روپے قرض میں ادا ہوئے یا نہیں؟

جواب ضمیمہ بالا: چونکہ سندِ مال ہونے کی صورت میں یہ حوالہ ہے جو برضاءِ محیل ومحتال علیہ ہوا ہے، اور حوالہ میں مدیون بالکل بری ہو جاتا ہے، اس لئے قرض ادا ہو گیا، البتہ اتنا شبہ ضرور ہے کہ حوالہ میں درصورت توی (۱) دین عود کر آتا ہے، تو آیا نوٹ کا ضیاع جزوِ توی میں داخل ہے یا نہیں، یہ شبہ مجھ کو پرانا ہے، جس میں اب تک شفاء نہیں ہوئی، اس کو علماء سے تحقیق فرما لیا جائے۔ ۱۳۳۸ھ

نوٹ وغیرہ کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ

سوال: زکوٰۃ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں عموماً مرسل الیہ کو ڈاک خانہ سے نوٹ دیئے جاتے ہیں، نوٹ سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، اس دشواری سے بچنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے گی؟

الجواب۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ اس مقام میں کسی کو وکیل بنا دیا کہ اس نوٹ کو نقد

---

(۱) ضائع ہونا۔۱۲

کر کے فلاں مستحق کو دے دو۔ ۱۳۳۸ھ

سوال: زکوٰۃ منی آرڈر میں ڈاک خانہ کو نوٹ دیئے جاسکتے ہیں یا روپیہ ہی دینا ضروری ہے؟

الجواب۔ دونوں یکساں ہیں، زکوٰۃ ادا نہ ہونے کی شرطیں دونوں صورتوں میں مشترک ہیں۔ ۱۳۳۸ھ

سوال: جب مرسل الیہ کو عموماً ڈاک خانہ سے نوٹ ہی دیئے جاتے ہیں تو پھر بیمہ کیوں نہ کیا جاوے کہ اس میں فیس کی بھی کفایت ہے؟

الجواب۔ ایسا ہی کیا جائے، مگر زکوٰۃ ادا ہونے کے لئے نوٹ کا قبض کافی نہیں۔

تاریخ بالا

سوال: گلٹ کے سکے درحقیقت اُس قیمت کے نہیں ہیں جو اُن پر درج ہے اور نہ وہ شرعاً مال ہیں، اس لئے کسی قدر نوٹ کے مشابہ ہیں اور یہ بھی خبر ہے کہ روپیہ بھی گلٹ کا بنے گا اور یہ خبر میں نے خود اخبار میں دیکھی کہ چاندی کی گرانی کی وجہ سے پارلیمنٹ میں یہ طے ہوگیا کہ آئندہ اگر چاندی کے سکے بنائے جائیں تو ان میں صرف چھٹا حصہ چاندی کا شامل کیا جائے، اس صورت میں بھی یہ سکے شرعاً مال نہ ہوں گے، کیونکہ اس میں غش غالب ہوگا، پھر ادائے زکوٰۃ میں اور بھی دشواری ہوگی، براہِ کرم تفصیلی جواب مرحمت فرمائے جائیں، کیونکہ مجھے ادائے زکوٰۃ میں ان اُمور سے بہت دُشواری پیش آرہی ہے۔

الجواب: غلبۂ غش سے ذہب یا فضہ ہونے کی نفی صحیح ہے، نہ کہ مال ہونے کی، مال کی تعریف اُس پر صادق آتی ہے، لہٰذا وہ مال ہے، البتہ اگر زکوٰۃ غیر جنس سے ادا نہ ہوتی تو اس کا ذہب وفضہ نہ ہونا بھی مضر تھا، مگر غیر جنس سے بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، جب بازار میں اس کی قیمت حقِ واجب کے برابر ہو، اور یہ تساوی اس میں حاصل ہے، لہٰذا زکوٰۃ میں کوئی دشواری نہیں جیسے پیسوں سے نقدین کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، اور اگر ایسی ہی احتیاط ہو تو اور کوئی متقوّم چیز خرید کر جیسے کپڑا یا غلہ وہ زکوٰۃ کی نیت سے دیدے۔ ۱۳۳۸ھ

سینما دیکھنا جائز نہیں

سوال: سینما (جس میں قصہ کے پیرایہ میں تصویریں مشین کے ذریعہ دکھائی جاتی ہیں) دیکھنے کا مجھ کو کچھ شوق ہے، اور مقصود اس کے دیکھنے سے یہ ہوتا ہے کہ چونکہ تصاویر یورپ اور امریکہ کے مکانات اور اشخاص وغیرہ کی دکھائی جاتی ہیں، اس لئے ان تصاویر سے یورپ وامریکہ کے مذاق کا پتہ چلے اور معلوم ہو کہ وہ لوگ اپنے مقاصد کو کس طرح حاصل کرتے ہیں، لہٰذا ارشاد ہو کہ کیا سینما میں دیکھ سکتا ہوں؟

از ناچیز .... سلام مسنون، یہ سینما کا کھیل تصاویر متحرکہ کا تماشا ہے، اس سے پہلے ایک قسم کا باجا بجایا جاتا ہے، اسکے بعد بجلی کے ذریعہ سے تصاویر متحرک کی جاتی ہیں۔

الجواب: سینما میں جبکہ تصاویر محرمہ موجود ہیں، اور شئے محرم سے انتفاع وتلذذ ناجائز ہونا معلوم، پھر سوال کی کیا گنجائش ہے؟ اور اس سے جو مقصود لکھا ہے اولاً مقصود کی مشروعیت طریقِ اباحت کو مستلزم نہیں، پھر مقصود بھی کون سے ضروری ہے؟ اور باجہ کا منضم ہونا اور بھی قبح کو بڑھادیتا ہے۔ ۶/رجب ۱۳۳۹ھ

گمشدہ پارسل ڈاک یا ریلوے کا معاوضہ

سوال: دو ریلوے پارسل ریلوے کمپنی نمبر:۱ کے ذریعہ سے یہ فرروز پور بھیجے گئے، اتفاقاً اس شخص نے جس کے لئے وہ بھیجے گئے تھے نہیں لئے، تو پھر کمپنی نمبر:۳ کو فیروز پور لکھا کہ وہ پارسل واپس کردو، اس نمبر:۳ کمپنی نے پارسل واپس کئے، اور یہ لکھا کہ کمپنی نمبر:۱ سے اپنے پارسل لے لو، جب کمپنی نمبر:۱ سے پارسل لینے گئے تو وہاں بجائے دو کے ایک ہی پارسل تھا، اور ایک گم ہوگیا تھا، جب اس سے بہت خط وکتابت کی تو اس نے لکھا کہ ہم نے کمپنی نمبر:۲ سے ایک ہی پارسل پایا، تم اپنے گمشدہ پارسل کا مطالبہ کمپنی نمبر:۲ سے کرو، حالانکہ پارسل کمپنی نمبر:۳ نے گم کیا تھا، مگر کمپنی نمبر:۱ نے کمپنی نمبر:۲ کا غلط حوالہ دیا، بہر حال

ہم کمپنی نمبر:۲ سے دو برس تک خط وکتابت کرتے رہے، اس نے کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا، بلکہ وقت (اپنی غفلت اور لاپروائی سے) ضائع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانوناً ہم کمپنی نمبر:ا یا نمبر:۳ سے جو پارسل لانے اور لے جانے والی ہیں، کسی قسم کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے، اس لئے ہم نے کمپنی نمبر:۲ پر الف اصل مالیت ی، ب اس کے سود کی، ج خطوط کے مصارف کی بحسابِ فی خط عہ ار نالش کر دی، عدالت نے باوجود فریقِ ثانی کی سخت جدوجہد کے ہمارا کل مطالبہ تسلیم کر کے ڈگری دیدی، اور اس کی رقم سرکاری خزانہ میں کمپنی نمبر:۲ سے وصول کر کے داخل کر لی اور اب ہماری درخواست پر ہمیں سرکاری خزانہ سے وہ رقم ملے گی۔

دریافت طلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا نالش سے ہم اپنا روپیہ لے سکتے ہیں، نیز سود کے نام کی رقم جو ایک حربی سے وصول ہوئی ہے، اور جس پر پہلے گورنمنٹ مستولی ہوگئی ہے، وراسی طرح ا، کے خطوط کا جو عہ ار یہ سب جواَب ہمیں گورنمنٹ کے ہاتھوں سے ملے گا، کسی طور پر ہم اس کے مستحق ہو سکتے ہیں؟ کمپنی نمبر:۲ کا وکیل یہ بھی کہتا تھا کہ جو روپیہ ہم نے تمہیں دیا ہے ہم کمپنی نمبر:ا سے وصول کر لیں گے، سود کی رقم اس لئے مجبوراً لگانی پڑتی ہے کہ عدالت سے پورا خرچہ نہیں ملتا، اور خرچہ وصول کرنے کا سوائے سود کے اور کوئی حیلہ بھی نہیں

تشریح: ابتداء جسے پارسل دیا گیا تھا وہ کمپنی نمبر:ا ہے، اور اس کمپنی نے وہ پارسل کمپنی نمبر:۳ کے سپرد کیا پھر نمبر:۳ نے ہماری درخواست پر نمبر:ا کو واپس کیا، یہ نمبر:ا کی غلطی تھی کہ وہ ہمیں بجائے اسکے کہ یہ ہدایت کرتی کہ تم اپنا گمشدہ پارسل کمپنی نمبر:۳ سے لو، یہ لکھ دیا کہ نمبر:۲ سے لو، ہم نے اسی تحریر کی بناء پر جس کی غلطی اب دورانِ مقدمہ میں ثابت ہوئی کمپنی نمبر:۲ سے مطالبہ کیا، اس کمپنی نمبر:۲ کا یہ فرض تھا کہ ہم سے صاف کہہ دیتی کہ اس پارسل سے ہم کو کچھ تعلق نہیں، بلکہ بجائے صاف جواب کے ہم سے ہمارے مال کا بل (حساب) مانگا جس سے ہمیں اپنے مطالبہ کے جائز اور وصول ہو جانے کا یقین ہو گیا، نالش کمپنی نمبر:ا یا نمبر:۳ پر اس لئے نہیں ہو سکتی کہ نالش کے لئے چھ ماہ کے اندر ہونے کی شرط ہے، اب جبکہ دو برس محض کمپنی نمبر:۲ کی غفلت ولاپروائی سے گزر گئے، اس لئے ہم نے اس

پر نالش کی۔ غالباً باہمی تعلقات کمپنیوں میں یہ ہیں کہ ایک کمپنی دوسری کمپنی کے ٹکٹ یا پارسل کا لین دین بطورِ وکالت بلا اجر کے کرتی ہے بطورِ اجر کے چند پیسے جو کبھی ایک آنہ سے زائد نہیں ہوتے جسے وہ حقِ تحریر کہتے ہیں۔

الجواب: اصل مصارف وصول کرنا جائز ہے، اور خرچہ ضروری بھی اصل مصارف کے ساتھ ملحق ہے، جن میں خطوط کے ٹکٹ بھی داخل ہیں، اور سود لینا جائز نہیں، نہ فی خط عہ/ لینا، البتہ اگر یہ خرچہ بدون عنوانِ سود کے وصول نہ ہو، تو بمقدار اس کے بعنوانِ سود بھی وصول کر سکتے ہیں، زائد نہیں، اور حربی کا مال جو عقودِ فاسدہ سے مباح ہوتا ہے اُس کی رضا شرط ہے، اور استیلاء جو موجبِ ملک ہے وہ ہے جو بہ نیت تملک کے ہو، اور یہاں استیلاء صرف مستغیث کے حق کی حفاظت کے لئے ہے، لہٰذا حق سے زائد حلال نہ ہوئی۔ ۱۴ر شوال ۱۳۳۹ھ

مویشی خانہ سے خریدے ہوئے جانور کی قربانی

سوال: مویشی نیلام شدہ کانجی ہاؤس کہ جو مالک کے پاس سے خواہ بطورِ آوارگی یا بذریعہ چوری کانجی ہاؤس میں بند کی گی ہے، چوری کی تشریح یہ ہے کہ کوئی چور مویشی لایا، اور اس نے کسی الزام سے بچنے کی غرض سے کانجی ہاؤس میں گردی، گورنمنٹ مالک کو کسی ذریعہ سے اطلاع نہیں دیتی، پندرہ روز کانجی ہاؤس میں رکھ کر اپنے اختیار سے نیلام کر دیتی ہے، اور اس کی قیمت خود سرکار رکھ لیتی ہے، ایسے مشتریٔ نیلام کو جائز ہے کہ وہ اس مویشی کو قربانی کرے یا نہیں؟

الجواب: ان دونوں حالتوں میں شرعاً قیمت کا تصدق واجب ہے، خود رکھنا درست نہیں، جب بائع کی نیت قیمت خود رکھنے کی ہو اور مشتری کو معلوم ہو تو اس کا خریدنا اعانت علی غیر المشروع ہے، اس لئے درست نہیں، اور استیلاء کا مسئلہ یہاں غامض ہے۔ ۲۲ر ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ

تمت مسائل امداد الفتاویٰ

ٹیپ ریکارڈر مشین پر تلاوتِ قرآن کے اَحکامِ

ٹیپ ریکارڈر مشین جو حال میں عام ہوئی ہے، اس کے ذریعہ ہر متکلم کی آواز کا ریکارڈ ایک رِیل (ٹیپ) پر محفوظ کرلیا جاتا ہے، پھر یہ ٹیپ ریکارڈ جب چاہیں مشین پر چڑھا کر وہی آواز سنی جاسکتی ہے، جیسے گراموفون کے ریکارڈوں سے سنی جاتی ہے اگراموفون کی طرح یہاں بھی چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

۱: اس مشین پر ریکارڈ کرنے کے لئے قرآن کی تلاوت کرنا، یا کوئی دینی وعظ وتقریر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۲: اس کے ذریعہ تلاوت اور تقریر وغیرہ کا سننا کیسا ہے؟

۳: اس پر اگر آیت سجدہ پڑھی جائے تو سننے والوں پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟

۴: اس کے ریکارڈ جن میں قرآن کی تلاوت محفوظ ہو، اُن کا ایسا ہی حکم ہے جیسا اُن اوراق کا جن پر قرآن کی کوئی آیت یا سورۃ لکھی ہو کہ اس کو بلاوضو چھونا جائز نہیں یا اس کا حکم اُن سے مختلف ہے؟

الجواب

۱: یہ مشین اپنی وضع اور عام استعمال میں کچھ گراموفون سے مختلف ہے کہ گراموفون کا استعمال عام طور پر لہو ولعب اور طرب کی مجلسوں میں تفریح طبع کے لئے ہوتا ہے، اس

مشین کا یہ حال نہیں، بلکہ عموماً اس کو مفسد کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے، کوئی شخص اپنی بد مذاقی سے گانے بجانے میں بھی استعمال کر لیتا ہو تو اس کی وجہ سے اس مشین کو آلۂ لہو ولعب کے حکم میں نہیں رکھا جا سکتا، جیسے کہ گراموفون کہ عموماً لہو ولعب میں استعمال ہونے کے سبب اس کو آلاتِ لہو کے حکم میں سمجھا گیا ہے، اس لئے اس مشین پر تلاوتِ قرآن اور دوسرے مفید مضامین کا پڑھنا اور اس میں محفوظ کرانا جائز ہے۔

۲: یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اس میں پڑھنا جائز ہے تو سننا بھی جائز ہے، شرط یہ ہے کہ ایسی مجلسوں میں نہ سنائے جہاں لوگ اپنے کاروبار یا دوسرے مشاغل میں لگے ہوں، سننے کی طرف متوجہ نہ ہوں، ورنہ بجائے ثواب کے گناہ ہوگا۔

۳: ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ جو آیتِ سجدہ سنی جائے اس کا وہی حکم ہے جو گراموفون کے ریکارڈ کا کہ اس کے سننے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا، کیونکہ سجدۂ تلاوت کے وجوب کے لئے تلاوتِ صحیحہ شرط ہے، اور آلۂ بے جان، بے شعور سے تلاوت متصور نہیں۔

۴: ظاہر ہے کہ اس کے ریکارڈ میں حروفِ قرآنی ایسی صورت سے نہیں لکھے جاتے جس کو پڑھا جا سکے، اس کے نقوش کو قرآن نہیں کہا جا سکتا اور اسی بناء پر اس کا بلا وضو چھونا جائز ہے جیسے گراموفون کی پلیٹ ریکارڈ کا چھونا بلا وضو جائز ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دار العلوم کراچی نمبر ۱۴

۵ ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ

☆☆☆

۱۰۱

اپریل فول

اور اس کی ابتداء

تاریخ تالیف ______

مقامِ تالیف ______

مغربی تہذیب میں یکم اپریل کو جھوٹ بول کر دوسروں کو بے وقوف بنانا اچھا سمجھا جاتا ہے، حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے مسلمانوں کو اس قبیح رسم سے بچانے کے لئے یہ مختصر تحریر لکھی۔

اپریل فول

اور اس کی ابتداء

مسلمانوں کے لئے ایک ضروری انتباہ

”ماہ اپریل کے اوائل میں جھوٹ بولنا اور لکھنا اور شائع کرنا یورپین مذہب میں فقط جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے اور یورپ کے اخبار اس پر عامل ہیں۔ ان کے دیکھا دیکھی ہماری مسلم اخبارات نے بھی ان کی نقل اتار نا مدت سے شروع کر رکھا ہے اسکے متعلق ذیل کی معلومات مسلمانوں کے انتباہ کے لئے پیش کیجاتی ہے۔“

جب سے ہندوستان اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں یورپین رسم ورواج اور وضع وتراش کی اشاعت ہوئی اور بہت سے مسلمان اندھا دھند یورپ کی رسوم پر شریعت کی طرح عامل ہو گئے اور جو کام کسی یورپین نے کر لیا وہ ہی مایہ اعزاز وافتخار بن گیا۔ تجربہ شاہد ہے کہ اس وقت سے مسلمانوں کا نہ فقط علمی اخلاقی، اقتصادی، نشو ونما اور ارتقاء بند ہوا بلکہ ہر قسم کا انحطاط وتنزل شروع ہو گیا۔

اسلامی اصول میں سے ہے کہ مسلمان اپنی طرز و وضع اور طراش وخراش اور رسوم ورواج میں ہر غیر مسلم قوم سے ممتاز ہو کر رہے۔ غیر مسلوں کی کوئی وضع خاص یا رسم خاص اگر چہ دنیوی اور معاشی امور ہی میں ہو مسلمان کے لئے اس کا قصداً اختیار کرنا جائز نہیں جیسا کہ بے شمار نصوص شرعیہ قرآن وحدیث کی اس سلسلہ میں وارد

ہیں لیکن اگر یہ رسم ورواج غیر مسلموں کے کسی مذہبی عقیدہ یا عبادت سے تعلق رکھتا ہے تو مسلمان کے لئے اس کا اختیار کرنا اور بھی زیادہ شدید ترین مذہبی جرم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اسکی بعض خاص صورتوں میں انسان اپنی عزیز ترین دولت یعنی مذہب اسلام ہی سے محروم ہو جاتا ہے جس کی مثالیں:۔

(۱) زنار گلے میں ڈالنا۔

(۲) بت کو سجدہ کرنا۔

(۳) صلیب کے سامنے نصاریٰ کی طرح عبادت کی شکل بنانا وغیرہ تمام کتب فقہ وعقائد میں مشہور ومعروف ہیں۔

اپریل فول ...... کے متعلق میں ہمیشہ یہ خیال کرتا تھا کہ یہ بھی یورپ کی انہیں لغو وبیہودہ رسوم میں سے ہے جوان کی عیاشی اور تفریح طبع کے لئے آئے دن ایجاد ہوتی رہتی ہیں لیکن ایک روز اتفاقاً اس کا ذکر اپنے استاد محترم رئیس المتکلمین مفسر قرآن شارحِ مسلم حضرت مولانا شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے آ گیا تو آپ نے فرمایا کہ فقط یہی نہیں ہے کہ یہ یورپ کی ایک تفریحی نمائش ہے۔ بلکہ یہ درحقیقت نصاریٰ کی ایک مذہبی رسم ہے اور مسلمان اپنی ناواقفیت کی وجہ سے اس میں مبتلا ہو گئے اور مولانا موصوف نے اس کے لئے دائرۃ المعارف علامہ فرید وجدی کا حوالہ پیش فرمایا۔ اور نصاریٰ میں یہ ایک مذہبی رسم بن گئی اور دورِ حاضر میں تو جس قدر زیادہ جھوٹ بولا جائے اسی قدر زیادہ کمال سمجھا جاتا ہے۔

(دائرۃ المعارف للعلامہ الفرید الوجدی ص۲۲ ج۱)

انتباہ

نصاریٰ کی اس خرافات کا تو ہم کیا شکوہ کریں کہ انہوں نے جھوٹ بولنے کو

مذہبی شعار بنالیا۔ اور جو کام ان کے پیغمبر مسیح علیہ السلام کے دشمنوں نے کیا تھا وہ آج اس کی نقل اُتار کر خود بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی توہین کرنے والوں میں داخل ہوتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ حضرت مسیح کے فعل کی نقل اور یادگار ہے۔ یا ان کے دشمنوں کے فعل کی۔ بلکہ ہمیں تو اپنے افعال واعمال اور یورپ کی جاہلانہ تقلید کا رونا ہے۔ کیونکہ ؎

درد سر ماہمیں سر ماست بارے کہ بدرش ماست دوش ست

آج مسلمان اخبارات وجرائد بھی نصاریٰ کی اس رسم میں پورا حصہ لیتے ہیں۔ اور چند ناعاقبت اندیش لوگوں کی تھوڑی دیر کیلئے تفریح طبع کے واسطے اس گناہ عظیم کو سر رکھ لیتے ہیں کہ اول تو جھوٹ بولنا اور دھوکہ دینا خود کبیرہ گناہ ہے۔ پھر اس خاص جرأت وجسارت سے اس کو شائع کرنا دوسرے مسلمانوں کے لئے گناہ کا سامان مہیا کرنا ہے۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ ان مخصوص ایام میں ایسا کرنا نصاریٰ کی مذہبی رسم میں شرکت ہے جو شدید ترین گناہ ہے۔ حدیث میں ایسے کلمات کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بعض کلمات آدمی معمولی سمجھ کر محض مجلس کو ہنسانے کے لئے بے پراوئی سے کہہ دیتا ہے مگر یہی کلمہ اس کے لئے آخرت کے عذاب شدید کا سبب ہو جاتا ہے۔ اس لیے مسلم اخبارات وجرائد سے میری درخواست ہے کہ اس مضمون کو اپنے صحائف میں شائع فرما کر ممنون فرمائیں اور اس گناہ عظیم اور نصاریٰ کی تقلید سے مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کریں۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان.

بندہ محمد شفیع

۱۰۲

تفصیل الکلام فی مسئلۃ الاعانۃ علی الحرام

ناجائز کاموں میں تعاون کی شرعی حیثیت

تاریخ تالیف ——— ۳ر صفر ۱۳۸۳ھ (مطابق ۱۹۶۳ء)

مقامِ تالیف ——— دارالعلوم کراچی

مذکورہ موضوع پر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عربی میں ایک مفصل رسالہ ہے، ایک سوال کے جواب میں اردو میں اس کا خلاصہ لکھا گیا ہے جو مستقل رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔

ناجائز کاموں میں تعاون کی شرعی حیثیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔

امابعد! مسئلہ عنوان کثیر الوقوع معاملات سے تعلق رکھتا ہے، سوالات بھی بکثرت آتے رہتے ہیں، اور ہزاروں جزئیات فقہیہ کا اس سے تعلق ہے، اس سلسلہ میں ایک مفصل رسالہ احقر نے عربی زبان میں اب سے اکیس سال پہلے لکھا تھا، حال میں ایک سوال کے جواب میں اس کا خلاصہ اردو میں لکھنے کی نوبت آئی، تو مناسب معلوم ہوا کہ اس کو ایک مستقل رسالہ کی صورت دے دی جائے تا کہ اہل علم کے لئے معین ثابت ہو، سبحانک اللھم اھدنی لما اختلف فیہ الی الحق باذنک و بیدک التوفیق للصواب و السداد و الیک المرجع فی المبدأ و المعاد.

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دار العلوم کراچی

۳ صفر المظفر ۱۳۸۳ھ

سوال

مسئلہ ذیل میں مفتیان کرام کیا فرماتے ہیں کہ:

زید نے ایک مکان کرایہ پر دینے کی غرض سے بنانے کا ارادہ کیا، تو ایک بینک والا مکان کرایہ لینے پر آمادہ ہوا گفتگو کے بعد زید نے بینک والے کے پاس کرایہ دینا طے کیا، اور انہی کے پلین و پروگرام کے مطابق گھر بنایا کہ اس میں دفتر کے لئے وسیع کمرہ، خزانہ کے لئے مضبوط و محفوظ کوٹھی، پہرہ داروں کا گھر وغیرہ سب کچھ کما حقہ رکھا گیا، الغرض ایک بینک کے لئے جیسا وضع قطع ضروری ہے، اس مکان میں اس کی پوری رعایت رکھی گئی، اس کے چند دنو بعد زید کو بحالتِ مرض یہ خیال آیا کہ بینک کے لئے مکان کرایہ دینا اور اس کی آمدنی تصرف میں لانا جائز ہے، یا نہیں؟ چنانچہ بعض عالم صاحب سے دریافت کیا کہ میرا یہ مکان بینک کو کرایہ دینا جائز ہوا یا نہیں، مجھے شبہ ہو رہا ہے لہٰذا آپ اس کی تحقیق فرمائیں، مذکورہ عالم صاحب نے تحقیق کے بعد یہ فرمایا کہ کسی حرام کام و کاروبار کے لئے اگر مکان کرایہ دیا جائے، تو اس میں امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جائز ہے، امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ مکان والا معصیت کا مسبب ہے، اور کاروبار کرنے والا ہے فاعل مختار۔ اور ان کا اصولی قاعدہ کہ مسبب اور معصیت کے درمیان جب فاعل مختار کا فعل حائل واقع ہو، تو معصیت کی نسبت فاعل کی طرف ہوتی ہے، اور صاحبین فرماتے ہیں کہ یہ اجارہ ناجائز ہے، بوجہ اعانۃ علی المعصیت لقولہٖ تعالیٰ ''و تعاونوا علی البر و التقویٰ و لاتعاونوا علی الاثم و العدوا''ن (الایۃ) اب ان دونوں قول میں

مفتیٰ بہ کونسا ہے، یہ اکثر کتابوں میں مذکور نہیں، البتہ حاشیہ زیلعی چلپی میں مرقوم ہے کہ "قول الامام قیاس و قول صاحبیه استحسان" پس اصولی قاعدہ کی رو سے قیاس اور استحسان میں تعارض ہونے سے استحسان پر فتویٰ ہونا چاہئے، اور خلاصۃ الفتاویٰ میں قول امام یوں مذکور ہے کہ "یصح الاجارة و لکن یاثم" اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک یہ اجارہ گو قیاساً صحیح ہے، لیکن اعانت علی المعصیت کے سبب موجب گناہ ہوگا۔ پس قول امام وقول صاحبین کا مرجع ایک ہی ٹھہرتا ہے، پس اب دریافت طلب یہ ہے کہ قول امام وقول صاحبین کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمائیں، کہ اس سودی کاروبار کے لئے بحالت مذکورہ مکان کرایہ دینا شرعی حیثیت سے کیا حکم رکھتا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟ صاف صاف مع دلیل تحریر فرماویں۔

فقط والسلام

المستفتی

(دستخط) شاہ نور خان کشور گنج ضلع میمن سنگھ مشرقی پاکستان

الجواب

اعانت علی المعصیۃ اور تسبب للمعصیت کے مختلف درجات ہیں، اور اسی وجہ سے احکام بھی مختلف ہیں، فقہاء حنفیہ کی تصریحات اس مسئلہ میں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں، اسی لئے احقر نے بامر حضرت سیدی حکیم الامت اس موضوع پر ایک مفصل تحریر لکھنا شروع کی تھی، اسی تحریر کے دوران حضرت قدس سرہٗ کی وفات ہوگئی، جب اس صدمہ جانکاہ سے کچھ سکون سا ہونے لگا، تو تعمیل حکم کا قصد کیا، مسئلہ بے حد الجھا ہوا تھا، اور مرشد کامل کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، کئی ہفتے کتابوں کے مطالعہ میں سرگرداں

رہا، دعائیں کیں آخر کار حق تعالیٰ نے اس مشکل کا حل دل میں ڈال دیا وہ لکھا، پھر استاذِ محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو دکھلایا، انہوں نے پسند کیا یہ تحریر تقریباً آٹھ دس صفحات میں عربی زبان میں ہے، نقل کرنے کی ہمت نہیں جو کچھ احقر نے لکھا ہے، اس کا بہت مختصر خلاصہ یہ ہے کہ کسی معصیت کی اعانت جواز روئے قرآن حرام ہے، وہ ہے جس میں معصیت کا قصد و نیت حقیقۃً یا حکماً شامل ہو حقیقۃً یہ کہ دل ہی میں یہ ہو کہ اس کے ذریعہ عمل معصیت کیا جائے، یا یہ کہ صلب عقد میں احد المتعاقدین کی طرف سے اس معصیت کی تصریح آجائے، اور حکماً یہ ہے کہ وہ چیز بجز معصیت کے کسی دوسرے کام میں آتی ہی نہ ہو، جیسے آلات معازف طبلہ سارنگی اور مختلف قسم کے آلات موسیقی ان چیزوں کا بنانا اور بیچنا اگرچہ بقصد معصیت نہ ہو مگر حکماً وہ بھی قصد معصیت میں داخل ہیں، اور جہاں قصد معصیت نہ حقیقتاً ہو نہ حکماً، وہ اعانت علی المعصیۃ میں داخل نہیں، البتہ اعانت سے ملتی جلتی ایک اور چیز ہے جس کو اصطلاح میں تسبب کہتے ہیں، وہ بھی از روئے نص قرآن حرام ہے، خواہ ہیئت معصیت ہو یا نہ ہو، مثلاً سب الہ مشرکین کی نص قرآنی میں ممانعت اسی لئے فرمائی گئی ہے کہ وہ سبب ہوتی ہے سب الہ حق کیلئے اسی طرح کسی کے ماں باپ کو گالی دینا حدیث میں اپنے ماں باپ کو گالی دینا اسی تسبب کی بناء پر قرار دیا گیا، و **لایضربن بارجلھن** میں ضرب ارجل للنساء کی ممانعت اسی تسبب للمعصیۃ پر مبنی ہے، و **لا تخضعن بالقول** کی نہی بھی اسی پر وارد ہے، اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ ان تمام امور میں معصیت کے قصد و نیت کا دور کا بھی احتمال نہیں۔

لیکن یہاں ایک اہم بات قابل غور یہ ہے کہ تسبب ایک ایسا وسیع لفظ ہے جس میں سارے مباحات آجاتے ہیں، اگر تسبب کے مفہوم کو مطلقاً سببیت کے لئے عام رکھا جائے، تو شاید دنیا کا کوئی مباح کام بھی مباح اور جائز نہیں رہے گا، زمین

سے غلہ اور پھل اگانے والا اس کا بھی سبب بنتا ہے کہ اس غلہ اور ثمرات سے اعداء اللہ کو نفع پہنچے، کپڑا بننا، مکان بنانا، ظروف اور استعمالی چیزیں بنانا، ان سب میں بھی یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک بر و فاجر ان کو خریدتا استعمال کرتا ہے، اور اپنے فسق و فجور میں بھی استعمال کرتا ہے، اور سبب اس کا ان چیزوں کا بنانے والا ہوتا ہے، اگر اس طرح حرمت کو عام کیا جائے، تو شاید دنیا میں کوئی کام بھی جائز نہ رہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سبب قریب و بعید کا فرق کیا جائے، سبب قریب ممنوع اور سبب بعید مباح ہو، مذکورہ امثلہ سب سبب بعید کی مثالیں ہیں، اس لئے وہ جائز رہیں گی، پھر سبب قریب کی بھی دو قسمیں ہیں۔

ایک سبب جالب و باعث جو گناہ کے لئے محرک ہو کہ اگر یہ سبب نہ ہوتا، تو صدور معصیت کے ہونے کی کوئی ظاہری وجہ نہ تھی، ایسے سبب کا ارتکاب گویا معصیت ہی کا ارتکاب ہے، علامہ شاطبی نے موافقات جلد اول کے مقدمہ میں ایسے ہی اسباب کے متعلق فرمایا ہے کہ ایقاع السبب ایقاع للمسبب۔

نص قرآنی میں جہاں تسبب کو حرام قرار دیا ہے، جیسے سبّ الٰہ مشرکین یا عورتوں کے لئے ضرب ارجل یا خضوع بالقول یا تبرج جاہلیت یہ سب اسی قسم کے اسباب ہیں کہ معصیت کی تحریک کرنے والے اور جالب و باعث ہیں، ایسے اسباب کا ارتکاب معصیت ہی کا ارتکاب سمجھا جاتا ہے، اس لئے باتفاق حرام ہیں۔

ایسے اسباب معصیت کا ارتکاب گویا خود معصیت ہی کا ارتکاب ہے، اس لئے معصیت کی نسبت اس شخص کی طرف ہی کی جائے گی، جس نے اس کے سبب کا ارتکاب کیا، کسی فاعل مختار کے درمیان میں حائل ہونے سے معصیت کی نسبت اس سے منقطع نہیں ہوگی، جیسا کہ حدیث میں دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دینے

والے کے حق میں اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا کہا گیا ہے، کیونکہ ایسا تسبب للمعصیۃ بنص قرآن وحدیث خود ایک معصیت ہے۔

دوسری قسم سبب قریب کی وہ ہے کہ ہے تو سبب قریب مگر معصیت کے لئے محرک نہیں بلکہ صدور معصیت کسی دوسرے فاعل مختار کے اپنے فعل سے ہوتا ہے، جیسے بیع عصیر عنب ممن یتخذہ خمراً یا اجارۃ دار ممن یتعبد فیھا الاصنام وغیرہ کہ یہ بیع واجارہ اگرچہ ایک حیثیت سے سبب قریب ہے معصیت کا، مگر جالب اور محرک للمعصیۃ نہیں، شیرۂ انگور خریدنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو شراب ہی بنائے اور گھر کو کسی مشرک کے لئے کرایہ پر دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس میں بت پرستی بھی کرے، بلکہ وہ اپنی خباثت یا جہالت سے اس گناہ میں مبتلا ہوتا ہے، شیرہ بیچنے والا یا مکان کرایہ پر دینے والا معصیت کا باعث اور محرک نہیں ہے۔

ایسے سبب قریب کا حکم یہ ہے کہ اگر بیچنے یا اجارہ پر دینے والے کا مقصد اس معصیت ہی کا ہو، تب تو یہ خود ارتکاب معصیت اور اعانت معصیت میں داخل ہو کر قطعاً حرام ہے۔ اور اگر اس کا قصد ونیت شامل نہ ہو، تو پھر اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس کو علم بھی نہ ہو کہ یہ شخص شیرۂ انگور خرید کر سرکہ بنائے گا یا شراب، یا گھر کرایہ پر لے کر اس میں صرف سکونت کرے گا، یا کوئی ناجائز کام فسق وفجور کا کرے گا، اس صورت میں یہ بیع واجارہ بلا کراہت جائز ہے، اور اگر اس کو علم ہے کہ یہ شخص شیرۂ انگور خرید کر شراب بنائے گا، یا مکان کرایہ پر لے کر فسق وفجور کرے گا یا سودی کاروبار کرے گا، یا جاریہ کو خرید کر اس کو گانے کے کام میں لگائے گا، یا امرد کو خرید کر اس سے سیاہ کاری میں مبتلا ہوگا یا لوہا خرید کر مسلمانوں کے خلاف استعمال کرے گا، تو اس صورت میں یہ بیع واجارہ مکروہ ہے، اسی صورت میں حضرت امام اور صاحبین کا اختلاف منقول ہے مگر اس میں جو امام صاحب کی طرف قولِ جواز منقول ہے اس کا

وہی مطلب ہے، جو سوال میں بحوالہ خلاصۃ الفتاویٰ نقل کیا ہے، اب اگر حضرات صاحبین اس عقد ہی کو جائز قرار نہیں دیتے، تو اختلاف حقیقی ہوگیا کہ ان کے نزدیک عقد ہی درست نہیں، اور متعاقدین کے لئے مبیع وثمن میں تصرف حلال نہیں، اور امام صاحب کے نزدیک عقد درست مگر گناہ ہے، اور اگر صاحبین کا قول عدم جواز کا حاصل بھی صرف ارتکاب گناہ ہے، فسادِ عقد نہیں، تو پھر یہ اختلاف صرف لفظی ہوگا کہ صاحبین نے ناجائز قرار دیا بمعنی الاثم والمعصیت اور امام صاحب نے جائز قرار دیا بمعنی جواز عقد نہ بمعنی رفع اثم۔ پھر اس مکروہ کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ معصیت اس کے عین کے ساتھ متعلق ہو، بغیر کسی تغیر اور تصرف کے دوسرے یہ کہ کچھ تصرف وتغیر کے بعد وہ معصیت کے کام میں آئے، پہلی صورت مکروہ تحریمی ہے، دوسری مکروہ تنزیہی۔ فتاویٰ قاضی خان اور دوسری کتب فقہ کی عبارتوں میں جو کراہت تحریم وتنزیہ کا اختلاف نظر آتا ہے، اس کی تطبیق بھی اس تفصیل سے ہوجاتی ہے فللّٰہ الحمد۔

اس کے بعد مسئلہ زیر بحث کو دیکھ لیا جائے کہ اس میں اعانت کا مفہوم تو ہے نہیں، کیونکہ نہ قصداعانت حقیقۃً ہے، نہ حکماً اور تسبب بھی سبب محرک یا جالب کے ساتھ نہیں، اس لئے حرمت صریحہ میں داخل نہیں، البتہ سبب قریب کی دوسری قسم میں داخل ہے، جو محرک نہیں ہے، اس لئے اگر کسی کو یہ علم نہ ہو کہ اجارہ پر لینے والا اس میں بینک بنائے گا، تو بلا کراہت جائز ہے، اور اگر علم ہے تو مکروہ ہے۔

البتہ کراہت تحریم وتنزیہ کا فیصلہ اس بارہ میں محل غور ہے، اگر یہ دیکھا جائے کہ بنانے والے نے بینک کی مناسبت سے کمرے بنوائے ہیں، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کراہت تحریم ہے، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ ایسے کمرے صرف بینک ہی کے لئے نہیں دوسرے کاموں اور دفاتر کے لئے بھی بنتے ہیں، تو کراہت تنزیہ کہا جاسکتا ہے،

اس میں مجھے ہنوز تردد ہے، کہ اس کو مکروہ تحریمی کہا جائے، یا تنزیہی۔ دوسرے علماء سے بھی استصواب فرمالیں، اور یہ اس وقت ہے کہ تنبہ کے بعد بھی اس پر اصرار کرے، اور اگر تنبہ کے بعد توبہ کرلی، مگر فسخ اجارہ قدرت میں نہیں، تو اپنی پوری سعی فسخ اجارہ میں کرلینے کے بعد امید ہے کہ معذور سمجھا جائے گا۔ واللہ اعلم

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۳ صفر ۱۳۸۳ھ

تفصيل الاحكام للارباح الفاسدة والمال الحرام

ناجائز معاملات پر ایک تصنیف کا خاکہ

مع

صدائے عاجزودرماندہ

تاریخ تالیف ______ جمعہ ۷/جمادی الثانیہ ۱۳۹۴ھ (مطابق ۱۹۷۴ء)

مقامِ تالیف ______ دارالعلوم کراچی

رائج الوقت معاملات کے احکام شرعیہ کی تحقیق کے لئے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بالا نام سے ایک کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ فرمایا تھا جس کے لئے یہ ابتدائی تمہید لکھی گئی تھی اوراس میں کتاب کا خاکہ بیان کیا گیا ہے تفصیل کے لئے اسی رسالہ میں ''صدائے عاجز و درماندہ'' ملاحظہ فرمالیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ و لا سیما سیدنا محمد صلی اللّٰہ علیہ و سلم و آلہ و من بھدیہ اھتدی .

اما بعد !

اس زمانہ میں حلال روزی حاصل کرنا اس قدر دشوار ہو گیا ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اس کا ارادہ بھی کرتا ہے، تو بظاہر اس پر معاش کے دروازے بند اور زمین اس پر تنگ نظر آتی ہے، کسب معاش کے ذرائع، زراعت، تجارت، ملازمت جہاں نظر ڈالئے، سود، قمار، رشوت اور معاملات باطلہ و فاسدہ سے لبریز ہیں۔ یہاں تک کہ بعض سطحی نظر والے یہ سمجھنے لگے کہ حلال و حرام کے متعلق اسلامی قانون اس قدر سخت ہے کہ اس پر عمل سخت دشوار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حلال سے مایوس ہو کر بے دھڑک حرام کے پیچھے پڑ گئے۔

لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جاوے تو معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ دشواریاں، قانون اسلامی کی سختی کا نتیجہ نہیں، بلکہ ابنائے زمانہ کی کج روی اور ایسی ملحدانہ آزادی کا نتیجہ ہیں کہ اس کے ساتھ وہ کسی آسان سے آسان قانون کی پابندی بھی برداشت نہیں

کر سکتے۔ اور جب کثرت ایسے لوگوں کی ہوگئی تو تمام معاملات باطل اور فاسد اور خلاف شرع ہونے لگے، اب ہزاروں میں ایک دواگر یہ چاہیں، کہ ہم خلافِ شرع معاملات اور مال حرام سے بچیں، تو معاملہ کرنے کہاں جائیں، انھیں لوگوں سے معاملات پڑیں گے، جن کو حلال وحرام کا ذرا احساس نہیں، بلکہ اس کو (معاذ اللہ) تنگ نظری خیال کرتے ہیں، اس لئے روزی حلال طلب کرنے والے کے لئے دشواریاں پیش آگئیں، ورنہ اسلامی قانون اس بارہ میں بھی اس قدر سہل اور وسیع ہے کہ دنیا کی کوئی ضروری اور حقیقی واقعی حاجت اس کے دائرہ میں رہتے ہوئے بند نہیں ہوتی، اور یہ صرف اسلام ہی کی شان امتیاز ہے، ورنہ دنیا کے دوسرے مذاہب اور ان کے قوانین پر نظر ڈالو، تو صرف دو ہی راستے نظر آتے ہیں کہ یا تو تمام دنیوی اور معاشی ضروریات اور بشری حوائج کو چھوڑ چھاڑ کر جوگیوں اور راہبوں کی زندگی اختیار کرلیں، اور یا مذہب سے ہاتھ اٹھائیں۔

جس وقت تک عام مسلمانوں میں حلال وحرام کا احساس تھا، غیر مسلم بھی معاملات میں ان کی رعایت کرنے پر مجبور تھے، اور اس وقت بھی اگر کسی بڑی جماعت کا کوئی خاص مذاق کارخانہ والوں کو معلوم ہوتا ہے، تو وہ اپنے سامان کی نکاسی کے خیال سے ان کی رعایت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

افسوس ناک مسائل

آج کل یورپ سے جو دوائیں اور غذائیں آتی ہیں، ان کے لیبل اور اشتہار میں بکثرت پایا جاتا ہے، کہ اس میں کوئی حیوانی جزو شامل نہیں، یہ صرف اس وجہ سے کہ ان کو ہندو قوم کا مذاق معلوم ہے، کہ وہ اس سے پرہیز کرتے ہیں، اور یہ کہیں نظر نہیں پڑتا کہ اس میں شراب یا کوئی نشہ آور چیز شامل نہیں، کیونکہ مسلمانوں نے

اپنے طرز عمل سے اس میں احتیاط کا ثبوت نہ دیا، ورنہ یورپ کے پیسہ پرست کارخانے خدا کے خوف سے نہیں بلکہ اپنی کساد بازاری کے خوف سے اس پر مجبور ہوتے کہ ستر کروڑ مسلمانوں کے مذاق کا احترام کریں۔

الغرض اس وقت کسب حلال میں جو تنگی پیش آرہی ہے، وہ ''از ماست کہ بر ماست'' کا مصداق ہے، اپنی بے فکری و بے احتیاطی کا نتیجہ ہے، قانون کی سختی ہرگز نہیں اور یہ بدیہی امر ہے کہ جو کام عوام خلائق چھوڑ دیں، وہ کتنا ہی آسان ہو، اس کا کرنا دشوار ہو جاتا ہے، ٹوپی اوڑھنا اور پاجامہ پہننا کوئی مشقت کی چیز نہیں لیکن اگر ساری مخلوق اس کو چھوڑ بیٹھے پھر کوئی قدامت پسند اسی وضع پر رہنا چاہے، تو اس کو ٹوپی اور پاجامہ میسر آنا ایک مصیبت ہو جائے گا، نہ اس کا سینے والا ملے گا، نہ درست کرنے والا روٹی پکا کر کھانا کوئی سخت کام نہیں، لیکن اگر ساری دنیا سے یہ رواج مٹ جائے، اور سب چاول کھانے لگیں، یا آٹے کو کسی دوسرے طریق سے کھانے لگیں، اور پھر کوئی چاہے کہ روٹی کھایا کرے، تو روٹی حاصل کرنا ایسی مصیبت ہو جائے گی کہ اس کو ناقابل عمل کہنے لگے تو بعید نہیں، اس سے یہ تو واضح ہو گیا کہ اسلامی قانون پر تنگی و سختی کا الزام سراسر بہتان اور غلط ہے، جو کچھ تنگی و دشواری ہے، وہ محض عام مسلمانوں کی آزادی سے ہے، کہ ان کے نزدیک حلال و حرام میں کوئی فرق نہیں، ایک معاملہ جو ذرا سے تغیر کے ساتھ حلال ہو سکتا تھا، اس کو اپنی بے فکری سے حرام طریق پر کیا جاتا ہے، لیکن یہ اشکال ابھی تک باقی ہے کہ تنگی خواہ مسلمانوں کی بے فکری ہی سے ہو مگر حلال روزی حاصل کرنے والے کے لئے دشواریاں تو بہر حال پیدا ہو گئیں، وہ ایسی صورت میں کیا کرے۔

سو جواب اس کا اول تو یہ ہے کہ انسان دنیا کی چند روزہ راحت یا بعض

انسانوں کو راضی کرنے کے لئے ہزاروں قسم کی مشقتیں اور مصائب جھیلتا ہے، اگر آخرت کی دائمی حیات اور غیر فانی نعمتوں کے لئے اپنے مالک کو راضی کرنے کے لئے بھی اگر کچھ مشقت اٹھائے، تو کوئی بڑی بات نہیں، بالخصوص جب کہ مشقت اٹھا کر حلال روزی حاصل کرنے کی صورت میں اس کا اجر وثواب بھی بہت زیادہ بڑھ جائے گا، جیسا کہ حدیث صحیح میں اس کا وعدہ ہے۔

دوسرے حق تعالیٰ کا یہ بھی وعدہ ہے کہ جو شخص اس کی رضا جوئی کی فکر میں لگتا ہے، وہ اس کے لئے مشکلات میں بھی آسانیاں پیدا فرما دیتے ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ:

الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا.

(یعنی جو لوگ ہمارے راستہ میں کوشش کرتے ہیں، ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھائیں گے)

اور اس کا مشاہدہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر معاملات باطلہ و فاسدہ پیش آتے ہیں، یا جو مجبوریاں ملازمتوں میں پیش آتی ہیں، ان کو لکھ کر علماء سے سوال کیا جائے کہ ان میں گناہ اور حرام سے بچنے کی کوئی شرعی تدبیر بتلائی جائے، تو یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ سارے معاملات فاسدہ میں جواز کی صورتیں نکل آویں گی، لیکن بامید قوی یہ کہہ سکتا ہوں کہ اکثر معاملات فاسدہ میں بہت معمولی اور آسان تغیر کر دینے سے جواز وحلت کی صورتیں پیدا ہو جاویں گی، اور جو کام وہ حرام کر کے کرتے ہیں، حلال کر کے کر سکیں گے۔ لیکن کسی کو حلال کی فکر ہی نہ ہو تو اس کا کیا علاج۔

اسی بناء پر ایک مدت مدید سے احقر کو خیال تھا کہ جو معاملات فاسدہ و باطلہ ملک میں رائج ہیں ان کے متعلق نیز جو مال حرام یا ناجائز کسی کے پاس جمع ہو گیا یا وراثت پہنچ گیا اب اس کی ذمہ داری اور گناہ سے بچنے کی صورتوں کے متعلق ایک

رسالہ لکھا جاوے، لیکن اول تو پیہم امراض وافکار سے نجات نہ ہوئی، دوسرے بہت سے معاملات مروجہ کا احقر کو تفصیلی علم نہیں، اور اہل معاملہ سے اس کے معلوم کرنے کی فرصت نہیں اسلئے یہ ارادہ یوں ہی ٹلتا رہا، آخر ۱۳۵۹ھ میں جب دارالعلوم کی فتویٰ نویسی کی خدمت دوبارہ احقر پر آئی، اور اس قسم کے معاملات کے متعلق کچھ سوالات سامنے آئے، تو پھر اس ارادہ کی تجدید ہوگئی، اور اب بایں خیال اس رسالہ کو بنام خدا تعالیٰ شروع کرتا ہوں، کہ اگر پورا نہ ہو سکے گا، تو ایک نمونہ جمع ہو جائے گا، جو خود بھی فائدہ سے خالی نہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں کسی اہل علم کو اس کی طرف توجہ ہو، اور وہ اس کی تکمیل کر دیں، رسالہ کے مضامین کو تین باب پر تقسیم کیا ہے۔

باب اول:......کسب حلال کی فضیلت اور حرام کا وبال عظیم۔

باب دوم:......مروجہ معاملات فاسدہ میں جواز کی صورتیں یہ باب تین فصلوں پر منقسم ہو گا۔

فصل اول:......معاملات متعلقہ زراعت

فصل دوم:......متعلقہ تجارت

فصل سوم:......متعلقہ ملازمت واجارہ

باب سوم:......ناجائز اور حرام اموال سے متعلقہ احکام۔ یہ باب بھی تین فصلوں پر منقسم ہوگا۔

فصل اول:......خود کاسب حرام کے متعلق۔

فصل دوم:......مال حرام سے ہدیہ لینے یا بیع وشراء کرنے کے متعلق۔

فصل سوم:......وراثت وغیرہ میں مال حرام مل جانے کے متعلق۔

واللہ الموفق و المستعان و علیہ التکلان۔

صدائے عاجز ودرماندہ

رسالہ'' تفصیل الاحکام للارباح الفاسدة و المال الحرام " کی مذکور الصدر تمہید احقر نے اس وقت لکھی تھی جب کہ بناء پاکستان سے پہلے احقر دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی کی حیثیت سے خدمت فتویٰ پر مامور تھا، وقت کی اہم ضرورت سمجھ کر یہ تمہید لکھی اوراس تصنیف کے لئے کتب فقہ سے مواد جمع کرنا شروع کیا تھا، مگر یہ کام اس پر موقوف تھا کہ ملک میں جو معاملات جدیدہ رائج ہیں، اور وہ سود و قمار اور دوسری وجوہ فاسدہ کی وجہ سے ناجائز ہیں، ان کی صحیح صورتیں معلوم ہوں، اور ان کے متبادل جائز صورتوں کی تحقیق کی جاوے، یہ کام وسیع وقت اور طویل فرصت چاہتا تھا، جو اس وقت میسر نہ ہوئی، اس لئے تمہید سے آگے کوئی قدم نہ بڑھ سکا، یہاں تک کہ پاکستان قائم ہوا، اور ہجرت کر کے پاکستان آنا ہوا، اور ایک طویل مدت اس جدید مملکت کے جدید مسائل میں صرف ہوئی، اور پھر جب کہ ۱۳۷۰ھ میں کراچی میں ایک دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، تو اس کی مصروفیات اتنی ہوئیں کہ اس طرح کے کاموں کے لئے وقت نکالنا مشکل تھا، تاہم اس کام کی تکمیل کے لئے ایک عالم کو مستقلاً اس کے لئے تیار کیا، کہ وہ کراچی کے مختلف بازاروں، صرافہ، کپڑا مارکیٹ اور دوسری مارکیٹوں اور کارخانوں میں جا کر ان کے ایسے معاملات کی فہرست تیار کریں، جو کسی جزوی خلاف شرع صورت کے استعمال کی وجہ سے ناجائز ہیں، اور ان کی اصلاح کی جا سکتی ہے، یہ کام ایک حد تک ہوا بھی اور کچھ یادداشتیں جمع بھی ہوئیں، مگر افسوس کہ اس حد تک نہ پہنچا کہ اس ضرورت کی تکمیل ہو سکتی۔

اب ۱۳۹۴ھ میں جب کہ احقر کی عمر اسّی سال کو پہنچنے والی ہے، اور مختلف امراض مستقل طور پر لگ گئے ہیں، قویٰ بھی ساقط ہو گئے، خصوصاً نظر جواب دینے لگی، اس وقت سابق ناتمام مسودات میں یہ تمہید بھی سامنے آئی، اس کو اس لئے شائع کرنا مناسب معلوم ہوا کہ شاید کسی دوسرے اہل علم کو اس طرف توجہ ہو جائے، اور یہ تمہید اس کام کی تکمیل کا ذریعہ بن جائے، ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ؎

وَ کَمْ حسراتٍ فی بطون المقابر

واللّٰہ المستعان و علیہ التکلان

بندہ محمد شفیع

جمعہ ۷/ جمادی الثانیہ ۱۳۹۴ھ

۱۰۴

القـول السَّـديـد فـى تـحـقيـق میراث الحفید الملّقب بارغام العنید

یتیم پوتے کی میراث

تاریخ تالیف ـــــــــ ۱۳۷۴ھ (مطابق جنوری ۱۹۵۴ء)

مقامِ تالیف ـــــــــ لاہور

بعض اہل تجدد نے پنجاب اسمبلی میں ایک بل برائے منظوری پیش کیا تھا جس کا حاصل یہ تھا کہ بیٹے کی موجودگی میں یتیم پوتے کو میراث نہ ملنا اسلامی تعلیمات اور انصاب کے خلاف ہے، لہٰذا اسے بھی میراث دلائی جائے۔ اس رسالہ میں اس کا جواب شرعی وعقلی دلائل سے دیکر ہر اشکال کو دور کر دیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اہل تجدد کا موقف

پنجاب قانون ساز اسمبلی میں محمد اقبال صاحب چیمہ نے ایک بل کا مسودہ پیش کیا ہے، جس کا مقصد میراث کے اس اصول کی ترمیم ہے، جس کی رو سے بیٹوں کے ہوتے ہوئے پوتوں کو دادا کی وراثت میں حصہ نہیں ملتا۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ یتیم پوتوں کو بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی دادا کی وراثت ملنا چاہئے، اس ترمیم میں ظاہر کیا گیا ہے، کہ یتیم پوتوں کو دادا کی میراث نہ ملنا روح اسلام کے منافی ہے، اور مروجہ قانون کو اسلام کی منشاء کے مطابق بنانے ہی کے لئے یہ ترمیم پیش کی جارہی ہے۔

مسئلہ کے دو پہلو

اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں، ایک ''موجودہ قانون کا مطابق شرع اہل اسلام یا خلاف اسلام'' ہونا۔ دوسرا ''یتیم پوتے کو وراثت نہ ملنے کی صورت میں پیش آنے والی مشکلات کا حل۔''

جہاں تک مسئلہ کے دوسرے پہلو کا تعلق ہے، شریعتِ اسلام نے نہ صرف یتیم پوتے کے لئے بلکہ تمام یتیموں اور ان کے اموال کی حفاظت کے لئے بہترین

انتظام فرمایا ہے، اور یتیموں کی راہ میں پیش آنے والی ہر مشکل کا حل پیش کیا ہے، جس کو بعد میں عرض کیا جائے گا، اسلامی قانون کو مکمل طور پر جاری نہ کرنے کی وجہ سے اگر کچھ ملک کے یتیم بچے کسی آفت میں مبتلا ہوں، تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری قانونِ اسلام کے بجائے اس قانون ساز مجلس پر ہے جس کے ہاتھ میں اس کا نفاذ ہے۔

میراث کا شرعی اصول

اب اصل بحث یہی رہ گئی ہے کہ دادا کی میراث میں پوتوں کے حصے سے متعلق شریعتِ اسلام کا صحیح فیصلہ کیا ہے، اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے چند اصولی باتیں سمجھ لینا ضروری ہیں۔

۱:......میراث کی تقسیم اسلام میں بلکہ کسی مذہب وملت میں بھی ضرورت و حاجت کے معیار پر نہیں، بلکہ قرابت و رشتے کے معیار پر ہے، ورنہ اگر ضرورت و حاجت پر مدار ہوتا، تو ہر مالدار کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے، پوتے، باپ، دادا، بیوی، بھائی، بہن جو فقیر نہ ہوں، سب محروم رہتے، اور بستی کے فقراء و مساکین وارث بنتے۔

۲:......اور جب مدار کار رشتہ و قرابت پر ٹھہرا تو ساری دنیا ایک ہی باپ آدم علیہ السلام کی اولاد ہے، مطلق رشتہ و قرابت تو ہر انسان کا ہر انسان سے کہیں نہ کہیں دور یا قریب نکل ہی آئے گا، اب اگر قرب و بُعد کو معیار قرار دے کر اقرب کے ہوتے ہوئے ابعد کو محروم نہ کریں، تو ہر انسان کی وراثت میں ساری دنیا کے انسان داخل ہو جاتے ہیں، اور مذہب کے اختلاف پر مسلمان کی وراثت سے غیر مسلموں کو علیحدہ کر کے بھی تمام دنیا کے مسلمان تو شریک میراث بن ہی جاتے ہیں، اور ظاہر

ہے کہ اس طرح مرنے والوں کے ترکے تقسیم ہوا کریں، تو کسی کو بھی کسی کے ترکے سے کوئی قابلِ انتفاع حصہ نہ ملے گا، بڑے سے بڑا سرمایہ بھی کوڑیوں میں بکھر کر ضائع ہو جائے گا، بلکہ ترکہ کی تقسیم ہی عادۃً ناممکن ہو جائے گی۔

اس لئے عقلاً و شرعاً ضروری ہے کہ قرب و بعد رشتہ کو مدار کار ٹھہرا کر قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو محروم قرار دیا جائے، اس کے بعد اصل مسئلہ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھئے۔

میراث میں اولاد کا حصہ

قرآن کریم نے کچھ قریبی رشتہ داروں کے تو مبہم حصے تہائی چوتھائی وغیرہ کہہ کر متعین فرما دیئے ہیں، ان حصوں کو حدیث و فقہ کی اصطلاح میں فرائض اور حصہ والوں کو ذوی الفرائض یا ذوی الفروض کہا جاتا ہے، اور اولاد کے لئے اس طرح کوئی حصہ مقرر نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد ہوا۔

آیتِ قرآنیہ

یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین (نساء پارہ: ۴) جس کا مطلب یہ ہوا کہ ذوی الفروض کے حصے نکالنے کے بعد جو کچھ بچے وہ اولاد میں اس نسبت سے تقسیم ہوگا کہ ہر لڑکے کو دوہرا حصہ اور ہر لڑکی کو اکہرا حصہ ملے گا۔

لفظ اولاد کی تحقیق

پھر لفظ اولاد عربی لغت و محاورہ میں حقیقتاً و اصالۃً بلا واسطہ اولاد کے لئے بولا جاتا ہے، اور کبھی اس کا اطلاق توسعاً اولاد کی اولاد کو بھی شامل ہو جاتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم کی آیت ان لم یکن لھن ولد میں ولد کا لفظ اسی عام معنی میں استعمال

ہوا ہے۔ (روح المعانی)

اسی لئے آیتِ مذکورہ یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم میں دو احتمال پیدا ہو گئے ایک یہ کہ بلا واسطہ اولاد مراد ہو، دوسرے یہ کہ عام معنی مراد ہوں، جس میں اولاد کی اولاد یعنی پوتے بلکہ نواسے بھی شامل ہوں۔

اب اگر آیت مذکورہ میں دوسرے معنی مراد لئے جائیں، تو معنی یہ ہوں گے، کہ صلبی بیٹے اور پوتے نواسے خواہ ان کے باپ زندہ ہوں، یا وفات پا گئے ہوں، سب کے سب اس حکم میں شامل ہیں، اور بیٹوں کے ساتھ برابر کا حصہ پائیں گے۔

لیکن آیت کے یہ معنی نہ اصولی طور پر معقول ہیں کہ قریب و بعید کو یکساں حصے دیئے جائیں، نہ عہد رسالت اور خلفائے راشدین و مابعد میں کہیں ایسا عمل ہوا، اور نہ پوری امت محمدیہ میں کوئی اس کا قائل ہے۔

اس لئے پہلے معنی متعین ہو گئے کہ اولاد سے مراد اس جگہ بلا واسطہ اولاد ہے۔

اب صورت یہ رہ جاتی ہے کہ کسی مرنے والے کا بیٹا کوئی زندہ نہ ہو، اور پوتے موجود ہوں، تو پوتوں کو وراثت کس پیمانے پر ملے گی، اس بارے میں باجماع صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ فیصلہ قرار پایا کہ جب کسی مرنے والے کا کوئی صلبی بیٹا زندہ نہ ہو، صرف پوتے پوتیاں موجود ہوں، تو ان کو وراثت اسی معیار پر ملے گی، جو معیار صلبی اولاد کے لئے قرآن نے مقرر کیا ہے یعنی ہر پوتے کو دو حصے اور ہر پوتی کو ایک حصہ۔

حدیث بخاری و اجماع امت

صحیح بخاری میں اس مضمون کا ایک مستقل باب رکھا ہے، باب میراث ابن الابن اذا لم یکن ابن۔ اس باب میں حضرت زید بن ثابتؓ کا فتویٰ نقل کیا ہے، جس

پر تمام صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے، علامہ عینی نے شرح بخاری، ص:۲۳۸، ج:۲۳ میں نقل فرمایا ہے وہ اجماعی فیصلہ یہ ہے:

ولد الابناء بمنزلة الولد اذا لم يكن دونهم ولد ذكر هم كذكر هم و انثاهم كانثاهم يرثون كما يرثون و يحجبون كما يحجبون و لايرث ولد الابن مع الابن.

بیٹوں کی اولاد بیٹوں ہی کے حکم میں ہے جب کہ ان کے اور میت کے درمیان کوئی بیٹا موجود نہ ہو، ان میں لڑکے لڑکوں کی طرح اور لڑکیاں لڑکیوں کی طرح میراث پائیں گے، اور جس طرح بیٹے پوتوں کے لئے حاجب ہوتے ہیں، پوتے پڑپوتوں کے لئے حاجب ہوں گے، یعنی پوتوں کے ہوتے ہوئے پڑپوتوں کو میراث نہ ملے گی۔

اس اجماعی فیصلہ میں پوتا یتیم ہو، یا اس کا باپ زندہ ہو، دونوں کا ایک ہی حکم ہے کہ مرنے والے کا کوئی بیٹا زندہ ہے، تو پوتوں کو وراثت نہ ملے گی۔

وہ اسلام جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں لائے تھے، ساڑھے تیرہ سو برس کے مسلمانوں کے اجماع و اتفاق سے اس کا تو یہی قانون ہے۔

ایک مغالطہ کا جواب

ہاں چودھویں صدی کے آخر میں ایک نیا اسلام کراچی سے طلوع ہو رہا ہے اس کے موجدین نے اس مسئلہ میں عجیب نکات پیدا کئے ہیں: مثلاً

اس اجماعی فیصلہ کے آخر میں جو لایرث ولد الابن مع الابن آیا ہے، اس میں ان کا خیال ہے، کہ ولد الابن سے صرف وہ پوتا مراد ہے، جس کا باپ زندہ ہو، اور اس کے ثابت کرنے لئے دلیل پیش کی جاتی ہے، اس اصول فقہ کی جس کے رد

کرنے اور جس پر استہزاء و تمسخر کرنے ہی کے لئے یہ نیا اسلام طلوع ہو رہا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ الابن جو معرفہ کی صورت میں مکرر لایا گیا، تو حسب تصریح اصول حنفیہ اس سے عین اول یعنی وہ ابن جو ولد الابن میں مذکور ہے مراد ہوگا۔

مگر ان کو کیا خبر کہ فقہاء نے اس کو قاعدہ کلیہ قرار نہیں دیا، اور اس کلام میں تو اس معنی کی کوئی گنجائش ہی نہیں کیونکہ اس جملے سے پہلا جملہ **اذا لم یکن دونهم ولد** میں لفظ ولد نکرہ آیا ہوا ہے، مگر اس پر ان کی نظر کیوں جانے لگی تھی، ان کو تو نیا اسلام، نئے معارف، نئے اصول پیش کرنا ہیں۔

اس اجماعی فیصلے کے ابتدائی جملوں سے آنکھیں بند کر کے آخری جملے میں فقط الابن کو معرفہ لانے سے اس پر استدلال کیا کہ ابن الابن سے مراد اس جگہ زندہ بیٹے کا بیٹا ہے، انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اگر یہ مراد ہوتی، تو اس کے لئے سیدھی عبارت یوں ہوتی، لا یرث الابن مع ابیہ۔ اس کو بھی چھوڑ یئے، تو پہلے جملے میں ولد نکرہ موجود ہے، اس پر نظر کرنا تو گویا ان کے لئے ضروری نہیں تھا، اور عام لوگوں کی عادت سے بھی وہ مطمئن تھے کہ کون اتنی زحمت گوارا کرے گا، جو بخاری اٹھا کر دیکھے اور ان کی چوری پکڑے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن میں تو پوتوں کا ذکر نہیں، اور اجماعی فیصلے میں یتیم اور غیر یتیم ہر قسم کے پوتے ایک ہی حکم میں ہیں، اب یتیم پوتے کو دوسرے پوتوں سے ممتاز کر کے دادا کی وراثت دینا معلوم نہیں کون سے قرآن میں دیکھ کر اسلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

حال میں اسی قرآن و حدیث سے آزاد مجتہد نے اس جگہ ایک عجیب ضابطہ

ایجاد کیا ہے، کہ ایک شخص جو میت سے بالواسطہ قرابت رکھتا ہے، اگر واسطہ کا انتقال ہو جائے، تو یہ بالواسطہ قرابت رکھنے والا اب اصل واسطہ کے قائم مقام ہو کر میت کا اقرب بن جاتا ہے۔ مثلاً پوتا جو دادا کے ساتھ اپنے باپ کے واسطہ سے قرابت رکھتا ہے، اگر اس کا باپ مر جائے، تو اب یہ تمام احکام میں اپنے باپ کا قائم مقام ہو کر دادا کے دوسرے بیٹوں کے برابر ہو جائے گا، تمام اہلِ عقل اور اہلِ علم کے نزدیک جس رشتہ دار کی قرابت میت سے بلاواسطہ ہو، وہ اقرب کہلاتا ہے، اور جس کا تعلق کسی واسطہ سے ہو، وہ ابعد خواہ یہ واسطہ زندہ ہو، یا مردہ کیونکہ واسطہ کی زندگی اور موت کا رشتہ کی نوعیت کے قرب و بعد سے کوئی تعلق نہیں، جو شخص میت سے قرابت کسی واسطہ کے ذریعہ رکھتا ہے، اور اس وجہ سے ابعد کہلاتا ہے، تو وہ جس طرح واسطہ کی زندگی میں ابعد ہے، اسی طرح اس واسطہ کے مر جانے کے بعد بھی اس کے رشتہ و قرابت کی نوعیت نہیں بدلی، وہ بدستور اب بھی ابعد ہی ہے، ہاں اقرب کے موجود نہ ہونے پر ابعد ہونے کے باوجود اس کو وارث تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اس نئے آزاد مجتہد نے اقرب و ابعد کا مفہوم بھی اپنی خواہش کے مطابق بدل ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ جب واسطہ مر جائے، تو ابعد رشتہ دار اقرب بن جاتا ہے، ان مجتہد صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جو کچھ کہیں قرآن سے کہیں، فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں، لیکن عادت یہ ہے، کہ جو کچھ کہیں صرف اپنے دماغی تخیل سے کہیں، اور اس کو قرآن کہہ کر ملت کے سر تھوپنے کی کوشش کریں، اس قائم مقامی کے ضابطہ کی بھی قرآن میں تو کوئی سند ہے نہیں، مگر ان کی نظر میں وہ جو کچھ فرما دیں، سب قرآن ہی ہوتا ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ

پھر اگر یہی قائم مقامی کا ضابطہ ہے، تو باپ کے مرنے پر چچا اور پھوپھی کے مرنے پر ماموں اور خالہ، باپ اور ماں کے قائم مقام ہو کر ان کا حصہ پانے کے مستحق

ہونے چاہئیں یعنی باپ کے مرنے پر بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے چچا اور پھوپھی کو باپ کا حصہ اور ماں کے مرنے پر ماموں اور خالہ کو حصہ ملنا چاہئے، اور اس ضابطہ سے اگر پہلے بیوی مر جائے، تو بیوی کے ماں باپ اور بھائی بہن شوہر کے ترکہ میں اپنی اولاد کے موجود ہوتے ہوئے حصہ پانے کے مستحق ہونے چاہئیں، اسی طرح شوہر پہلے مر جائے، تو شوہر کے ماں باپ اور بہن بھائی کو بیوی کے ترکہ میں سے حصہ شوہری ملنا چاہیئے جس کو خود یہ نئے مجتہد بھی تجویز نہیں کرتے۔

اور یہ نئے مجتہد جو قرآن وحدیث کی پابندیوں سے بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں، اگر ایسی تجویز کر بھی لیں، تو ان سے یہ بھی کچھ بعید نہیں، مگر ظاہر ہے کہ اسلام اور قانون اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

مسئلہ کی مذہبی اور اسلامی حیثیت تو مذکورہ بالا تحریر میں واضح ہو چکی کہ باجماع امت کسی بیٹے کے ہوتے ہوئے کسی پوتے کو وراثت کا حصہ نہیں ملتا۔

ایک اور شبہ کا جواب

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ایک شخص کے چار بیٹے ہیں، اور بیٹوں کی اولاد پوتے بھی موجود ہیں، اگر اس شخص کی زندگی میں ایک بیٹے کا انتقال ہو جائے، تو موت کے وقت اس کے تین بیٹے ترکہ کے وارث ہوں گے، اور ان کے واسطہ سے تینوں بیٹوں کی اولاد بھی گویا وراثت سے حصہ پائے گی، وہ لڑکا جس کا انتقال باپ کی زندگی میں ہو چکا ہے، اس کی اولاد کو کچھ نہ ملے گا، حالانکہ اس کی اولاد یتیم ہونے کی حیثیت سے زیادہ حاجتمند اور قابل رحم ہے۔

لیکن اگر ذرا گہری نظر سے اس اشکال کا تجزیہ کیا جائے، تو اس کی بنیاد دو چیزوں پر ہے اور وہ دونوں غلط ہیں۔

ا:......اول یہ مفروضہ کہ جن پوتوں کے باپ زندہ ہیں، ان کو وراثت کا حصہ ملے گا، اور جن کا باپ فوت ہو گیا، وہ محروم رہے گا، باپ کی ملکیت کو بیٹے کی ملکیت سمجھنا یا قرار دینا کسی ان پڑھ بازاری آدمی سے تو ممکن ہے، تعجب ہے کہ قانون داں اور قانون ساز حضرات اس میں کیسے مبتلا ہو گئے، جہاں بال کی کھال نکالی جاتی ہے، اور رات دن باپ بیٹے بیوی کی ملکیتوں کی علیحدگی پر ہزاروں مقدمات کے فیصلے ہوتے ہیں۔

یہ مغالطہ صرف اس بناء پر لگ سکتا ہے، کہ باپ کی ملکیت سے عادۃً اس کی اولاد منتفع ہوتی ہے، سو اول تو ایسے واقعات کم نہیں کہ دادا کے انتقال کے بعد باپ ہی کی عمر طویل ہو، اور وہ دادا سے ملا ہوا حصہ کھا پی کر برابر کر دے، عمر بھی طویل نہو اپنی بدنظمی یا کسی آفت کے سبب ختم کر دیں گے، اور اگر باپ کی ضرورتوں اور زمانہ کی آفتوں سے کچھ بچ بھی گیا، تو وہ باپ ہی کے حسنِ انتظام اور جدوجہد کا نتیجہ ہے، جس طرح اس کی خود پیدا کردہ دولت ہے، تو اس کی اولاد کو جو کچھ ملا وہ درحقیقت اپنے باپ کی کمائی یا حسنِ انتظام اور جدوجہد کے نتیجہ میں ملا، اس کو دادا کی کمائی سے محروم کہنا بھی غلط ہوا، بلکہ حقیقت یہ نکلی کہ جس نے پایا اپنے باپ سے پایا، اور جو محروم رہا، وہ اس بناء پر رہا کہ اس کے باپ نے کچھ بھی نہیں چھوڑا یا کم چھوڑا ہے۔

سو اس مساوات اور برابری کی کون ذمہ داری لے سکتا ہے، کہ چار بھائی جب مریں، تو ایک ہی حیثیت کا ترکہ چھوڑ کر مریں تا کہ ان کی اولادیں برابر رہیں۔

یہ تو دنیا ہے جس میں افراد کے حالات اور ان کی کمائی کے تفاوت کا کوئی پیمانہ نہ کبھی مقرر کیا جا سکا ہے نہ آئندہ کیا جا سکتا ہے، ایک شخص ایک دن میں ایک کروڑ روپیہ کما سکتا ہے، اور دوسرے کی عمر بلکہ اس کی سات پشتوں کی عمریں بھی اتنی کمائی سے عاجز رہتی ہیں۔

اور جس یتیم پوتے پر رحم کھا کر یہ قانون بدلا جا رہا ہے کیا اس کا امکان کچھ بعید ہے کہ اس کا باپ اپنے مرنے سے پہلے اتنی دولت چھوڑ جائے، جو دادا کو بھی نصیب نہیں، اور اس کے وارثوں کو بھی، اگر اولاد در اولاد برابری کی اسکیم کسی کے ذہن میں ہے تو پھر یہاں کیا کوئی ایسا قانون بنایا جائے گا کہ یتیم پوتوں کی دولت ان کے چچاؤں پر تقسیم کرائی جائے۔

اشکال کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ مرنے والے کے یتیم پوتے زیادہ حاجتمند اور واجب الرحم ہیں، لیکن یہ بھی درحقیقت قانونِ وراثت کی اصل بنیاد اور روح سے ناواقفیت پر مبنی ہے کیونکہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میراث کی تقسیم حاجت وضرورت کے معیار پر نہیں بلکہ قرابت اور رشتہ داری کے معیار پر ہے، ورنہ اگر حاجت و ضرورت کو معیار قرار دیں، تو بیشتر یہ ہوگا کہ مرنے والے کے بیٹے پوتے بیوی سب محروم ہو جائیں گے، اور اس کے غریب ہمسائے جو حاجت وضرورت میں ان سے زیادہ ہیں، ان کو وارث قرار دینا پڑے گا۔

جب معیار قرابت و رشتہ کو بنایا جائے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ مطلق قرابت اور رشتہ تو ہر انسان کا ہر انسان سے کسی نہ کسی پشت میں جا کر مل ہی جاتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ قرابت کے درجات پر مدار رکھا جائے، قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو محروم سمجھا جائے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ضابطہ مقرر فرمایا۔

حدیث:

الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فهو لاولى رجل ذكر. (بخاری ص:۹۹۷، ج:۲)

فرائض (یعنی قرآن کے مقرر کردہ حصے) اہل فرائض کو دے دو، پھر

جو کچھ بچے اس شخص یا اشخاص کا حصہ ہے، جو مرد ہوں اور رشتے میں میت سے قریب تر ہوں۔

اور جب مدار رشتہ اور قرابت پر ہوا، اور اس میں درجات قرب و بعد کی رعایت ضروری ہوئی تو یہ کون سا انصاف ہوگا کہ صلبی بیٹوں کے ہوتے ہوئے ان کے حصہ میں کمی کر کے اولاد کی اولاد کو بانٹ دیا جائے۔

اور پھر یہ کیا ظلم نہ ہوگا کہ دادا کی میراث میں سے ایک بیٹے کی اولاد کو تو حصہ دیا گیا اور دوسرے زندہ بیٹوں کی اولاد کو محروم کر دیا گیا، جو درجے میں انہی کے برابر ہیں، اور ان کے باپوں کو جو کچھ ملا ہے وہ در حقیقت ان کو نہیں ملا، اور ایسے امکانات بھی بعید نہیں کہ آئندہ بھی وہ ان کو نہ پہنچے، اور پہنچا بھی تو اپنے والد کے ترکہ کی حیثیت سے پہنچے گا جس سے یتیم پوتا بھی محروم نہیں۔

الغرض یتیم پوتے پر رحم کھا کر قانون شرعی میں ترمیم بہت سے لوگوں پر بے رحمی و ظلم کا سبب بنے گی، اور سب سے بڑا ظلم اپنی جان پر ہوگا کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ قانون کی ترمیم کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

الغرض قانون وراثت کے تحت شرعاً و عقلاً اس کی کوئی وجہ نہیں کہ بیٹوں کی موجودگی میں پوتوں کو وارث قرار دیا جائے۔

یتیم پوتے کی کفالت کا مسئلہ

ہاں ایک بات قابل نظر رہ جاتی ہے اور وہ بھی در حقیقت اس قسم کی ترمیمات کی محرک ہوتی ہے وہ یہ کہ بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ ایک شخص کے چند بیٹوں میں سے ایک کا انتقال اس کے سامنے ہوگیا اور اس کی اولاد یتیم و مسکین رہ گئی دادا کی وراثت کو چچا تاؤں نے بانٹ کھایا تو ان کے گزارہ کی کیا صورت ہوگی۔

سو اول تو شریعت کے ضابطہ وراثت میں دادا کو صرف حق ہی نہیں بلکہ قرآن و حدیث نے جا بجا اس کی ترغیب دی ہے کہ ایسے غریب رشتہ داروں کا خیال رکھے، جو ضابطہ سے وراثت میں حصہ نہیں پائیں گے، ان کو اپنی زندگی اور صحت میں ان کی ضرورت و حاجت کے پیش نظر جتنا چاہے اپنے ہاتھ سے دے سکتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ چاہے تو سب بیٹوں سے زیادہ ان پوتوں پوتیوں کو دے سکتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اس دینے میں ان کی حاجت و مصلحت پیشِ نظر ہو، دوسرے وارثوں سے ضد اور ان کو محروم کرنے کا قصد نہ ہو، اور اپنی زندگی میں نہیں دیا تو مرنے کے بعد کے لئے ایک تہائی حصہ کی حد تک وصیت کر سکتا ہے، اب اگر قرآنی ترغیبات اور خاندانی قرابت کے جذبات اور دنیا کی شرم و حیا سبھی کو بالائے طاق رکھ کر نہ ان پر دادا نے رحم کھایا، اور نہ چچا تاؤں نے جس کی وجہ سے یہ بیچارے کسی مصیبت میں گرفتار ہوئے، تو یہ ایک سماوی آفت ہو گی، جس سے کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا اس قانون میں ترمیم کرنے کے بعد بھی ایسی آفتیں آسکتی ہیں کہ ان غریبوں کو کچھ نہ ملے۔

ثانیاً یتیم پوتے پوتیاں جب تک نابالغ ہیں، یا ان میں سے کوئی اپاہج ہے، تو شرعی قانون میں ان کا نفقہ بمقدار وراثت ان کے چچاؤں پر عائد ہو گا۔ (عالمگیری مصری کتاب النفقات، ص:۵۸۵، ج:۱)

ثالثاً قانون وراثت یا وصیت تمام انسانوں کے گزارہ کا ذمہ دار نہ عقلاً ہو سکتا ہے نہ شرعاً اگر لوگوں کے گزارہ کا مدار وراثت ہی پر رکھا جائے، تو کروڑوں انسان وہ ہیں، جن کے مورث کچھ بھی چھوڑ کر نہیں مرتے، جو انتظام ان کے گزارہ کا ہو گا، وہی ان یتیم پوتوں کے گزارہ کا بھی ہو جائے گا۔

اسلامی شریعت کی رو سے تمام باشندگان ملک کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری ایک حیثیت سے اسلامی حکومت پر ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ

جو لوگ کمائی کے قابل ہیں، ان کو حسب حیثیت وصلاحیت کسی کام پر لگائے جو نابالغ یا اپاہج ہیں، اور ان کا کوئی رشتہ دار بھی ایسا نہیں، جو ان کے مصارف اٹھا سکے، تو بیت المال (سرکاری خزانہ) پر ان کا حق ہے، یہ یتیم پوتے پوتیاں بھی اس قانون سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتے ہیں۔

اگر کہا جائے کہ یہ اسلامی قوانین آج کل نافذ نہیں اس لئے ان کے گزارہ کی صورت مشکل ہے تو ظاہر ہے اس کا یہ حل نہیں ہے کہ جو رہے سہے اسلامی قوانین ہیں، ان کو بھی ختم کر دیا جائے، بلکہ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ اس قانون میں پیش کرنے والے حضرات ایسی ترمیمیں پیش کرنے کے بجائے ان شرعی قوانین کو بشکل بل پیش کریں جن کے ذریعہ یتیموں غریبوں کی کفالت ہو سکے۔

اسمبلی کو مشورہ

آخر میں ہمارا مشورہ پنجاب قانون ساز اسمبلی کو یہ ہے کہ وہ اس قانونِ شریعت میں جو باجماع امت ثابت ہے ترمیم کا خطرناک اقدام ہرگز نہ کرے کہ اولاً یہ خود اس کی اپنی اسلامی حیثیت کے منافی ہے ثانیاً عوام میں بلاوجہ ایک نیا اضطراب پیدا کرنے کا موجب ہے۔

اس مسئلہ میں مسلمانوں کی تمام جماعتیں حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی اور اہل حدیث وغیرہ سب ہی متفق ہیں۔ صرف وہ چند لوگ اس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں، جو قرآن کو تعلیمات رسول سے علیحدہ کر کے اپنی ہواء وخیالات کا تابع بنانا چاہتے ہیں، جن کی مسلمانوں میں نہ کوئی تعداد ہے نہ کوئی علمی یا عملی حیثیت۔ و ما علینا الا البلاغ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کراچی نمبر ۱ آخر جنوری ۱۹۵۴ء

تصدیقات علماء

الجواب صواب و للّٰہ در المجیب فقد اجاد و اصاب فیما اجاب

اس تحریر دلپذیر کو پڑھا جس کا ہر ہر لفظ عقل اور نقل کی ترازو میں تلا ہوا ہے، اور عقلی اور نقلی دلائل سے مدلل اور مبرھن اور قانونی نظائر سے روشن اور مزین ہے، امید ہے کہ اہل اسلام کے لئے عموماً اور ارکان اسمبلی کے لئے خصوصاً یہ تحریر شب تاریک میں شمع ہدایت کا کام دے گی۔

والسلام

محمد ادریس غفراللہ لہٗ

(شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور)

پوتے کی میراث کے متعلق حضرت مفتی صاحب کی تحریر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے منکرین حدیث کے کل وساوس کا جواب لاجواب دے کر فرض ادا فرما دیا جزاہ اللہ خیر الجزاء اراکین سمبلی نے اگر اس جرم کا ارتکاب کیا کہ پوتے کو دادا کے مال سے چچا کی موجودگی میں حصہ دلایا، تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور کل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور پونے چودہ سو سال کے گزرے ہوئے علماء ربانی، مجتہدین، مفسرین، محدثین، اولیائے امت کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس جرم کا انجام

سوچ لیا جائے، اور یہ بھی یقین رکھیں کہ ہمارے فیصلے سے اسلام کا قانون منسوخ نہ ہو سکے گا، تا قیامت باقی رہے گا۔

پوتے کا مسئلہ اجماعی ہونے میں قربانی کے مسئلہ کی طرح ہے منکرین حدیث نے قربانی کا بھی انکار کیا، مگر قربانی جاری ہے، اسی طرح یہ پوتے کی میراث کا مسئلہ بھی اسی طریق پر رہے گا، جس طرح شروع اسلام سے آج تک ہے۔

فقط محمد حسن

(دستخط حضرت اقدس مولانا محمد حسن صاحب

خلیفہ اعظم حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ)

مہتمم جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد۔ لاہور

ماشاء اللہ حضرت مفتی اعظم زید فیضہم کا یہ مضمون نہایت جامع اور شبہات کا دافع اور انصاف پسند کے لئے شافی وکافی ہے، بالکل صحیح اور قرآن وحدیث اور اجماع امت وعقل سلیم کے فیصلہ سے مستحکم ہے، احقر نے بھی ایک مضمون اخبار نوائے وقت کو دیا تھا، مگر اس نے شائع نہیں کیا، پھر ایک مضمون ادارہ اشاعت اسلام انارکلی کو دیا ہے، جو مستقل شائع ہو رہا ہے، اور ایک مضمون رسالہ ''درویش اسلام'' کو دیا ہے جو غالباً فروری ۱۹۵۴ء میں طبع ہوگا، اور ایک رسالہ ''تذکرہ کراچی'' کو دیا ہے جو غالباً مارچ کے پرچہ میں آئے گا، اور ایک مفصل کتاب ''پوتے کی میراث اور عقل پرستوں کی تحریفات'' مستقل طبع ہونے والی ہے جس میں رسالہ طلوع اسلام ور پمفلٹ ''یتیم پوتے کی میراث'' کی ہر ہر چیز کی حقیقت بھی آشکارہ کی گئی ہے، جس

سے ان کی تحریفوں اور دھوکہ بازیوں کا انداز اور عقلیات کی نامعقولیت معلوم ہوگی۔

جمیل احمد تھانوی

(مفتی جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور)

جواب مفتی صاحب کا حق ہے، اور حق ہی لائق اتباع ہے۔

محمد عبد الغنی غفرلہ

مدرس مدرسہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور

میرے نزدیک حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی کا جواب متلاشی حق مسلمان کے لئے نہایت کافی اور بالکل صحیح ہے۔

محمد عبید اللہ

مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور

لاریب فیه و ما سواه لایخلو عن ریب

محمد رسول خان

(سابق مدرس اعلیٰ دار العلوم دیوبند حال لاہور)

حضرت مفتی صاحب قبلہ کے افادات مذکورہ سے کامل طور پر متفق ہوں، اللہ کریم حضرت موصوف کو جزاء خیر عطا فرمائے۔

محمد فیوض الرحمٰن عثمانی

مدرسہ رحیمیہ لاہور

الجواب صحیح

بندہ

غلام محمد غفرلہٗ

مدرس مدرسہ جامعہ اشرفیہ

احقر نجم الحسن تھانوی غفرلہٗ

(مدیر رسالہ انوار العلوم جامعہ اشرفیہ لاہور)

محمد علی عفا اللہ

خطیب مسجد سریانوالی۔ ملتان شہر

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے پوتے پوتی کے وارث ہونے کے مسئلہ پر جو آج کل پنجاب اسمبلی میں پیش ہے، جو جواب تحریر فرمایا ہے، وہ باوجود مختصر ہونے کے جامع مدلل اور مسکت ہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

سید داؤد غزنوی

مہتمم مدرسہ دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور

و ممبر پنجاب اسمبلی

۱۰۵

وصیت نامہ

مع مضمون ”کچھ تلافی مافات“

تاریخ تالیف ــــ از ۱۳۶۴ھ تا ربیع الثانی ۱۳۹۵ء (مطابق ۱۹۴۴ء تا ۱۹۷۵ء)

مقامِ تالیف ــــ دارالعلوم دیوبند

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے ۱۳۶۴ھ میں پہلی بار اپنا وصیت نامہ تفصیلاً تحریر فرمایا، پھر اس میں حالات کے مطابق ترمیم وتنسیخ اور کمی بیشی ہوتی رہی، یہاں تک اس وصیت نامہ کا عمومی حصہ ماھنامہ البلاغ کے شمارہ شعبان المعظم اور رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ میں شائع ہوکر مفید عام وخاص ہوا، اس کے بعد علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی اس کی اشاعت ہوتی رہی، اس رسالہ کی اہمیت کے پیش نظر اب اسے شامل کتاب کیا جارہا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفی و سلامہ علی عبادہ الذینَ اصطفٰی،

اما بعد:

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وصیت نامہ کافی عرصہ پہلے تحریر فرمایا تھا، اور انہی کی ایماء پر اُسے شعبان ورمضان ۱۳۹۵ھ کے ماہنامہ البلاغ میں شائع بھی کر دیا گیا تھا۔ پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض متوسلین نے اسے الگ صورت میں بھی شائع کر کے تقسیم کیا۔ اب جب کہ ۱۰/۱۱/شوال ۱۳۹۶ھ کی درمیانی شب میں رشد وہدایت کا یہ آفتاب غروب ہو گیا تو اسی وصیت نامے کی اشاعت کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے، اس لئے بنام خدا تعالیٰ اس کو الگ کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ آج حضرت موصوفؒ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن بفضلہٖ تعالیٰ اُن کی تعلیمات وہدایات کی روشنی زندۂ جاوید ہے۔ اور یہ وصیت نامہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے عمر بھر کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ لہٰذا ضرورت اسکی ہے کہ ہر مسلمان اُسے حرز جان بنائے اور اسے زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرے۔ آپ یہ وصیت نامہ پڑھ کر کسی اور کو دے دیجئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق کامل مرحمت فرمائے۔ امین ثم امین۔

بندہ

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

وصیت نامہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(مطبوعہ رسالہ ''البلاغ'' بابت ماہ شعبان المعظم و رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ)

احقر کے وصیت نامہ کے دو جز تھے ایک وہ جس میں اپنی اولاد و احباب کے ساتھ عام مسلمانوں کے لئے بھی وصیت ہے۔ دوسرے وہ جس کا تعلق اپنی ذاتی املاک اور خاص وارثوں سے ہے اس دوسرے جز کی اشاعت کی ضرورت نہیں تھی صرف پہلے جز کو شائع کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرَّحمن الرَّحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ و کَفٰی وَسَلامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصْطَفٰی،

امَّا بَعد

بندہ ناکارہ و آوارہ، سراپا تقصیر و خطا، سراسر جرم و گناہ محمد شفیع بن مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم سابق مدرس دارالعلوم عفا اللہ عنہما عاملھما اللہ بلطفہ و کرمہ مُظہر مدعا ہے کہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مَنْ مَّاتَ عَلٰی وَصِیَّۃٍ مَاتَ عَلٰی سَبِیْلٍ وَّسُنَّۃٍ وَّمَاتَ عَلٰی تُقًی وَّ شَہَادَۃٍ وَّمَاتَ مَغْفُوْراً لَّہٗ

(مشکوۃ بحوالہ سنن ابن ماجہ)

یعنی جو شخص وصیت کر کے مرے وہ سیدھے راستے اور سنت پر مرا، اور تقویٰ اور شہادت پر اس کی موت ہوئی اور گناہوں کی بخشش کے ساتھ مرا۔

اور ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا حَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَيْئٌ يُوصِي فِيهِ يَبِيتُ لَيلَتَيْنِ اِلَّا وَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ، (رواہ البخاری ومسلم)

یعنی جس شخص کے ذمہ کوئی واجب ادا کرنا جس کی وصیت کرنا اس کے لئے ضروری ہے اس کو حق نہیں کہ دو راتیں بھی اس طرح گزارے کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس نہ ہو

ان روایات سے حقوق واجبہ کی وصیت کا وجوب اور غیر واجبہ کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ بناءً علیہ احقر نے ۱۳۶۴ھ میں اپنا ایک وصیت نامہ لکھا تھا جس کے بعد اپنے وطن اصلی دیوبند ضلع سہارنپور (بھارت) سے ہجرت کر کے ۱۳۶۸ھ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کراچی منتقل ہونے کی نوبت آئی اور اکثر وصیتیں جو وطن اصلی کے مکانات وغیرہ کے متعلق تھیں منسوخ کرنا پڑیں، پاکستان آنے کے بعد بھی عرصہ دراز تک کوئی استقرار نہ تھا تو بار بار وصیتوں میں تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں اتفاقاً احقر کو ایک شدید قلبی دورہ پڑا جس نے موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ وہ ماہ شدید علالت میں گزرے اس وقت اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب وصیت نامہ از سر نو مرتب کیا جائے۔ فوری طور پر اسی سابق وصیت نامے میں کچھ ترمیمیں کر دی تھیں۔ اب کہ اللہ تعالیٰ نے صحت عطا فرما کر زندگی کو کچھ اور مہلت عنایت فرما دی۔ از سر نو وصیت کو مرتب کرتا ہوں، اور پہلے وصیت نامے کو ختم کرتا ہوں۔

آج شعبان ۱۳۹۲ھ کی بیسویں تاریخ اور جنوری ۱۹۷۳ء کی ۱۷ تاریخ ہے۔ بحساب قمری اسلامی احقر کی عمر اٹھتر ۷۸ منزلیں ختم ہو کر اناسی واں سال شروع ہو رہا ہے جب اس طرف دھیان گیا کہ رب العزت نے کتنی بڑی مہلت و فرصت اس ناکارہ گنہگار کو اپنی اصلاح اور تلافی مافات کے لئے عطا فرمائی، ۷۸ سال کے نو سو چھتیس ۹۳۶ مہینے اور ان کے تقریباً ساڑھے ستائیس ہزار لیل و نہار ملے جن میں اللہ تعالیٰ کی بیشمار غیر محدود نعمتیں بارش سے زیادہ برستی رہیں، اس طویل مہلت اور اس میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی نعمتوں کا شکر کیا ادا کیا اور آخرت کے لئے کتنا سامان کیا تو حیرت و حسرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہوں کہ زاد آخرت کا سفر اور گناہوں کے انبار نظر آتے ہیں اور ﴿اِنَّہٗ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا اِلَیْہِ﴾ اور اس کے فضل و کرم کے سوا کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ وہی رحیم الرحماء ہیں کہ سیئات کو بھی حسنات سے بدل دیتے ہیں۔ اسی کے لطف و کرم سے مغفرت کی امید بندھتی ہے۔

یَارَبِّ عَامِلْنِیْ بِمَآ اَنْتَ اَھْلُہٗ وَلَا تُعَامِلْنِیْ بِمَآ اَنَا اَھْلُہٗ۔

(۱) میں اپنی اولاد، اہل و عیال۔ احباب و اصحاب اور تمام مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ وہ گوہر نایاب ہے جس کی قیمت ساری دنیا و مافیہا نہیں ہو سکتی۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کی رضا جنت کی دائمی نعمتیں خریدی جا سکتی ہیں اللہ تعالیٰ کی اس بھاری نعمت کو اس کی نافرمانیوں میں صرف کرنے سے بچیں اور اس میں اپنی پوری کوشش صرف کریں۔ کسی نفسانی غرض اور دنیوی راحت و نفع کو اس پر غالب نہ ہونے دیں۔ عمر کی جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے اس کے ایک ایک منٹ کی قدر کریں۔ گذشتہ کا کفارہ توبہ و استغفار سے اور آئندہ کی اصلاح عزم مصمم سے کرتے رہیں۔ فضول اور لایعنی کلام، کام اور مجلسوں سے کلی احتراز کریں ع من نکردم شما حذر بکنید۔ عمر کے اوقات کو تول تول کر صحیح کاموں میں

صرف کرنے کی کوشش کریں۔ ہر کام سے پہلے سوچیں کہ جس طرف قدم یا قلم اٹھ رہا ہے وہ اللہ جل شانہٗ کی مرضی کے خلاف تو نہیں، خلاف نظر آئے تو سارے مصالح کو قربان کر کے پوری ہمت کے ساتھ اس سے بچنے کی کوشش کریں۔

(۲) علم دین کی تحصیل کو عمر کا اہم مقصد بنائیں، میری اولاد میں جنہوں نے علم دین کو باقاعدہ حاصل کیا ہے وہ بھی اس کا مشغلہ کسی وقت نہ چھوڑیں اور ہمیشہ اپنے آپ کو طالب علم سمجھ کر جہاں سے کوئی صحیح علم حاصل کیا جا سکتا ہو۔ اس کو نہ چھوڑیں، اور جنہوں نے باقاعدہ علوم دینیہ کی تکمیل نہیں کی، وہ بھی اپنے آپ کو اس مشغلہ سے یہ سمجھ کر فارغ نہ سمجھیں کہ علماء کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے بلکہ حضرت سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ اور دوسرے اکابر علماء کی تصانیف کا مطالعہ ایک معمول بنا کر روزانہ کرتے رہیں بلکہ سب گھر والوں کو جمع کر کے سنایا کریں تا کہ سب پر اثر پڑے اور اپنا ماحول دینی ہو جائے ورنہ تجربہ یہ ہے کہ جب کسی کا ماحول (سوسائٹی) دینی نہ ہو تو اس کو دین پر قائم رہنا مشکل ہوتا ہے اور جس قدر دینی امور کا خود کو علم ہو وہ دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں خواہ خود عالم کامل نہ ہوں۔

(۳) ایسے علماء کی صحبت کو کیمیا اور غنیمت کُبریٰ سمجھیں جو علمی تحقیق میں مشائخ ولی اللّٰہی یا بعنوانِ دیگر علماء دیوبند کے مسلک پر ہوں، اور صرف کتابی علم کے حامل نہ ہوں بلکہ تمام معاملات میں خدا ترسی اور خوف آخرت اور تعلق مع اللہ ان کی زندگی میں نمایاں ہو۔ اور بہتر یہ ہے کی ایسے بزرگ سے باقاعدہ بیعت ہو جائیں جو کسی متبع سنت بزرگ کا خلیفۂ مجاز ہو، خصوصاً سیدی حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے کسی بزرگ سے مناسبت ہو تو وہ زیادہ بہتر ہے۔

(۴) بچوں کو جب تک قرآن کریم ناظرہ مکمل اور دین کی ضروری معلومات

سے پوری طرح واقفیت نہ ہو جائے کسی دوسرے کام میں نہ لگائیں۔ بچوں کی تربیت میں اس کا خاص اہتمام کریں کہ ان کے اعمال واخلاق شریعت کے مطابق ہوں، جھوٹ، فریب، بد معاملگی سے بچنے کی پوری کوشش کریں اور فرائض وواجبات اور سنن کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔

(۵) ایسے لوگوں کی صحبت اور زیادہ میل جول سے کلی احتراز کریں جو نماز روزہ حلال وحرام اور دینی معاشرت سے غافل ہوں۔ اگر وہ رشتہ دار یا قدیم دوست ہیں تو صرف ادائیگی حقوق تک ان سے ملیں۔ دوستانہ تعلقات اور خصوصی صحبت صرف ایسے لوگوں کے ساتھ ہو جو دین میں تمہارے لئے معین ثابت ہوں۔ اگر ایسے لوگوں میں کسی سے قلبی تعلق زیادہ ہے تو اس کو اپنے رنگ پر لانے کی پوری کوشش کریں۔ اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سب مسلمانوں پر عائد کیا ہے۔ اس میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ ہر انسان کا اپنا ماحول دینی ہو جائے اور دینی معاملات میں یہ صحبتیں رکاوٹ بننے کی بجائے معین و مددگار بنیں۔ بچوں کو بھی ابتدا ہی سے ایسی آزاد صحبتوں سے بچایا جائے۔

(۶) اس زمانے کی سب سے بڑی افتاد جو شریف اور دینی گھرانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے وہ عورتوں میں بے پردگی کے رجحانات، لڑکیوں میں جدید قسم کے نیم عریاں ملبوسات ہیں۔ جن گھروں میں پردے کا نام باقی بھی ہے وہاں بھی وہ شدت واحتیاط باقی نہیں جو ان کے بڑوں میں تھی۔ عزیزوں میں غیر محرم لڑکے لڑکیاں حدود شریعت کے پابند نہیں رہے۔ بے تکلف ایک دوسرے سے اختلاط رکھتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں اور اس کے نتائج پورے خاندان کے لئے نہایت خطرناک ہیں۔

(۷) عورتوں میں یہ غیر شرعی رجحانات بھی زیادہ تر ایسی آزاد عورتوں کے اختلاط سے بڑھتے جاتے ہیں جو شرعی پردہ اور عبادات و معاملات میں شرعی حدود کی پابند نہیں۔ ایسی عورتوں سے زیادہ اختلاط کو زہر قاتل سمجھیں، جن سے تعلقات رکھنا ہوں ان کو کوشش کر کے اپنی راہ اور اپنے دینی رنگ پر لائیں ورنہ یکسوئی اختیار کریں۔

(۸) ایسی کتابیں دیکھنے سے مرد و عورت ہر شخص اجتناب کرے جن میں خلاف شرع امور کا بار بار تذکرہ ہو کہ قلب و دماغ پر اس کا اثر ناگریز ہے۔ عموماً ناول، افسانے اور ایسی تصنیفات جو اس طرح کی چیزوں سے لبریز ہیں ان کا داخلہ گھروں میں ممنوع ہونا چاہئے۔ دینی کتابوں میں صرف محقق اور با خدا علماء کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے جن کے علم صحیح اور دیانت وتقویٰ پر مکمل اعتماد ہو۔ جب تک مصنف پر اتنا اعتماد نہ ہو اس کی کتاب نہ دیکھی جائے۔ البتہ صرف اہل علم ہر کتاب دیکھ سکتے ہیں وہ بھی بقدر ضرورت۔ کیونکہ اہل فسق و فجور و اہل فساد و الحاد کی تصانیف بھی انسان پر ان کی بری صحبت کی طرح غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتی ہیں اس لئے بلاضرورت شرعیہ ان سے اجتناب کرنا چاہئے۔

(۹) اپنے سب محبین و متعلقین اصاغر و اکابر سے عاجزانہ درخواست ہے کہ میری باقی زندگی میں بھی اور میرے بعد بھی جس وقت کبھی ناکارہ کا خیال آجائے، میرے لئے دعائے مغفرت فرمادیں۔

(۱۰) اپنے اقارب اور خاص احباب سے درخواست ہے کہ روزانہ اگر ہو سکے تو سورۂ یٰسین شریف ایک مرتبہ ورنہ تین مرتبہ سورۂ اخلاص (قُلْ هُوَ اللّٰهُ) پڑھ کر ایصال ثواب کر دیا کریں، جس سے انشاء اللہ تعالیٰ وہ خود بھی اجر عظیم کے مستحق

ہوں گے، باقی مالی صدقات کا ایصال ثواب طعام ولباس و دیگر ضروریات فقراء میں جس قدر ہمت ہو اخفاء کے ساتھ خالصاً لوجہ اللہ کر دیا کریں، نام ونمود اور رسمی دعوتوں سے ہمیشہ احتراز کریں کہ اس کا نہ میت کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ خرچ کرنے والے کو۔

(۱۱) میرے سب متعلقین اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ اپنے ہر کام میں اتباع سنت کو مضبوطی سے پکڑیں۔ بدعات اور رسوم جاہلیت سے کلی اجتناب کریں۔ آخرت کی فکر کو دنیا کی فکروں پر غالب رکھنے کی کوشش سے کبھی غافل نہ ہوں۔ متبع سنت علماء اور بزرگوں سے تعلق، ان کی صحبت و خدمت کو سرمایۂ سعادت سمجھیں، جن علماء ومشائخ سے عقیدت ومناسبت ہو اُن سے استفادہ کریں اور جن سے مناسبت نہ ہو اُن کے بارے میں بھی بدگمانی اور بدزبانی کو زہر قاتل سمجھیں خصوصاً وہ حضرات جو عبادات یا خدمت دین میں مشغول ہوں۔

(۱۲) اس وقت ہمارا پورا معاشرہ جس تیزی کے ساتھ دین سے منحرف اور سنت سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے اُس کی نظیر پچھلے کسی دور میں نہیں ملتی، معاشرے اور ماحول کی خرابی کا یہ لازمی اثر ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی طبیعت سے عمل صالح اور سنت پر قائم رہنا بھی چاہئے تو گرد و پیش کے عوامل اور احباب واخوان اسے سیدھے راستے پر نہیں رہنے دیتے، اس لئے اسلامی تعلیمات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بنیادی اصول کی حیثیت دی گئی ہے۔ خصوصاً اپنے ماحول کے لوگوں کی اصلاح کی فکر کا فریضہ ہر انسان پر اہمیت کے ساتھ عائد کیا گیا ہے۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ اور قُوْآ اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِکُمْ نَاراً
وغیرہ ارشادات میں اسی کی تلقین کی گئی ہے۔

اس زمانے میں جبکہ مغربی دہریت اور اباحیت کا طوفان پوری دنیاء اسلام پر چھایا چلا جارہا ہے اپنے ایمان کی بھی اس وقت تک خیر نہیں جب تک اپنے ماحول اور معاشرے کی اصلاح پر پوری توجہ نہ دی جائے۔

بے پردگی، عریانی اور بے حیائی کے رجحانات نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں اس درجہ عام ہو چکے ہیں کہ کسی شریف نیک لڑکے کو اس کے مناسب لڑکی اور نیک صالح لڑکی کے لئے اس کے مناسب لڑکا ملنا انتہائی دشوار ہو گیا ہے۔

بڑے سے بڑے دیندار گھرانے مجبور ہو کر رشتہ نکاح میں صرف مادی منافع کو دیکھنے لگے اور دینی اور اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ اس لئے میری آخری اور سب سے اہم وصیت اپنے عزیزوں کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً یہ ہے کہ اپنے ماحول کو دینی بنانے کی انتہائی فکر اور پورا اہتمام کریں۔

بہت سے گھرانوں میں ماں باپ دیندار ہیں مگر اولاد کی راہ دوسری ہے شوہر کا ایک طرز ہے، بیوی اس سے متفق نہیں ہے بعض جگہ بیوی دیندار ہے اور شوہر اس سے مختلف ہے۔ یہ بلا عام ہے اور اس کی وجہ سے پہلی نحوست تو عام حالاتِ زندگی میں اختلاف رائے اور نفرت و بغض ہوتا ہے جس کا اثر نسلوں میں چلتا ہے، دوسری مصیبت یہ ہوتی ہے کہ جو شخص دین اور سنت پر قائم رہنا چاہئے اُس کی زندگی وبال ہو جاتی ہے اور قدم قدم پر اس کے لئے مشکلات حائل ہوتی ہیں، اور اگر کسی طرح وہ سب مشکلوں کو عبور کر کے اپنا عمل درست بھی کر لے تو دوسرں پر اُس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ دشمنی اور بغاوت کے جذبات اُبھرتے ہیں۔ اس معاملے میں اعزاء واحباب کو بہت تنگ پکڑنا بھی مناسب نہیں کہ وہ چل نہیں سکتا، میرے خیال میں اگر مندرجہ ذیل چیزوں کو اپنے خاندان کی ایسی خصوصیت بنالیا جائے کہ جو عزیز یا

دوست اس سے منحرف ہو، پورا خاندان اس سے منحرف ہو جائے۔ مگر تشدد کا طرز ہرگز اختیار نہ کیا جائے کہ وہ مضر ہی مضر ہے۔ بلکہ فہمائش اور خیر خواہی اور ہمدردی کے لہجے میں اس کو اپنے ماحول میں لانے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں تو امید ہے کہ وہ معاشرہ کے بگاڑ کو کسی حد تک روک دے گا۔ وہ امور یہ ہیں:۔

(الف) خود اور اپنی اولاد واحباب کو نماز با جماعت کا پابند بنائیں، عورتیں اول وقت گھروں میں نماز ادا کرنے کی عادی بنیں۔ اذان ہوتے ہی سب کام موقوف کر کے نماز میں مشغول ہوں۔ خانگی نظام الاوقات میں پہلے سے اس کا خیال رکھا جائے۔

(ب) صبح کو نماز کے بعد جب تک ہر بچہ اور ہر بڑا، مرد اور عورت کچھ تلاوت قرآن نہ کر لے کسی کام میں نہ لگے۔

(ج) بے پردگی اور عریانی کو اپنے معاشرے میں کسی حال میں برداشت نہ کیا جائے۔ رشتہ منگنی کرتے وقت ان چیزوں کی پوری دیکھ بھال کی جائے۔

(د) فیشن پرستی اور مغربی طرز زندگی تو ایک لعنت اور سمِ قاتل سمجھ کر پورے معاشرے کو سادہ زندگی اور بے تکلف ملاقاتوں کا عادی بنایا جائے۔

(ہ) شریعت کے کھلے ہوئے محرمات، سود، شراب، ناچنے گانے کی محفلوں سے خود اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو ایسا بچایا جائے جیسے زہر سے بچایا جاتا ہے۔

یہ چند امور ہیں جن کا ہر خاندان کے افراد کو آپس میں معاہدہ کر لینا چاہئے اور ان کی خلاف ورزی کو ایک جماعتی اور خاندانی عہد شکنی قرار دے کر نرم تدبیروں کے ساتھ اس کی اصلاح کی فکر کو لازم سمجھا جائے۔ بائیکاٹ اور قطع تعلق کے طریقوں سے قطعی اجتناب

کیا جائے کہ اس کا نتیجہ تجربۃً اچھا نہیں ہوتا، مگر کوشش مسلسل جاری رکھی جائے۔

وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِیْنُ

وصیت متعلقہ اجازت بیعت وتلقین

احقر آوارہ ناکارہ اپنی حالت سے الحمدللہ بے خبر نہیں ہے کہ سراپا عیوب وذنوب ہے جو خود اپنی اصلاح نہ کر سکا ہو وہ دوسرے کی اصلاح کیا کرے لیکن سیدی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے اس ناکارہ کو بیعت وتلقین کی اجازت دے کر ایک بھاری ذمہ داری مجھ ضعیف پر عائد فرمادی جس کو آئندہ کے لئے فال نیک سمجھ کر احقر نے اختیار کیا۔ اور بہت سے حضرات اہل دین کو تربیت کے متعلق مشورے دیتا رہا۔ ان میں سے چند حضرات کے متعلق اس کا اندازہ ہوا کہ بحمداللہ یہ دوسرں کی تربیت واصلاح کی خدمت انجام دے سکتے ہیں ان کو بنام خداتعالیٰ بیعت وتلقین کی اجازت دے دی۔ مندرجہ ذیل فہرست میں ان کے نام اور پتے اس دینی مصلحت سے شائع کئے جارہے ہیں کہ طالبین حق اپنی اپنی مناسبت طبع کے اعتبار سے ان میں سے کسی کو اختیار کر کے ان سے اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کریں۔ نیز اس لئے بھی کہ غلط انتساب سے حفاظت ہو سکے۔ سیدی حکیم الامت قدس سرہ نے بھی اسی مصلحت سے اپنے مجازین کی فہرست خود شائع فرمادی تھی۔

میری طرف سے جن حضرات کو اجازت دی گئی اُن کی فہرست یہ ہے:۔

(۱)　میر امام الدین صاحب، حیدرآباد دکن، ان کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔

(۲) مولوی محمود حسن صاحب پرنام بٹ مدارس (ہندوستان)

(۳) مولوی سید محمود حسن صاحب۔ ۲۷، مکتبہ اشرفیہ، متصل جامعہ مسجد اظہر گوہر روڈ وحید آباد کراچی نمبر ۱۸

(۴) مولوی عبدالحکیم صاحب مدرس ومفتی مدرسہ اشرفیہ کوئنس روڈ سکھر۔

(۵) مولوی محمد طفیل صاحب، مقیم پیپلز کالونی لائل پور۔

(۶) مولوی عبدالرؤف صاحب معین مدرس ومعین مفتی دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

(۷) حکیم امداد اللہ صاحب۔ ۲۱۲ حیدر آباد کالونی بہادر یار جنگ روڈ کراچی نمبر ۵

(۸) شاہ سلیمان صاحب ۲۹۹ زمان آباد۔ ۳۶ بی لانڈھی کراچی نمبر ۳۰

(۹) حاجی غلام قادر صاحب، سابق کمپاؤنڈر نیوی ہسپتال کراچی۔ حال مساعد عملیات مستشفی غیزہ سعودی عرب۔

(۱۰) حاجی محمد عثمان صاحب میمن۔ لیاقت آباد۔ ۱۸۸ کراچی نمبر ۱۹

۲۷ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ کو مزید تین حضرات کو اجازت دیگئی جو پہلے سے دوسرے بزرگوں کے زیر تعلیم تھے۔

(۱۱) مولوی محمد وجیہ مفتی ومدرس دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو اللہ یار ضلع حیدر آباد سندھ۔

(۱۲) مولوی عبدالشکور صاحب ترمذی، مدرس ومہتمم مدرسہ حقانیہ مقام ساہیوال ضلع سرگودھا۔

(۱۳) ماسٹر محمد اقبال صاحب قریشی، ہارون آباد ضلع بہاولنگر۔ معرفت دکان مستری نظام الدین۔ متصل ڈاک خانہ، ہارون آباد۔

نوٹ:۔ وفات سے چند روز پہلے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ کے مولانا مفتی محی الدین صاحب کے نام کا بھی اضافہ فرمایا جن کا پتہ حسب ذیل ہے:۔

(۱۴) مولانا مفتی محی الدین صاحب ۳۲/۳۱ بڑا کسٹرہ لین پوسٹ چوک بازار۔ ڈھاکہ۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۱ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ / ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۹۵ء

کچھ تلافی مافات

اپنے احباب اور متعلقین سے ایک دردمندانہ درخواست

کئی سال ہوئے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ العزیز و نفعنا بعلومھم وفیوضھم کا ایک مضمون بعنوان ''کچھ تلافی مافات'' بطور ضمیمہ ماھنا البلاغ کراچی شائع ہوا تھا جس کو مناسبت مقام اور افادۂ عوام کی غرض سے وصیت نامہ کے آخر میں شامل کیا جاتا ہے ۱۲م

وصیت نامہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ و کفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ،

امّا بَعد

احقر اس وقت اپنی عمر کا ستتر واں سال گزار رہا ہے، اور یوں تو انسان کی پوری زندگی ہی اس کام کے لئے ہے کہ اسے سفر آخرت کی تیاری میں صرف کیا جائے، کیوں کہ اس سفر کے لئے جوانی یا بڑھاپے کی کوئی قید نہیں، کتنے بوڑھے ہیں جنہوں نے اپنے پوتوں پڑپوتوں کو مٹی دی ہے اور کتنے جوان ہیں جو اپنی اولاد بھی نہیں دیکھ پائے۔ لہٰذا واقعہ تو یہ ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں آخرت کی فکر سے غفلت برتی جا سکے، لیکن خاص طور سے بڑھاپے کی اس عمر کا سب سے بڑا مطالبہ انسان سے یہ ہے کہ اگر اس نے ماضی میں غفلت برتی ہے تو کم از کم اب وہ

مکمل طور سے سفر آخرت کی تیاری کی طرف متوجہ ہو جائے۔

سفر آخرت کی تیاری کے یوں تو بہت سے شعبے ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ سنگین معاملہ حقوق العباد کا ہے کیوں کہ وہ صاحب حق کی معافی کے بغیر معاف نہیں ہوتے حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس کے ذمہ کسی (مسلمان یا انسان) بھائی کا کچھ حق ہو اس کی آبرو کے متعلق یا اور کسی قسم کا، وہ واس سے آج معاف کرالے ایسے وقت سے پہلے کہ نہ اس کے پاس دینار ہوگا نہ درہم (مشکوۃ باب الظلم)

اسی لئے میرے شیخ و مُرشد اور مربی، سیدی وسندی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے شوال ۱۳۴۴ھ کے ماہنامہ "النور" میں (یعنی وفات سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے) ایک مضمون "العُذر وَالنّذر" کے نام چھپوایا تھا جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنے ذمہ جو حقوق العباد رہ گئے ہوں ان کا تصفیہ کیا جائے۔

عرصہ سے میرا بھی ارادہ تھا کہ اس قسم کا ایک مضمون تحریر کر کے اپنے اعزہ، احباب اور متعلقین میں شائع کروں لیکن گوناگوں مصروفیات میں یہ کام ٹلتا گیا۔ آج جبکہ دورۂ قلب کے حملے کی وجہ سے میں تقریباً اٹھارہ روز سے ہسپتال میں زیر علاج ہوں اور اللہ تعالیٰ نے طبیعت کو روبصحت کر کے اتنا افاقہ بخشا ہے کہ میں اپنا یہ مجوزہ مضمون لکھوا سکوں، میں چاہتا ہوں کہ اس فرض سے سبک دوش ہو جاؤں۔

حقوق العباد دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک مالی، دوسرے غیر مالی، جہاں تک مالی حقوق کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں نے کوشش ہمیشہ یہ کی ہے کہ اس قسم کے حقوق سے سبک دوش رہوں اور جن کی ادائیگی باقی ہے، ان کا بحمد اللہ انتظام کر رکھا ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ کچھ حقوق میرے ذہن میں نہ رہے ہوں، لہٰذا اگر کسی صاحب کا کوئی مالی حق میرے ذمہ رہ گیا ہو جسے میں بھول گیا ہوں تو براہ کرم

وہ مجھے یاد دلا دیں، اگر مجھے یاد آ گیا تو انشاء اللہ اس کی ادائیگی کر دوں گا۔

رہے غیر مالی حقوق، مثلاً کسی کو ناحق کچھ کہہ لیا ہو، کسی کی دل شکنی کی ہو، خواہ روبرو یا پس پشت، اور خواہ ابتداً ایسا کیا ہو یا انتقام میں جائز حدود سے تجاوز ہو گیا ہو یا کسی کو ناحق بدنی ایذاء پہنچائی ہو (اور اس قسم کے حقوق کا احتمال زیادہ ہے) ان سب اہل حقوق کی خدمت میں دست بستہ نہایت لجاجت سے درخواست ہے کہ ان حقوق کا خواہ مجھ سے معاوضہ لے لیں۔ (بشرطیکہ مدعی کا صدق میرے دل کو لگ جائے) اور خواہ حسبۃً للہ معاف فرما دیں، میں دونوں حالتوں میں ان کا شکر گذار رہوں گا کہ مجھ کو آخرت کے محاسبہ سے بری فرمایا، اور معافی کی صورت میں دعا بھی کرتا رہوں گا کہ میرے ساتھ مزید احسان فرمایا۔

جن مسائل میں احقر کو دوسروں سے علمی، نظریاتی یا سیاسی اختلاف رہا ہے ان میں اپنے شیخ و مربی، سیدی وسندی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے مزاج کے مطابق احقر کا معمول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ میں نے اختلاف کو نظریہ، اصول اور مسلک کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اشخاص و ذوات کو اس کا ھدف بنانے سے حتی الوسع پرہیز کیا ہے، تاہم ان مسائل میں حدود کی رعایت آسان نہیں ہوتی، اس لئے ممکن ہے کہ کوشش کے باوجود کہیں حدود سے تجاوز ہو گیا ہو اور میرا قلم یا زبان کسی کی ناحق دل شکنی کا سبب بنی ہو، اس لئے جن حضرات سے میرا علمی، نظریاتی یا سیاسی اختلاف رہا ہے، ان سے بھی میری یہی درخواست ہے

حدیث میں کسی مسلمان بھائی کی معذرت قبول کر لینے اور اسے معاف کرنے کے بڑے فضائل آئے ہیں بلکہ ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ ''جو شخص اپنے مسلمان بھائی سے معذرت کرے اور وہ اس کو قبول نہ کرے اس پر ایسا گناہ ہو گا جیسا ظلماً محصول وصول کرنے والے پر ہوتا ہے۔ (ابن ماجہ)

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''جس شخص سے اس کا بھائی معذرت کرے اور وہ اس کو قبول نہ کرے، وہ میرے پاس حوض کوثر پر نہ آنے پائے گا۔''

ترغیب وترھیب منقول از العذر و النذر. لہٰذا امید ہے کہ جن حضرات کے ایسے حقوق مجھ پر واجب ہیں وہ ان احادیث کے پیش نظر انشاء اللہ مجھے ضرور معاف فرما دیں گے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ کسی شخص کی غلطی معاف کرنے یا معذرت قبول کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے دوستانہ اور خصوصی تعلقات بھی ضرور رکھے جائیں، کیوں کہ ایسا کرنا بعض اوقات مشکل اور بعض اوقات خلاف مصلحت ہوتا ہے، لھٰذا معافی کی اس درخواست کا مطلب دوستی، بے تکلفی اور خصوصی مراسم کی درخواست نہیں، صرف حقوق شرعیہ سے سبک دوش کرنے کی درخواست ہے۔

اور جس طرح میں دوسروں سے معافی کا طلب گار ہوں، اسی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بموجب اللہ تعالیٰ سے عفوودرگذر کی امید کرتے ہوئے اپنے وہ تمام غیر مالی حقوق بلا استثناء سب معاف کرتا ہوں جو کسی دوسرے مسلمان پر ہوں اور میرے جو مالی حقوق دوسروں پر واجب ہیں ان کے بارے میں یہ گذارش ہے کہ جن حضرات کو ادائیگی پر قدرت نہ ہو وہ مجھ سے خاص طور پر گفتگو کر لیں، انشاء اللہ ان کے لئے کوئی آسان راستہ نکال دوں گا، خواہ معافی، خواہ تخفیف، خواہ مہلت، خواہ اور کچھ۔

آخر میں اپنے تمام اعزہ، احباب اور متعلقین سے درخواست ہے کہ وہ احقر کو حتی الامکان دعاؤں میں یاد رکھیں جَزَاھمُ اللّٰہ تعالٰی خَیرَ الْجزآء

احقر

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ

فہرست عنوانات بترتیب حروف تہجی

نمبر شمار رسائل .... رسالہ نمبر جلد نمبر صفحہ نمبر

﴿ آ ﴾

﴿ الف ﴾

...... ت ......

...... ج ......

چ

ح

خ

د

﴿ڈ﴾

﴿ر﴾

﴿ز﴾

﴿س﴾

﴿ش﴾

﴿ص﴾

﴿ض﴾

﴿ط﴾

﴿ع﴾

﴿ف﴾

﴿ق﴾

﴿ک﴾

﴿م﴾

﴿ن﴾

المقالات الفقهية

لفضيلة الشيخ المفتي محمد رفيع العثماني حفظه الله
رئيس جامعة دار العلوم كراتشي

الناشر
مكتبة دار العلوم كراتشي

شرح عقود رسم المفتي

تالیف

العلامة محمد امين ابن عابدين رحمه الله

مع تعليقات نافعة

لفضيلة الشيخ المفتي محمد رفيع العثماني حفظه الله
رئيس جامعة دار العلوم كراتشي

مكتبة دار العلوم كراچي ۱۴